علم و دانش کے معمار

احمد عقیل روبی

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

نام کتاب: علم و دانش کے معمار

مصنف: احمد عقیل روبی

سرورق: مظہر الاسلام۔ منصور احمد

طبع اوّل: 2011ء

طبع دوم: 2011ء

تعداد: 1000

کوڈ نمبر: GNU-419

قیمت: 600/- روپے

آئی ایس بی این: 978-969-37-0533-1

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کیلئے رابطہ:

ویب سائٹ http://www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125

یا ای میل books@nbf.org.pk

خالد چوہدری کے نام

فہرست

پہلی بات

کتابیں اُستاد بھی ہیں اور دوست بھی...... زندگی کے سفر میں سچا ساتھی ہیں تو حیات کا روحانی زادِ راہ بھی...... کتابیں رہنما بھی ہیں اور شخصیت ساز بھی...... کتابیں معاشرے کا اثر قبول کر کے لکھی جاتی ہیں تو یہ سماج کی تشکیل بھی کرتی ہیں...... کتاب ایک مگر اس کے زاویے ہزار ہوتے ہیں۔ کتاب منزل پر پہنچنے کی راہیں اَن گنت لیکن جستجو کا مسافر جس راہ سے بھی گزر کر یہاں تک پہنچے، ذہن کی آسودگی، روح کی بالیدگی اور شعور کی پختگی کو اپنے استقبال کے لیے منتظر پائے گا۔

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کے تحت کوشش کی گئی ہے کہ اس طرح کی مفید کتابوں کی اشاعت ممکن بنائی جائے جو قارئین کے ذوقِ کُتب بینی کی تسکین اور علم و دانش کے فروغ کے ساتھ ساتھ، ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والوں افراد کے لیے یکساں طور پر اہمیت اور دلچسپی کی حامل ہوں۔ نیشنل بُک فاؤنڈیشن نے ملک میں کُتب بینی کے فروغ کے لیے اہم نوعیت کے اقدامات کیے گئے ہیں، جس میں مختلف سطح پر ''ریڈرز کلب'' کا قیام بھی ہے۔ ان میں چلڈرن بُک کلب، ٹریولرز بُک کلب، ولیج بُک کلب، پرزنرز فری مائینڈز بک کلب، سٹی بک کلب اور ہسپتال بک کلب شامل ہیں۔ ساتھ ہی کتاب اور کُتب بینی کے فروغ کے لیے سفیرانِ کتاب Book's Ambassidors بھی مقرر کیے گئے ہیں، تا کہ پاکستان میں فنونِ لطیفہ اور علم و دانش کی دنیا کی ممتاز شخصیات لوگوں کو کتاب اور مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کرسکیں۔

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کا مقصد ہے کہ ادب، فنون، سائنس، فلسفہ، تحقیق، تنقید، تاریخ اور نفسیات سمیت ایسے تمام تر موضوعات پر کُتب شائع ہوں جو عام قارئین، طالب علموں، محققین، ماہرین اور اساتذہ کے لیے یکساں طور پر افادیت کی حامل ہوں۔ زیرِ نظر کتاب 'علم و دانش کے معمار' اسی فِکر کی ایک عملی مثال ہے۔

''علم و دانش کے معمار'' احمد عقیل روبی کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ادب، فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، تنقید، تحقیق...... غرضیکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا قاری زندگی کے کسی بھی شعبے

سے تعلق رکھتا ہو، یہ اُسی سے مخاطب ہے۔ کتاب میں جن شخصیات اور اُن کی فکر کو موضوع بنایا گیا ہے، وہ ہر عہد کے زندہ لوگ ہیں۔ اُن کی فکر صدیوں گزر جانے کے باوجود آج بھی بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ سچ ہے کہ بڑے لوگ مرتے نہیں بلکہ تاریخ میں چلے جاتے ہیں اور اُن کی فکر کتابوں کی صورت میں ہمیشہ دانش بانٹتی رہتی ہے اور حروف کی صورت میں قاری کی درست راہ کی سمت رہنمائی کرتی رہتی ہے۔

مظہرالاسلام

چند باتیں

اس کتاب میں شامل عہد ساز Trend Setter مصنفین اور دانشوروں کے حالات کے بارے میں اطلاعات کا تنکا تنکا اکٹھا کرنے میں ایک طویل عرصہ لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب Internet کی نعمت آسمان سے زمین پر نہیں اُتری تھی۔ بس واحد سہارا کتابیں تھیں۔ ان مصنفین کے بارے میں جاننا میرا جنون تھا اور پھر ان کے بارے میں لکھنا میرا کتھارسس۔ جب ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد وقت میسر آیا اور بکھرے کاغذات پر نظر پڑی تو مجھے لکھنے کی تحریک دلانے میرے دوست خالد چودھری آ گئے۔ یہ سارے مضامین خالد چودھری کی محبت اور اخبار کی فراخ دلی کا نتیجہ ہیں۔ وجاہت مسعود، ندیم رضا، نوشین نقوی، محمود عالم، اعزاز احمد اور محمد صفدر شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔

میری اس کوشش کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ایم ڈی مظہرالاسلام نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ وہ خود ایک منفرد اور صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں۔ جب سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کا ادارہ ان کے زیر انتظام آیا ہے۔ ان کی نظر ایسی کتابوں کی تلاش میں رہتی ہے جو ہر عمر کے قارئین کی پسند پر پوری اُتریں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہیں یہ مضامین پسند آئے اور اب یہ کتابی شکل میں چھپ کر آپ کے سامنے ہیں۔

انتظار حسین میرے قلبی اور روحانی گُرو ہیں۔ یہ مضامین لکھنا شروع کیے تو راستے کی کٹھنائیاں اور پیچیدگیاں منہ اٹھا اٹھا کر مجھے گھورنے لگیں۔ یہ مشکلات انتظار صاحب کے مشوروں سے دور ہوئیں۔ ''انتظار کارنر'' میں بیٹھنے والے اکرام اللہ، زاہد ڈار اور اریج مبارک نے حوصلہ بڑھایا۔ ان تینوں پڑھے لکھے آدمیوں کا شکریہ۔

اب ایک شکریہ اور مجھ پر واجب ہے اور وہ میری بیوی بشریٰ عقیل کا شکریہ ہے، جس نے وقت دیا۔ آسانیاں پیدا کیں اور یہ کام مکمل ہوا۔

رہی ان مضامین کی قدر و قیمت کی بات تو اس سلسلے میں ایک واقعہ سن لیجیے۔ جن دنوں روسی ناول نگار گوگول (Gogol) پیٹرز برگ میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ پشکن کی سفارش پر اسے یونیورسٹی میں لیکچرر کی نوکری مل گئی۔

گوگول ایک لیکچر دے کر بھاگ گیا۔ دوبارہ یونیورسٹی نہیں گیا۔ پشکن نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا:

''جتنا مجھے آتا تھا میں نے پڑھا دیا۔ اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں وہاں جا کر طالب علموں کو کیا پڑھاؤں گا۔''

میرا بھی یہی حال ہے۔ اس کتاب میں جن لوگوں پر میں نے لکھا ہے ان کا میرے ہاں طویل عرصے سے آنا جانا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر، انہیں پڑھ کر جو کچھ یاد رہا میں نے لکھ دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور یہ کتاب...... اس کتاب میں اگر کوئی اچھائی ہے تو اسے اتفاق سمجھیں اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو اس کی وجہ میری لاعلمی۔ مجھے جو آتا تھا، جتنا یاد تھا میں نے لکھ دیا ہے۔

احمد عقیل روبی

ہومر

(Homer)

800 قبل مسیح کا عظیم یونانی شاعر ''ایلیڈ'' اور ''اوڈی سی'' کا خالق۔ اسے ہر عہد کا عظیم شاعر اور داستان نویس مانا جاتا ہے۔ ورجل، دانتے، ملٹن، جیمز جوائس، کازان زا کیز، اِس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عالمی ادب پر سب سے زیادہ اثر ہومر کا ہے۔

''ایکلیز میدان جنگ کی طرف بڑھا۔اس زہریلے سانپ کی طرح جو اپنے اندر زہریلا مادہ لے کر کسی انسان کی طرف لپکے جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں اور جو اپنے شکار کے لئے بل کھا رہا ہو یا اس پہاڑی عقاب کی طرح جو تیزی سے پرندے کی طرف بڑھے جو جان بچانے کے لیے آگے آگے اڑ رہا ہو اور عقاب چیختا چلاتا اس پر لپکے۔''

....

''آجکس میدان جنگ سے یوں آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا جیسے کھیت سے گدھا بچوں کی مسلسل مار کھا کر باہر نکل رہا ہو۔''

(ایلیڈ)

....

ہر لکھنے والے کو اپنے دن اور رات ہومر کے ساتھ بسر کرنے چاہئیں۔

(ہوریس)

ہومر

ملک اور سرزمین اپنے معدنی وسائل، جہازوں کی تعداد، فوجی استحکام اور اجناس کے ذخائر سے نہیں پہچانی جاتی۔ نامور شخصیتیں ملک اور سرزمین کی پہچان بنتی ہیں۔ادب، شاعری، فلسفہ اور علم انہیں ناقابل فراموش اور زندہ جاوید بناتا ہے۔امام غزالی 28 سال کی عمر میں نظام الملک طوسی کے پاس گئے اور نظام الملک نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر 60 ہزار اشرفیوں کی خطیر رقم سے بغداد میں ایک مدرسہ بنوا دیا جہاں وہ ایک عمر فلسفے کی تعلیم دیتے رہے نظام الملک طوسی ملک شاہ کے وزیر تھے ملک شاہ کو جب پتہ چلا تو اس نے نظام الملک سے کہا:

''بابا (ملک شاہ نظام الملک کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے) آپ نے اتنی رقم سے مدرسہ بنوا دیا اگر یہ رقم فوج پر خرچ کی جاتی تو ہم کچھ مزید علاقہ فتح کر سکتے تھے۔''

نظام الملک نے جواب دیا:

''تمہاری فوج کے تیر چند فرلانگ تک جائیں گے، لیکن اس مدرسے سے فلسفے اور علم کی پھوٹی ہوئی خوشبو صدیوں تک جائے گی۔''

نظام الملک کی بات بالکل درست تھی۔جلیل القدر سلطنتوں کا جاہ وجلال، شان وشوکت، محل مینارے، فوجی دبدبہ سب کچھ خاک بن کر بکھر جاتا ہے۔بس باقی رہتی ہے تو علم ودانش کی روشنی جو ملک اور قوم کو زندہ رکھتی ہے۔یونان ایسی ہی سرزمین تھی۔صدیاں گزر چکی ہیں مگر وہاں مہکنے والے علم ودانش کے پھولوں کی مہک اب بھی قلب وجاں کو راحت بخش رہی ہے۔انگریزی شاعر پی۔بی۔شیلے نے اپنی نظم (Queen Mab) میں یونان کی سرزمین کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

This was the Land Where Nature Cultivated wit, Wisdom and Intelegence

ذہانت، علم دانش اور فہم سے شیلے کی مراد وہ نامور شخصیتیں ہیں جنہیں زمانہ، سقراط، افلاطون، ارسطو اور ان سب سے پہلے ہومر (Homer) کے نام سے یاد کرتا ہے۔یہ لوگ وقت کی فصیل پر چراغ بن کر جل رہے ہیں اور ان کی روشنی میں صدیاں راستہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چل رہی ہیں۔

ہومر (Homer) یونان کا بہت بڑا رزمیہ (Epic) نگار تھا۔سقراط، افلاطون اور ارسطو کی تحریریں اسی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتی ہیں۔تینوں اسے عظیم منصف تسلیم کرتے ہیں۔اس سے اختلاف بھی کرتے تو اس انداز میں کہ وہ اختلاف بھی اعتراف سخن دکھائی دیتا ہے۔

ہومر (Homer) کو اپنی دو عظیم اور لافانی طویل نظموں ایلیڈ (Iliad) اور اوڈی سی (Odyssey) کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے۔صدیاں گزر چکی ہیں اس کی شہرت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا اور دنیا کے ادب اور شاعری پر ہومر Homer کا اثر آج بھی نظر آتا ہے۔دنیا کے ہر بڑے لکھنے والے نے ہومر کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔اور ان کی تحریروں

میں اس عظیم اور مہان لکھاری کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

ہومر آٹھویں قبل مسیح کا شاعر ہے۔ کئی شہر یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ اس کی پیدائش ان کی سرزمین میں ہوئی تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وہ نابینا تھا اور یونان کے مغربی ساحل (ایشیائے کوچک) کے کسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اپنی حمد یہ نظم جو اس نے اپالو کی مداح میں لکھی تھی اپالو کے مندر کی دیکھ بھال کرنے والی لڑکیوں سے کہتا ہے:

''جب بھی کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور تم سے پوچھے کہ اے لڑکیو! اپالو کے اس مندر میں آنے والوں میں وہ کون سا شاعر کون سا گویا ہے جسے تم سب سے زیادہ پسند کرتی ہو۔'' تو تم سب یک زبان ہو کر کہنا۔ ''وہ نابینا شاعر ہے، جو (Chios) کی پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ جس کے لکھے گیت اور اشعار ہمیشہ اچھے سمجھے جائیں گے۔''

اس کی موت کے بارے میں بھی یونانیوں میں ابھی تک ایک (Legend) بڑا مشہور ہے۔ اس کی اپنی جنم بھومی کے بارے میں کوئی سند نہیں ملتی۔ کہتے ہیں یہ نابینا شہر شہر اپنی نظمیں سناتا پھرتا تھا۔ ایک بار یہ ڈلفی کے مندر میں پہنچا جہاں عام آدمی کی آواز پر دیوتا اس کے سوال کا جواب دیتے تھے یہ دیوتا اپالو کا مندر تھا۔ ہومر نے اس سے بھی پوچھا:

''میرا آبائی شہر کون سا ہے؟''

غیبی آواز نے جواب دیا۔ ''تم وہاں مرو گے جہاں بیٹھے لڑکوں کی پہیلی تمہارے سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' چنانچہ ہومر جب بوڑھا ہو گیا تو وہ اپنے سالے (اس کی بیوی، سالے اور بیٹی کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے) سے ملنے (IOS) گیا اور اس کی ملاقات سمندر کے کنارے بیٹھے لڑکوں سے ہوئی جو مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ہومر نے ان سے پوچھا:

''اے بچو! کیا جال میں کوئی مچھلی پھنسی؟''

لڑکوں نے جواب دیا:

''جو کچھ ہم نے شکار کیا ہے وہ ہم چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جو نہیں شکار کیا وہ لے جا رہے ہیں۔''

ہومر کے یہ بات سمجھ میں نہ آئی اور ہومر کو دیوتاؤں کی بات یاد آ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھا۔ دور جا کر دلدل میں گر گیا اور تیسرے دن فوت ہو گیا۔ اور (IOS) میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر پر آج تک یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

''اس قبر میں اس مقدس آدمی کا سر دفن ہے، جس نے اس دھرتی کے بہادروں کی قدر اور شان بڑھائی اس آدمی کا نام ہومر ہے۔''

ہومر کی وجہ شہرت اس کی دو طویل (EPICS) ہیں جن کی وجہ سے وہ ہر عہد کا بڑا مصنف اور لکھاری مانا جاتا ہے۔ ان نظموں میں اگرچہ وہ یونانی بہادروں کی جرأت، شجاعت، بہادری اور انسان دوستی کی مداح سرائی کرتا ہے یونانی ثقافت اور طویل طرزِ زندگی کے نقشے کھینچتا ہے لیکن یہ سب کچھ اس اسلوب میں بیان کرتا ہے کہ قدیم اور جدید لکھنے والے اسے سر جھکا کر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ

''ہومر یونان ہے اور یونان ہومر ہے''

ہومر بلاشبہ آج، گزرے کل اور آنے والے کل کا ایک عظیم لکھاری ہے۔ داستان گوئی کے سارے گن، ہنر، اُس کی شاعری میں موجود ہیں۔ ورجل نے اپنی عظیم نظم ایسینڈ لکھنے کے لیے اس کا انداز اپنایا اور اس کی نظم ایلیڈ کے بچے کھچے کردار کہانی کے لیے انتخاب کئے۔ دانتے ورجل سے متاثر ہوا اور اسے استاد مانا۔ جو اصل میں ہومر کا ہی اعتراف تھا۔

اطالوی زبان کے عظیم شاعر ہوریس (Horace) نے اپنے دن رات ہومر کی کتابوں کے ساتھ بسر کئے افلاطون اور سقراط نے اسے داد دی۔ ارسطو نے بوطیقا کا تانا بانا ہومر کو سامنے رکھ کر بُنا۔ ارسطو کا شاگرد اسکندر اعظم ایلیڈ کی کاپی ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ میدانِ جنگ میں اپنی فوجوں کو اس طرح ترتیب وار کھڑا کر سکے جس طرح ہومر نے کتاب میں کھڑا کیا ہے۔ (ہمارے عہد کے نپولین بوناپارٹ نے ایک خط میں جوزیفین کو لکھا کہ میدانِ جنگ کا جو تجربہ اور مشاہدہ ہومر کی کتابوں میں نظر آتا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔ ورجل کی نظم میں یہ سب کچھ ایسے لگتا ہے جیسے وہ ایک سکول ماسٹر ہے جو بچوں کو مشق کرا رہا ہے)

ہومر کو انگریزی میں سب سے پہلے Chapman ایڈیشن میں ایلیڈ کا ترجمہ کیا گیا۔ جسے پڑھ کر انگریزی کے مشہور شاعر کیٹس Keats نے اپنا مشہور سانٹ (Much have I travelled...) لکھا اس کے بعد دوسرا اہم ترجمہ الیگزینڈر پوپ کا ترجمہ ہے اور پھر اس کے بعد رچمنڈ لیٹی مور، سر ولیم موریس اور سیموئیل بٹلر کے ترجمے آئے اور ہومر پوری دنیا میں پڑھا جانے لگا اور انگریزی سے دوسری زبانوں میں ترجمے ہونے لگے۔ (محمد سلیم الرحمٰن نے اوڈیسی کا جہاں گرد کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا) اور عالمی ادب ہومر کے اثر سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ ہوریس، ورجل، دانتے، ملٹن، ٹینی سن، میتھیو آرنلڈ اور عہد جدید کے ایذرا پاؤنڈ (جنھوں نے ہومر کو اپنی منزل کہا) جیمز جوائس اور عہد جدید کی مشہور ایپک (Odyssey the modern sequel) کا مصنف کازان زاکیز (Nikos Kazantzakis) بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکا۔ جس کا سارا شعری نظام ہومر کے نظام پر مبنی ہے۔ بس اس نے کرداروں کی نفسیات کو تبدیل کیا ہے۔ دیباچہ نگار Antofagnslta اس کتاب کے شروع میں کہتا ہے:

"Kazantzakis's odyssey and the ulysses of James Joice, both works concern with modern man in search of soul and both utilize the frame work of Homer's odyssey as reference"

''کازان زاکیز، کی ''اوڈیسی'' (Odyssey the modren sequel) اور جیمز جوجوائس کا ''یولیسس'' دونوں کی کہانی ایک ایسے جدید آدمی کے گرد گھومتی ہے جو روح کی تلاش میں سرگرداں ہے ان دونوں نے ہومر کا نظام شعری اپنایا ہے اور ان دونوں کی کہانیوں کا خمیر ہومر کی اوڈیسی سے اٹھا ہے''

ایلیڈ میں ہونے والی ٹرائے (Troy) کی جنگ ایک خونریز جنگ تھی جس میں ٹرائے کا شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور لاکھوں معصوم اور بے گناہ انسان ایک خوبصورت عورت کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھ گئے جس کا نام ہیلن تھا دیکھا جائے تو بچاری ہیلن بھی بے قصور تھی اس لڑائی کے پس منظر میں اولمپکس میں ہنستے کھیلتے دیوتاؤں کے منصوبے کارفرما تھے۔ ان منصوبوں کو سمجھنے کے لئے ایک چھوٹی سی نظم پڑھ ڈالیں جس کا عنوان کیپریا (Kypria) تھا۔

اس نظم میں اکلیز (جو ایلیڈ کا ہیرو ہے) کی ماں Thetis (جو سمندری دیوی تھی) کی شادی کی تقریب میں سب دیوتا جمع ہیں۔ زیس دیوتا دوسرے دیوتاؤں سے کہتا ہے کہ انسانوں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے چنانچہ اس آبادی کو کم کرنے کیلئے ایک بڑی جنگ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دیوی (Thetis) ایک گولڈن سیب محفل میں لاتی ہے۔ ایفروڈائٹی، اتھینا اور ہیرا۔ تینوں دیویاں اسے للچائی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر جا کر کسی انسان سے فیصلہ کرالو کہ تم میں سے خوبصورت کون ہے۔ جو خوبصورت قرار پائے وہ یہ سیب لے لے۔ چنانچہ وہ سیب لے کر زمین پر آجاتی ہیں اور ان کی ملاقات ٹرائے کے بادشاہ پریام (Priam) کے بیٹے

پیرس (Paris) سے ہوتی ہے۔

پیرس کی کہانی یہ ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تو نجومیوں نے بتلایا کہ یہ شہزادہ ٹرائے کے لئے مصیبت کا باعث بنے گا اور شہر ٹرائے تباہ ہو جائے گا چنانچہ پریام نے اسے شہر سے دُور بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے بھیج دیا اور تینوں دیویاں اس کے پاس انصاف کرانے آگئیں۔ باری باری ہر دیوی نے اسے لالچ دیا۔ آخر وہ ایفروڈائٹی کے جال میں پھنس گیا جس نے یہ کہا کہ وہ اسے دنیا کی خوبصورت ترین عورت انعام میں دے گی۔ یہ سن کر پیرس نے گولڈن سیب اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ ایفروڈائٹی نے اپنا وعدہ نبھایا۔ ہیلن بادشاہ میلینس کی بیوی یونان کی خوبصورت ترین عورت تھی پیرس مہمان بن کر اس کے ہاں جاتا ہے۔ ایفروڈائٹی کے جادو کی وجہ سے وہ پیرس کے چکر میں آجاتی ہے اور پیرس اسے بھگا کر ٹرائے لے جاتا ہے۔ ہیلن یونانیوں کی عزت تھی چنانچہ وہ سب فوجیں اکٹھی کر کے ٹرائے جاتے ہیں اور ایک خون ریز جنگ ہوتی ہے۔ ٹرائے تباہ ہوتا ہے۔ پیرس سمیت سب مارے جاتے ہیں اور یونانی ہیلن کو لے کر یونان واپس آجاتے ہیں۔

ہیلن نے زمین پر بسنے والی ایک عورت اور آسمانی دیوتا کے ملاپ سے جنم لیا تھا۔ اس کی خوبصورتی اور حسن بے مثال تھا۔ چنانچہ یونان کی ریاستوں کے شہزادے اس سے شادی کے خواہش مند تھے اور وہ سب کے سب ہیلن کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ ہیلن کے باپ نے گھر کے سامنے بادشاہوں اور شہزادوں کا ہجوم دیکھ کر ایک بات سوچی اور سب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قرعہ اندازی کے ذریعے ہیلن کے ہونے والے شوہر کے نام کی پرچی نکال لی جائے اور ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی رکھی کہ جس کا نام نکل آئے باقی شہزادے پھر اس کی اور ہیلن کی حفاظت کریں اور اس کی عزت پر حرف نہ آنے دیں۔ سب اس بات پر راضی ہو گئے اور میلینس سے ہیلن کی شادی ہو گئی۔ جب شہزادہ پیرس ہیلن کو لے کر ٹرائے بھاگ گیا تو وعدے کے مطابق سب شہزادے اپنی اپنی فوج لے کر ٹرائے کی طرف روانہ ہو گئے اور ایک تباہ کن جنگ کا میدان سج گیا۔ اس جنگ میں یونان کے نامور بہادروں نے حصہ لیا اور شجاعت کی داد پائی۔ اکلیز، اوڈی سی لیس، آگامم نان اور ایجکس کے نام قابل ذکر ہیں۔ ٹرائے کی جنگ فرضی نہیں حقیقی واقعہ ہے۔ تاریخ اس کے ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس جنگ کے قصے بہادروں کی داستانیں سینہ بہ سینہ (Bards) کے ذریعے میلوں میں دھرائی جاتی تھیں جنہیں زبانی رزمیہ (Oral Epic) کہا جاتا تھا ہومر نے پہلی بار انہیں (Written Epics) کی شکل دی اور اپنے اسلوب بیان سے زندہ جاوید بنا دیا۔ ایلیڈ 24 حصوں پر مشتمل طویل نظم ہے۔ جنہیں آپس میں جوڑ کر ہومر نے ایک مربوط دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی بنا دیا ہے کہانی ٹرائے شہر کے سامنے سے شروع ہوتی ہے جہاں یونانیوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور شہر کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ کہانی کا ہیرو اکلیز یونانی فوج کے سپہ سالار آگامم نان (جو میلینس کا بھائی ہے) اکلیز سے ناراض ہے اور ایک جھگڑے کی وجہ سے جنگ میں شامل نہیں ہو رہا لیکن جب اس کا دوست پیٹروکلس ٹرائے کے ہیرو ہیکٹر (Hector) کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اکلیز غصے میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور جنگ میں حصہ لیتا ہے اور اس دلیری اور بہادری سے لڑتا ہے کہ ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ ٹرائے کا محاصرہ دس سال رہا لیکن اس میں دو ماہ کے محاصرے کی تفصیل ہے باقی یونان سے ٹرائے کی طرف سفر۔ راستے کے واقعات اور آسمان پر دیوتاؤں کی منصوبہ بندی کی روداد شامل ہے۔

ایلیڈ میں یونانیوں کا کلچر، ان کی ثقافت، رہن سہن، پہناوا، عادات وخصائل، ذہنی وسعت، پرانی اقدار، عورتوں مردوں کے بے مثال کردار، سب کچھ موجود ہے۔ کہنے کو یہ ایک جنگ کی کہانی ہے مگر اس میں یونانی فکر اور یونانی کردار

پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں کہ ہومر نے اس میں یونانیوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اس میں ٹرائے کے لوگوں کی بہادری اور جاہ وجلال کی بھی عکاسی کی ہے۔ ہیکٹر، اس کی بیوی انڈرومائیکی پریام، اس کی بیوی (Hucuba) ہیلن کو اغوا کرنے والے پیرس سب کے کردار اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں اور اپنا اپنا منفرد تاثر چھوڑتے ہیں۔ ان میں ایک بے مثال بہادر اینیس بھی ہے جو جنگ کے بعد ٹرائے چھوڑ کر اپنے خاندانوں کو لے کر چلا جاتا ہے اور جسے ورجل (Virgil) نے اپنی عظیم نظم اینیڈ کا ہیرو بنایا ہے۔

ایلیڈ میں ہومر کا اسلوب اپنے پورے عروج پر ہے اس میں لوہے اور فولاد کی تلواروں کی کھنک بھی ہے۔ فاتح کی دھاڑ بھی اور محکوم کا تاسف بھی۔ زخمی اجسام کی سسکیاں بھی اور نیزوں سے لگائے ہوئے زخموں کی کسک بھی۔ ہومر نے میدان کارزار میں انسانوں کی مختلف تصویریں بنائی ہیں جن میں غصہ، بزدلی، دہشت، عجز، فتح، شکست کے رنگ بڑی ہنرمندی سے بھرے ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ٹرائے کا ہیرو۔ پیرس کا بھائی ہیکٹر میدانِ جنگ میں دشمنوں میں گھرے ہیکٹر کی جوانمردی کو یوں ظاہر کیا ہے۔

ہیکٹر یونانی سپاہیوں کے درمیان یوں کھڑا تھا۔ جیسے ایک بہادر شیر شکاری کتوں کے درمیان کھڑا ہو یا خونخوار شکاریوں نے اسے گھیرا ہو لیکن ہیکٹر کے چہرے پر نہ کوئی خوف تھا نہ وہ پریشان تھا۔" ہومر نے کرداروں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے عام زندگی کے مشاہدے سے بڑا کام لیا ہے۔ ایجکس (Ajax) یونانیوں کی فوج کا ایک بہادر سپاہی ہے۔ دن بھر کی لڑائی سے تھک ہار کر جب وہ تھکے قدموں سے واپس آتا ہے تو ہومر نے اس کی کیفیت تین جملوں میں کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

"ایجکس میدانِ جنگ سے یوں آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہا تھا جیسے مکئی کے کھیت سے گدھا بچوں کی مسلسل مار کھا کر باہر نکلتا ہے۔"

یہ تو میدانِ جنگ کی کیفیات ہیں اب ایک مثال یونانی فوج کے سپہ سالار آگامم نان کی دیکھیے جسے اس کا ملازم آ کر اطلاع دیتا ہے کہ چھاؤنی کے ایک حصے میں اس کے خلاف کچھ سپاہی بغاوت کر رہے ہیں۔ ہومر نے خیمے سے باہر نکلنے تک جو اس کا (Mannerism) دکھایا ہے اس میں یونانی اشرافیہ اور یونانی تہذیب کا پورا رکھ رکھاؤ شامل ہے۔ (اس قسم کے ادب آداب اور تہذیبی رویہ اردو کے شاعر ملا وجہی کی سب رس میں بھی جا بجا ملتے ہیں) آگامم نان کی جاگنے کی کیفیت ہومر نے کچھ یوں بیان کی ہے:

"آگامم نان جاگا، جاگ کر دعا مانگی، غیبی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا تھا۔ قمیض پہنی، لمبا چوغہ قمیض پر پہنا۔ پیروں میں سینڈل پہنے، موتیوں سے مزین تلوار کاندھے پر لٹکائی۔ کونے میں رکھا اپنے باپ کا قدیمی عصا اٹھایا خیمے سے نکل کر یونانی فوجیوں کے کیمپ کی طرف چلا گیا۔"

اکلیز جو ایلیڈ کا ہیرو ہے۔ جو سمندری دیوی کا بیٹا ہے۔ جس کی مثال پورے یونان میں ناپید ہے۔ جب ہیکٹر پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کے غیض وغضب کی حالت کچھ یوں ہے:

"اس زہریلے پہاڑی سانپ کی طرح جو اپنے اندر زہریلا مادہ لے کر کسی انسان کا منتظر ہو۔ جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں اور جو اپنے شکار کے لئے بل کھا رہا ہو یا اس پہاڑی عقاب کی طرح وہ لپکا جو تیزی سے پرندے کی طرف بڑھے جو جان بچانے کے لئے اس کے آگے آگے اُڑ رہا ہو اور عقاب چیختا چلاتا اس کے قریب پہنچ جائے۔"

ایلیڈ کا وہ منظر ادب میں اپنی مثال آپ ہے جب اکلیز اپنے دوست کا بدلہ لینے کے لئے ہیکٹر کو مار دیتا ہے اور اس کی لاش اپنے خیمے میں لے جاتا ہے اور ہیکٹر کا باپ پریام اس کے پاس لاش لینے کے لئے جاتا ہے تاکہ اسے دفنا سکے۔ پریام اکلیز سے کہتا ہے:

''اکلیز ذرا اپنے باپ کے بارے میں سوچو اور مجھ پر رحم کرو میں کتنا بے بس ہوں۔ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا ہوں جس کے ہاتھوں نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے۔''

اکلیز یہ سن کر نادم ہوتا ہے۔ ہیکٹر کے باپ کو دیکھ کر اسے اپنا باپ یاد آجاتا ہے اور پتھر دل اکلیز موم بن جاتا ہے۔ وہ پریام کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لے جاتا ہے۔

''خیمے میں دو انسان زار وقطار رو رہے تھے۔ پریام اکلیز کے پیروں میں بیٹھا اپنے بیٹے کے لئے رو رہا تھا اور اکلیز اپنے باپ کو یاد کر کے رو رہا تھا۔''

پوری کتاب میں ایسے بے شمار مناظر ہیں جن میں انسانوں کو کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اوڈی سی لیس، ہیکٹر، ایجکس، آگامم نان اور مینلیس کے کردار یوں تشکیل دیئے گئے ہیں کہ وہ زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔

ایلیڈ میں عورتوں کے بے مثال کردار ابھرتے ہیں۔ پریام کی ملکہ (Hucuba) ہیکٹر کی بیوی انڈرومائیکی اور ہیکٹر کی بہن کیسنڈرا، ناقابل فراموش کردار ہیں۔ لیکن ان سب میں جاندار کردار ہیلن کا کردار ہے جو دنیا کے ادب میں اب تک مختلف انداز میں کسی نہ کسی حوالے سے زندہ جاوید کردار بن گیا ہے۔

ہیلن جسے ٹرائے کے لوگ عجوبہ، خوبصورت بلا، فساد کی جڑ، خوبصورت بلا، مصیبت کا سبب، لڑائی کی وجہ اور پیرس کا پاگل پن سمجھتے تھے اور اسے ایک بے وفا عورت کہتے تھے جس نے اپنے خاوند سے بے وفائی کی اور دو ملکوں کے درمیان 20 سال کی طویل لڑائی کا سبب بنی لیکن ان تمام الزامات اور خطابات کے باوجود ٹرائے کے لوگ ہیلن کو قصوروار نہیں ٹھہراتے کیونکہ آسمانی دیوتا اس کی اس بھول کے پیچھے تھے۔ انہوں نے ٹرائے اور یونان پر ایک جنگ مسلط کرنا تھی۔ انسانوں کی آبادی کم کرنا مقصود تھی چنانچہ پیرس کے ہاتھوں ہیلن کا اغوا کرا دیا۔ ایفروڈائٹی نے ہیلن کے دماغ میں فتور برپا کر دیا اور ہیلن پیرس کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور کہانی بھی چلتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پیرس نے جس ہیلن کو اغوا کیا تھا وہ اصل ہیلن نہیں تھی بلکہ ایک چڑیل تھی جس نے ہیلن کا روپ دھار رکھا تھا۔ اصل اس موضوع پر یوری پیڈیز نے ہیلن کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے جس میں یہی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جب ٹرائے کی تباہی کے بعد مینلیس ہیلن کو لے کر واپس آرہا تھا تو اس کا جہاز مصر کی بندرگاہ پر رکا اور اصل ہیلن سے اس کی ملاقات ہوئی ہیلن نے اصل کہانی بتلائی۔ یہ کہانی سن کر جب ہیلن کا خاوند مینلیس جہاز پر پہنچا تو وہ چڑیل سب کے سامنے ہوا میں تحلیل ہو گئی اور یونانی ہیلن کو لے کر یونان اپنے وطن واپس آگئے۔

ہیلن فطری طور پر ایک گھریلو خاتون تھی جس نے جی جان سے اپنے خاوند مینلیس کی خدمت کی اس کو ذہنی جسمانی اور قلبی سکون بخشا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ دیوتا اسے اس رنگ میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے پیرس کو مہمان بنا کر ہیلن کے گھر بھیجا۔ ایفروڈائٹی نے ہیلن کے دماغ میں عشق کا خلل ڈالا اور وہ پیرس کے ساتھ بھاگ گئی۔ وہ بے بس تھی کیونکہ آدمی ہر چیز سے لڑ سکتا ہے لیکن قسمت اور دیوتاؤں کی منصوبہ بندی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہیلن ٹرائے میں پیرس کے گھر آکر اداس تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی اس حرکت کی وجہ سے ٹرائے اور اس کے شہری

جنگ کا عذاب جھیل رہے تھے۔ ہیلن سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھی ریشمی کپڑے پر کڑھائی کرتی رہتی اور اس کا دل جنگ اور قتل وغارت پر کڑھتا رہتا اور وہ اس کا بار بار تذکرہ کرتی ہے ایک بار جب ہیکٹر تھک ہار کر جنگ کے میدان سے واپس لوٹتا ہے تو وہ کہتی ہے:

''آؤ بھائی یہاں میرے پاس بیٹھ کر چند لمحے آرام کر لو۔ میں جانتی ہوں تم وہ مصیبت اور پریشانی اٹھا رہے ہوں جو میری اور پیرس کی بے وقوفی کی وجہ سے تم پر نازل ہوئی ہے اور آنے والے وقت میں یہ بے وقوفی یاد کر کے لوگ ہم پر لعنتیں بھیجتے رہیں گے۔''

ہیلن کی خوبصورتی اور بے مثال حسن ہی اس کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔ بقول فارسی شاعر ''اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی''۔ اس کی خوبصورتی نے یونان کی ریاستوں کے شہزادوں اور نوجوانوں کے دلوں میں اس کے لئے طوفان برپا کیا اور ان شہزادوں اور نوجوانوں نے ہیلن کے گھر کے سامنے ڈیرے ڈال دیئے اور سب چاہتے تھے کہ ہیلن سے اس کی شادی ہو جائے۔ ہیلن نے فیصلہ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ دیا اور باپ نے قرعہ اندازی سے اس کی شادی مینلیس سے کر دی اور شہزادہ پیرس اسے لے اُڑا۔ اگر دیکھا جائے تو ہیلن دیوتاؤں کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی تھی اور اس نے وہی کیا جو دیوتاؤں نے چاہا۔

ہیلن کی خوبصورتی نے نہ صرف اس کے عہد کے لکھنے والوں کو متاثر کیا اور انہوں نے اسے اپنی تحریروں میں موضوع بنایا۔ آنے والے عہد کے ادیبوں نے بھی اس پر لکھا۔ انگریزی کے مشہور ڈرامہ نگار کرسٹوفر مارلو نے اپنے ڈرامے ''ڈاکٹر فاسٹ'' میں ہیلن کو بڑے شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فاسٹ سے جب شیطان اس کی روح کا سودا کرتا ہے اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی حامی بھرتا ہے تو ڈاکٹر فاسٹ اس سے کہتا ہے کہ مجھے ہیلن سے ملواؤ اور جب فاسٹ سے ملتا ہے تو دیکھ کر کہتا ہے:

''کیا یہ وہی چہرہ ہے
جس نے ٹرائے شہر کو جلا کر راکھ کر دیا تھا
اے ہیلن تم شام کے ستارے سے زیادہ روشن
اور ہوا سے زیادہ سبک رفتار ہو
اے ہیلن میرے قریب آؤ
اور مجھے چوم کر لافانی بنا دو''

ایلیڈ ٹرائے کی تباہی یونانی فوجوں کی فتح اور پریام بادشاہ کی شکست پر ختم ہوتی ہے۔ یونانی ہیلن کو لے کر واپس یونان کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ مال غنیمت میں ملی عورتیں اور مال وزر بھی ہے۔ ان عورتوں میں ملکہ ہیکٹر کی بیوی انڈرومائیکی ہیکٹر کی بہن کیسنڈرا بھی ہے۔ ہومر کی دوسری کتاب مشہور یونانی سپہ سالار اوڈی سی لیس کے واپسی کے سفر کی پوری روداد ہے۔

ہومر کی دوسری کتاب اوڈی سی اور ڈی سی لیس کے گھر واپسی کی داستان ہے۔ دیوتا اپالو اوڈی سی لیس سے خوش نہیں چنانچہ وہ اس کے جہاز کو سمندری طوفان میں گم کر دیتا ہے اور اوڈی سی لیس مختلف جزیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ کبھی وہ اس جزیرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں ایک جادوگرنی اس کے تمام آدمیوں کو سؤر بنا دیتی ہے اور کبھی وہ سائیکلوپس کی غار میں

قید کردیا جاتا ہے کبھی ایک جادوگرنی اسے اپنے جزیرے میں قید کرلیتی ہے اور اوڈی سی پس اپنی بیوی اور بیٹے کی یاد میں آنسو بہاتا رہتا ہے۔ دوسری طرف اس کی بیوی پینی لوپی مشکلات کا شکار ہے اور (Ithaca) میں بیٹھی اوڈی سی لیس کا انتظار کررہی ہے۔ اردگرد کی ریاستوں کے شہزادے اس کے گھر آکر ڈیرے ڈال دیتے ہیں اور پینی لوپی سے شادی کے منتظر ہیں اور پینی لوپی سے کہتے ہیں کہ اب تمہارا خاوند واپس نہیں آئے گا تم ہم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو۔ پینی لوپی ایک چادر بننا شروع کرتی ہے اور کہتی ہے جب یہ چادر مکمل ہو جائے گی تو میں کسی ایک کا انتخاب کرلوں گی اور چال وہ یہ چلتی ہے کہ دن میں وہ چادر بنتی ہے اور رات کو ادھیڑ دیتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے ٹیلی ماکسس (جسے اوڈی سی لیس 2 سال کا چھوڑ کر گیا تھا اب جوان ہو چکا ہے) کو ہیلن کے پاس بھیجتی ہے تاکہ اوڈی سی لیس کا کچھ اتا پتا چل سکے۔ آسمانوں پر دیوتا اوڈی سی لیس کی حالت پر رحم کھاتے ہیں اس کی مشکلات ختم کرتے ہیں۔ اوڈی سی بڑی مشکلات برداشت کرکے ڈرامائی انداز میں اپنے گھر فقیر کے بھیس میں پہنچتا ہے۔ ٹیلی ماکس باپ کو پہچان لیتا ہے باپ بیٹا دونوں گھر آئے شادی کے امیدواروں سے لڑتے ہیں اور مار بھگاتے ہیں اور اس طرح اوڈی سی لیس اپنی بیوی اور بیٹے سے ملتا ہے اور کہانی کا انجام خوشی اور ملاپ پر ختم ہوتا ہے۔

ہومر کی یہ نظم ایلیڈ کی طرح ایک عظیم (Epic) تصور کی جاتی ہے جس میں یونانیوں کی بہادری کا ذکر بار بار آتا ہے لیکن ہومر کے نقاد ایلیڈ کے مقابلے میں اسے چھوٹا کارنامہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس نظم میں وحدت اور نظم وضبط کا فقدان ہے۔ اس بات کا ذکر ارسطو نے بھی بوطیقا میں کیا ہے۔ مشہور نقاد لون جائی نس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ نظم ہومر کے بڑھاپے کی تخلیق ہے اس لئے اس میں وہ جوش، وہ ہنرمندی اور دلچسپی نہیں۔ ایلیڈ میں ہومر نے جنگ، کشمکش اور تصادم کو بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے جبکہ اوڈی سی میں کہانی پر ہومر کی یہ گرفت نہیں۔

نقادوں کی آراء کے باوجود یہ طویل رزمیہ ایک عظیم رزمیہ ہے اس میں کردار نگاری، مشاہدہ، اسلوب اور زندگی کا بھرپور تجربہ موجود ہے۔ اگرچہ اس میدان جنگ کے ناقابل فراموش کارنامے موجود نہیں لیکن یہ زندگی کے لافانی رشتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں ہومر نے انسانی نفسیات اور جذبوں کے ایسے عجیب وغریب بھنور سے قاری کو گزارا ہے کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پینی لوپی جسے خاوند سے بچھڑے 20 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ یہ عرصہ کیسے گزارتی ہے کن کن مصائب سے نبرد آزما ہے ہومر نے ان کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے اس کا کردار ادب کا ایک منفرد کردار ہے۔ جب اس کے محل میں اس سے شادی کرنے والے دعوت اڑا رہے ہیں وہ کھڑکی میں بیٹھی چادر بن رہی ہے ایک گویا (Bard) ٹرائے کی جنگ کے واقعات پر مبنی اشعار گا کر سنا رہا ہے جس میں اوڈی سی لیس کا نام آتا ہے تو پینی لوپی رونے لگتی ہے اور چلا کر کہتی ہے:

''بند کرو یہ گیت۔ ان مہمانوں کو خاموشی سے شراب پینے دو۔ یہ کہانی نہ چھیڑو۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کیونکہ یہ کہانی سن کر مجھے

اپنا خاوند یاد آرہا ہے جس کا میں مسلسل سوگ منا رہی ہوں۔ اس اوڈی سی لیس کا جو پورے یونان میں صرف ایک ہی تھا۔''

پینی لوپی ایک وفادار بیوی ہے جو 20 سال سے اپنے خاوند کا انتظار کررہی ہے چادر دن کو بُن کر رات کو ادھیڑ دینا خاوند سے اس کی وفاداری کا ثبوت ہے۔ جب اوڈی سی لیس فقیر کے بھیس میں آتا ہے تب بھی وہ اسے شک کی نظر سے دیکھتی

ہے کہ کہیں یہ بھی آسمانی دیوتا کی کوئی چال نہ ہو لیکن جب اوڈی سی لیس میاں بیوی کے درمیان کچھ خفیہ اشاروں کا ذکر کرتا ہے تب وہ اس سے والہانہ ملتی ہے۔

اوڈی سی میں انسانی جذبوں کی اعلیٰ عکاسی کے بے شمار مناظر ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اوڈی سی لیس کے کتے آرگس سے 20 سال بعد اوڈی سی لیس کے ملنے کا منظر بہت اچھا لگتا ہے یہ وہ منظر ہے جسے دنیائے ادب کا ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اوڈی سی لیس کا کتا آرگس جو جوانی میں اوڈی سی لیس کے ساتھ شکار پر جاتا تھا اور جسے وہ دل وجان سے چاہتا تھا اب بوڑھا ہو چکا ہے اور 20 سال کے انتظار نے اسے قریب المرگ کردیا ہے اور انتظار نے اس کی ساری توانائی نچوڑ لی ہے۔ اوڈی سی لیس جب چراگاہ میں داخل ہوتا ہے اپنے نوکر سے باتیں کررہا ہے تو آرگس اوڈی سی لیس کی آواز سن لیتا ہے اور چونکتا ہے۔

''آرگس چراگاہ کے گیٹ کے پاس گندگی کے ایک ڈھیر پر مردہ حالت میں پڑا تھا۔ اپنے مالک کی آواز سن کر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اپنی کمزوری کے باوجود دم ہلاتی۔ کان کھڑے کیے۔ زمین پر اپنے آپ کو گھسیٹ کر چلنے کی کوشش کی مگر ہل نہ سکا اوڈی سی لیس اس کی طرف بڑھا۔ موت کا اندھیرا آرگس پر چھا رہا تھا اوڈی سی لیس نے منہ ایک طرف کرکے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔''

اپنے نوکر، اپنی دایہ اور اپنے بیٹے سے ملنے کے مناظر بے حد جذباتی اور ڈرامائی ہیں اور ان کیفیات کی عکاسی کرتے وقت ہومر کا فن اپنے عروج پر ہے۔

ان دونوں کتابوں میں سب سے اہم چیز ہومر کا قیامت خیز مشاہدہ ہے وہ چیزوں کو اتنا قریب سے دیکھتا ہے اور پھر اپنے بیانیہ میں اتنی مہارت سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بعض نقادوں کو یہ شک ہے کہ کیا ہومر واقعی اندھا تھا؟ کیونکہ کوئی نابینا شخص چیزوں کا اتنی جزیات کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ شاید ہومر کی ایک تیسری آنکھ بھی تھی اس سے وہ سب کچھ نظر آجاتا ہے جو ہم دو آنکھوں والوں کو نظر نہیں آتا ہے۔

ہومر، پہاڑوں، سمندروں، جزیروں اور علاقے کے موسموں اور فصلوں کے بارے میں بھرپور علم رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے زمانے میں کوئی جغرافیہ دان ایسا ہو جس سے اس نے یہ سارا علم حاصل کیا ہو۔ ایک نقاد (Louis Loomi) کی یہ رائے ہے کہ ہومر کے زمانے میں ایک یونانی جغرافیہ دان گزرا ہے جس کا نام سٹاربو (Starbo) تھا چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہومر نے یہ سب کچھ اس سے حاصل کیا۔

ہومر کی اوڈی سی میں ابھرنے والا ہر کردار اپنی ایک شناخت رکھتا ہے اور یہ شناخت اسے ہومر نے دی ہے۔ وہ ہر وحشی اور درندہ صفت میں کوئی نہ کوئی نیکی، خیر اور اچھائی کی قوت ڈال دیتا ہے جس سے اس کی وحشت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً انسانوں کو کھانے والا سائیکلوپس۔ مگر اسے بھی جانوروں سے محبت ہے۔ وہ اپنے دنبے سے جب باتیں کرتا ہے تو ہمدردی اور محبت اس کے لہجے میں گھل جاتی ہے۔

اوڈی سی لیس کا کردار ایک بہادر، جری، چالاک اور عقل ودانش سے بھرپور کردار ہے۔ اس کی چالاکی اور عقل مندی نے لکڑی کا گھوڑا بنایا اور ٹرائے فتح ہوگیا۔ وہ اپنے آدمیوں کی جان بچانے کے لئے جادوگرنی سے محبت کا کھیل رچاتا ہے اور اپنے دوستوں کی جان بچالیتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے خوبصورت عورتیں راہ روکتی ہیں لیکن وہ پینی لوپی کے پاس جانے کے لئے بے تاب ہے۔ اس کی حکمتِ عملی میدان جنگ میں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے۔ وہ میدان

جنگ میں تلوار کا دھنی ہے۔اور محفل رنگ و مستی میں ایک خوبصورت گفتگو کرنے والا آدمی ہے اوڈی سی لیس ایک بے چین روح ہے جو ہمیشہ سفر میں رہنا چاہتی ہے۔اسے کہیں چین نہیں۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی میں جب دانتے اپنی بنائی ہوئی دنیا میں اسے ملتا ہے تو وہ دانتے کو بتلاتا ہے کہ گھر پہنچ کر مجھے چین نہ آیا میں پھر سفر پر نکل کھڑا ہوا اور آخر سمندر میں میری موت ہوگئی۔

کازان زاکیز(Kazantzakis) کے رزمیہ(Odyssey the modern sequel) میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ وہ جب گھر میں اکتانے لگا تو جا کر ہیلن کو اغوا کیا اور ملک ملک امن، روح اور انصاف کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اوڈی سی لیس کے کردار کی جھلک جدید ادب میں اب نظر دکھائی دیتی ہے۔جیمز جوائس کی(Ulysses) اور کازان زاکیز، کی Epic کا ضمیر اسی طویل ایپک سے اٹھا ہے۔دانتے اور ٹینی سن اور میتھیو آرنلڈ کے ہاں ہمیں اس کردار کی چاپ سنائی دیتی ہے ہومر کا یہ لافانی کردار ہر اس شخص کے اندر موجود ہے جسے اپنی منزل کی طرف جانا ہو۔اس کی تلاش میں بے چین ہو جسے قیام سے الجھن اور مسلسل سفر میں تسکین محسوس ہوتی ہو۔

ہومر اپنی ان دو طویل ایپک کی اعلیٰ تخلیق کی بنا پر کل کی طرح آج بھی عظیم ہے۔اسے نقادوں نے ہر عہد کا عظیم شاعر قرار دیا ہے ورجل، دانتے، ہورلیس، ملٹن، جیمز جوائس، ٹینی سن کو تخلیقی طاقت دینے والا جو 800 سال قبل مسیح کا شاعر تھا۔آج کا بھی زندہ شاعر ہے 1488 عیسوی میں یورپ کے قارئین سے اس کا تعارف ہوا اسکندریہ دور میں مرتب کیا ہوا ایلیڈ کا مسودہ فلورنس کی لائبریری میں اب تک پڑا ہے۔اسے مائیکل اینجلو نے ڈیزائن کیا تھا اور ہومر کے نام کے آگے لکھا تھا:

Homer whom the muse loved above all other men.

اسکائی لس

(Aschylus)

525 قبل مسیح کا المیہ نگار جسے یونانی God Intoxicated Man کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ان کا ایمان تھا کہ اسے دیوتا ڈایونی سس نے ڈراما لکھنے کی طرف مائل کیا۔اس نے 90 ڈرامے لکھے جن میں سے 7 ڈرامے موجود ہیں۔

پرومی تھیس

اے آسمان، اے تیز ہوا، اے سمندر کی لہرو
اے روشن درخشندہ آفتاب تم سب کی دہائی
میں خود دیوتا ہوں مگر زیوس کے عذاب میں مبتلا ہوں
دیکھو دیوتاؤں کے شہنشاہ نے میرے لئے زنجیریں بنوائی ہیں
نہ جانے مصیبتوں کی یہ مدت کب ختم ہوگی
تقدیر کے لکھے کو خوش ہو کر برداشت کرنا چاہیے
کیونکہ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا
میں نے آگ کنول کے ڈنٹھل میں چھپا کر انسان کو دی
تاکہ فن کے سوتے پھوٹیں
وہ علوم وفنون سے آشنا ہو
اسے زندگی کی آسائش ملے
اس جرم میں مجھے اس پہاڑ پر باندھ دیا گیا ہے

(پرومی تھیس باؤنڈ)

اسکائی لیس (Aschylus)

اسکائی لیس (Aschylus) کو یونانی پیغمبرانہ صفات کا المیہ نگار مانتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ اسکائی لیس پر ڈرامے کے موضوعات اور پلاٹ وحی کی صورت میں اترتے ہیں۔ وہ اس کو God Intoxicated Man کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

اسکائی لیس کے بارے میں یہ بات پورے یونان میں مشہور تھی کہ ڈرامے کی طرف اسے ڈایونی سس (Dionysus) کھینچ کر لایا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ وہ نوجوانی میں ایک انگور کے باغ میں ملازم تھا۔ ایک رات ڈایونی سس (Dionysus) اس کے خواب میں آیا اور حکم دیا کہ اسکائی لیس ڈراما لکھے۔ چنانچہ اس نے دوسری صبح اٹھ کر ڈراما لکھنا شروع کیا اور پھر اس نے مسلسل ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔

اسکائی لیس (Aschylus) نے جب ڈراما نویسی کا آغاز کیا تو اس کے سامنے دو چیزیں تھیں۔ مذہبی رسومات اور تھیٹر میں گانے والوں کا گروہ اور ڈراما۔ اسکائی لیس بہترین ڈانس ماسٹر اور کورس ڈائریکٹر تھا۔ چنانچہ اس کے ڈراموں میں طویل ترین کورس پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے ڈرامے کی طرف بھی توجہ دی۔ ڈراموں میں عمل اور Action کو بڑھایا اور اس کے لئے اس نے ٹریجڈی میں ایک ایکٹر کا اضافہ کیا۔ Tehspis کے زمانے میں ایک ایکٹر ہوتا تھا لیکن اسکائی لیس نے تعداد دو کر دی بعد میں سوفیکلیز نے تین کر دی تھی۔

ایتھنز کا یہ المیہ نگار 525 قبل مسیح کے قریب (Eleusis) میں پیدا ہوا۔ 490 ق۔م میں ایرانیوں سے ہونے والی جنگ میں حصہ لیا۔ ڈایونی سس کی ہدایات کے مطابق اس نے 25 سال کی عمر میں ڈراما نویسی کا آغاز کیا اور تقریباً 90 کے قریب ڈرامے لکھے جن میں سے صرف 7 ڈرامے باقی بچ سکے ہیں۔ 484 ق۔م تک اسے ڈراموں کے مقابلے میں کوئی انعام نہ مل سکا۔ 472 میں اسے پہلا انعام ملا۔ اس ڈرامے کا نام Perisans تھا۔ اس ڈرامے کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ ایتھنز کے ساتھ والی ریاستیں اسکائی لیس کے فن کو دیکھنے کی خواہش مند بن گئیں۔ چنانچہ Syracuse کے حکمران Hieron نے اسے خاص دعوت دے کر بلایا تا کہ اسکائی لیس اس کی ریاست میں ڈراما سٹیج کر سکے۔ جب وہاں سے ایتھنز واپس آیا تو اپنی مشہور Theban Trilogy پیش کی جس کا صرف ایک ڈراما یعنی Seven Against Thebes محفوظ شکل میں قارئین تک پہنچا ہے۔ اسکائی لیس کی دوسری Trilogy جس کے تینوں ڈرامے مکمل شکل میں محفوظ ہیں اس کا نام Oresteia ہے اس کا پہلا ڈراما Agamennon ہے جس میں ٹرائے کا فاتح آگاممنان بڑی شان وشوکت کے ساتھ گھر واپس آتا ہے لیکن بیوی کلائی ٹم نسٹر (Clytemnestra) اسے اپنے عاشق کے ساتھ مل کر قتل کر دیتی ہے۔ دوسرا ڈراما Choephoroel ہے جس میں کلائی ٹم نسٹرا کو اس کا بیٹا اورسٹیز (Orestes) قتل کر دیتا ہے اور پھر اپنے گناہ کی تلافی کے لئے (جو اس نے دیوتا اپالو کے کہنے پر کیا تھا) ڈیلفی (Delphi) جاتا ہے اس پر مقدمہ چلتا ہے لیکن دیوتا کی بروقت مدد کے باعث وہ سزا سے بچ جاتا ہے۔

Suppliant Women کو کچھ نقاد اس کا آخری ڈراما کہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ۔ اسکائی لیس کا آخری ڈراما Prometheus Bound ہے جسے دنیا کے ادب میں ایک عظیم مقام حاصل ہے۔

اسکائی لیس کا ڈراما Perisian نقادوں کی نظر میں بڑا اہم ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں اسکائی لیس نے اپنی حب الوطنی کے جذبات کو پوری طرح اُجاگر کیا ہے۔ یونانی قوم کی بہادری اور جرأت کو مثالی بنا کر پیش کیا اگر چہ یہ سارے کا سارا ڈراما ایرانی دربار کے ماحول میں دکھایا جاتا ہے لیکن اسکائی لیس نے اس ڈرامے میں یونانی کرداروں کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا ہے جو سٹیج پر نظر نہیں آتے ۔ ایرانیوں کی زبانی یونانیوں کا ذکر کر کے یونانی قوم کی بہادری، اصول پرستی ،قانون سے محبت کے جذبے کو سراہا ہے۔

Persians کا شمار اسکائی لیس کے جنگی ڈراموں میں ہوتا ہے ۔ اس ڈرامے میں ایران کے بادشاہ Xerxes کے یونان پر حملے سے پیدا ہونے والے واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس ڈرامے میں 2400 سال پہلے کی سمندری جنگ کا نقشہ اس چشم دید گواہ یعنی اسکائی لیس کی زبانی کھینچا گیا ہے جو اس جنگ میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑا تھا۔ اسکائی لیس نے روایتی یونانی ادب میں ہر شے کو تفصیلاً بیان کیا ہے ۔ جنگ سے ایک رات پہلے کی تفصیل ۔طلوع صبح کا منظر۔ دن بھر کا کشت وخون ۔ ساحل سمندر پر گہما گہمی ۔ یہ سارا کچھ ایک نہ بھولنے والے شخص کی یادداشت کا کمال نظر آتا ہے ۔ اس ڈرامے میں یونانیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست کی روداد بیان کی گئی ہے ۔ اس ڈرامے میں کوئی Action نہیں، کوئی تصادم نہیں ۔صرف کرداروں کی زبانی پورے جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی یونانی کو کردار بنا کر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یونانیوں کی عظمت ایرانیوں کے مکالموں کے ذریعے بیان کی گئی ہے اور یونانیوں کی جرأت بہادری اور قانون کے ساتھ ان کی محبت کو لفظی اور شعری زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

Persians ڈراما کئی لحاظ سے یونانی ڈراموں میں اہمیت کا حامل ہے ۔ پہلی خصوصیت تو یہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس میں یونانی نظر نہیں آتے لیکن ان کے ذکر سے سارے ڈراما میں یونانیوں کی بہادری اور فلسفے کی فضا طاری رہتی ہے ۔ دوسری خصوصیت یہ کہ یونانی ڈراموں میں یہ پہلا ڈراما ہے جس کے لباس یونانیوں کے لباسوں سے مختلف تھے اور ڈرامے کا ماحول یونانی ماحول سے قطعی طور پر جدا تھا۔ اس ڈرامے کی ایک اور اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ نقادوں کے نزدیک یہ پہلا Ghost Play ہے ۔ ایران کا بادشاہ دارا (Darius) مر چکا ہے ۔ اس کا بیٹا Xerxes میدان جنگ میں لڑ رہا ہے۔ ایران پر ملکہ Atossa حکمران ہے۔ تمام طاقت اور اختیار اس کے پاس ہیں۔ اسے برے برے خواب آتے ہیں تو اس کا مشیر Elders اسے اپنے خاوند کے حضور نذرانہ پیش کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کا خاوند اسے اکثر خواب میں آکر مشکلات کا حل بتلاتا ہے اور اس کے سوالوں کا جواب دیتا ہے اور بتلاتا ہے کہ یونانی کون ہیں؟ ان کی فوج کتنی ہے؟ ان کا کردار کیا ہے؟ وہ بڑے بڑے دشمنوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ڈرامے کے دوران جب ایرانیوں کو شکست ہوتی ہے اور قاصد آکر شکست کی خبر سناتا ہے تو دارا اپنی قبر سے باہر آتا ہے اور بیوی کو اس کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ قبر سے اس کی روح کا باہر آنا پہلی بار سٹیج پر دکھایا گیا۔ اسکائی لیس کی اس ندرت اور نئے پن کو نقاد سٹیج کی تاریخ اور روایت میں ایک اضافہ خیال کرتے ہیں۔

ڈرامے کا آغاز ایرانی دربار سے ہوتا ہے جہاں ملکہ (Atossa) جنگ کی خبروں کی منتظر ہے۔ اچانک قاصد آتا ہے

اس کی حالت بری ہے، وہ زخمی ہے، کپڑے پھٹے ہیں۔ ملکہ اس سے پوچھتی ہے کہ شکست کس کو ہوئی ہے اور کون مرا ہے؟ قاصد جواب دیتا ہے کہ Xerxes کو شکست نہیں ہوئی ، وہ زندہ ہے ۔ ملکہ اداس ہو جاتی ہے اس کے بعد اس کا بیٹا Xerxes پھٹے پرانے کپڑوں میں نوحہ کناں داخل ہوتا ہے تو درباری اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ سب کہاں ہیں جو ساتھ گئے تھے؟ اس دھرتی کے لال کہاں ہیں؟ جو تمہارے ساتھ لڑے وہ کہاں ہیں؟ بادشاہ مختصر جواب دیتا ہے:

I left them Dying

Fallen I left them

From a Tyrian Gallyey

Fallen and lost.

اس کے ساتھ ڈرامے میں ایران کی شکست پر آہ وزاری اور مرنے والوں کے لئے نوحے شروع ہو جاتے ہیں اسکائی لیس کا یہ ڈراما یونانی فتح کی خوشی میں منائی جانے والی تقریب کے لئے لکھا گیا تھا۔

اسکائی لیس نے اس ڈرامے میں یونانیوں کی جرأت، بہادری، قانون اور وطن سے ان کی محبت کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے یونانیوں کے کردار اور نفسیات کو ایرانی کرداروں کے حوالے سے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ یونانی آزاد ہیں لیکن ہر چیز میں نہیں۔ وہ قانون کو اپنا حاکم تصور کرتے ہیں اس کا حکم مانتے ہیں، میدان جنگ میں فتح حاصل کرتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔

یونانیوں کی وطن دوستی اور قانون کے احترام کی اس سے بہتر مثال پورے ڈرامے میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے کردار کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اسکائی لیس ایرانیوں کو بھی ان کی بہادری کی داد دیتا ہے۔ ایرانی بزدل نہیں۔ وہ بہادر اور جنگجو ہیں۔ اسے ان کی شکست پر افسوس ہے۔ ملکہ ایک پروقار عورت ہے اس کے منہ سے نکلا کوئی لفظ اس کے کردار کی نفی نہیں کرتا۔ دارا ایک بوڑھا اور بہادر بادشاہ ہے۔ Xerxes اپنے باپ کی طرح بہادر ہے لیکن یونانیوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔

اسکائی لیس کا اسلوب زبان کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ پُرشکوہ اور پروقار زبان استعمال کرنے کا عادی تھا اور اس نے کسی ڈر اور تنقیدی حملوں سے بے پرواہ ہو کر ایسا کیا۔ اگرچہ اس سے اس کی زبان ایک خاص بوجھل پن کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

اسکائی لیس کے بعد آنے والے ڈراما نگاروں نے اس کے اسلوب کی کسی نہ کسی حوالے سے پیروی کی۔ ارسٹوفینیز کے زمانے تک نہ صرف ڈراما نگار بلکہ عام لوگ بھی اس کے گیتوں کے رسیا نظر آتے ہیں۔ ارسٹوفینیز نے اپنے ڈرامے Wasps میں اسکائی لیس کے گیتوں کی مقبولیت کا حوالہ دیا ہے وہ اپنے کچھ کرداروں کی نقل وحرکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Lamps in their hands, old music on their lips wild Honey and the east and Loveliness.

یہاں Old Music سے ارسٹوفینیز کی مراد ان گیتوں سے ہے جنہیں اسکائی لیس نے اپنے ڈراموں میں استعمال کیا تھا۔

اسکائی لیس نے ٹریجڈی میں قابل قدر اضافے کیئے اور اس فن کو عروج تک پہنچایا اور بعد میں آنے والے المیہ نگاروں کے لئے کھلا میدان چھوڑا۔موضوع، زبان، کردار نگاری اور فکر کے حوالے سے اسے آگے بڑھایا۔

اسکائی لیس نے انسان اور خدا کے درمیان رشتوں کا تعین کیا۔(بعد میں انگریزی شاعری ملٹن نے اسی کو بنیاد بنا کر اپنی عظیم نظم(Paradise Lost) کا حسین محل بنایا)

اسکائی لیس نے اپنے ڈراموں میں اس چیز کی مخالفت کی کہ خدا انسان کی خوشحالی سے خوش نہیں۔اس نے اپنے ڈرامے پرومی تھیس باؤنڈ میں اگرچہ پرومی تھیس کو خدا کے عذاب کا شکار دکھایا ہے لیکن اس لڑی کے آخری ڈرامے میں (Zeus) پرومی تھیس کی سزا ختم کر دیتا ہے اور انسانوں سے اپنے تعلقات ٹھیک کر لیتا ہے۔اسکائی لیس دیوتا Zeus کو طاقت اور عقل کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور انسانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ دکھوں کے ذریعے سے ہی علوم کا حصول ممکن ہے۔ اور انسانوں پر Learn . By . Suffereing کی شرط عائد کرتا ہے۔فکر، مسرت، یقین اور ایمان کو دُکھ درد کی نعمت قرار دیتا ہے۔اسکائی لیس نے یونانی المیہ کو طاقتور مذہبی صنف بنانے میں اہم رول ادا کیا۔زبان، فکر اور مضبوط ڈکشن کی بنا پر نقاد اس کو انگریزی شاعر مارلو(Marlow) کا استاد قرار دیتے ہیں۔پروفیسر (Maurray) کا کہنا ہے کہ اسکائی لیس کے اسلوب میں آسمانی آگ بھری ہے۔پروفیسر مرے ان تین بڑے المیہ نگاروں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے اسکائی لیس کو مارلو۔سوفیکلیز کو شیکسپیئر اور یوری پیڈیز کو گوئٹے،ابسن اور ٹالسٹائی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔زبان، فکر اور لسانی ارتقا کے علاوہ اسکائی لیس نے اسٹیج کو بھی جدید طریقوں سے روشناس کرایا۔مثلاً اس نے پہلی بار اسٹیج پر ڈرامے کے دوران جن اور روحوں کو ظاہر ہوتے ہوئے دکھایا۔اس کے ڈرامے(Perisian) میں پہلی بار روح کو لوگوں کے سامنے کرین کے ذریعے اترتے دکھایا گیا اور لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ماسک(Masks) بنانے اور اسے مزید نئے طریقوں سے روشناس کرانے میں اسکائی لیس کا بڑا ہاتھ ہے۔نقادوں کا کہنا ہے کہ اسٹیج پر ڈرامے کی پیش کش میں تو اسکائی لیس کا ایک مقام اور ایک نام ہے ہی اس نے پس پردہ بھی بہت سے یادگار اقدام اٹھائے جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پرومی تھیس باؤنڈ
PROMETHEUS BOUND

اسکائی لیس Aschylus کا یہ نا قابل فراموش المیہ فکر، خوبصورتی اور کرداروں کے لحاظ سے ایک عظیم ترین المیہ ڈراما ہے۔اس موضوع پر اس کے ہمعصر اور بعد میں آنے والے کسی المیہ نگار نے قلم نہیں اٹھایا۔اس المیہ کا ہیرو پرومی (Prometheus) ہے۔زیوس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوا ہے۔انسانوں کا ہمدرد ہے اور وہ خود بھی ایک دیوتا ہے۔ اس (Trilogy) کا صرف یہ حصہ محفوظ رہ سکا ہے۔پہلے حصے میں پرومی تھیس آگ چرا کر انسان کو دیتا ہے جس کا عنوان ہے: اگنی دیوتا۔Prometheus Bound the Fire Giver زیوس(Zeus) پرومی تھیس کو اس جرم میں سزا دیتا ہے اور کاکیشیا کی چوٹی پر باندھ کر اس پر بھوکا عقاب چھوڑ دیتا ہے۔تیسرے حصے Prometheus unbound میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح زیوس کے فانی بیٹے ہرکولیس نے وحشی عقاب کو ختم کیا اور زیوس کے مشورے سے پرومی تھیس کو اس عذاب سے رہائی دلائی۔Prometheus Bound ایک مابعد طبیعیاتی ڈراما ہے جس کے تمام کردار یونانی دیوتا ہیں۔پرومی تھیس زیوس دیوتا کی ملکوتی سلطنت بنانے میں اس کی مدد کی لیکن اسے زیوس کے ظلم وستم سے نفرت تھی۔وہ انسانوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرتا تھا۔انسانوں کی نسل کو ختم کر کے کرۂ ارض پر کوئی اور نسل بسانا چاہتا تھا چنانچہ

پرومی تھیس زیوس سے بغاوت کر دیتا ہے آگ چرا کر انسان کو دیتا ہے۔انہیں علوم وفنون سے آشنا کرتا ہے۔موت کا غم ان کے دل سے نکال کر امید کی کرن ان کے سینے میں بوتا ہے تا کہ وہ دیوتا کے جبر سے آزاد ہو سکیں۔زیوس اس کی اس حرکت سے ناراض ہوتا ہے اور پرومی تھیس کو کاکیشیا میں جکڑ دیتا ہے جہاں ایک بھوکا عقاب دن بھر اس کا جگر نوچتا رہتا ہے۔رات کو جگر پھر اصلی حالت میں آجاتا ہے اور صبح عقاب پھر نوچنا شروع کر دیتا ہے۔یہ ڈراما کوہ کاکیشیا سے شروع ہوتا ہے جہاں پرومی تھیس کو جکڑا گیا ہے۔طاقت(Migh) اور ہفاس ٹس(Hephaestus) اسے جکڑنے کے لئے آتے ہیں ان کے دلوں میں اس کے لئے رحم بھی ہے لیکن وہ زیوس کے حکم کے آگے بے بس ہیں۔

سفاس ٹس: ایک بازو جکڑ دیا ہے اب یہ نہیں ہلے گا۔

طاقت: دوسرا بھی جکڑ دو تا کہ یہ چال باز جان لے کر زیوس کے سامنے اس کی چالاکی کتنی چھوٹی ہے۔اب یہ سلاخ لو اور اس کے سینے میں ٹھونک دو۔

(دونوں اسے جکڑ کر جانے لگتے ہیں اور پرومی تھیس سے کہتے ہیں)

طاقت: اپنے غرور کو اس ویران چٹان کے تخت پر بٹھاؤ اور آگ چرا کر انسان کو دینے کا مزہ چکھو، دیکھتے ہیں یہ فانی انسان تمہیں کیسے اس عذاب سے بچاتا ہے۔

(وہ سب چلے جاتے ہیں)

پرومی تھیس: (چلا کر کہتا ہے) اے آسمان! اے تیز ہوا، اے دریا، اے سمندر، اے سمندر کی لہرو! اے میری ماں! اے روشن درخشندہ آفتاب تم سب کی دہائی۔

یہ ظلم دیکھو میں خود دیوتا ہوں کہ کس طرح زیوس دیوتا کے عذاب میں گرفتار ہوں۔

دیکھو دیوتاؤں کے اس شہنشاہ نے میرے لئے زنجیریں بنوائی ہیں۔

نہ جانے مصیبتوں کی یہ رات کب ختم ہوگی اور نجات کی سحر کب آئے گی۔تقدیر کے لکھے کو خوش ہو کر برداشت کر لینا چاہئے۔

کیونکہ تقدیر کے ساتھ کوئی نہیں لڑ سکتا۔

پرومی تھیس: میں نے انسان کو قوت اور طاقت سے روشناس کرایا ہے۔

میں نے آگ سونے کے ڈنٹھل میں چھپا کر انسان کو دی ہے تا کہ فن کے سوتے پھوٹیں۔اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوں اور اس جرم میں مجھے یہاں اس پہاڑ پر باندھ دیا گیا ہے۔

اس کے بعد بجلی چمکتی ہے زلزلہ آتا ہے آتشیں دائرے پرومی تھیس کو گھیر لیتے ہیں سمندر اور آسمان ایک ہو جاتے ہیں اور پرومی تھیس اپنی ماں تھیس کی دہائی دیتا ہے جل پریوں سمیت زمین میں غائب ہو جاتا ہے اور ڈراما کا اختتام عمل میں آتا ہے۔

یہ ڈراما بلندی فکر، شاعرانہ اسلوب، جاندار کرداروں کی تشکیل کے اعتبار سے اسکائی لیس کا ایک نا قابل فراموش المیہ ہے۔یہ اس کی Trilogy کا ٹکڑا ہے جس میں پرومی تھیس کا کردار ہے جو ظلم کے خلاف ایک آواز بلند کرتا ہے۔زیوس کا ظلم اسے یہ آواز دبانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔یہ کردار ظالم کا دشمن اور کمزوروں کا ہمدرد ہے۔اس نے زیوس کی مدد کی لیکن جب اس نے تخت پر بیٹھ کر انسانوں پر ظلم ڈھائے تو وہ جیوپیٹر کے خلاف ہو گیا۔

انسانوں سے ہمدردی جتائی۔ انسان کو آگ دی۔ علوم وفنون سکھائے۔ دنیا میں رہنے کا ڈھنگ سکھایا۔ ان کے دلوں سے موت کا وسوسہ ختم کر کے مستقبل سے امیدیں باندھنے کا گر سکھایا۔ چیونٹیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والوں کو گھروں میں رہنے کا شعور دیا۔ چنانچہ زیوس کو یہی بات اچھی نہ لگی اور پرومی تھیس کو اس پاداش میں عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا لیکن پرومی تھیس کے دل میں پھر بھی خوف طاری نہ ہوا، وہ برملا اس کی مخالفت کرتا رہا۔ رود بار کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا۔ ہرمیس جو اس کے لئے صلح کا پیغام لے کر آتا ہے اور سودا بازی کرنا چاہتا ہے کہ اگر پرومی تھیس زیوس کو اس شادی کا راز بتلا دے جس سے اس کی تباہی آئے گی تو شاید زیوس اس کی سزا میں کمی کر دے۔ پرومی تھیس انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ عورتوں کی طرح اپنے بدترین دشمن سے آزادی کی بھیک نہیں مانگے گا۔ یہ اس کی جرأت کی بہترین دلیل ہے۔ پرومی تھیس لافانی ہے حیات ابدی کا مالک ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے دکھوں کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا کیونکہ موت کے ساتھ سب دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ پرومی تھیس جانتا ہے کہ یہ مسلسل عذاب اسے دیمک کی طرح چاٹتا رہے گا۔

Thou are happy that death from all the living wrongs may free thee, I, whom fate has made immpotal no end to my long lingering pains appointed.

لیکن زیوس کے سامنے گردن نہیں جھکاتا کیونکہ وہ حق پر ہے اور برملا کہتا ہے کہ اس کے ظلم کے سامنے میں اپنے فخر کا سر خم نہیں کروں گا۔

اسکائی لیس اس نظریئے کا قائل ہے کہ تقدیر انسانوں اور دیوتاؤں دونوں سے یکساں سلوک کرتی ہے۔ اگر انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے تو دیوتاؤں کو بھی اس سے فرار حاصل نہیں۔ چنانچہ پرومی تھیس بھی اس کا شاکی ہے اور وہ بار بار اس چیز کا ذکر کرتا ہے کہ بے شک میں ہنرمند ہوں لیکن تقدیر سے لڑنا ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ ہر ستم کو نوشتہ تقدیر جان کر برداشت کرتا ہے اور اس امید پر عذاب سہتا ہے کہ کسی نہ کسی دن ظالم کو زوال ضرور آئے گا اور اسے آزادی ملے گی۔ پرومی تھیس کا کردار ظلم کے خلاف آزادی اور جرأت کی ایک بہترین مثال ہے۔ وہ ایک ایسا کردار ہے جو ظالم اور ڈکیٹر کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا بلکہ اس کے غلط فیصلے پر آواز بلند کرتا ہے۔ زیوس نے تخت پر بیٹھ کر انسان کو محروم رکھا بلکہ کرۂ ارضی سے اسے مٹانے کی کوشش کی تو سارے دیوتاؤں نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن اس کے خلاف آواز بلند کرنے والا صرف پرومی تھیس تھا۔ چنانچہ اس کی سزا اسے ملی۔ پرومی تھیس ڈراموں کی تاریخ میں ظلم کے خلاف احتجاج کی پہلی بڑی آواز ہے جس کی گونج اور چاپ ہمارے آج کے جدید ڈراموں میں بھی مسلسل سنائی دے رہی ہے۔

اس ڈرامے کا دوسرا اہم کردار جیوپیٹر یا زیوس کا کردار ہے جو سٹیج پر نہیں آتا لیکن ڈرامے کے شروع سے لے کر آخر تک اس کی گونج سنائی دیتی رہتی ہے۔ پرومی تھیس کی ساری تقریر میں اس کے ظلم کی کہانیاں ہیں جن سے اس چیز کی وضاحت ہوتی ہے کہ جیوپیٹر ایک ظالم اور جابر کردار ہے۔ پرومی تھیس کو بخشا ہوا مسلسل عذاب اس کی زندہ مثال ہے۔ اس نے اپنے ظلم سے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ اپنے باپ کرونس کو تخت سے محروم کیا۔ وہ دوست دشمن بھی ہے۔ پرومی تھیس نے تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی لیکن بعد میں وہ اس کا ہی دشمن بن گیا اور احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔ وہ ظالم ہونے کے علاوہ جنسی ہوس کا بھی شکار ہے۔ آیو جیسی معصوم دوشیزہ اس کی وجہ سے بے گھر ہے اور مسلسل عذاب میں مبتلا ہے۔ اگر وہ اس سے ہم بستری کی خواہش نہ کرتا تو ہیرا کا انتقام آیو کو یہ دن دیکھنے پر مجبور نہ کرتا۔ یونانی دیومالائی قصوں میں دیوتاؤں کو جنسی ہوس کا شکار دکھایا گیا ہے۔ زیوس اس میں پیش پیش ہے۔ فانی عورتوں سے اس کی کئی شادیاں

اس کا ثبوت ہیں۔ یوری پیڈیز دیوتاؤں کے اس پہلو سے سخت متنفر تھا اور اس نے اپنے ڈراموں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ دیوتاؤں کو اس میں مبتلا یا ملوث کرنا درست نہیں۔ اس نے اس کو یکسر غلط قرار دیا اور کئی بار کہا:

If Gods do evilds, They are no Gods.

اسکائی لیس کا تصور یہ تھا کہ جیوپیٹر پہلے بے شک ظالم اور ستم شعار تھا لیکن بعد میں اس نے یہ عادت چھوڑ دی۔ انسانوں کا دوست بن گیا اور انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر ہو گئے تھے۔ شاید اس Trilogy کے آخری حصے میں پرومی تھیس کی سزا معاف کرنا اسی انسان دوستی کا ایک ثبوت تھا۔ یہ بعد کی بات ہے لیکن زیر بحث ڈرامے میں اس کا کردار ایک ظالم ملکوتی بادشاہ کا کردار ہے جس کے دل میں رحم نہیں۔ انسان دشمن ہے۔ احسان فراموش ہے اور جنسی بھوک کے ہاتھوں دوشیزاؤں کو بے گھر کرتا ہے۔ بیوی سے بے وفائی کرتا ہے اور دوسری عورتوں کے لمس سے اپنا بستر گرم کرتا ہے۔

آیو ایک معصوم دوشیزہ کے روپ میں ابھرتی ہے اس کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ ایک عذاب پاؤں میں باندھ کر گردش کے سفر پر رواں دواں ہے۔ اس کا جرم اس کا کنوارا پن اور اس کی خوبصورتی ہے جس نے جیوپیٹر کے دل میں شوق کی آگ جلائی اور ہیرا کے دل میں انتقام کا الاؤ روشن کیا۔ وہ اس خوبصورتی کے ہاتھوں تنگ ہے۔ اسے بچھیا کا روپ ملتا ہے۔ بڑمکھی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ مرنا چاہتی ہے لیکن مر نہیں سکتی کیونکہ تقدیر میں ابھی موت نہیں لکھی۔ موت آئے لیکن سارے عذاب سہہ کر۔ اس کا تو یہ حال ہے:

ہم اُڑتے پھرتے ہیں مثلِ خوشبو
دیکھتا رہتا ہے رستہ ہم کو

جل پریوں کا کردار ایک لحاظ سے بڑا اہم ہے۔ وہ اس لئے کہ وفا کی جو مثال یہ قائم کرتی ہیں اس ڈرامے میں ابھرنے والے کسی کردار نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ پرومی تھیس عذاب میں مبتلا ہے۔ جل پریاں اس سے ہمدردی جتلاتی ہیں لیکن جیوپیٹر کے ظلم کے سامنے بے بس ہیں۔ جل پریاں بھی جیوپیٹر کے ظلم سے واقف ہیں لیکن ان کے دلوں میں پرومی تھیس کی دوستی کی جڑیں جیوپیٹر کے ظلم سے زیادہ گہری ہیں۔ جب رود بار انہیں کہتا ہے کہ تم ایک طرف ہو جاؤ کہیں زیوس کا غضب تمہیں بھی ختم نہ کر دے تو وہ اس مشورے کو خاطر میں نہیں لاتیں بلکہ کہتی ہیں:

With his sorrow I will sorrow. I will hate a traitor's name. Earth has plague but non more than a faithless friend in need.

یہ سطریں ان کی وفا کی روشن دلیل ہیں چنانچہ زیوس پرومی تھیس کو زمین میں غرق کرتا ہے یہ اس کے ساتھ زیرِ زمین جاتی ہیں:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

سوفیکلیز

(Sophocles)

496 قبل مسیح کا المیہ نگار۔ اسکائی لیس کے بعد دوسرا بڑا ڈراما نویس ایڈی پس ریکس کا خالق جسے دنیا کا سب سے بڑا ڈراما قرار دیا جاتا ہے۔ 124 ڈرامے لکھے۔ ٹریجڈی فیسٹیول میں 24 بار انعام جیتا۔

اے عظیم ایڈی پس
ہمارے شہر پر آسیب کا سایہ ہے
جو گھر آباد تھے برباد ہو گئے ہیں
موت کا سایہ بڑھتا جا رہا ہے
تُو انسانوں میں سب سے عظیم ہے
آسمان سے ہمکلام ہونے کا فن جانتا ہے
تو نے ایک بار پہلے بھی ہمارے شہر کو موت کے منہ سے بچایا تھا
آ ہمارے شہر کو پھر زندہ کر
تو یہ تو جانتا ہے کہ زندہ لوگوں پر حکومت کرنا
مردہ لوگوں پر حکومت کرنے سے بہتر ہے۔

(ایڈی پس۔ ریکس)

سوفیکلیز

یونانی المیہ نگاری کے فن کو تین لوگوں نے عالمی شہرت بخشی، ناقابل فراموش، بے مثال اور قابلِ تقلید بنایا جو وقت کی شاہراہ پر میراتھن کھلاڑیوں کی طرح صدیوں سے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ جن کی رفتار میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا نہ قدم لڑکھڑائے، نہ انہیں تھکن محسوس ہوئی۔ وہی شان، وہی وقار اور وہی اسلوب کا دبدبہ۔ یہ تین بڑے، اسکائی لیس، سوفیکلیز اور یوری پیڈیز ہیں۔ لکھنے کے لئے تینوں نے وہ موضوعات منتخب کئے جو قارئین کی یادداشت میں محفوظ تھے، کہانیاں وہ اٹھائیں جو ڈراما دیکھنے والوں کو ازبر تھیں مگر ان تین بڑے لکھاریوں نے اپنے اپنے اسلوب، ڈکشن اور زبان کا تڑکا لگا کر دنیا کو ششدر اور حیران کر دیا۔ فلسفے کی ایسی گرہیں لگائیں کہ آج بھی انہیں کھولتے کھولتے نقادوں کی انگلیاں تھک جاتی ہیں۔ سوفیکلیز، اسکائی لیس کا جونیئر اور یوری پیڈیز کا سینئر تھا۔ اسکائی لیس کے ہوتے ہوئے اس نے ٹریجڈی کی صنف پر اپنے نام کی مہر لگائی اور اسکائی لیس جیسے قادرالکلام مصنف کو تھوڑا سا پریشان بھی کیا حالانکہ وہ خود کہتا تھا کہ میں نے ڈراما لکھنے کا فن اسکائی لیس کو پڑھ پڑھ کر اور اس کے ڈراموں کو نقل کر کر کے سیکھا ہے۔

سوفیکلیز بہت خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت خوبصورت نوجوان بن کر ایتھنز کی سوسائٹی میں ابھرا۔ کہتے ہیں اس کا جسم بہت خوبصورت، ملائم اور چمکیلا تھا۔ کپڑے اتار کر ناچنے گانے کا فن آج کے عہد کا ہی جنون نہیں یہ ہنگامہ نوجوان سوفیکلیز کے عہد میں بھی کرتے تھے اور بڑے بڑے جلوس اور تقریبات میں فرمائش پر اس کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ آج جب کسی ٹی وی شو میں بالی وڈ کے اداکار کو قمیض اتار کر جسم دکھانے کی فرمائش ہوتی ہے تو مجھے سوفیکلیز کی ایک تقریب یاد آ جاتی ہے جب ایتھنز کے لوگوں نے اس سے کپڑے اتار کر ناچنے کے لئے کہا تھا تاکہ لوگ سوفیکلیز کا سنہری جسم دیکھ سکیں۔ چنانچہ سوفیکلیز نے ایسا ہی کیا اور کپڑے اتار کر ایک گھنٹہ رقص کیا اور ایتھنز کے لوگ تالیاں بجا بجا کر اسے داد دیتے رہے۔

سوفیکلیز نے شاید اسکائی لیس اور یوری پیڈیز سے زیادہ خوش حال زندگی گزاری۔ دونوں سے زیادہ مقابلے میں انعامات جیتے۔ ٹریجڈی فیسٹیول میں اس نے 24 بار مقابلہ جیتا اور ڈرامے کا اوّل انعام حاصل کیا۔ 123 ڈرامے لکھے جن میں سے ہمارے ہاتھ صرف سات ڈرامے آئے ہیں۔ وہ بھی بھلا ہو سکندر اعظم کا جس کے کہنے پر یہ ڈرامے تلاش کیے گئے اور پھر انہیں سکولوں کے نصاب کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا اور یہ ڈرامے آج دنیا کے عظیم ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔

ایتھنز کے مال دار شخص کا بیٹا سوفیکلیز 496 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ میراتھن کی جنگ 490 ق م میں ہوئی۔ یہ اس جنگ کے چھ سال بعد پیدا ہوا۔ ڈراما فیسٹیول میں حصہ لیا تو اس کا پہلا ڈراما ہی اول انعام کا مستحق قرار پایا۔ اس کے مقابلے میں عظیم المیہ نگار اسکائی لیس تھا مگر اسے انعام نہ ملا اور وہ اس ناکامی کا دکھ دور کرنے سسلی سیر کرنے چلا گیا۔

اپنے پہلے ڈرامے ہی سے سوفیکلیز پورے ایتھنز میں مقبول ہو گیا، پھر ادب اور سماجی زندگی میں اس کی مقبولیت تیزی

سے بڑھنے لگی۔ مشہور جنگ (Salamis) میں جب یونانیوں نے ایران کو شکست دی اور عقیدت کے طور پر یونانیوں نے دیوتا کو ایک بڑے گیت کا نذرانہ پیش کیا گیا تو سوفیکلیز 16 منتخب جوانوں میں مشعل ہاتھ میں لے کر سب سے آگے تھا۔ وہ مشہور جمہوری شخصیت پیریکلیز کے قریبی دوستوں میں سے تھا اور پیریکلیز کی وجہ سے وہ ایتھنز کی سماجی زندگی میں بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر فائز رہا بلکہ ساموس کی جنگ میں وہ ایک جرنیل کی حیثیت سے لڑنے کے لئے میدان میں بھی اترا۔ جنگ میں متاثرہ لوگوں کی بحالی کے لئے جب دس آدمیوں کا ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تو سوفیکلیز کی حیثیت اس میں کلیدی اور مرکزی تھی۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ جب ایتھنز میں معاشی بحران آیا تو اسے اس کے حل کیلئے کمشنر مقرر کیا گیا۔

سوفیکلیز سارے یونانی لوگوں کی آنکھ کا تارا بن کر جیتا رہا۔ (سوائے اپنے دو بیٹوں کے جنہوں نے اس کے ساتھ ناقابل فراموش سلوک کیا) یونان کے مشہور طربیہ نگار ارسٹوفینز نے اپنے ایک ڈرامے (The Muses) میں سوفیکلیز کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

Blessed is sophocles, who had a long life, was a man both happy and talented, and he ended his life without suffering any misfortune.

ارسٹوفینز کی ساری بات درست ہے سوائے اس کے کہ اسے کسی بدنصیبی سے واسطہ نہیں پڑا۔

سوفیکلیز نجی زندگی میں بڑا خوشحال، خوش اور عاشق مزاج آدمی تھا۔ ایتھنز میں اس کے چرچے گلی گلی تھے۔ جتنا کتابوں سے اسے عشق تھا اتنا ہی وہ خوبصورت لڑکوں سے عشق کرتا تھا۔ یہ صفت دراصل اس وقت یونان کے رئیس زادوں میں ایک اضافی شان سمجھی جاتی تھی۔ ایتھنز کی پڑھی لکھی سوسائٹی میں دو لفظ بہت عام تھے

(عاشق) Erastes اور دوسرا (محبوب) Eromenos

یہ دونوں لڑکوں سے تعلق کی وضاحت کرتے تھے۔ سوفیکلیز کے بارے میں بھی یہ کہانیاں مشہور تھیں کہ وہ بھی اس کا شوقین تھا۔ ان کہانیوں پر شاید یقین نہ کیا جاتا لیکن افلاطون نے Republic میں سچ بول کر ان کہانیوں کو سچا ثابت کر دیا ہے۔ افلاطون لکھتا ہے کہ جب سوفیکلیز آخری عمر میں مردانہ صفات سے محروم ہو گیا تو اس نے بہت خوش ہو کر کہا:

''شکر ہے ایک وحشی اور خونخوار جذبے سے میری جان چھوٹ گئی''۔

سوفیکلیز 90 سال تک جیا۔ 24 بار اول ڈرامانگار کی حیثیت سے انعامات حاصل کیے۔ دو شادیاں کیں۔ دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ساری زندگی چین اور آرام سے گزاری، بس آخری دن بہت برے گزرے۔ اس کی خوشی میں دکھ کا بھنور پیدا کرنے والا کوئی اور نہ تھا اس کا بیٹا ہی تھا۔ اس نے عدالت میں مقدمہ کر دیا کہ سوفیکلیز کا دماغی توازن درست نہیں۔ یہ بات کرتے کرتے بھول جاتے ہیں اس لئے جائیداد کا بٹوارہ ہو جانا چاہیے۔ عدالت میں مقدمے کا دفاع سوفیکلیز نے خود کیا اور کہا کہ میں ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہوں، میری یادداشت بالکل درست ہے، عدالت نے ثبوت مانگا تو اس نے اپنا ڈراما Oedipus at Colonus زبانی پڑھ کر سنا دیا۔ بیٹا خود بھی ڈرامانگار تھا۔ باپ کے مقابلے میں میدان میں اتر آیا۔ بیٹے کی یہ حرکت سوفیکلیز کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی۔

سوفیکلیز کی موت کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ انگور کھا رہا تھا، انگور کا ایک دانہ سانس کی نالی میں اٹک گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ کسی نے مشہور کر دیا کہ آخری عمر میں اسے ایک ڈرامے پر انعام ملا اور وہ اتنا خوش ہوا کہ خوشی برداشت نہ ہوئی اور مر گیا۔ ایک داستان یہ بھی مشہور ہو گئی کہ وہ اپنے مشہور ڈرامے انٹی گون کا طویل

ترین مصرع پڑھ کر سنا رہا تھا کہ اس کا سانس اکھڑ گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ بہر حال سوفیکلیز ایک عظیم المیہ نگار، ایتھنز کی سب سے بڑی سماجی شخصیت اور سب کا محبوب لکھاری (406ق م) میں فوت ہو گیا۔

سوفیکلیز نے ٹریجڈی میں بڑا نام کمایا۔ اسکائی لیس کی خدمات کو بالکل فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ڈرامے میں ایک کردار کا اضافہ کیا۔ پہلے ڈراما گیتوں کی شکل میں آگے بڑھتا تھا اور مکالمہ بہت کم تھا۔ اسکائی لیس نے ایک کردار کا اضافہ کر کے مکالموں کی مقدار میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ماسک کی ساخت میں حقیقی رنگ بھرا۔ گرین روم اور آرائش میں اضافے کیے۔ اس نے مناظر میں خوف اور ڈر کی فضا میں اس قدر حقیقت سے کام لیا کہ اس کا ڈراما دیکھتے ہوئے بعض لوگ ڈر سے بے ہوش ہو جاتے تھے اور عورتوں کے حمل ضائع ہو جاتے تھے چنانچہ انتظامیہ نے بورڈ لگانے شروع کر دیئے کہ کمزور دل اور حاملہ عورتیں ڈراما دیکھنے نہ آئیں۔ اسکائی لیس کو نقادوں نے ٹریجڈی کا روشن دن قرار دیا ہے۔

سوفیکلیز نے آ کر اس دن کی روشنی میں بے مثال اضافہ کیا اور اپنے اسلوب سے اپنی جگہ بنائی۔

سوفیکلیز نے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے 123 ڈرامے لکھے لیکن سب ضائع ہو گئے صرف سات ڈرامے باقی ہیں اور یہی سات ڈرامے اس کی بے مثال شہرت کا سبب ہیں۔ وہ ڈرامے یہ ہیں۔

1- Oedipus Rex
2- Oedipus at colonus
3- Antigone
4- Ajax
5- Electra
6- The Trachiniae
7- Philoctetes

ڈراما ایجکس (Ajax) ایک فوجی سپہ سالار کی کہانی ہے جو اس فوج کے ساتھ گیا تھا جو ہیلن کو (Troy) کے شہزادے سے واپس لینے کے لیے گئی تھی جو اسے یونان سے اغوا کر کے ٹرائے لے گیا تھا۔ اس ڈرامے میں سوفیکلیز نے ایجکس کے پاگل پن کو موضوع بنایا ہے۔ جو ہتھیار حاصل کرنے کیلئے اوڈی سی لیس کے خلاف ہو گیا تھا اور اس کی جان لینا چاہتا تھا مگر اوڈی سی لیس کی حامی دیوی نے ایجکس کو پاگل کر دیا اور ایجکس اسی پاگل پن میں مر گیا۔

الیکٹرا (Electra) آگا مم نان کی بیٹی تھی۔ جب وہ ہیلن کو بازیاب کرا کے اس کے خاوند کے ساتھ گھر چھوڑ کر اپنے گھر آتا ہے تو اس کی بیوی کلائی ٹم نسٹرا اپنے عاشق کے ساتھ مل کر آگا مم نان کو قتل کر دیتی ہے۔ الیکٹرا اور اس کا بھائی کچھ عرصے کے بعد ان دونوں سے باپ کے قتل کا انتقام لیتے ہیں۔ یہ ڈراما اسی قصے کو بیان کرتا ہے۔ (شیکسپیئر کے ڈرامے ہیملٹ کی ساری کہانی اسی پر مبنی ہے، چند اختتامی مناظر کو تبدیل کر کے شیکسپیئر نے اپنا بنا لیا)

ڈراما (Trachiniae) ایک شہزادی (Lole) کے انتقام کی کہانی ہے جسے ہرکولیس نے ایک شہر فتح کر کے اپنا غلام بنا لیا اور بیوی کے پاس بھیج دیا تھا جہاں وہ اس کی بیوی کو مار کر انتقام لیتی ہے۔

یونان کی متحدہ فوجیں جو ہیلن کی بازیابی کے لئے ٹرائے گئی تھیں ان میں ایک ماہر تیر انداز Philoctetes بھی تھا جسے فوجی ایک جزیرے میں چھوڑ آئے تھے لیکن جب انہیں ٹرائے میں تیر انداز کی کمی محسوس ہوئی تو اوڈی سی لیس اسے لینے

کے لئے واپس جاتا ہے۔ یہ ڈراما اسی سفر اور اس کی واپسی کی روداد ہے۔

یہ سب ڈرامے سوفیکلیز کی فنکارانہ ہنرمندی، اسلوب اور ڈکشن کی بدولت اپنی اپنی جگہ بے مثال شاہکار ہیں۔ مناظر، کردار، شاعری، کوئی نہ کوئی عنصر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے مگر سوفیکلیز کا اصل ہنر ''ایڈی پس خاندان'' کے ڈراموں میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی ڈرامے ساری دنیا میں مقبولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

سوفیکلیز کے Thebes Plays میں سب سے اہم ڈراما (جسے دنیا کا سب سے بڑا ڈراما قرار دیا جاتا ہے) وہ ''ایڈی پس ریکس'' ہے۔ (Oedipus-rex) میں ایڈی پس کی پیدائش، پرورش، بچپن میں شہر بدری، جوانی اور پھر واپسی، باپ کو قتل اور پھر ماں سے شادی اور دوبارہ (Thebes) شہر سے نکلنا شامل ہے۔ کہانی کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ایڈی پس کے باپ کو ایک معجزے کے ذریعے خبردار کیا گیا تھا کہ اس کا بیٹا اسے قتل کر کے تخت نشین ہوگا، اپنی ماں سے شادی کرے گا اور اس سے چار بچے پیدا ہوں گے۔ میاں بیوی اس پیشنگوئی سے بڑے خوفزدہ ہوئے اور ایڈی پس کو پیدا ہوتے ہی ایک ملازم کے ذریعے قتل کرا دیا، لیکن ملازم نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ ساتھ کی ریاست کے ایک بے اولاد آدمی کو دے دیا اور بھیڑ کے خون سے کپڑے لت پت کر کے ایڈی پس کے باپ کو یقین دلایا کہ بچے کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ایڈی پس ساتھ والی ریاست میں پرورش پاتا رہا لیکن جب وہ جوان ہوا تو اسے یہ طعنہ برداشت کرنا پڑا کہ وہ اپنے ماں باپ کا اصل بیٹا نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ نے اسے یقین دلایا کہ ایسا بالکل نہیں۔ وہ ان کا اصل بیٹا ہے۔ ایڈی پس کے دل میں شک نے جب زور پکڑا تو وہ اپالو کے مندر میں چلا گیا جہاں غیب کی آوازیں لوگوں کو سنائی دیتی تھیں اور لوگ سوال کر کے جواب حاصل کرتے تھے۔ جب ایڈی پس نے اپنی الجھن بیان کی تو ایک مبہم سا جواب آیا کہ تم اپنے باپ کو قتل کر کے ماں سے شادی کرو گے۔ ایڈی پس جو پرورش کرنے والوں کو ہی اپنا ماں باپ سمجھتا تھا بہت خوفزدہ ہوا اور اس دوہرے گناہ سے بچنے کیلئے شہر سے بھاگ گیا اور اس راستے پر چلنے لگا جو اس کے آبائی شہر Thebes کی طرف جاتا تھا۔ اتفاق سے اس کا اصلی باپ شکار کھیلنے اسی راستے سے گزر رہا تھا۔ دونوں کی کسی بات پر تُو تُو مَیں مَیں ہوئی اور ایڈی پس نے اپنے اصلی باپ کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف Thebes شہر کے دروازے پر ایک بلا آ کر بیٹھ گئی اور بیماریاں اور امراض اپنے سانسوں سے شہر کی طرف بھیجنے شروع کر دیئے اور شہر تباہ ہونے لگا۔ بلا سب لوگوں سے ایک سوال کرتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر میری پہیلی کا کوئی درست جواب دے گا تو میں خود ہی جل کر مر جاؤں گی اور شہر کو عذاب سے نجات مل جائے گی۔ شہر والوں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ جو بھی بلا کی پہیلی کا درست جواب دے گا اسے وہ شہر کا بادشاہ بنا لیں گے۔

ایڈی پس باپ کو قتل کر کے پھرتا پھراتا Thebes شہر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بلا نے اس کے سامنے بھی پہیلی رکھی اور پوچھا۔

''وہ کون سی چیز ہے جو صبح چار پیروں پر چلتی ہے۔ دوپہر کو دو پیروں پر اور شام کو تین پیروں پر''

ایڈی پس نے فوراً جواب دیا۔

''انسان''

بلا نے پوچھا ''کیسے''۔

ایڈی پس نے جواب دیا ''بچہ بچپن میں چار پیروں پر یعنی دو ہاتھوں اور دو پیروں پر چلتا ہے، یہ صبح ہے۔ دوپہر یعنی جوانی میں دو پیروں پر اور شام یعنی بڑھاپے میں دو پیروں کے ساتھ ایک چھڑی بھی آ جاتی ہے''

بلا نے جب یہ جواب سنا تو اپنی آگ میں جل کر [illegible] ہو گئی اور شہر والوں نے ایڈی پس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ قانون کے مطابق پہلے بادشاہ کی بیوی یعنی ایڈی پس کی ماں ایڈی پس کی بیوی بن گئی اور دیوتاؤں کی پیشنگوئی پوری ہو گئی اور ایڈی پس تقدیر اور دیوتاؤں کی سازش سے ماں کے ساتھ خاوند بن کر زندگی بسر کرتا رہا، چار بچوں کا باپ بن گیا۔ دیوتاؤں نے ایک بار پھر ایک کھیل کھیلا اور بلا ایک بار پھر شہر کے دروازے پر آ بیٹھی۔ وبا، بیماری، تعفن اور دھواں شہر کی طرف چھوڑنے لگی۔ اس بار اس نے اس گناہگار اور قاتل کا مطالبہ کیا جس نے باپ کو قتل کر کے ماں سے شادی کی ہے۔ شہر کے لوگ دن رات مرنے لگے اور گھر گھر قبرستان بن گیا۔ اس دکھ پر ایڈی پس خود بھی پریشان تھا۔ شہر کے لوگ جانتے تھے کہ اس شہر میں صرف ایک ہی دانا اور عقلمند آدمی ہے اور وہ ایڈی پس ہے۔ اس نے پہلے بھی بلا سے ہماری جان بچائی تھی اس بار بھی یہی ہمارا دکھ دور کرے گا۔ چنانچہ شہر کے لوگ عبادت خانوں کے پجاری اکٹھے ہو کر اس کے پاس آتے ہیں، فریاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

پادری: اے ہماری دھرتی کے حکمران! اے عظیم ایڈی پس!

تو ہمیں شاخوں کی طرح خمیدہ دیکھ رہا ہے۔

کچھ یہاں تک آتے آتے تھک گئے ہیں کچھ لوگ ہاتھوں میں ہار لے کر چوراہے پر کھڑے رو رہے ہیں

ہمارے شہر پر آسیب کا سایہ ہے

جو گھر آباد تھے برباد ہو گئے ہیں

موت کا سایہ بڑھتا جا رہا ہے

تُو انسانوں میں سب سے عظیم ہے

آسمان سے ہمکلام ہونے کا فن جانتا ہے

ہم تجھے سب سے اعلیٰ مانتے ہیں

تیری گزشتہ خدمات کے مدنظر

یہ شہر تجھے پھر بلا رہا ہے

تُو نے ایک بار پہلے بھی

ہمارے شہر کو موت کے منہ سے بچایا تھا

اس طرف دھیان دے

آ ہمارے شہر کو پھر زندہ کر

نہیں تو سب مر جائیں گے

تُو یہ تو جانتا ہے کہ زندہ لوگوں پر حکومت کرنا

مُردہ لوگوں پر حکومت کرنے سے بہتر ہے

ایڈی پس کو خود بھی شہر پر طاری مصیبت اور عذاب کا دکھ تھا، اس نے اپنے سالے کریون کو اپالو کے مندر میں بھیجا کہ وہ اس مصیبت کا کوئی حل پوچھ کر آئے۔ وہ پادری سے کہتا ہے:

ایڈی پس: مجھے پتا ہے کہ تم تباہ ہو رہے ہو۔

میرا دل تمہارے لئے سوگوار ہے۔
تمہارے لئے اشکبار ہے۔
لیکن میں روتے ہوئے بھی بھلائی اور بچاؤ کی کوئی راہ تلاش کر رہا ہوں۔
میں نے اپنی بیوی Jocasta کے بھائی کو اپالو کے مندر بھیجا ہے۔
تاکہ کوئی عمل اور اشلوک لائے۔
جو شہر کو بچانے میں ہمارا مددگار ثابت ہو۔

اسی دوران اس کا سالا آ جاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ شہر کو بچانے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ کے قاتل کو شہر بدر کر دیا جائے۔

ایڈی پس جو لاعلم ہے اور نہیں جانتا کہ اس نے کیا کیا ہے، پوچھتا ہے:
ایڈی پس: مگر وہ قاتل کہاں ہے؟
کریون: مندر کا پروہت کہتا ہے،
جو تلاش کریں گے اسے ڈھونڈ لیں گے۔

پھر بادشاہ کے قاتل کو ڈھونڈنے کی کوششیں شروع ہوتی ہیں اور سب کا یہ فیصلہ ہے کہ اندھے (SEER) کو بلایا جائے جو پچھلے اور آنے والے زمانے کا بھید جانتا ہے۔ شاید وہ بتلا سکے کہ بادشاہ کا قاتل کون ہے، چنانچہ ایڈی پس کے کہنے پر اندھے کو بلایا جاتا ہے، اندھا بوڑھا دربار میں آتے ہی چلاتا ہے کہ مجھے دربار سے جانے دو کیونکہ مجھے دربار سے قاتل کی بدبو آ رہی ہے۔ ایڈی پس اس پر زور دے کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ قاتل کون ہے لیکن بوڑھا بتانے سے انکار کرتا ہے۔

اندھا: مجھے گھر جانے دو کیونکہ میں سب کچھ جانتا تھا
مگر یہاں آتے آتے سب کچھ بھول گیا ہوں۔
ایڈی پس: تمہیں قاتل کا نام بتلانا ہوگا، بتاؤ کیا راز ہے؟
اندھا: وہ راز تمہارے لئے فائدہ مند نہیں ہوگا۔
ایڈی پس: کیا مطلب؟
اندھا: میں تمہیں مصیبت میں بتلا نہیں کرنا چاہتا۔
ایڈی پس: اگر تم نے قاتل کا نام نہ بتلایا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔
اندھا: تو پھر سنو، وہ قاتل تم ہی ہو۔
تم ہی نے بادشاہ کو قتل کر کے اس کی بیوی سے شادی کی۔
تم نے لاعلمی میں گناہ کیا۔
جو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر
اپنی نوعیت کا سب سے بڑا گناہ ہے۔
کیونکہ تم نے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں سے شادی کی ہے۔

خوف کے قدم بہت دور تک تیرا تعاقب کریں گے
اس زمین پر تجھ سے تباہ حال زندگی کسی کی نہ ہوگی۔

اندھا یہ کہہ کر چلا جاتا ہے اور ایڈی پس کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ایڈی پس اور اس کی بیوی (یعنی اس کی ماں) تمام گزشتہ صورتحال سے بےخبر ہیں۔ ایڈی پس کو قاتل کی تلاش ہے تاکہ شہر پر طاری عذاب سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ آہستہ آہستہ گتھیاں سلجھنا شروع ہوتی ہیں۔ سانپ اور سیڑھی کا کھیل جاری رہتا ہے۔ اس شخص کو بلایا جاتا ہے جسے ایڈی پس (بچے) کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ بتلاتا ہے کہ اس نے بچے کو مارا نہیں تھا بلکہ ساتھ والے شہر کے ایک آدمی کو دے دیا تھا آدمی کا نام وہی ہے جس نے ایڈی پس کی پرورش کی تھی۔ پھر اس آدمی کو طلب کیا جاتا ہے جس نے بادشاہ کے قاتل کو دیکھا تھا کیونکہ وہ آدمی بادشاہ کے ساتھ تھا۔ وہ آدمی ایڈی پس کو پہچان لیتا ہے اور آخر یہ کھیل یہاں ختم ہوتا ہے کہ ایڈی پس قاتل قرار پاتا ہے۔ Jocasta اس شرمندگی سے کہ اس کا بیٹا اس کا شوہر بن گیا، خودکشی کر لیتی ہے۔ ایڈی پس اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے اور اپنے لئے شہر سے جلاوطن ہونے کی سزا تجویز کرتا ہے تاکہ شہر کو عذاب سے چھٹکارا مل سکے، اپنے سالے کریون کو بادشاہ بنا دیتا ہے اور آخری بار اپنے بیٹوں سے ملتا ہے اور لڑکوں سے بات کرتا ہے اور پھر شہر چھوڑ کر دنیا میں دھکے کھانے کے لئے اپنا سفر شروع کر دیتا ہے اور کورس اسے جاتے دیکھ کر اختتامی گیت گاتا ہے۔

کورس: THEBES کے لوگو، دیکھو یہ ایڈی پس ہے
جو شریف النسل تھا
اور مشہور پہیلی جانتا تھا
جس نے اس شہر کو بلا سے بچایا تھا
اور اب وہ کرب کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے
یہاں سے یہ سبق ملتا ہے
کہ آدمی اس وقت تک خوش نہیں ہوتا
جب تک اس کا آخری دن نہ آ جائے
وہ سرحد پار نہ کر جائے جو زندگی کو موت سے الگ کرتی ہے۔

....

سوفیکلیز کا یہ ڈراما اپنے مضبوط پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے اعلیٰ ترین ڈراما ہے۔ سوفیکلیز نے ایک کردار کا مزید اضافہ کر کے تصادم کی فضا کو اور بڑھا دیا ہے۔ سوفیکلیز کی منفرد امیجری اور قادر الکلامی کا یہ ڈراما بہترین مثال ہے۔ اسے کسی کردار کا المیہ یا تقدیر کی ستم ظریفی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ڈراما ایک انسان کی ذہانت اور سچ کی تلاش کا ڈراما ہے۔ ایڈی پس اگر چاہتا تو تلاش کی ڈوری درمیان میں چھوڑ کر حالات کو تبدیل ہونے سے روک سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور سچ کو ڈھونڈ کر دم لیا اور اپنے لئے سزا تجویز کی اور انسان کی عظمت کو برقرار رکھا۔

اس کڑی کا دوسرا ڈراما OEDIPUS AT COLONUS ایڈی پس کی دربدری کا ڈراما ہے جب وہ COLONUS میں آتا ہے اور لوگ اسے حیرانی سے دیکھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ذہانت بھی کتنا خطرناک ہتھیار ہے۔ یہی ایڈی پس کبھی بادشاہ تھا اور اب دربدر دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ اس کی بیٹیاں انٹگنی اور اسمنی بھی اس کے پاس آ جاتی ہیں۔
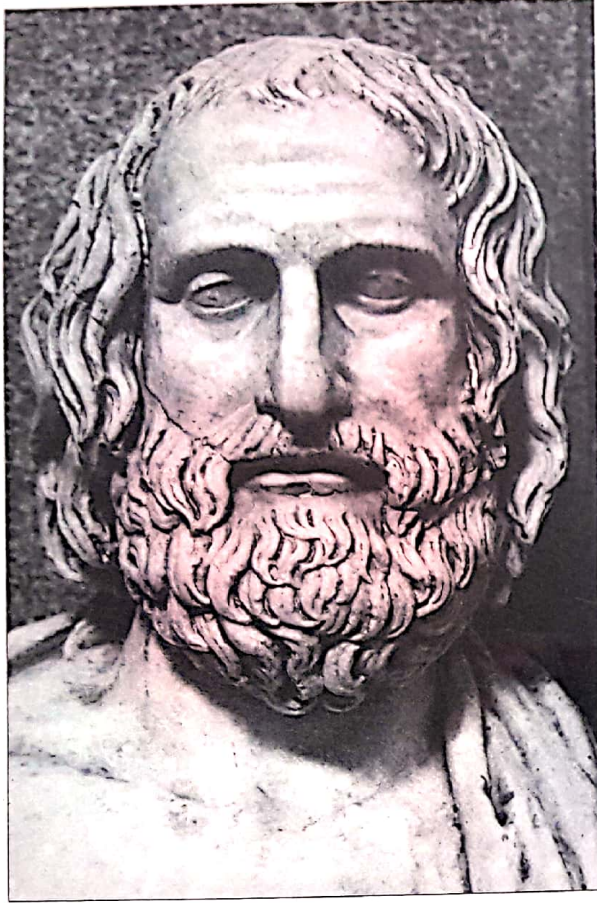
THEBES PLAYS کی آخری کڑی یعنی تیسرا ڈراما انٹگنی ہے۔ جس کا مرکزی کردار انٹگنی ہے۔ ایڈی پس کے دو بیٹے ہیں ایک کریون بادشاہ کے حق میں ہے دوسرا اس کے خلاف۔ مخالف بیٹا لڑائی میں مارا جاتا ہے۔ کریون حکم دیتا ہے کہ اس کی لاش کو دفنایا نہ جائے جو دفنائے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ انٹگنی کریون کے حکم کو نہیں مانتی اور بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بھائی کو دفناتی ہے۔ یہ ڈراما باہمت انٹگنی کی جرأت اور بہادری کا ڈراما ہے جو ایک آمر بادشاہ کا مقابلہ کرتی ہے اور بڑی جرأت سے موت کو گلے لگاتی ہے۔

سوفیکلیز کو المیہ نگاری میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ یونان کے تینوں المیہ نگار اپنی اپنی منفرد صفات کی بنا پر اپنی اپنی جگہ نا قابل شکست ہیں۔ اسکائی لیس کے اسلوب میں حرارت ہے۔ آسمانی آگ ہے۔ یوری پیڈیز کے ڈراموں میں انسان زندگی کی زنجیروں کو توڑتا اور مفلسی کے خلاف لڑتا نظر آتا ہے۔ یہ دونوں باتیں ہمیں سوفیکلیز میں نظر نہیں آتیں لیکن پروفیسر مرے کے مطابق اس کے ڈرامے میں کرداروں کا نفسیاتی الجھاؤ، پلاٹ کی تشکیل، زبان کا جائز استعمال، اسے دونوں سے منفرد بنا دیتا اور صف اوّل کے ڈراما نگاروں میں لا کھڑا کرتا ہے۔

سوفیکلیز کے ڈراموں کی ایک اہم ترین صفت ڈراموں میں آنے والے خاموش مناظر ہیں۔ نقادوں کا یہ خیال ہے کہ سوفیکلیز انسانی فطرت، انسانی نفسیات اور انسان کے اندر اٹھنے والے طوفانوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ڈراموں میں خاموش مناظر لکھ کر ڈرامے کی شدت کو بڑھا دیا ہے۔ وہ سین میں کرداروں کو بولنے کے لیے مکالمہ نہیں دیتا بلکہ خاموشی کی ایک ایسی فضا منظر پر طاری کر دیتا ہے جس سے ڈرامے کا پورا ماحول بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسکائی لیس اور سوفیکلیز کا موازنہ کرتے ہوئے کئی نقادوں نے یہ بات لکھی ہے کہ سوفیکلیز کے خاموش مناظر اسکائی لیس کے مکالماتی مناظر سے زیادہ بہتر ہیں۔ یہ صفت صرف سوفیکلیز میں ہے۔

ایتھنز کے لوگ سوفیکلیز کو ڈراما نگار کے ساتھ ساتھ مذہبی عقیدت کی نظر سے بھی دیکھتے تھے۔ آخری عمر میں اس نے اپنے گھر کو دیوتا ASCLEPIUS کا مندر بنا دیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ دیوتا اس سے بات کرتے ہیں۔ ایک بار ایک سنہری تاج گم ہو گیا۔ اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ روایت مشہور ہے کہ ایک رات ہرکولیس کی روح اس کے گھر آئی اور اسے چور کا نام اور وہ جگہ بتلا دی جہاں تاج چھپایا گیا تھا۔ سوفیکلیز نے صبح اٹھ کر لوگوں کو وہ جگہ بتلا دی جہاں تاج چھپایا گیا تھا۔ اس بات سے لوگوں میں اس کا احترام اور بڑھ گیا لیکن اس کے بیٹوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسے عدالت میں کھینچ لائے اور جہاں سوفیکلیز کو اپنے ہی ڈرامے کا مصرعہ دہرانا پڑا:

آدمی اس وقت تک خوش نہیں ہوتا
جب تک اس کا آخری دن نہ آ جائے
وہ سرحد پار نہ کر جائے
جو زندگی کو موت سے الگ کرتی ہے۔

یوری پیڈیز
(Euripides)

480 قبل مسیح کا عظیم یونانی المیہ نگار۔ پہلا ڈرامہ نویس جس نے روایت سے بغاوت کی۔ عام آدمی کو ڈرامے کا ہیرو بنایا۔ ٹالسٹائی کی نظر میں یوری پیڈیز کا ایک ڈرامہ پورے روسی ادب پر بھاری ہے۔

میرا جامِ حیات ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے
میں مرنا چاہتی ہوں
جس سے میں نے محبت کی وہ بے وفا نکلا
اے جیسن ۔ یہ شہر تیرا ہے ۔ یہ گھر تیرے باپ کا ہے
میں بے وطن، نہ ماں، نہ باپ، نہ رشتے دار
میرے چاروں طرف طوفان ہے بچانے والا کوئی نہیں
کاش میری بانہوں میں اتنی طاقت آ جائے
کہ میں جیسن سے انتقام لے سکوں
عورت جنگ سے ڈرتی ہے لیکن وہ کمزور نہیں
اگر مرد بے وفائی کرے تو وہ وحشی بن جاتی ہے
پھر جنت اور دوزخ میں
اس جیسا وحشی ڈھونڈے سے نہیں ملتا

(میڈیا)

یوری پیڈیز

ٹالسٹائی نے یونانی المیہ نگار یوری پیڈیز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ روس کے سارے ادب کو اگر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں یوری پیڈیز کے ڈراموں کو رکھا جائے تو یوری پیڈیز کا پلڑا پھر بھی بھاری رہے گا۔

اپنے عہد میں یوری پیڈیز کو اتنے ہی دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا جتنے دشمن سقراط کے تھے ۔ وہ سقراط کا دوست تھا۔ مشہور کامیڈی رائٹر ارسٹوفینز دونوں کے خلاف تھا۔ اس نے اپنے ڈراموں میں دونوں کو کردار بنا کر انکی تضحیک کی اور یہ ڈرامے پڑھ کر پورا ایتھنز دونوں کے خلاف ہو گیا۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ یوری پیڈیز نے ایک ڈراما ایسا بھی لکھا جس میں ایتھنز کے فوجیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا ۔ ایتھنز کی فوج نے ایک جزیرے پر حملہ کیا تھا فتح کے بعد انہوں نے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا۔ یوری پیڈیز کو یہ بات پسند نہ آئی ۔ اس نے کھل کر اپنے ڈرامے میں اس رویے پر تنقید کی ۔ سکرپٹ جب منظوری کے لیے اس زمانے کے سکرپٹ ڈائریکٹر سولون (Solone) کے پاس منظوری کے لیے گیا تو اس نے یہ ڈرامے کھیلنے کی اجازت نہ دی ۔ یوری پیڈیز نے یہ ڈراما اس جگہ کیا جہاں ایتھنز کی سرحد ختم ہوتی تھی ۔ اور ایتھنز ریاست کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا تھا۔ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لیے صرف ایک تماشائی آیا اور اس کا نام سقراط تھا۔

یوری پیڈیز نے دراصل ٹریجڈی کے روایتی موضوعات سے ہٹ کر ڈرامے لکھے ۔ اسکائی لیس اور سوفیکلیز نے تقریباً اپنے سارے موضوعات دیومالائی کہانیوں سے لیے لیکن یوری پیڈیز نے ٹریجڈی کی بہت سی طے شدہ باتوں سے بغاوت کی ۔ ٹریجڈی میں عام طور پر ڈراما شاہی گھرانوں کے افراد کو ہیرو بنا کر لکھا جاتا تھا مگر یوری پیڈیز نے اپنے کئی ہیرو عام انسانوں میں سے منتخب کیے ۔ مچھیروں اور بستی میں رہنے والے لوگوں کو ایماندار بہادر بنا کر پیش کیا۔ ایتھنز کے لوگوں کو یہ بات پسند نہ تھی چنانچہ یوری پیڈیز سے مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی ۔

یوری پیڈیز عورتوں کے کرداروں میں فطری کمزوریاں اور خامیاں نکال کر ڈرامے میں پیش کرنے کا عادی تھا۔ چنانچہ ایتھنز کی عورتیں اس کے خلاف ہو گئیں اور پورے شہر میں اسے ''بُرا شوہر'' کے نام سے مشہور کر دیا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس نے دو شادیاں کیں اور وہ دونوں سے نبھا نہ کر سکا۔

ارسٹوفینز نے تو ایک ڈرامے میں اسے یوں پیش کیا کہ عورتیں ایک میٹنگ میں اس پر مقدمہ چلاتی ہیں اور پھر اسے موت کی سزا دے دیتی ہیں ۔ اس میٹنگ میں یوری پیڈیز عورتوں کا لباس پہن کر آتا ہے اور عورتیں اسے مارتی ہیں ۔

یوری پیڈیز 480 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ایک مال دار گھرانے سے تھا۔ یہ المیہ نگاری کا آخری بڑا ڈراما نگار تھا۔ اس کا عہد سوفیکلیز کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے 95 ڈرامے لکھے لیکن ان میں سے 19 ڈرامے مل سکے ہیں جن کے نام کچھ یوں ہیں ۔

1)- ALCESTIS

2)- MEDEA

3)- HERACLEIDAE

4)- HIPPOLYTUS

5)- ANDROMACHE

6)- HECUBA

7)- THE SUPPLIANTS

8)- ELECTRA

9)- HERACLES

10)- THE TROJAN WOMEN

11)- IPHIGENIA IN TRURIS

12)- ION

13)- HELEN.

یہ ڈرامے مکمل شکل میں ہیں۔ ان کے علاوہ جو ڈرامے ملتے ہیں وہ ٹکڑوں کی شکل میں ہیں جن کے کچھ حصے وقت اور حالات کی نذر ہو گئے ہیں۔ لیکن ان ٹکڑوں کو دیکھ کر بھی یوری پیڈیز کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

یوری پیڈیز ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ وہ ایتھنز کے اخلاقی نظام اور ان کے مذہبی عقائد کے خلاف تھا۔ اسی لیے اس زمانے کے دانشوروں کے ساتھ اس کے تعلقات نہ بن سکے ٹریجڈی کے نگران جج اس کے خلاف تھے چنانچہ اسے زیادہ انعامات سے بھی نہ نوازا گیا۔ وہ اسے اسکائی لیس اور سوفیکلیز سے چھوٹا ڈرامانگار سمجھتے تھے لیکن آج وہ بعض صفات اور فکری طور پر ان کے برابر اور کبھی کبھی ان سے آگے نکل جاتا ہے۔

یوری پیڈیز ایتھنز کے مذہب اور ان کے خداؤں کے خلاف تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسے دیوتاؤں اور آسمانی خداؤں کے خلاف ہوں جو انسانوں کو دکھ دیتے ہیں اور خود بھی گناہوں اور برائیوں میں ملوث ہیں۔ وہ دیوتاؤں کی ان جنسی حرکتوں کے خلاف تھا جو وہ زمینی عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان ہی حرکتوں کا شاخسانہ تھا کہ یونانیوں کی تاریخ ان ہیروز سے بھری پڑی ہے۔ جن کی ماں زمینی اور باپ آسمانی دیوتا ہیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ یوری پیڈیز نے ایتھنز کے لوگوں کو سوچنے اور کچھ باتوں پر احتجاج کرنے کا شعور بخشا کیونکہ یوری پیڈیز نے جو دیکھا اسے اپنے ڈرامے میں لکھ دیا۔

اس کی اس صفت اور خوبی کا اس کے دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ ارسٹوسوفینز جو اس کا دشمن تھا۔ اسے اپنی تنقید کا نشانہ بناتا تھا اس کے بارے میں کہتا ہے:

"He Thaught the Athenians, to see, understand, suspect, Question, Everything."

یونان کے لوگوں کو دیکھنے، سمجھنے، شک کرنے، سوال کرنے اور ہر چیز کے بارے میں سوچ بچار کرنے والا یوری پیڈیز مقدونیہ کے بادشاہ کی دعوت پر وہاں چلا گیا اور زندگی وہاں گزار دی۔ اس کی موت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رات کو بادشاہ کی دعوت میں شریک ہو کر گھر واپس لوٹ رہا تھا کہ بادشاہ کے شکاری کتوں نے اس پر حملہ کر دیا، وہ زخمی ہو گیا اور

زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ یہ 406 قبل مسیح کی ایک رات کا واقعہ ہے اور اسے مقدونیہ ہی میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی موت کے بعد ایتھنز کے لوگوں کو اس کی عظمت کا احساس ہوا اور اسے ایتھنز میں لا کر دفن کیا گیا۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن

یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

یوری پیڈیز سچائی کا متلاشی تھا۔ اس کے ڈراموں میں کرداروں کو ان کی فطری نفسیات کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اس کے دو ڈراموں (Hippolytus) اور Bacchae میں اس نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ آدمی اپنی مضبوط فطری قوتِ جنس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کی رگ و پے میں رچا ہوا ہے۔ اس سے نگاہیں نہیں چرائی جا سکتیں۔

اپنے عالمی شہرت یافتہ ڈرامے Medea میں وہ عورت کی نفرت اور حسد کے بارے میں بات کرتا ہے۔ جو عورت کی فطرت ہے اور وہ اپنے ہوتے ہوئے اپنی زندگی میں دوسری عورت (سوتن) کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ مرد سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے لیکن مرد اگر اس کے مقابلے میں دوسری عورت کو پسند کرنے لگے تو یہ شدید محبت شدید نفرت میں بدل جاتی ہے۔

یوری پیڈیز نے اپنے ڈراموں میں کرداروں کو ان کی اصل شکل اور حقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اسکائی لیس اور سوفیکلیز سے ہٹ کر اس نے مشہور ہیروز کے اندر چھپی ہوئی نفسیات کو کرید کر ڈراموں میں پیش کیا۔ ان ہیروز میں انسانی کمزوریوں کو تلاش کیا اور انہیں ڈراموں کا حصہ بنایا۔ مثلاً ہیلن کے خاوند (Menelacu) اور خاوند کے بھائی (Agamemnon) کو روایتی انداز سے ہٹ کر تشکیل دیا اور چھوٹی چھوٹی فطری خامیوں کو ان کے کردار کا حصہ بنایا اور انہیں (Anti-Hero) بنا کر تماشائیوں کے سامنے پیش کیا۔ آج کے نقاد کے مطابق اس کی اہم ترین خصوصیت اس کے ڈرامے میں عام آدمی کی شمولیت ہے۔

سوشل اور سماجی مسائل کو ڈرامے میں پیش کرنا یوری پیڈیز کا خاص وصف تھا۔ مثلاً 416 قبل مسیح میں یونانیوں کی ایک جزیرے پر فوج کشی، جزیرے کی بربادی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں پر ان کے ظلم و ستم۔ یہ سب کچھ یوری پیڈیز کے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ یوری پیڈیز نے The Trojan Women میں اسی ڈرامے کو موضوع بنا دیا۔ یہ وہی ڈراما ہے جس کا صرف ایک تماشائی تھا اور وہ سقراط تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ڈراما Hecbua جو ٹرائے کی ملکہ ہے۔ ٹرائے کی شکست اور بربادی کے بعد کے حالات اس ڈرامے میں دکھائے گئے ہیں۔ یونانیوں نے فتح کے بعد ٹرائے کی عورتوں کو کس طرح تقسیم کیا، غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے اپنے حصے میں شامل کیا۔ یہ سب کچھ اس ڈرامے کا حصہ ہے اور اس میں وہ طنز اور تنقید بھی ہے جو یوری پیڈیز یونانی فوجیوں پر کرتا ہے۔

یوری پیڈیز کا ڈراما (Helen) اگرچہ کمزور ڈراما ہے لیکن اس میں یوری پیڈیز نے ہیلن پر لگے سارے الزام دھو دیئے ہیں ہومر (Homer) کی کہانی میں ہیلن کو پیرس کے ساتھ بھاگتے ہوئے دکھایا گیا ہے، لیکن یوری پیڈیز کا خیال ہے کہ جو ہیلن پیرس کے ساتھ بھاگ کر گئی تھی وہ اصلی ہیلن نہ تھی بلکہ ایک بدروح چڑیل تھی اصل ہیلن تو مصر کے ایک مندر میں پجارن بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ جب یونانی فوجیں ٹرائے کو برباد کر کے واپس لوٹ رہی تھیں اور ہیلن کے شوہر کا جہاز مصر کی بندرگاہ پر آ کر لنگر انداز ہوا تو اصلی ہیلن سے اس کی ملاقات ہوئی اور وہ ہیلن یعنی چڑیل جسے وہ ٹرائے سے لیکر واپس آ رہا

تھا وہ غائب ہوگئی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یوری پیڈیز کے ڈراموں میں اس کی ساری ہمدردیاں عورتوں کے ساتھ ہیں۔ اس کے ہاں عورتوں کے کردار بڑی فنکارانہ خوبیوں کے ساتھ تشکیل دیئے گئے ہیں اور پھر بھی ایتھنز کی عورتیں اس کے خلاف تھیں۔ مثلاً میں اپنے اس مضمون میں اس کے دو اور ڈراموں کا حوالہ دوں گا ایک ڈراما (Alcest's) ہے اور دوسرا Ifphigenia ہے۔

Alcestis ڈراما ایک عورت کی وفا اور مرد کی بے وفائی کا قصہ ہے۔ اس ڈرامے میں موت کا فرشتہ بادشاہ کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے۔ بادشاہ بہت سخی اور ہر دل عزیز ہے۔ اپالو انسانی روپ میں اس کا نوکر ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بادشاہ مر جائے (اپالو دیوتا ایک جرم کی سزا بھگت رہا ہے اور اسے یہ سزا دی گئی ہے کہ وہ ایک خاص مدت تک کسی انسان کی ملازمت میں گزارے) چنانچہ وہ موت کے فرشتے سے بادشاہ کی جان بخشی کی سفارش کرتا ہے لیکن موت کا فرشتہ ایسا نہیں کرتا اور تجویز یہ دیتا ہے کہ بادشاہ اپنی ماں، باپ، دوست اور درباریوں کو جان دینے کی درخواست کرتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بجائے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جب وہ سب سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی اس کی بجائے مرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے لیکن وہ یہ شرط عائد کرتی ہے کہ بادشاہ اس کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کرے گا۔ فرشتہ اس کی بیوی کی روح قبضے میں لے کر رخصت ہوتا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں ہرکولیس ظاہر ہوتا ہے اور بادشاہ کی اچھائی اور نیکی کو دیکھ کر وہ فرشتے سے اس کی بیوی کی روح واپس لے آتا ہے۔

دوسرا ڈراما Ifphigenia at Tauris ہے جس میں آگامم نان کی بیٹی یونانیوں کی غیرت اور قومی عزت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن آسمانی دیوتا اسے ایک معجزے کے تحت بچا لیتے ہیں۔ یہ دونوں ڈرامے مردوں کی خود غرضی اور بے وفائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان دونوں ڈراموں میں عورت کی خیرات، بہادری اور وفاداری کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ہیکٹر (Hector) کی بیوی انڈرومائیکی کے بارے میں اسی نام پر لکھا گیا ڈراما اور ہرکولیس نامی ڈرامے میں شہزادی کا کردار جو ہرکولیس سے اس کی بیوی کو مار کر انتقام لیتی ہے۔ دونوں ڈرامے عورت کی وفا اور جرأت کے ڈرامے ہیں۔ عورتوں کے جتنے مضبوط کردار یوری پیڈیز کے ہاں ملتے ہیں اور جس ہنرمندی سے اس نے انہیں (NET) کیا ہے۔ یہ کمال اور ہنرمندی اسکائی لیس اور سوفیکلیز کے ہاں ناپید ہے۔

یوری پیڈیز کا وہ ڈراما جس نے اسے عالمی شہرت سے ہمکنار کیا وہ بھی عورت کے بارے میں ہے اور اس کا مرکزی کردار بھی عورت ہے اس ڈرامے کا نام میڈیا ہے۔

میڈیا ایک جادوگر عورت کی کہانی ہے جو ایک یونانی بہادر جیسن کی موت میں اپنی ساری جادوئی طاقتیں سپرد آتش کر دیتی ہے۔ جیسن کو اپنی مہم میں کامیاب کرانے کے لیے اپنے باپ سے غداری کرتی ہے۔ اسے سونے کی اُون اور موت کو قبضے میں کرنے کے اسرار بتلاتی ہے اور پھر اس کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر کے یونان آ جاتی ہے۔

جیسن یونان واپس آتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرتا ہے کیونکہ سلطنت واپس لینے کی یہی شرط تھی کہ وہ دور دراز علاقے سے موت کو ہل میں جوت کر سونے کی اُون لائے اور یہ دونوں مہمات اس نے میڈیا کی مدد سے سر کر لی تھیں۔ میڈیا کے ہاں دو بچے پیدا ہوتے ہیں اور پھر کہانی میں ایک خطرناک صورتحال پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ جیسن کی بے وفائی ہے۔ جیسن کو بادشاہ کریون یہ لالچ دیتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کرے تو وہ اسے اپنی حکومت میں

بھی حصے دار بنا لے گا۔ میڈیا کو جیسن کی یہ بے وفائی اچھی نہیں لگتی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ کریون میڈیا کو جلاوطن کرنے کی بھی شرط عائد کرتا ہے جس پر جیسن راضی ہو جاتا ہے۔ میڈیا کو اس بات کا بہت دکھ ہوتا ہے اور اس کی محبت شدید نفرت میں بدل جاتی ہے۔ جب اس سازش کی خبر محل میں پہنچتی ہے تو اس کی نوکرانی کہتی ہے:

نوکرانی: مرد اور عورت جب ایک گیت پر تھرکتے ہیں\
تو زخم مندمل ہو جاتے ہیں\
اب ہر طرف نفرت ہے\
جیسن اپنے بچوں اور میڈیا کو چھوڑ رہا ہے\
اور کریون کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے\
جو تخت کی وارث ہے\
میڈیا نے جیسن کی بات سن کر\
اس کی بے وفائی دیکھ کر\
آنکھ نہیں اٹھائی

وہ اداس ہے\
وہ تنہائی میں بیٹھی\
اپنے باپ اور اپنے وطن کو یاد کر رہی ہے\
کہیں وہ اپنے کمرے میں جان نہ دے دے\
جہاں جیسن کا بستر لگا ہوا ہے\
اس نے ایک خنجر چھپا کر رکھا ہے\
کہیں وہ بادشاہ اور دلہن کو قتل نہ کر دے

ادھر کمرے میں میڈیا اداس ہے اور بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ اسے جیسن کے ساتھ گزارا ماضی یاد آ رہا ہے اور وہ پرانی یادوں میں کھوئی ہوئی ہے۔

میڈیا:۔ میرا جام حیات ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے\
میں مرنا چاہتی ہوں\
جس سے میں نے محبت کی وہ بے وفا نکلا\
اے جیسن\
یہ شہر تیرا ہے، یہ گھر تیرے باپ کا ہے\
میں بے وطن، نہ ماں، نہ باپ، نہ رشتے دار\
میرے چاروں طرف طوفان ہے\
بچانے والا کوئی نہیں\
کاش میری بانہوں میں اتنی طاقت آ جائے

کہ میں جیسن سے انتقام لے سکوں

عورت جنگ سے ڈرتی ہے

لیکن وہ کمزور نہیں

اپنی حق تلفی برداشت نہیں کرتی

اگر مرد بے وفائی کرے

تو عورت وحشی بن جاتی ہے

پھر جنت اور دوزخ میں

اس جیسا وحشی ڈھونڈے سے نہیں ملتا

اور پھر میڈیا پر ایک وحشت سوار ہوتی ہے۔اس کی ساری محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔کریون بادشاہ اس سے ملنے کے لیے آتا ہے۔وہ اس سے صرف دو دن کی مہلت مانگتی ہے دو دن کے بعد وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر یہ ملک چھوڑ دے گی۔بادشاہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ کہیں میڈیا اسے اور اس کی بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچادے لیکن میڈیا چال چلتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرونگی۔بادشاہ کے جانے کے بعد جیسن اس سے ملنے کے لیے آتا ہے۔وہ اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔

میڈیا:۔میرے دشمن بے وفا

تجھے میرے پاس آنے کی جرأت کیسے ہوئی

تیری محبت نے مجھے دھوکہ دیا

انسان کی بدترین عادت

بدترین مرض یہ ہے

کہ اسے شرم نہ آئے

میں نے تیری زندگی بچائی

تیرے آرگو(Argo) جہاز کے آدمی گواہ ہیں

اس لمحے جب تجھے ان سانڈوں کے پاس بھیجا گیا

جن کے منہ سے آگ نکلتی تھی

اور تو موت کی زمین جوتنے گیا تھا

میں نے تیری مدد کی

اس قدیم اژدھا کو ختم کیا

جو سنہری اُون کا نگران تھا

اور جس کی آنکھیں نیند سے واقف نہ تھیں

اور تو نے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا

میں تیرے بچوں کی ماں ہوں

کیا عہد اور وعدے اتنے کمزور ہوتے ہیں

جیسن اس کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ وہ شادی کر رہا ہے لیکن وہ شہزادی کے لیے شادی نہیں کر رہا۔سلطنت کی حدود میں وسعت کے لیے شادی کر رہا ہے تاکہ ہمارے بچے بڑے ملک کے وارث بن سکیں۔میں بادشاہ سے کہہ کر تیری جلاوطنی کی سزا معاف کرادوں گا۔میڈیا کے ذہن میں ایک منصوبہ بنتا ہے اور وہ جیسن سے ایک چال چلتی ہے اور اس سے اجازت لیتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کچھ تحفے میں دے کر نئی دلہن کے پاس بھیجے تاکہ دلہن کا دل موم ہو سکے اور وہ اس کی سزا ختم کرا سکے۔جیسن اس بات کی اجازت دیتا ہے اور پھر میڈیا ایک عروسی لباس اپنے بچوں کے ہاتھ نئی دلہن کے پاس بھیجتی ہے۔اس لباس میں میڈیا نے ایک ایسا زہر ملا دیا جو پہننے والے کو پل بھر میں موت کی گود میں لے جائے گا اور جو اسے ہاتھ بھی لگائے گا وہ بھی موت کے منہ میں آجائے گا۔بچے عروسی جوڑا دلہن کو دے کر واپس آتے ہیں۔اس دوران میڈیا نے دیوتاؤں سے ایک اڑن گاڑی رو رو کر مانگ لی تھی جب بچے واپس آتے ہیں تو وہ انہیں کمرے میں لے جاتی ہے اور دل پر پتھر رکھ کر دونوں بچوں کو ختم کر دیتی ہے۔اس دوران جیسن واپس آتا ہے کیونکہ دلہن زہریلا لباس پہن کر مر چکی ہے اس بات کی اطلاع نوکر میڈیا کو دیتا ہے۔

نوکر: دلہن نے لباس زیب تن کیا

فوراً اس کے رخسار زرد پڑ گئے

اس نے چیخ ماری، سفید جھاگ منہ سے نکلنے لگا

وہ زمین پر گر گئی

اب وہ ایک لاش تھی

ہڈیوں سے گوشت جدا ہو رہا تھا

جیسے گوند کے پیڑ سے گوند باہر آ رہا ہو

کوئی نہیں جانتا تھا کہ

شاہی رخسار کہاں تھے۔اس کی آنکھیں کہاں تھیں

اور پھر اس نے دم توڑ دیا

بادشاہ نے ہاتھ لگایا

تو وہ بھی دم توڑ گیا

اب بیٹی اور باپ دونوں ساتھ ساتھ مرے پڑے ہیں

میڈیا بہت خوش تھی، جیسن آیا تو وہ جادو کی گاڑی پر بیٹھی ہوئی تھی اور بچوں کی لاشیں گاڑی میں رکھی ہوئی تھیں۔اس نے جیسن کی گالیاں سن کر دور سے ہاتھ لہرا کر کہا۔

میڈیا:۔تیری ساری فضول باتوں کا ایک ہی جواب ہے

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تو زندگی خوش و خرم گزارے

اور میرا بستر خالی ہو

میں بچوں کو لے جا رہی ہوں

میں انہیں آسمان کی چاردیواری میں دفن کروں گی
تا کہ کوئی ان کی قبر نہ توڑ سکے
میں جارہی ہوں
تُو اپنی نئی دلہن کے پاس جا

یہ کہہ کر میڈیا جیسن کو بے وفائی کی سزا دے کر اپنی جادو کی گاڑی پر آسمانوں کی طرف اُڑ جاتی ہے۔

میڈیا عورت کے انتہائی سخت انتقام کا ایک بہترین ڈراما ہے۔ جیسن ایک مطلب پسند انسان ہے، جوضرورت کے وقت اپنی وفابدلنے کا ماہر ہے۔ اس کے دل میں محبت نام کا کوئی جذبہ نہیں وہ اسے ضرورت کے وقت استعمال کرنے کی چیز سمجھتا ہے۔ میڈیا کا کردار یوری پیڈیز کے کرداروں میں ایک اہم ترین کردار ہے۔ میڈیا محبت کرنے میں بے مثال تھی جب نفرت کرنے پر اتری تو اس نے اس جذبے کو بھی بے مثال بنا دیا۔ یوری پیڈیز نے ان دو کرداروں کے اندر اُتر کر محبت، لالچ، حسد اور انتقام کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ میڈیا ایک ایسی عورت ہے جس نے محبت کے لئے گھر بار چھوڑا باپ، ملک اور رشتے داروں کو ایک شخص کے لیے دھوکا دیا۔ جب اس شخص نے اس سے بے وفائی کی تو وحشی بن کر اس کا گھر اُجاڑ دیا اور خود بھی برباد ہوگئی۔ آج بھی جب اخباروں میں اس عورت کی خبر چھپتی ہے جو خاوند کی بے وفائی سے تنگ آ کر بچوں سمیت دریا میں کود جاتی ہے تو مجھے میڈیا کے زندہ ہونے کا یقین آجاتا ہے۔ ارسطو نے ٹھیک کہا ہے:

''سوفیکلیز اور اسکائی لیس نے اپنے کرداروں میں انسانوں کو ایسا دکھایا جیسا انہیں ہونا چاہیے لیکن یوری پیڈیز نے انہیں ایسا دکھایا جیسے وہ ہیں۔''
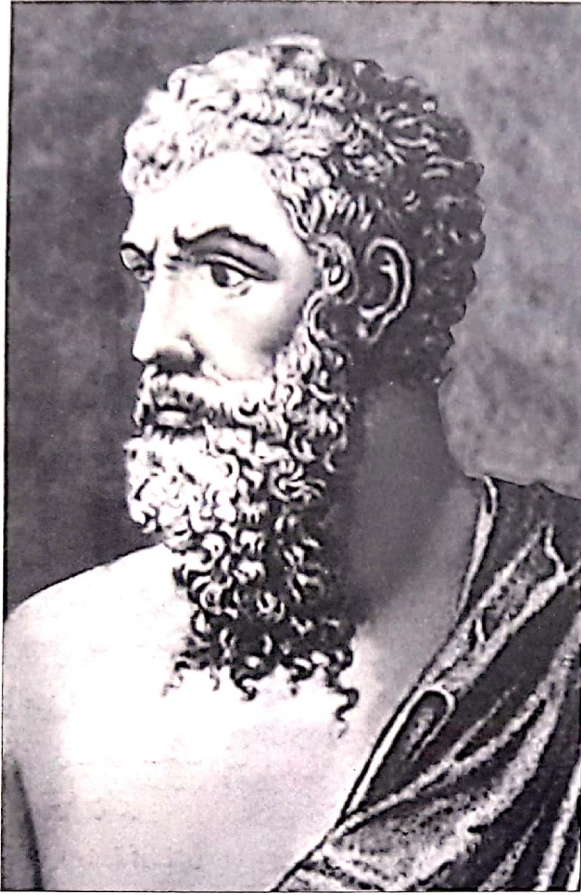
ارسٹوفینیز

(Aristophanes)

448 قبل مسیح کا عظیم طربیہ نگار، جس کے ڈراموں میں یونان کے لوگوں کی حماقتیں، عادات وخصائل، کمزوریاں کردار بن کر چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا طنز نگار تھا۔

عورتوں کی لیڈر:۔

مرد کہتے ہیں سب برائیوں کی جڑ ہم ہیں
عورتیں، جنگ، جھگڑے، قتل وغارت
کا باعث ہم ہیں
ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر ہم
جھگڑالو ہیں، ہم تکلیف دہ ہیں
تو پھر مرد ہمیں حاصل کرنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہیں
ہمیں بیویاں بنا کر گھر میں کیوں رکھتے ہیں
کیوں خواہش مند ہیں کہ ہم مسکرا کر
اُن کا استقبال کریں
اگر ہم کسی سہیلی کے ہاں رات کو رُک جائیں
تو یہ پاگلوں کی طرح ہمیں
جگہ جگہ کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں

ارسٹوفینیز

یوں تو ایتھنز کے تقریباً سارے بااثر لوگ سقراط اور یوری پیڈیز کے خلاف تھے لیکن ان لوگوں میں پیش پیش ارسٹوفینیز تھا جو مشہور طربیہ نگار تھا۔ جس نے اپنے ڈراموں میں سقراط اور یوری پیڈیز کے نظریات کی مخالفت کی بلکہ ان دونوں کو کردار بنا کر ان کا مذاق اڑایا۔ افلاطون کے مکالموں میں بھی ارسٹوفینیز کے کردار سے ہم متعارف ہوتے ہیں جن میں وہ باقاعدہ سقراط کی باتوں کا مذاق اڑاتا نظر آتا ہے اور اپنے تیز جملوں سے سقراط کی گفتگو میں مداخلت کرتا ہے اور کئی بار تو اس نے زیادہ شراب پی کر سقراط کی محفل کو منتشر کرنے کی کوشش بھی کی اور کامیاب بھی رہا۔

ارسٹوفینیز سقراط اور یوری پیڈیز کا ہمعصر تھا۔ ایتھنز کا اہم ترین آدمی۔ ریاست کے امور اور انتظامیہ میں اس کا عمل دخل تھا۔ تحریر اور تقریر میں کمال رکھتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بااثر تھا اس کی بات مانی جاتی تھی اور اس نے سقراط اور خاص طور پر یوری پیڈیز کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ اس کے تیز جملوں اور عملی منصوبوں کا نتیجہ ہی تھا کہ یوری پیڈیز کو ایتھنز چھوڑ کر ساتھ والی ریاست میں جا کر پناہ لینا پڑی اور وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔

یوری پیڈیز کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی سارے محققین یہی کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش 448-B.C میں ایتھنز میں ہوئی اور وہ (388-385, B.C) کے دوران فوت ہوا لیکن کس مقام پر فوت ہوا یہ کسی کو نہیں پتا۔ ارسٹوفینیز کو قدیم کامیڈی کا ایک نمائندہ ڈرامانویس مانا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے طربیہ ڈراموں میں فحش اور جنسی مناظر پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کے ہاں اپنے عہد کی سیاست، روزمرہ کی زندگی اور عصری ادب پر ایک بھرپور طنز بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے ڈراموں میں ایتھنز کی زندگی کے بھرپور نقشے ملتے ہیں، ایتھنز کے لوگوں کی حماقتیں ان کی نفسیات اور عادات وخصائل، ان کی کمزوریاں سب کچھ ان ڈراموں میں موجود ہے۔ فرانسیسی مزاح نگار والٹیئر کا کہنا ہے:

''میں جب ارسٹوفینیز کے طربیہ ڈرامے پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ڈرامے نہیں اس زمانے کا اخبار پڑھ رہا ہوں جس میں ایتھنز کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں''۔

والٹیئر کی ارسٹوفینیز کے بارے میں یہ رائے بالکل درست ہے۔ آپ اس کے کامیڈی ڈرامے اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو ایسا آئینہ دکھائی دے گا جس میں اس عہد کا ایتھنز چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ اس دور کے سیاست دان، جنگ سے متنفر لوگ، جنگ کا رسیا گروہ، ٹیکس کے بوجھ تلے دبے دکان دار، آسمانی فلسفے پر یقین رکھنے والے لوگ، سقراط، اس کے شاگرد، جنس زدہ لوگ، عورتوں کا احتجاج، مذہب کے خلاف احتجاج کرنے والے، ان کا راستہ روکنے والے عورتوں کے رسیا اور مردوں سے بیزار عورتیں۔ یہی وہ سب کردار ہیں جو ارسٹوفینیز کے ڈراموں کو اپنے افعال اور مکالموں سے سنوارتے ہیں۔

کامیڈی یا طربیہ کا آغاز بقول ارسطو جنسی اور فحش گیتوں سے ہوا۔ کامیڈی (Comedy) کا لفظ Kome سے بنا ہے

جس کا مطلب گاؤں یا Village ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ کامیڈی کا تعلق زرخیزی سے ہے۔ دیہاتی جب اپنے کھیتوں میں زرخیزی کے خواہش مند ہوتے تھے اور دیوتاؤں سے ان کی برکت کے طلب گار ہوتے تھے تو انہیں خوش کرنے کے لیے جنسی گیت گاتے تھے اور عورت مرد کے ملاپ کا مظاہرہ کرنے میں بھی گریز نہیں کرتے تھے تاکہ دیوتا خوش ہو کر ان کے کھیتوں پر اپنے کرم کی بارش کر دیں۔

(The Masters of World Drama) کے مصنف کا خیال ہے کہ کامیڈی کا آغاز سومیرین تہذیب (Mesopotamia) کے عبادت خانوں سے ہوا۔ عبادت خانوں کی پجارنیں ہی ان میں کردار ادا کرتی تھیں۔ کامیڈی یونان میں آئی تو اداکاروں نے گدھے، گھوڑے کا روپ دھار لیا۔ جنگل اور چراگاہوں کے دیوتا اور ڈائی یونی سس کو عبادت کا مرکز بنالیا گیا۔ اسے Satrys-Play کا نام دے دیا گیا اور اسے ٹریجڈی کا حصہ بنا دیا گیا۔ سوفیکلیز کے زمانے میں اس سے جنسی اور فحش حصے نکال دیئے گئے اور کامیڈی کا نام دے کر اسے پیش کیا جانے لگا اور شہری زندگی، معاشرتی کمزوریوں، ریاست اور ادب اور ادیبوں کو طنز کا نشانہ بنایا جانے لگا اور پھر کامیڈی باقاعدہ ایک ادبی شاہکار بن کر سامنے آئی۔ اسے یہ مقام دینے والا ارسٹوفینیز تھا۔

ارسٹوفینیز ایتھنز کی چلتی پھرتی زندگی کا طربیہ نگار ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جو ریاست کے لوگوں کے عکس میں دکھاتا ہے۔ اس کا آئینہ سقراط کے آئینے سے بہت مختلف تھا۔ سقراط نے ایتھنز کے لوگوں کی کمزوریوں، عادات و خصائل، عملی اور سیاسی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے ہمیں باخبر کیا۔ ارسٹوفینیز کے طربیہ ڈراموں کو پڑھے بغیر اس زمانے تاریخ مرتب کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

ارسٹوفینیز کا تعلق جنگ مخالف پارٹی سے تھا جو زمینداروں اور کسانوں کی پارٹی تھی اسے جنگ سے سخت نفرت تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ جنگ کے فوبیا میں مبتلا ہو کر کھیتوں کو چھوڑ کر میدان جنگ میں چلے جائیں اور کھیت ویران ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے جنگ کی سخت مخالفت کی۔ اسے سقراط، افلاطون اور یوری پیڈیز جیسے فلسفیوں ادیبوں سے بھی سخت نفرت تھی جو غلاموں اور کمزور لوگوں اور معاشرے کے مظلوم افراد کو حوصلہ اور جرأت مندی کا درس دیتے تھے اور شاید اسی لیے وہ یوری پیڈیز اور سقراط کے خلاف تھا اور انہیں اپنے ڈراموں میں طنز کا نشانہ بناتا تھا۔

ارسٹوفینیز بے حد ذہین، صاحب اسلوب اور قادر الکلام شاعر تھا۔ وہ سقراط جیسے فلسفی اور یوری پیڈیز جیسے عظیم ڈراما نویس کی مخالفت کا اہل تھا، ان دو دیوہیکل دانشوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس ذہانت کی ضرورت ہونا چاہیے وہ اس میں موجود تھی۔ اس نے ایتھنز کے لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ مذہب پر ہونے والے حملوں کو دلائل دے کر روکا۔ جنگ کے مہلک خطرات سے لوگوں کو آگاہ کیا اور اپنے عہد کے لوگوں کی کمزوریوں سے انہیں آگاہ کیا۔ مثلاً اس کے ایک ڈرامے (Wasps) کا آغاز دیکھئے وہ کس انداز سے شہریوں کو ان کی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ کرتا ہے۔ ارسٹو فینیز کے زمانے میں فنکار ڈراما دیکھنے والے لوگوں سے عموماً آگاہ ہوتے تھے۔ آبادی کم ہونے کے سبب وہ لوگوں کے ناموں اور ان کے شجرۂ نسب سے بھی واقف ہوتے تھے۔

ڈراما (Wasps) کا آغاز دو نوکروں کی بات چیت سے ہوتا ہے دونوں اپنے آقا کی خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔

نوکر ا:۔ ہمارے آقا کو ایک عجیب وغریب بیماری لگ گئی ہے۔

نوکر اا:۔ کونسی بیماری ہے وہ۔

نوکر ا: اس کا کسی کو نہیں پتا، تمہی بتاؤ۔

(نوکر اا:۔ تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے

نوکر اا:۔ سامنے (Pronapes) کا بیٹا بیٹھا ہے کہہ رہا ہے اسے جؤا کھیلنے کی بیماری لگ گئی ہے۔

نوکر ا:۔ یہ تو اپنی بیماری بتلا رہا ہے۔

نوکر اا:۔ وہ دیکھو (Sosias) بیٹھا ہے۔ اس کا خیال ہے ہمارا مالک شراب پینے کا عادی ہو گیا ہے۔

نوکر ا:۔ Sosias تو اپنی بیماری اور عادت بتلا رہا ہے۔

اور پھر اسی طرح وہ لوگوں کو ان کی عادات وخصائل بتلاتے رہے۔ جب ڈراما ختم ہوتا ہے دوسرے شو کے تماشائی آتے ہیں تو ڈرامے کے کردار انہیں دیکھ کر نام بدلتے رہتے ہیں اور ان کی کمزوریاں بتلاتے رہتے ہیں اور اس طرح پورے ایتھنز کے لوگوں کی کمزوریاں سامنے آجاتی ہیں۔ والٹیئر نے ایک سچی اور حقیقت پسندانہ کامیڈی کے بارے میں کہا تھا:

"True Comedy is the Speaking Picture of the Follies and Foibles of A Nation."

ارسٹوفینیز کے تمام ڈرامے جو پرانی کامیڈی کے کھاتے میں آتے ہیں۔ والٹیئر کی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں آپ اس کے تمام ڈرامے پڑھ لیں احساس ہوتا ہے جیسے ایتھنز کا کوئی (Comic Paper) پڑھ رہے ہیں اور اس اخبار کی ہر سطر میں ان کے زندگی اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ سیاست دان، شاعر، شہری، مختلف سیاسی شخصیتیں، عورتیں، ووٹر، تاجر، دکاندار، نوکر اور مالک سب کے سب ڈفلی بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سقراط ایتھنز کے شہریوں کو فلسفیانہ دلائل دے کر کم علم اور جاہل ثابت کرتا ہے۔ مقصد ارسٹوفینیز کا بھی یہی خیال ہے لیکن اس کا انداز طنزیہ اور منفرد ہے۔

ارسٹوفینیز کے طربیہ میں اُبھرنے والا ہر کردار ایک مقصد اور ایک نظریئے کو آگے بڑھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ارسٹوفینیز جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے سقراط کی روشن خیالی اور دلائل دینے کی عادت کے خلاف تھا۔ ایتھنز کے لوگوں میں یہ بات بہت عام تھی اور مشہور تھی کہ سقراط دلائل دے کر غلط کو درست اور درست کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔ وہ ہوائی باتیں کرتا ہے جن کا زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ارسٹوفینیز نے اپنے ڈرامے بادل (Cloud) میں سقراط کی ان دونوں باتوں کا نہایت خوبصورتی سے مذاق اُڑایا ہے۔

ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بوڑھے شہری نے ایک آدمی کا قرض دینا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر فلسفے کے سکول میں جاتا ہے تاکہ اس کا بیٹا دلائل دینے کا ہنر سقراط سے سیکھ سکے اور پھر اس آدمی کو دلائل دے کر یہ ثابت کر سکے کہ اس کے باپ نے کوئی قرض وصول نہیں کیا۔ باپ جب بیٹے کو لے کر سکول میں داخل ہوتا ہے۔

(سقراط دو بانسوں کے درمیان ایک ٹوکری میں بیٹھا ہے اور ٹوکری رسوں سے بندھی ہوئی ہے اور رسے دونوں بانسوں سے بندھے ہیں) وہ ایک طالب علم سے پوچھتا ہے۔

باپ:۔ اوپر ٹوکری میں کون بیٹھا ہے۔

طالب علم:۔ وہ خود ہے۔

باپ:۔ وہ خود کون۔

طالب علم:۔ سقراط اور کون۔

باپ:۔ اچھا سقراط، تو پھر اسے آواز دو۔

طالب علم:۔ میں کیوں آواز دوں، تم خود آواز دو۔

باپ:۔ محترم سقراط صاحب۔

سقراط:۔ (ٹوکری سے جھکا سر اٹھا کر کہتا ہے) یہ کس نے مجھے پکارا ہے۔

باپ:۔ تم ٹوکری میں کیا کر رہے ہو۔

سقراط:۔ میں ہوا پر چلتا ہوں
اور سورج کا مشاہدہ کرتا ہوں
اور اعلیٰ خیالات میں گم رہتا ہوں۔
زمین اس قابل نہیں۔
جہاں بیٹھ کر میں سوچ سکوں۔
کیونکہ زمیں میرے خیالات کو
اسی طرح چوس لے گی
جس طرح وہ پانی کو چوس لیتی ہے۔

اپنے بیٹے کو سقراط کے سکول میں داخل کرا کے باپ مزید مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بیٹے کے خیالات میں تبدیلی آ گئی۔ روشن خیالی نے اس کے دماغ میں جگہ بنالی اور وہ باپ کے قدیم خیالات کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ باپ اس کی شکایت کچھ یوں کرتا ہے۔ یہ اقتباس بھی (Clouds) میں سے ہے۔

باپ:۔ میں نے بیٹے سے کہا۔ ذرا ساز اٹھاؤ۔
اور شاعر کا کوئی گیت سناؤ
تاکہ ہمارے کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے۔
اس نے کہا وہ شاعر اب پرانا ہو چکا ہے۔
میں نے ضبط کیا اور اس کے گستاخانہ انداز کو نظر انداز کر کے کہا۔
تو چلو اسکائی لیس کے ڈرامے کا کوئی حصہ سنا دو۔
اس نے کہا۔ ''وہ مجھے پسند نہیں۔
اسکائی لیس ایک ایسا ہوا سے بھرا بیگ ہے
جس سے دھاڑنے کی آواز آتی ہے۔''
اس کی باتیں سن کر میں غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور کہا
تو چلو تم نوجوان جسے پسند کرتے ہو اس کی کوئی چیز سنا دو۔
میرا مطلب ہے یوری پیڈیز۔ جس کے اشعار کوئی

شریف آدمی گنگنانا پسند نہیں کرتا''۔
پھر میں نے غصے میں آ کر اسے مارنا شروع کر دیا۔
جواب میں اس نے مجھے۔ اپنے باپ کو
مار مار کر نڈھال کر دیا۔

بیٹا:۔ بالکل ٹھیک کیا میں نے۔
تم نے سب سے ذہین شاعر کو بُرا بھلا کہا۔
یوری پیڈیز سے اچھا شاعر کون ہے؟
کوئی نہیں۔

سیاسی شخصیتوں اور عبادت گاہوں کے مجاوروں پر ذرا اس کی طنز دیکھیں۔ ڈرامے کا نام (Plutus) ہے۔ ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ ایک نابینا آدمی جا رہا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور اس کا نوکر اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ نوکر اپنے آقا سے پوچھتا ہے کہ ہم ایک اندھے آدمی کا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟

آقا:۔ تم میرے غلاموں میں سب سے ذہین ہو۔
اور سب سے اچھے چور بھی ہو۔
میں ہمیشہ سے ایک مذہبی آدمی رہا ہوں۔
اور ہمیشہ سے مفلس اور غریب ہوں۔

غلام:۔ ہاں ایسا ہی ہے۔

آقا:۔ جب کہ عبادت گاہوں کے پجاری، ڈاکو
اور سیاست میں شامل چور
ہمیشہ دولت مند اور امیر رہے ہیں

....

یہی غلام ڈرامے میں آگے چل کر ایک سیاست دان سے ملتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے۔

ملازم:۔ تم اچھے آدمی ہو، کیا تم محبِ وطن ہو۔

سیاست دان:۔ ہاں اگر اس کا کوئی وجود ہے۔

غلام:۔ تو پھر تم کسان ہو، کھیتی باڑی کرتے ہو۔

سیاست دان: میں پاگل نہیں ہوں کہ یہ کام کروں۔

غلام:۔ تو پھر تم ضرور تجارت کرتے ہو۔ تاجر ہو؟

سیاست دان:۔ کبھی تجارت کرتا تھا مگر اب نہیں۔

غلام: تو پھر تم کیا کاروبار کرتے ہو۔

سیاست دان: کوئی کام نہیں کرتا۔

غلام:۔ تو پھر گزارا کیسے ہوتا ہے۔

سیاست دان:۔اس کا جواب یہ ہے کہ میں حکومت میں سپر وائزر جنرل ہوں۔
میں نجی اور عوامی اداروں کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔
غلام:۔واہ واہ بڑا عہدہ ہے۔اس عہدے کو حاصل کرنے کے تم اہل ہو؟
سیاست دان:۔بالکل نہیں، میں نے چاہا اور یہ مجھے مل گیا۔

ارسٹوفینیز کی ایتھنز کی سماجی اور سماجی مسائل پر بڑی گہری نظر تھی۔مثلاً اس کے زمانے کے ادیب خاص طور پر یوری پیڈیز کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ڈراموں میں عورتوں کے کردار بہت بُرے پیش کئے جاتے ہیں اور عورتوں میں وہ "بُرا شوہر" کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ اس نے تین شادیاں کیں اور وہ تینوں عورتوں سے نبھاہ نہ کر سکا۔

ارسٹوفینیز نے یوری پیڈیز کو مرکزی کردار بنا کر ڈراما لکھا جس میں عورتیں ایک عدالت لگا کر یوری پیڈیز کو موت کی سزا سناتی ہیں۔عورتیں مردوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ڈرامے میں اپنے خیالات پیش کرتی ہیں۔

مرد کہتے ہیں تمام برائیوں کی جڑ ہم ہیں۔
عورتیں:۔جنگ، جھگڑے، قتل و غارت
کا باعث ہم ہیں۔
ہم جھگڑالو ہیں، ہم تکلیف دہ ہیں
زمیں پر سب برائیاں ہم سے ہیں
ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر ہم
برائیوں اور جھگڑوں کا باعث ہیں
تو پھر مرد ہمیں حاصل کرنے کے لیے
اتنے بے تاب کیوں ہیں
ہمیں بیویاں بنا کر گھر میں کیوں رکھتے ہیں
کیوں خواہش مند ہیں کہ ہم
مسکرا کر ان کا استقبال کریں
اگر ہم کسی سہیلی کے ہاں رات کو رُک جائیں
تو یہ پاگلوں کی طرح ہمیں
کیوں جگہ جگہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔"

ارسٹوفینیز اپنے عہد کا اخباری رپورٹر تھا جس نے ہر خبر اپنے ڈراموں میں چھاپ دی۔وہ بے خوف، نڈر اور بے باک ڈراما نگار تھا۔جس کے موضوعات زمین سے تعلق رکھتے تھے۔وہ آسمان سے اُتری شاعری کا قائل نہ تھا اسے وہ شاعر پسند تھے جو شاعری کو آسمانی چیز سمجھتے تھے۔وہ اپنے ایک ڈرامے میں (جس سے میں نے عورتوں کی مثال پیش کی ہے) ان شاعروں پر بھرپور طنز کرتا ہے۔

ڈرامے کے آغاز میں یوری پیڈیز ڈراما نگار آگاتھن کے گھر کے قریب سے گزر رہا ہے۔ جہاں آگاتھن کا ملازم باہر کھڑا اعلان کر رہا ہے۔

ملازم:۔تمام لوگ ہونٹوں کو تالا لگا لیں۔
خاموشی کی حکمرانی جاری ہو
سمندری لہریں خاموش ہو جائیں
ہوا ساکت ہو جائے، جہاں ہے وہاں رُک جائے۔
شاعروں کے دیوتا۔
آگاتھن پر شاعری کی برکتیں نازل ہو رہی ہیں۔
اسی دوران آگاتھن عورتوں کے کپڑے پہن کر گھر سے باہر آتا ہے۔ جسے دیکھ کر یوری پیڈیز کا ساتھی پوچھتا ہے۔
ساتھی:۔تم کون ہو۔
کیا تم مرد ہو......نہیں تم عورت ہو۔
آگاتھن:۔نہیں جناب۔
میں مرد ہوں، شاعر ہوں۔
میں جب عورتوں کے بارے میں شاعری کروں
تو عورتوں کا لباس پہن کر شعر کہتا ہوں۔
اس سے میرے جذبات عورتوں کے جذبات میں ڈھل جاتے ہیں۔ہم شاعر جس جنس کے بارے میں لکھتے ہیں
اس جنس کا روپ دھار لیتے ہیں
اور اس جنس کی نقالی کرتے ہیں۔

....

ارسٹوفینیز ایک قادر الکلام شاعر تھا۔اسے اپنے موضوعات بیان کرنے، اسے شعری اسلوب دینے اور انہیں فنی حسن سے آراستہ کرنے کا فن آتا تھا۔ارسٹوفینیز نے قدیم طربیہ میں آنے والے زمانے کی جدید کامیڈی کے تمام امکانات سمو دیئے۔اگرچہ اس کے ڈراموں میں کچھ ایسے جنسی حصے بھی شامل ہیں جنہیں نقل نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے باوجود اس کے اسلوب اور موضوعات میں اتنی جان ہے کہ وہ آج تک زندہ ہے اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

سقراط

(Socrates)

469 قبل مسیح کا فلسفی جس نے کاغذ پر ایک حرف تک نہیں لکھا لیکن فلسفے کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ سقراط نے فلسفے کی بنیاد رکھی اور فلسفے کی دنیا کو افلاطون جیسا شاگرد دیا۔ جدید فلسفے کی عمارت سقراط کے فلسفے پر کھڑی ہے۔

سقراط

فلسفے کی تاریخ میں ایک فلسفی ایسا گزرا ہے جس نے دل کھول کر باتیں کیں لیکن کاغذ پر ایک حرف نہیں لکھا۔ ہزاروں سالوں سے اس کا ذکر فلسفے کی ہر کتاب میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونان نے اس سے بڑا آدمی پیدا نہیں کیا۔ اس کا نام سقراط ہے اور ایسا سعادت مند شاگرد بھی شاید دنیا میں ایک ہی ہے جس نے اپنے استاد کے ایک ایک حرف کو لکھ کر استاد کو زندہ جاوید بنا دیا اور خود بھی ناموری حاصل کی اور فلسفے کا اہم ترین رکن بن کر وہ کل بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے اس کا نام افلاطون تھا جو سقراط کا شاگرد تھا۔

سقراط 469 قبل مسیح میں یونان کی سب سے ترقی یافتہ ریاست ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس ایتھنز میں جہاں کے لوگ اپنے آپ کو ذہانت کا دکاندار (Shopkeeper of Wisdom) کہتے تھے۔ ایتھنز کا یہ سنہری دور تھا۔ فلسفہ، فنونِ لطیفہ، علم و حکمت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس سنہری دور میں سقراط ایک سنگتراش کے ہاں پیدا ہوا۔ ماں دائی تھی، سقراط بڑے پُرمزاح انداز میں کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی ماں کا کاروبار سنبھال لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو فکر و فہم کی دائی کہا کرتا تھا۔

سقراط نے کسی اکیڈمی میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ نہ اس کا کوئی استاد تھا۔ بس وہ خود ہی چیزوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرتے رہے، وہ لوگوں سے ان کے جواب پوچھتا رہا، سوال در سوال کرتا رہا اور اسی جستجو اور تلاش میں اسے اس کی منزل مل گئی۔ اس کے ذہن میں شروع ہی سے ہر ایک چیز کی وجہ، اس کی ابتدا اور انتہا جاننے کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ کائنات کیا ہے؟ یہ کائنات بنی کیسے؟ انہیں بنانے والا کون ہے؟ ہم کیسے سوچتے ہیں؟ کیا سوچنے کی ساری صلاحیت، خون، ہوا اور آگ میں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات اینکسا گورس نے بھی اٹھائے تھے، جس کا کہنا یہ تھا کہ ساری کائنات عقلِ کل نے بنائی ہے۔ چنانچہ سقراط نے اینکسا گورس کو پڑھنا شروع کر دیا لیکن بعد میں اس سے اختلاف کرنے لگا۔ سقراط کا کہنا یہ تھا کہ وہ ساری کائنات کو عقلِ کل کی تخلیق قرار دیتا ہے لیکن پھر کائنات کو ایتھر اور ہوا کی تخلیق قرار دیتا ہے اور عقلِ کل سے منحرف ہو جاتا ہے۔ سقراط کا یہ کہنا ہے کہ عقلِ کل ہی وجہ تخلیقِ کائنات ہے اور عقلِ کل سے مراد خدا کی ذات ہے۔ سقراط پہلا یونانی فلاسفر تھا جس نے خدا کے ایک ہونے کا تصور دیا۔

(To,Ti) ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''یہ کیا ہے''۔ بس یہی وہ چابی تھی جس سے سقراط نے چیزوں کی اصلیت کا تالا کھولا اور اپنی منزل کو پالیا اور فلسفے کی بنیاد رکھی۔ وہ بنیاد جس پر جدید اور آنے والے فلسفے اور فکر کی عمارت کھڑی ہے۔ سقراط نے سوال کیئے، دلائل دیئے اور انسانوں کو روشنی کی طرف لے گیا۔

سسرو (Cicero) نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے:

"He Brought Philosophy Down from Heaven to Earth"

(''یہ سقراط ہی تھا جو فلسفے کو آسمان سے زمین پر لے آیا۔'')

اس سے مراد شاید یہ ہے کہ سقراط نے اپنے خیالات کی حمایت میں جو دلائل دیئے، جو مثالیں دیں وہ ساری کی ساری

یہ سقراط ہی تھا جو فلسفے کو آسمان سے زمین پر لایا۔

(سسرو)

....

''اسمبلی، احمقوں، معذوروں، ترکھانوں، لوہاروں، دکانداروں اور منافع خوروں پر مشتمل ہے جو ہر وقت سوچتے رہتے ہیں کہ سستی چیز مہنگے داموں کیسے بیچی جائے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عوام کے مسائل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔''

(سقراط)

....

''اے ایتھنز کے لوگو! اب تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور کچھ دن بعد تمہیں احساس ہو گا کہ تم نے ایک عقل مند آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

(سقراط)

....

اگر میں جان بچا کر بھاگ گیا تو مر جاؤں گا۔ اگر زہر پی کر مر گیا تو قیامت تک زندہ رہوں گا۔

(سقراط)

زمینی تھیں، اردگرد کی زندگی سے ان کا تعلق تھا، وہ نظر آتی تھیں چنانچہ جو چیز سامنے ہو، جو نظر آتی ہو، اس پر یقین کرنے میں عقل کو الجھن کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ سقراط کے اردگرد اس کے چاہنے والے نوجوانوں کا ایک حلقہ جمع ہو گیا اور یہی وجہ اس کی موت کا سبب بنی اور اس نے سارے ایتھنز کی مخالفت مول لے لی۔

سقراط نے نوجوانی میں تین جنگوں میں بھی حصہ لیا۔ یونان میں ایک قانون یہ بھی تھا کہ ہر آدمی کو ایک خاص عمر کے بعد فوج میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ سقراط نے جنگ میں شمولیت کی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ اپنے ساتھیوں کی جانیں بچائیں۔ ایک جنگ میں جب سب فوجی شکست کے بعد واپس اپنے گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے اس وقت بھی سقراط اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اس کے ایک ساتھی نے واپس ایتھنز آ کر سب لوگوں کو بتلایا کہ اگر ہمارا ہر فوجی سقراط جیسا ہوتا تو ہمیں جنگ میں شکست نہ ہوتی اور ہماری چھاؤنی تباہ نہ ہوتی۔ سقراط نے صرف تین جنگوں میں حصہ لیا چوتھی جنگ میں وہ شامل نہ ہوا اور اپنے حکمرانوں سے کہا:

''اس جنگ میں ہمیں بہت بھاری شکست ہوگی میرا علم غیب مجھے یہی کہتا ہے''

سقراط کی پیش گوئی پر حکمرانوں نے یقین نہ کیا، یونانیوں کو اس جنگ میں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔

ان جنگوں سے یونانیوں کو کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں لیکن سقراط کو سیدھا راستہ مل گیا۔ اس کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ ایک رات جنگ کے میدان میں جب سب فوجی سو رہے تھے سقراط مشرق کی طرف منہ کر کے ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہا جب سورج نکلا تو اس نے لمبی سانس لی اور کہا:

''میں نے اسے پا لیا ہے'' شاید اس نے عقل کل کو پا لیا تھا اور پھر سقراط نے ایتھنز کی گلیوں اور بازاروں میں اپنے خیالات کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔

سقراط کے حلقہ احباب میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے۔ اگاتھن، السی بائی ڈیز، افلاطون ان میں نمایاں تھے، ان سب میں افلاطون کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، افلاطون اور سقراط کا ملنا ایک معجزہ تھا۔

افلاطون اور سقراط دونوں ایک عرصہ دور دور رہے۔ افلاطون پہلوانی کرتا رہا' ڈرامے لکھتا رہا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا رہا جبکہ سقراط جنگوں میں داد شجاعت لیتا رہا۔ جب وہ جنگ سے واپس آیا تو ایک ماہ تک ایک خواب اسے مسلسل آتا رہا اور وہ یہ تھا کہ ایک سنہری پروں والا پرندہ ایک مخصوص گیت گاتا ہوا اس کے اردگرد چکر لگاتا تھا اس کی چونچ میں ایک پھولوں کا ہار تھا وہ گیت گا کر سقراط کے گلے میں ڈال دیتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ سقراط کو یہ خواب مسلسل ایک کرب میں مبتلا کرتا رہا۔ ایک دن وہ ایتھنز کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے اسے ایک خوبصورت نوجوان آتا دکھائی دیا جو وہی گیت گا رہا تھا جو پرندہ خواب میں گاتا تھا۔ سقراط اس کی طرف بڑھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی یہ ملاقات ایک لافانی رشتے میں بدل گئی۔ اس نوجوان کا نام افلاطون تھا۔ جو استاد کی باتیں سن کر امر ہو گیا اور استاد کی باتیں لکھ کر استاد کو امر کر دیا۔

سقراط نے دو شادیاں کیں۔ پہلی خاتون کا تعلق معزز خاندان سے تھا جس کی ایتھنز میں بڑی حیثیت تھی۔ اس خاتون کا نام میرٹو (Myrto) تھا۔ ایتھنز میں ایک بار پلیگ کی بیماری پھیلی۔ میرٹو چل بسی۔ سقراط نے دوسری شادی 50 سال کی عمر میں کی۔ دوسری خاتون کی سقراط کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ کہتے ہیں وہ بڑی تیز مزاج، غصیلی اور منہ پھٹ تھی۔ سقراط کے سارے جاننے والے یہی کہتے ہیں کہ اس نے سقراط سے سیدھے منہ کبھی بات نہ کی اور سقراط اسکی جلی کٹی باتیں

سن کر ہمیشہ ہنس دیا کرتا تھا۔ اس خاتون کا نام زین تھپی (Xanthippe) تھا، اس نے سقراط کی جھولی میں تین بچے ڈالے اور بے شمار گالیاں......!

ایک بار سقراط کے ایک ساتھی زینسٹس تھینز (Zntisthenes) نے اس سے پوچھا:

''استاد۔ تمہاری بیوی زمانے بھر کی تند مزاج اور منہ پھٹ عورت ہے اس کے ساتھ کیسے گزارا ہوتا ہے۔''

سقراط نے ہنس کر جواب دیا:

''میں اس کے ساتھ لوگوں کو سدھارنے کی تربیت حاصل کر رہا ہوں اگر اسے راہ راست پر لے آیا تو پوری دنیا کو راہ راست پر لے آؤں گا۔''

ایک بار اس نے زین تھپی کے بارے میں کہا:

''میں سرکش گھوڑے پر سواری کر رہا ہوں۔ جو زین تھپی کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے' وہ دنیا میں سب سے نباہ کر سکتا ہے۔'' سقراط نے جب لوگوں سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا تو یونانی اس کے خلاف ہو گئے۔ سقراط نے حکومت اور انتظامیہ پر تنقید کی تو سارے اعلیٰ افسران اس سے نفرت کرنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے ایتھنز کی بیشتر آبادی اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگی۔ ان سب میں پیش پیش اس کے عہد کا سب سے بڑا کامیڈی لکھنے والا ارسٹوفینز (Aristophenes) تھا۔ اس کے جملے کی کاٹ بہت تیز تھی۔ وہ طنز اور مزاح کا بہت بڑا لکھاری تھا اس کی تحریریں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ سقراط کا بڑا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے سقراط کو کردار بنا کر ڈرامے لکھے اور سقراط کے نظریات اور طرز استدلال کا کھل کر مذاق اڑایا۔ اس کے دو ڈرامے (Clouds) اور (Frogs) بہت مشہور ہیں۔

سقراط معمولی شکل وصورت کا مالک تھا بلکہ بدصورت کہنا زیادہ بہتر ہوگا مگر اس بدصورتی میں دنیا کا سارا حسن شامل تھا۔ ایتھنز کے لوگ ظاہری خوبصورتی کے قائل تھے لیکن سقراط جسمانی لحاظ سے بھدا، بے ڈول تھا۔ اس کے دوست اسے مینڈک کہہ کر پکارتے تھے اور پورے ایتھنز میں وہ (Frog Face) کے نام سے مشہور تھا۔ سقراط انہیں یہ سمجھاتا رہا کہ میں باہر سے نہ سہی لیکن اندر سے خوبصورت آدمی ہوں۔

''اگرچہ میری گردن میرے کاندھوں میں دھنسی ہے۔ میری داڑھی بے ترتیب ہے، ناک چپٹی ہے، پیشانی چھوٹی ہے، لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں کیونکہ مجھے دیوتاؤں نے بنایا ہے اور دیوتاؤں کی یہی مرضی تھی۔''

ان خارجی بدصورتیوں کے باوجود اس سے اچھا، نیک اور ذہین آدمی پورے ایتھنز میں کوئی نہ تھا۔ اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ سقراط سے زیادہ نیک، شریف، عالم اور متوازن فکر رکھنے والا آدمی انہوں نے ساری دنیا میں نہیں دیکھا۔ اس کے اندر سچائی تھی۔ اس نے کسی کو تکلیف نہ دی بلکہ دوسروں کی تکلیفیں خود برداشت کیں۔ یہاں تک کہ جب اسے زہر کا پیالہ دیا گیا تو پیالہ دینے والے کی طرف سقراط نے دیکھ کر کہا:

''تم دنیا کے شریف ترین اور نیک ترین آدمی ہو۔''

اور وہ آدمی دیوار کے ساتھ لگ کر زار و قطار رونے لگا۔

سقراط نے جن نظریات کو ایتھنز کے لوگوں میں عام کیا وہ نظریات ایتھنز والوں کو قبول نہ تھے۔ سقراط جب بھی کسی سے بحث کرتا تھا اسے اپنے نظریات سنانے کی دعوت دیتا اور پھر دلائل دے کر ان نظریات کو غلط ثابت کرتا تو وہ سقراط

کے خلاف ہو جاتا تھا' جلد ہی سارا ایتھنز اس کے خلاف ہو گیا۔

سقراط کے بارے میں اس کے شاگردوں کے درمیان یہ بات بڑی مشہور تھی کہ ایک غیبی آواز اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ سقراط کہا کرتا تھا کہ جب بھی وہ کوئی غلط کام کرنے لگتا ہے، غیبی آواز اسے روک دیتی ہے۔ چنانچہ یہی غیبی آواز تھی جس نے مجھے سیاست میں حصہ لینے سے روکا۔ جب مجھے عدالت میں پیش ہونا تھا اور اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کے بارے میں کچھ کہنا تھا تو غیبی آواز نے مجھے عدالت میں جانے سے روکا نہ مجھے تقریر کرنے سے روکا اس کا مطلب ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اسی میں میری بھلائی ہے۔ اس غیبی آواز نے شاگردوں کے انتخاب میں بھی سقراط کی رہنمائی کی اور ایسے شاگردوں کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کرنے سے روکا جو اہل نہ تھے اور پھر اسی غیبی آواز نے اسے لوگوں میں اپنے خیالات عام کرنے کی دعوت کا حکم دیا اور اپنے نفس کی اصلاح کا مشورہ دیا اور بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ روح کی پاکیزگی ہی اصل حیات ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں واضح کیا کہ ہر حکم مجھے غیبی آواز نے دیا ہے جو میرے نزدیک خدا کا درجہ رکھتا ہے اور مختصر الفاظ میں یہ بات سمجھائی:

''چاہے بوڑھا ہو یا جوان، اپنے مال و جسم کو اولین قرار نہ دے بلکہ روح اور نفس کی پاکیزگی کو پہلا مقام دے''۔ اور پھر سقراط نے نیکی، بدی، ذلت، برائی، انصاف، ظلم، ضبط نفس، بہادری، بزدلی، ریاست، سیاست، سیاست دانوں اور سیاسی قیادت کے بارے میں بھرپور انداز میں اپنے نظریات بیان کیے۔

سقراط کے ایک دوست زینوفان نے، سقراط کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

''سقراط ہمیشہ محبت کی زبان استعمال کرتا تھا۔ اس کی نظر کبھی بھی انصاف کی ظاہری خوبصورتی پر نہ تھی۔ وہ ہمیشہ عقلی خوبصورتی کو عزیز رکھتا تھا اور اخلاقی تعلیم ہمیشہ اس کے پیش نظر ہوتی تھی''۔

افلاطون کی مشہور زمانہ کتاب ''ریاست'' میں سقراط کے ان ہی خیالات کی تشریح ہے۔ اس پر آنے والے دنوں میں نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام لگا لیکن اس نے کبھی بھی نوجوانوں کو گمراہی کے رستے پر نہ ڈالا۔ بلکہ یہی درس دیا کہ ''وہ جو بدصورت ہیں، بدصورتی کو اپنی نیکیوں سے دور رکھیں اور جو خوبصورت ہیں وہ اپنی خوبصورتی پر برائیوں کے دھبے نہ پڑنے دیں''۔

سیاست پر اس کے اعتراضات بڑے مدلل تھے۔ حکومت کو درست راستے پر چلانے کا فارمولا آج بھی اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر کامیابی سے رواں دواں ہے۔ سقراط نے سیاست اور سیاسی قیادت کو صاف صاف بتلایا۔

''جب اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے اور اس میں تعمیر اور جہاز رانی کے مسائل پر بحث ہوتی ہے تو ان مسائل کے حل کے لیے انہیں طلب کیا جاتا ہے جو تعمیر اور جہاز رانی کے بارے میں علم رکھتے ہیں لیکن جب حکومت چلانے کا مرحلہ آتا ہے تو ہر اس شخص کو بلا لیا جاتا ہے جو اہل نہیں ہوتا۔ حکومت کا کام اسے سونپ دیا جاتا ہے جو حکومتی اور ریاستی امور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور پھر ریاست کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یہی بات آگے چل کر سقراط نے اسمبلی کے ممبران کے بارے میں بھی کہی۔ سقراط کہتا ہے:

''اسمبلی، احمقوں، معذوروں، ترکھانوں، لوہاروں، دکانداروں اور منافع خوروں پر مشتمل ہے جو ہر وقت یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کیسے سستی چیز مہنگے داموں بیچ کر منافع کمایا جا سکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عوام کے مسائل کے بارے میں ایک دفعہ بھی نہیں سوچا ہو گا''۔ (یہ بات دھیان میں رہے کہ سقراط کے زمانے میں ایتھنز شہر کے دکاندار، تاجر اور

مختلف کاریگر ہی اسمبلی کے ممبر ہوتے تھے اور جب اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا تو تمام شہر کی دکانیں اور بازار بند ہوتے)

ایتھنز کی انتظامیہ نے سقراط کی ان باتوں کو اپنی توہین تصور کیا۔ جگہ جگہ سقراط کے بارے میں سازشوں کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے دوستوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مشہور ڈرامہ نگار یوری پیڈیز سقراط کا بہت قریبی دوست تھا وہ بھی سقراط کی طرح آسمانی دیوتاؤں کے خلاف تھا۔ اس نے سقراط کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہا کہ آسمانی دیوتا اگر برائی کے مرتکب ہوتے ہیں تو میں انہیں دیوتا تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے ایک ڈرامہ (Trojon Women) لکھا' جس میں یونانیوں کی فوجوں کو ایک لڑائی میں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ظلم کرتے اور انہیں زنجیریں پہنا کر غلام بناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ انتظامیہ نے اسے یہ ڈرامہ ایتھنز کی ریاست میں اسٹیج کرنے کی اجازت نہ دی کیونکہ اس میں یونانی فوجیوں پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ یوری پیڈیز نے کہا میں یہ ڈرامہ ہر صورت اسٹیج کروں گا چنانچہ اس نے جہاں ایتھنز کی ریاست کی سرحد ختم ہوتی تھی اور ایتھنز کا قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا تھا وہاں جا کر یہ ڈرامہ اسٹیج کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈرامہ دیکھنے والوں میں صرف ایک آدمی تھا اور اس کا نام سقراط تھا۔

ایتھنز کے لوگوں کو سقراط پر سب سے پہلا اعتراض یہ تھا کہ اس نے نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے۔ سقراط کے مداح زیادہ تر نوجوان لڑکے تھے۔ سقراط نے کھل کر مذہبی دیوتاؤں پر تنقید کی' ایک خدا کا تصور پیش کیا جو ایتھنز کے لوگوں کو بُرا لگا۔ ایتھنز کے روایتی دیوتاؤں پر اعتراضات سقراط کی عادت تھی اور وہ اس عادت کو نہ بدل سکا۔ ایتھنز کی اسمبلی کے فیصلوں پر اس نے کھل کر تنقید کی اور ان قوانین کو للکارا جو انسانی حقوق کے قاتل تھے۔ حکومت اور حکومت سے متعلقہ لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور سقراط کو عدالت میں بلا لیا گیا۔ مقدمہ اس عہد کے ایک شاعر میلی ٹس نے کیا تھا۔ سقراط پر الزامات یہ تھے کہ وہ دیوتاؤں اور مذہبی رسومات کی تذلیل کرتا ہے اور نئی نسل کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے۔ سقراط کا مقدمہ سننے کے لئے 501 ممبران کی جیوری بنائی گئی، پورا ایتھنز یہ مقدمہ سننے کے لئے عدالت میں آیا، اور تو اور سقراط کی بیوی زین تھپی بھی آئی۔ وہ بھی اس کے خیالات سے متفق نہیں تھی اور اکثر یہ کہا کرتی تھی۔

''سقراط جب بھی گھر آتا ہے، سودا سلف لے کر نہیں آتا بدنامی لے کر آتا ہے۔''

عدالت میں سقراط نے ہنس کر اور بڑے سکون سے اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات کو رد کیا۔ اس کے خلاف بولنے والے سب کے سب جھوٹے اور لاعلم تھے اور سقراط نے ان کے جھوٹ کو عدالت میں بے نقاب کیا۔

سقراط نے عدالت میں صاف کہا کہ میں رو کر اور گڑگڑا کر اپنے خلاف عائد الزامات کی تفصیل نہیں دوں گا۔ میں مردانگی اور ہمت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ مرنے سے۔ میرے لئے موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا نام ہے۔ بہت جلد ایتھنز کے لوگوں کو یہ احساس ہوگا کہ انہوں نے ایک دانا، عقل مند اور ذہین شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

سقراط نے عدالت میں کہا کہ وقت بہت تھوڑا ہے۔ اس تھوڑے وقت میں جھوٹ کے اس پلندے کا جواب نہیں دیا جا سکتا، جو مجھ پر لاد دیا گیا ہے۔ میں اگلے جہان دیوتاؤں کے پاس اس امید پر جا رہا ہوں کہ مجھے وہاں انصاف ملے گا، جو مجھے یہاں نہیں مل رہا۔

سقراط کی تعلیمات، جو وہ ایتھنز کی گلیوں میں دیتا پھرتا تھا۔ یا عدالت میں اس کا وہ بیان جو اس نے ان الزامات کو رد کرنے کے لئے دیا جو اس پر لگائے گئے تھے یا جیل میں دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ اس کی گفتگو یہ سب کچھ لافانی

الفاظ میں کی گئی باتیں ہیں۔ سقراط نے عدالت میں صاف صاف کہا کہ یہ سب الزامات بے بنیاد ہیں میں سچی باتیں کرتا ہوں اور سچ مجھے غیبی طاقت نے عطا کیا ہے۔ میں ان چیزوں کی اصلیت کی تلاش میں رہتا ہوں جو آسمانوں کے اوپر اور زمین کے نیچے ہیں اور یہی بات میں دوسروں کو سکھاتا ہوں۔ میں کسی کو کچھ سکھانے کا معاوضہ نہیں لیتا۔ ویسے بھی میں کسی کو کیا تعلیم دے سکتا ہوں۔ مجھے تو خود کچھ نہیں آتا۔ سقراط نے بار بار عدالت میں کہا کہ ایک سلسلے میں میں دوسروں سے زیادہ عقل مند ہوں دوسرے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ وہ کچھ نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

سقراط نے عدالت میں تلاش حقیقت کی کہانی بیان کی اور کہا کہ مجھے حقیقت کی تلاش میں بہت مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ میں سیاست دانوں، المیہ نگاروں اور شاعروں کے پاس گیا۔ شاعروں اور ڈرامہ نگاروں سے میں نے ان کی تخلیقات سمجھنے کی کوشش کی مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہیں خود بھی نہیں پتہ تھا کہ انہوں نے کیا لکھا ہے۔ جب میں نے انہیں ان کی اس کمزوری کا احساس دلایا تو وہ میرے خلاف ہو گئے میں نے باری باری سب لوگوں سے ان کے کام کے بارے میں پوچھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح سب لوگ میرے خلاف ہو گئے۔ سقراط نے مدلل تقریر کی، دلائل دیئے، مگر عدالت پر کوئی اثر نہ ہوا اور کثرت رائے سے سقراط کی سزا' موت تجویز ہوئی۔ سقراط نے یہ فیصلہ سنا اور مسکرا کر کہا:

''اے ایتھنز کے لوگو! اب تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور کچھ دن بعد تم لوگوں کو احساس ہوگا کہ تم نے ایک عقل مند آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے''

اور پھر سقراط نے مسکرا کر جیوری ممبران کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا:

''اب رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اپنے اپنے راستوں کی طرف جا رہے ہیں۔ میں موت کے راستے کی طرف اور تم لوگ زندگی کے راستے کی طرف، کون سا راستہ اچھا اور درست ہے۔ نہ تم جانتے ہو اور نہ میں۔ جاننے والی صرف خدا کی ذات ہے''

سقراط پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس نے خوبصورت نوجوان لڑکوں کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کئے ہیں۔ یہ بھی اس کے دشمنوں کا اس پر او چھا وار تھا، دراصل یونان میں لڑکوں کے ساتھ عشق کی یہ وبا عام تھی، ڈیما میتھنز نے ایک بار کہا تھا:

''مسرت کے لئے ہمارے پاس خوبرو لڑکے ہیں، جسمانی خواہشات کے لئے طوائفیں اور بچے پیدا کرنے کے لئے بیویاں ہیں''

لیکن سقراط کی لڑکوں کے بارے میں رائے مختلف تھی، السی بائیڈیز جو بہت خوبصورت تھا اور ہر وقت سقراط کے ساتھ رہتا تھا۔ لوگوں نے سقراط پر جب اعتراض کیا تو اس نے کہا:

''میں اسے ہر وقت اپنے پاس اس لئے رکھتا ہوں کہ یہ میری صحبت میں اچھا انسان بن جائے''

عدالت میں لوگ سقراط کی باتیں سن رہے تھے جیوری کے 501 ممبران کے ذہن میں فیصلہ موجود تھا۔ سقراط نے ان سے کہا بھی کہ مجھے پتا ہے کہ میلی ٹس کو میرے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی تحریک کس نے دلائی ہے۔ پھر اس نے لوگوں سے کہا کہ ایک دانا اور عقل مند آدمی پر یہ الزامات نہیں لگائے جا سکتے، میں دانا اور عقل مند ہوں اور یہ بات میں نہیں کہتا غیبی طاقت کہتی ہے۔ سقراط نے اپنی بات ثابت کرنے کے لئے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بار

ڈیلفی کے عبادت خانے میں گیا تھا اور بڑی ہمت، جرأت اور عاجزی سے پوچھا تھا کہ کیا پورے ایتھنز میں کوئی مجھ سے زیادہ عقل مند شخص موجود ہے؟ پجارن نے جواب دیا تھا کہ نہیں! ایتھنز تم سے زیادہ عقل مند کوئی شخص نہیں۔ تم سب سے زیادہ عقل مند ہو اور پھر سقراط نے کہا کہ میرا گواہ شیف ران ہے۔ وہ مر گیا ہے لیکن اس کا بھائی عدالت میں موجود ہے۔ وہ گواہی دے سکتا ہے کیونکہ وہ میرے ساتھ تھا۔ میں حاسدوں اور کم عقل لوگوں میں گھر گیا ہوں۔ جو میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ سقراط نے بہت دلائل دیئے لیکن جھوٹ نے سچ کی دلیلوں کو نہ سنا اور سقراط کو زہر کا پیالہ پینے کی سزا دے دی۔

جیل میں روزانہ سقراط کے دوست اس سے ملنے جاتے تھے۔ وہ سقراط کی باتیں سنتے جن میں نیکی، خیر، زندگی اور موت پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ سقراط موت سے بالکل خائف نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ موت میرا جسم فنا کر سکتی ہے میری روح کو نہیں مار سکتی۔ جو آگے سفر پر روانہ ہو جائے گی۔ بقول میر تقی میرؔ:

موت واماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سقراط کے دوستوں نے داروغہ جیل سے ساز باز کی اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سقراط کو جیل سے فرار ہونے میں مدد کرے گا اور سقراط دوسری ریاست میں چلا جائے گا جہاں ایتھنز کا قانون لاگو نہیں ہوتا اور سقراط کی جان بچ جائے گی۔ جب انہوں نے سقراط سے اس بارے میں بات کی تو وہ رضا مند نہیں ہوا اور کہنے لگا۔

''اگر میں جان بچا کر بھاگ گیا تو مر جاؤں گا اور اگر زہر پی کر مر گیا تو قیامت تک زندہ رہوں گا۔''

چنانچہ سقراط نے زہر کا پیالہ پی لیا اور وہ آج تک زندہ ہے۔

سقراط نے زندگی میں اتر کر اسے جاننے کی کوشش کی۔ اس نے ہنر، فن، تخلیق، نیکی، بدی، عدل، انصاف، اچھائی، برائی، ضمیر، مذہب، روح، موت...... خیر، شجاعت، سب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایلسی باڈیز کہا کرتا تھا کہ استاد سقراط دیکھنے میں بن مانس لگتا ہے لیکن اس کے اندر دیوتاؤں کا حسن موجود ہے۔ سقراط نے جو کہا افلاطون نے اپنے مکالموں اور تحریروں میں لکھ دیا اور اس کے خیالات جدید دنیا کے فلسفے کی بنیاد بنے بقول ول ڈیورانٹ۔

"Every School of Social Thought had there, its Representative, and its Origion."

سقراط کی کہانی، اس کی باتیں، اس کی محبت اور سوچ نے کل کو متاثر کیا، آج اس سے متاثر ہے اور آنے والا کل بھی اس سے متاثر ہوگا۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ:

"His Life Story is a Golden Thread in the dark Fabric of the world History."
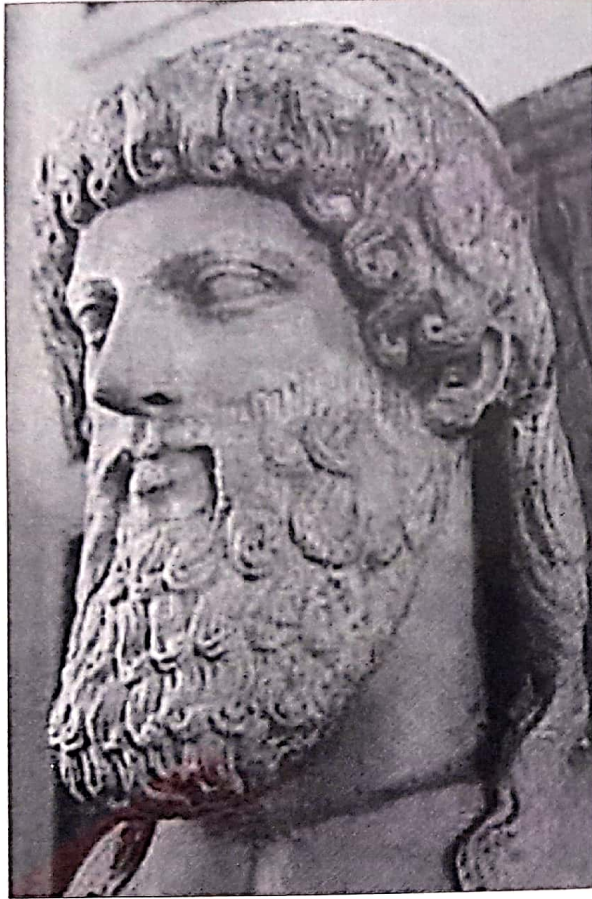
افلاطون

(Plato-Aflatun)

427 قبل مسیح کا فلسفی سقراط کا شاگرد جس نے اپنے استاد کے ایک ایک حرف کو محفوظ کر کے اسے حیاتِ جاوید بخشی اور خود امر ہوگیا۔ ''ریاست'' کا خالق جو فلسفے کی زندہ جاوید کتاب ہے۔

منصف ، نیک اور پاک آدمیوں کی نسل کبھی ختم نہیں ہوتی ۔ بے انصاف لوگ کیچڑ بھرے جوہڑوں میں پھینکیں جائیں گے۔

(افلاطون)

....

اچھا بادشاہ وہ ہے جو انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے ۔اس طرح سیاہ زمین گندم پیدا کرتی ہے۔درخت پھل دیتے ہیں۔بھیڑیں اپنی تعداد میں اضافہ کرتی ہیں اور سمندر مچھلیوں سے بھر جاتے ہیں۔

(افلاطون)

....

موسیقی کردار اور شخصیت پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔نہ صرف روح بلکہ جسم کی کئی بیماریوں کا علاج موسیقی سے ممکن ہے۔

(افلاطون)

افلاطون

افلاطون ایتھنز کے ایک معزز اور امیر گھرانے میں 427 قبل مسیح میں پیدا ہوا ۔ پورے یونان میں افلاطون کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ دیوتا اپالو کا بیٹا ہے۔اپالو نے اس کے باپ ارسٹون(Ariston) کو یہ خوشخبری خواب میں دی تھی اور اس کا نام ارسٹوکلیز رکھا گیا مگر یہ افلاطون کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ اس کا جسم کسرتی، بھرا ہوا تھا اور شانے بہت چوڑے تھے۔ یونانی زبان میں(Plato) کا مطلب بھی چوڑے شانوں والا ہے۔

افلاطون نے ڈرامے لکھے ۔ اپنی شاعری اور ڈراموں میں شعری اسلوب کا شاندار انداز اختیار کیا ۔ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر محفلیں سجائیں،خوب موج میلہ کیا مگر یہ سب کچھ سقراط سے ملنے سے پہلے تک تھا۔ جب اس سے ملا تو پھر اسی کا ہو کر رہ گیا۔سقراط سے اس کی ملاقات بھی ایک ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

ہوا کچھ یوں کہ سقراط طویل مدت سے روز رات کو ایک خواب دیکھ رہا تھا۔خواب یہ تھا کہ ایک ہنس کا خوبصورت بچہ اس کے سر پر منڈلا تا رہتا تھا اس کی چونچ میں پھولوں کا ایک خوبصورت ہار ہوتا۔وہ ہنس ہار سقراط کے گلے میں ڈال دیتا اور پھر ایک مدھر گیت گاتا ہوا غائب ہو جاتا۔سقراط یہ خواب دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتا رہا اور ہنس کے اس بچے سے ملاقات کا اشتیاق دن بدن بڑھتا گیا۔ایک دن وہ ایتھنز کے بازار سے گزر رہا تھا۔ ہنس کے بچے کا گیت اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔اس نے مڑ کر دیکھا، چوڑے شانوں والا افلاطون یہ گیت گنگناتا جا رہا تھا۔سقراط نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر مرتے دم تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔دونوں ایک دوسرے کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دونوں کی دوستی ساری دنیا کے لیے مثال بن گئی۔

سقراط سے مل کر افلاطون نے شاعری چھوڑ دی ،ڈرامے نذر آتش کر دیئے۔ ورزش اور پہلوانی سے کنی کترانے لگا۔ بس وہ تھا اور سقراط۔ دنیا کے سب کام بھول کر رانجھا رانجھا کرتی ہیر خود ہی رانجھا ہو گئی۔ سقراط نے بھی اپنا سب کچھ افلاطون کی یادداشت کی زنبیل میں انڈیل دیا۔اس ہونہار شاگرد نے بھی استاد کی باتوں کو یوں آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ بعد میں آنے والے سب فلسفی،سب دانشور،سب سوچنے والے سقراط ہی کے راستے پر چلنے لگے۔اپنے شاگردوں کے حلقے میں بیٹھ کر سقراط نے بیج بویا۔انصاف کی بات کی ،عدل کا فلسفہ بیان کیا۔حسن کی تعریف کی ۔ بادشاہوں کے فرائض گنوائے ، عام آدمی کی بات کی ۔ معاشرے کو سنوارنے کے گُر بتلائے ، ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا۔جھوٹے کو آئینہ دکھایا،سچائی کا علم بلند کیا۔ایتھنز کے حکمرانوں اور جھوٹے بناوٹی لوگوں کو سقراط کی یہ باتیں پسند نہ آئیں۔انہوں نے سقراط کا گھیراؤ کیا۔ جھوٹے الزامات لگائے اور ایتھنز کے سب جھوٹوں نے مل کر سچ کو زہر کا پیالہ پیش کر دیا۔سقراط نے ہنسے ہنستے زہر پی لیا اور حیاتِ جاوداں پالی۔

افلاطون نے سقراط کے ساتھ بہت وقت گزارا۔ دن رات سایہ بن کر اس کے ساتھ رہا۔بس سقراط کے انہی دو چار گھنٹوں میں افلاطون استاد کے ساتھ نہیں ہوتا تھا جو وہ اپنی لڑاکا بیوی کے پاس گزارتا تھا لیکن وہ گالیاں، وہ لڑائیاں جو

سقراط اور اس کی بیوی کے ساتھ ہوتی تھیں افلاطون ان کی تفصیل کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کر ہی لیتا تھا۔

مرزا غالب کی طرح سقراط کو شاید یقین نہ تھا کہ اس کا شاگرد جو سنے گا کاغذ پر لکھ کر جاوداں بنا دے گا۔ غالب کے شاگردوں نے غالب سے اجازت لے کر اس کے خطوط چھاپے مگر افلاطون نے یہ کام بغیر اجازت کیا۔ ایک بار ایتھنز میں افلاطون نے سقراط کے بارے میں اپنی تحریر کے کچھ حصے سنائے تو سقراط ہنس کر بولا۔

''ہرکولیس کی قسم۔ یہ نوجوان بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔''

افلاطون نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ ساری جوانی اپنے استاد سقراط کے پیروں میں گزار دی۔ سقراط کی موت کے بعد جب خود ادھیڑ عمری کی چھاؤں میں دم لینے کے لیے رکا تو مرتے دم تک اپنے شاگردوں کو پہلو میں بٹھائے رکھا۔ ان کے ساتھ راتیں گزاریں۔ انہیں وہ سب کچھ دیا جو اس نے خود سقراط سے حاصل کیا تھا۔ سقراط نے افلاطون کو تراش کر ہیرا بنا دیا افلاطون نے ارسطو جیسے صاحبِ کمال ذہن کی تربیت کی۔ افلاطون نے استاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن ارسطو نے افلاطون کی ہاں میں ہاں نہ ملائی بلکہ استاد کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اکیڈمی میں بیٹھ کر افلاطون کا لیکچر سنتا جب لیکچر ختم ہو جاتا تو دوستوں میں بیٹھ کر افلاطون کے لیکچر سے خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے خلاف دلائل دیتا۔ ایک بار اکیڈمی کے ایک طالب علم نے افلاطون سے شکایت کی اور کہا۔

''ارسطو ایسا کیوں کرتا ہے۔ آپ کی ہر بات کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

افلاطون نے مسکرا کر ناراض شاگرد کا غصہ ٹھنڈا کیا اور پھر قہقہہ لگا کر کہا۔

''دراصل ارسطو وہ بچھڑا ہے جو اپنی ماں کا سارا دودھ پی کر اب ماں کو دولتیاں مار رہا ہے۔''

افلاطون 80 سال تک بڑی ہنگامہ خیز اور خوشگوار زندگی گزارتا رہا۔ ایتھنز کے لوگ اسے دنیا کا ''پُر وقار بوڑھا'' کے القاب سے پکارتے تھے۔ یہ 347 قبل مسیح کی ایک رات تھی۔ افلاطون کے ایک شاگرد کی شادی تھی۔ افلاطون اس کی شادی میں شریک ہوا۔ ساری تقریب میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ صبح تقریب ختم ہوئی تو شاگرد موج مستی سے فارغ ہو کر جب استاد کی کرسی کی طرف بڑھے تو افلاطون مر چکا تھا۔

سقراط کو جب موت کی سزا سنائی گئی تو افلاطون بیمار تھا۔ بیماری کے باوجود اس نے دوستوں سے مل کر جیل کے داروغہ سے بات چیت کی کہ وہ سقراط کو فرار ہونے کی اجازت دے دے تاکہ وہ ساتھ والی ریاست میں جا کر پناہ لے جہاں ایتھنز کے قانون لاگو نہیں ہوتے لیکن سقراط نے بات نہ مانی اور زہر کا پیالہ پی لیا۔

سقراط کی موت کے بعد ایتھنز کی حکومت کے خلاف افلاطون کی نفرت بڑھ گئی۔ حکومت بھی اس کے خلاف تھی۔ چنانچہ افلاطون ایتھنز چھوڑ کر اٹلی، سسلی اور پھر ہندوستان چلا گیا۔ بقول ول ڈیورانٹ جہاں اس نے گنگا جمنا کے کنارے بیٹھ کر پنڈتوں اور گیانیوں سے علم وفن پر بحث کی۔ بہت کچھ انہیں دیا اور بہت کچھ ان سے حاصل کیا۔ 12 سال کے بعد ایتھنز واپس آیا۔ اکیڈمی قائم کی اور نوجوانوں کو فلسفے کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ زیتون کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنی بے مثال کتاب ریاست (Republic) لکھی۔

افلاطون کا یہ یوٹو پیا شاہکار اپنے مواد اور موضوع کے اعتبار سے فلسفے کی تاریخ کا اہم ستون ہے۔ ہر عہد کے انسان نے اس سے فکری پیاس بجھائی ہے اور فکری ارتقائی عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ فلسفے کی تاریخ میں افلاطون اور ارسطو اہم ترین نام ہیں۔ ان سے پہلے تاریکی اور ان کے بعد روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔

افلاطون کی Republic کو دنیا کی اہم ترین کتاب، فہم وعلم کی چابی اور عالی شان علمی، ذہنی، ڈراما کہا جاتا ہے۔ فلسفیانہ، سوشل، سیاسی، اخلاقی، گزرگاہوں میں شاید یہ پہلا انسانی سفر ہے۔ افلاطون نے اپنی خیالی ریاست کے لیے پہلی بار سماجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پیش کیا ہے۔ اس کے اسلوب کو دنیا کے ہر بڑے دانش ور اور نقاد نے سراہا ہے۔ عدل، حسن، تعلیم، نیکی، قانون، عورت، مرد، شاعری، ڈراما، فنونِ لطیفہ پر افلاطون نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ فلسفے کو بنیاد بنا کر افلاطون نے شاعروں کے انداز میں گفتگو کی ہے۔ افلاطون شاعری کے خلاف ہے۔ وہ شاعری کو نقالی قرار دیتا ہے لیکن شاعری پر اعتراض بھی افلاطون نے شاعرانہ طرزِ اسلوب میں کئے ہیں۔ وہ اپنی خیالی ریاست میں شاعروں کے وجود کو غیر ضروری سمجھتا ہے اور انہیں ریاست سے نکل جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ ملٹن (Milton) نے افلاطون کی اس تجویز پر بہت خوب تبصرہ کیا ہے۔ ملٹن کہتا ہے۔

''افلاطون شاعروں اور ڈراما نگاروں کو ریاست سے نکل جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن اسے سب سے پہلے اس مشورے پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ اس کا اسلوب اور طرزِ نگارش شاعرانہ ہے اور قدم قدم پر ڈرامائی عناصر موجود ہیں۔''

افلاطون کی Republic دس کتابوں یا حصوں میں تقسیم ہے۔ یہ دس مقالے ہیں جنہیں کتاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے (گریٹ ڈائیلا گز آف Plato) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دس کتابیں یا مقالے ہی ہیں جن میں افلاطون نے حسن، عدل، نیکی، خوشی، اخلاق، سیاست اور شاعری پر بحث کی ہے۔

جمہوریہ کی پہلی کتاب میں افلاطون نے عدل وانصاف جیسے آفاقی مسئلے پر بحث کی ہے اور مختلف حوالوں سے عدل اور انصاف کی تعریف کو انفرادیت سے آفاقیت کی طرف پھیلایا ہے۔ اس کتاب کے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

تجارتی انصاف

جنگل کا انصاف

سیاسی طاقت کا انصاف

مکالمہ سقراط کی ایک مذہبی میلے سے واپسی پر شروع ہوتا ہے۔ وہ افلاطون کے بڑے بھائی گلوکن کے ساتھ مذہبی یاترا سے واپس آ رہا تھا کہ پولی مرقس نے اسے اپنے گھر دعوت پر روک لیا اور لالچ سقراط کو یہ دیا کہ بہت سے لوگ موجود ہیں چلو تمہیں بولنے اور بحث کرنے کا موقع ملے گا۔ سقراط جو ازل سے گفتگو اور بحث کا بھوکا تھا اس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا جہاں پولی مرقس کے بوڑھے باپ کفلس کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ گفتگو کا آغاز پولی مرقس کا باپ کفلس بڑھاپے کی افادیت سے کرتا ہے جہاں پہنچ کر آدمی ہر لالچ اور بری خواہشات سے مبرا ہوتا ہے۔

کفلس سقراط کو بڑھاپے کے فوائد بتلاتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑھاپے سے وہ لوگ ڈرتے ہیں جنہوں نے جوانی میں غلط کاریوں سے واسطہ رکھا ہو۔ اگلے جہان میں جانے کا خوف صرف اس شخص کو ہوتا ہے جو اس خیال میں گم رہتا ہے کہ اس نے جوانی میں کس کس سے ناانصافی کی ہے۔ بڑھاپے میں ایسا انسان نیند میں ہڑبڑا کر اٹھتا ہے جیسے بچہ خوفناک خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہاں سقراط اس سے کہتا ہے کہ یہ انصاف کیا ہے؟ کفلس کہتا ہے یہی کہ انسان سچائی اور صداقت کو برقرار رکھے، کسی کا حق نہ مارے اور کسی سے لی ہوئی چیز اسے واپس لوٹا دے۔ جائز فعل اور عدل یہ ہے کہ ہر آدمی کو اسکا حصہ دیا جائے۔ اس کو Good Bussiness Justice کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہاں بیٹھے لوگوں میں بحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور سقراط اس سلسلے کو اپنے سوالوں سے طویل تر کرتا ہے۔ انصاف کی تعریف کا ایک رُخ یہ بھی بنتا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ مضبوط اور طاقتور کے سامنے اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں سے بحث ریاست اور حکمرانوں تک جا نکلتی ہے اور مختلف تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ انصاف اور درست فعل اور عدل کی یہ تعریف ہے کہ جس میں برسر اقتدار طبقے کا فائدہ ہو۔ اقتدار والے جس چیز کو پسند کریں وہی انصاف اور درست ہے۔ قوانین کی ساخت اور تشکیل میں عوام کی رضامندی ضروری نہیں۔ حکمران طبقے کے نزدیک انصاف کے یہ قانون غلاموں اور رعایا کے لیے ہوتے ہیں جسے حکمران طبقہ Slave Morality کہتا ہے۔

ایڈ منیطس انصاف کے حق میں ہومر Homer کی چند سطریں پیش کرتا ہے کہ کس طرح بادشاہ کے انصاف سے ملک اور قوم پھلتی پھولتی ہے۔ صحیح بادشاہ وہ ہے جو دل میں خوف خدا رکھ کر حکومت کرے اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس طرح سیاہ زمین گندم پیدا کرتی ہے، درخت پھل دیتے ہیں، بھیڑیں اپنی تعداد میں اضافہ کرتی ہیں اور سمندر مچھلیوں سے بھرے رہتے ہیں۔

منصف، پاک اور نیک آدمیوں کی نسل کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بے انصاف لوگ، کیچڑ بھرے جوہڑوں میں پھینکے جائیں گے۔

دوسری کتاب سقراط کے اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ معاشرے کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور اس کی تشکیل میں کون کون سے اصول اور عناصر سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ سقراط کا نظریہ یہ ہے کہ اکیلا انسان ایک معاشرے کی تشکیل نہیں کر سکتا۔ وہ خود کفیل نہیں اسے اضافی ضروریات پوری کرنے کیلئے دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ معاشرہ ایک دوسرے کی مدد اور ہم آہنگی سے پروان چڑھتا ہے۔ سقراط اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے معاشرے کے اقتصادی ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو پانچ طبقے مرتب کرتے ہیں:

1۔ تاجر

2۔ کسان

3۔ ملاح یا جہاز ران

4۔ مزدور

5۔ دکاندار

سقراط کے خیال کے مطابق ایک معاشرہ صرف اس لیے تشکیل پاتا ہے کہ انسان خود کفیل نہیں ہوتا۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہم دوسرے لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں اور پھر معاشرہ وجود میں آجاتا ہے چنانچہ ریاست انسانوں کی ضرورت کی پیداوار ہے۔

سقراط کا خیال ہے کہ کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جنہیں ریاست کے شہری پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے بیرون ریاست رابطہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک ایسا طبقہ بھی ہونا چاہیے جو بیرون ملک سے چیزیں لا کر شہریوں کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ یہ کام کرنے والے تاجر یا سوداگر کہلائیں گے۔ سقراط یہاں سے اپنی خیالی ریاست کا تانا بانا شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگ پُرسکون زندگی گزاریں گے۔ فصلیں اگائی جائیں گی۔ موسم گرما میں کم اور سردی کے موسم میں لوگ زیادہ لباس پہنیں گے۔ لوگ روٹیاں اور کیک بنا کر پتوں پر رکھ کر کھائیں گے۔ عبادت کریں گے اور صحت مند زندگی گزاریں گے لیکن

کیونکہ لوگوں کی آبادی بڑھے گی۔ دولت میں اضافہ ہوگا تو جنگ کا خطرہ پیدا ہوگا۔ چنانچہ ایک نئے طبقے کی ضرورت محسوس ہوگی جو سپاہی کہلائیں گے تاکہ وہ ملک کی نگہبانی کر سکیں۔ گلوکن کے سوال کے جواب میں کہ کیا شہری خود نہیں لڑ سکتے۔ سقراط جواب دیتا ہے کہ ریاست میں ایک آدمی صرف ایک کام کرے گا۔ سپاہی کا منصب صرف لڑنا ہے۔ ملکی دفاع ہے جس کے لیے تربیت اور ذہانت ضروری ہے۔

افلاطون کا خیال ہے کہ ''خیالی ریاست'' کی خوشحالی میں لڑائی کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ایک شہر میں ہمیشہ دو شہر ہوتے ہیں۔ ایک امیروں کا شہر، دوسرا غریبوں کا شہر۔ انسان کیونکہ بنیادی طور پر لالچی ہے وہ اس پر جو اس کے پاس ہے مطمئن نہیں ہوتا۔ چنانچہ مزید حاصل کرنے کی ہوس لڑائی کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ تقسیم کی یہ تبدیلی بہت سی تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے محافظوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کا بہتر، ذہین، حوصلہ مند اور فلسفی ہونا لازمی ہے۔ افلاطون نے محافظین کی تربیت کے دو حصے بیان کئے ہیں۔

1- Gymnastic for the body

2- Music for the soul

افلاطون نے موسیقی سے مراد آرٹ، لٹریچر، فلاسفی اور گیت لیا ہے۔ افلاطون نے سب سے پہلے ادب اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بتلایا ہے کہ کس قسم کا ادب اور کس قسم کی شاعری ''خیالی ریاست'' کے لیے ضروری ہیں۔

افلاطون نے تمام فنون لطیفہ کو نقالی قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمام کائنات ہر ذی روح حقیقت عظمیٰ کی نقالی ہیں۔ اگر چارپائی بنانے والا کاریگر چارپائی بناتا ہے تو یہ چارپائی اس کی تخلیق نہیں بلکہ نقل کی نقل ہے۔ اس نے اپنے ذہن سے نقل کر کے اسے بنایا جبکہ چارپائی کا نقشہ جو اس کے ذہن میں ہے وہ بھی اصل نہیں بلکہ خدا نے اس کے ذہن میں مرتب کیا ہے۔ اس لیے اس کی تخلیق اصل سے دو منزلیں دور ہے۔

افلاطون نے Republic میں شاعری پر جو اعتراضات اٹھائے ہیں ان سے بے شک آپ متفق نہ ہوں لیکن ایک بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور وہ یہ کہ اعتراضات پہلی بار کئے گئے ہیں اور اس سے تنقید کا ایک راستہ نظر آیا ہے۔ افلاطون نے تنقید پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی۔ مکالموں میں شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ جس نے اسے پہلے باقاعدہ نقاد کی صورت میں ابھارا ہے ان اعتراضات سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے شاگرد رشید ارسطو نے ان اعتراضات کے جواب میں ایک ایسی کتاب بوطیقا لکھ ماری جو آج تک تنقید کی ایک مستند اور تاریخی دستاویز مانی جاتی ہے۔ اگر افلاطون جھنجھلا کر شاعری پر اعتراض نہ کرتا تو شاید ارسطو بوطیقا نہ لکھتا۔

انسان کی جسمانی اور نفسیاتی صورتحال پر بحث کرتے ہوئے افلاطون کہتا ہے کہ انسانی نفسیات تین دائروں میں گردش کرتی ہے۔

1۔ Desire: ہماری جبلت، فطری خواہش، بھوک اور جنسی طاقت کا منبع ہے اس کا مرکز کمر ہے۔

2۔ Emotions: ان کا تعلق روح، خواہش اور حوصلے سے ہے اور ان کا مسکن دل ہے۔ خون کی گردش اسی کے دم سے چلتی ہے۔

3۔ Knowledege: فکر، دلیل اور ذہانت کو جنم دیتا ہے۔ اس کا مرکز سر ہے لیکن اس کا رابطہ مندرجہ بالا دونوں

چیزوں سے ہے۔ عالم روح اور جنس دونوں کو کنٹرول کرتا ہے۔

پہلی قسم کے انسان جو Desire کے ضمن میں آتے ہیں، مادی دنیا کے کاروبار میں تیز ہوتے ہیں ۔ یہ صنعت اور کاروبار میں کھپ جاتے ہیں۔ Emotions رکھنے والے میدان جنگ میں کارفرما نظر آتے ہیں اور فوجی شعبے میں چلے جاتے ہیں۔ تیسری قسم کے انسان علم اور خیر کے رسیا ہوتے ہیں۔ فکر اور محویت میں مسرت تلاش کرتے ہیں۔ سقراط اب خیالی ریاست کے حکمرانوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تاجر پیشہ لوگ صرف صنعت اور پیداوار کا عمل جاری رکھیں گے۔ حکومت سے ان کا تعلق نہیں ہوگا۔ فوج اور محافظین کا کام صرف سرحدوں کی حفاظت اور بیرونی حملوں سے بچاؤ ہوگا۔ ان کا کام حکومت کے کاموں میں دخل دینا بالکل نہیں۔ حکومت صرف عالم لوگ کریں گے جن کی رہنمائی فلاسفی اور سائنس کرے گی۔ جس طرح علم خواہشات کی رہنمائی کرتا ہے اس طرح لوگوں کے لیے ایک فلسفی رہنما ضروری ہے۔ اسے افلاطون فلسفی بادشاہ کا نام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی طبقے کی حکمرانی کو افلاطون ریاست کی تباہی کا نام دیتا ہے۔ تاجر کا دل دولت کا شیدائی ہے۔ وہ ریاست کے شہریوں کی بھلائی کی بجائے اپنی تجوری بھرے گا اس لیے اس کا حکومت میں آنا سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

افلاطون کا نظریہ ہے کہ فلسفی بادشاہ کا انتخاب ادھیڑ عمر اور نوجوان شہریوں سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں برائیاں گھر کر جاتی ہیں اور باقاعدہ تعلیم و تربیت کا فقدان ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ اس انتخاب کے لیے افلاطون ریاست میں سے دس سال کی عمر تک کے بچوں کو تلاش کرتا ہے تاکہ ان کو والدین کے برے اثر سے بچا کر باقاعدہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کیا جاسکے۔

ان بچوں کی بلاامتیاز تربیت کی جائے گی اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے کیونکہ یہ بالکل نہیں کہا جاسکتا کہ صلاحیت کی روشنی کہاں چھپی ہوئی ہے۔ ان بچوں کے پہلے دس سال کھیلوں اور کھیل کے میدان میں گزریں گے تاکہ جسمانی طور پر یہ نسل مضبوط ہو اور ڈاکٹروں سے چھٹکارا حاصل کرسکے اس تربیت کو افلاطون بے حد ضروری قرار دیتا ہے۔

جسمانی تربیت کے بعد افلاطون اگلے دس سال موسیقی کے لیے مقرر کرتا ہے۔ کیونکہ توانا جسم میں حوصلہ اور جمالیات صرف موسیقی پیدا کرتی ہے۔ افلاطون ''ریاست'' میں صرف کھلاڑیوں اور باڈی بلڈرز کی فوج نہیں چاہتا۔ ان میں جمالیت اور حوصلے کی بیداری بھی چاہتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ موسیقی کے اوزان اور غنائیت روح کے نہاں خانوں میں اتر کر روح کو بیدار اور شگفتہ کرتی ہے اور بقول پروٹا گور موسیقی روح کو پُرشکوہ اور توانا بناتی ہے۔ افلاطون مشہور موسیقی دان Damon کے حوالے سے کہتا ہے کہ موسیقی میں ہونے والی تبدیلیاں ریاست کے بنیادی قوانین میں تبدیلیاں لاتی ہیں۔

افلاطون کا خیال ہے کہ موسیقی کردار اور شخصیت پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔ نہ صرف روح بلکہ جسم کی کئی بیماریوں کا موسیقی سے علاج ممکن ہے۔ Corybaintic کا پادری عورتوں میں ہسٹریا کی بیماری کا علاج بانسری کے میوزک سے کرتا تھا۔ بانسری کی دھن پر وہ ناچتی رہتی تھیں حتیٰ کہ ناچتے ناچتے تھک کر گر جاتیں۔ جب نیند سے بیدار ہوتی تھیں تو ان کی بیماری دور ہو جاتی تھی۔

موسیقی کی تربیت بھی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے جس طرح حد سے بڑھی جسمانی تربیت شہری کو وحشی بناتی ہے موسیقی کا یک طرفہ رجحان شہری کو بے حد یا نرم بنا دے گا۔ چنانچہ 16 سال کی عمر کے بعد میوزک کی تعلیم بند کر دینا چاہیے۔

صرف حمد یہ گیت گانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اب طالب علم کی توجہ علم ہندسہ سائنس اور تاریخ کی طرف دلائی جائے لیکن یہ علوم اس پر زبردستی نہ ٹھونسے جائیں بلکہ طالب علم کا فطری میلان دیکھا جائے۔

افلاطون نے عورت کو مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ اپنی اہلیت کے مطابق وہ ریاست کے ہر عہدے تک پہنچ سکتی ہے۔ اسے صرف ذہانت کے وہ امتحان پاس کرنے ہوں گے جو اس عہدے کے لیے ضروری ہوں گے۔

سقراط نے کسی بھی منصب کے لیے جنس کی شرط عائد نہیں کی بلکہ اس کے لیے اہلیت کو ضروری قرار دیا ہے۔ سقراط دلیل دیتا ہے کہ اگر کتا ریوڑ کی رکھوالی کرسکتا ہے تو کتیا بھی اس کام کو سرانجام دے سکتی ہے۔ گھوڑا چھکڑا کھینچ لیتا ہے تو گھوڑی بھی اس کام میں پیچھے نہیں۔ چنانچہ عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہیں۔ اگر عورت اہل ہے تو اسے اعلیٰ منصب دیا جانا چاہیے۔ اچھی نسل اور توانا قوم کے سلسلے میں افلاطون نے شادی سے پہلے میاں بیوی کا صحت مند ہونا ضروری قرار دیا ہے اور اس کے لیے وہ ہیلتھ سرٹیفکیٹ کی شرط لازمی قرار دیتا ہے۔

افلاطون کا خیال ہے کہ تعلیم، رہن سہن اور شہری آزادی کے سلسلے میں ہر شہری کو جمہوری فضا دستیاب ہوگی۔ ہر شہری اپنی ذہانت سے جو عہدہ چاہے حاصل کر سکے گا۔ ریاست کی نوکریاں ووٹوں کے ذریعے نہیں بلکہ اہلیت کے معیار پر حاصل کی جاسکیں گی لیکن یہ مرحلہ ٹریننگ کے بعد طے ہوگا۔ نچلی سطح کی نوکری پر فائز آدمی تربیت اور ٹریننگ کے بعد بڑی نوکری پر جاسکے گا۔ سفارش کے بل بوتے پر وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا صرف ذہانت اور اہلیت اس کی سب سے بڑی سفارش ہوگی۔

افلاطون نے فرد اور ریاست، دونوں کو اہم قرار دیا ہے۔ دونوں کو وہ ایک دوسرے کا حصہ سمجھتا ہے کیونکہ وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اچھے شہری ہی اچھی حکومت بناتے ہیں جو عناصر کسی فرد کی تباہی کا باعث بنتے ہیں وہی اسباب ریاستوں کے زوال کی وجہ بنتے ہیں۔ افلاطون نے طریق حکومت کی پانچ اقسام بتلائی ہیں:

1۔ اشرافیہ حکومت
2۔ سرداروں کی حکومت
3۔ دولت مندوں کی حکومت
4۔ شخصی یا ڈکٹیٹرشپ
5۔ جمہوریت

اشرافیہ وہ طرز حکومت ہے جسے چند معزز لوگ مل کر چلاتے ہیں۔ یہ سب حکومت کے اہل ہوتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں خرابی کی وجہ سے انہیں زوال آجاتا ہے۔ سرداری حکومت میں حکمران کسی صاحب عزت شخص کا بیٹا ہوگا۔ عقل کی بجائے وہ جذبات کا غلام ہوگا۔ موسیقی اور تقریروں سے لگاؤ رکھے گا۔ ایسا حکمران عموماً کسی بہادر باپ اور فلسفی ذہن کی اولاد ہوتا ہے لیکن عام طور پر اسے یہ گلہ ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے دولت نہیں کمائی۔ چنانچہ ابتدا میں تو وہ دولت سے نفرت کرتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ دولت کا شیدائی ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جو اس کے باپ سے مختلف ہوتے ہیں۔

دولت مندوں کی حکومت کو سقراط Oligrachy کا نام دیتا ہے۔ یہ وہ طرزِ حکومت ہے جس میں دولت مند طبقہ اپنی دولت کے بل بوتے پر حکومت کرتا ہے۔ پرائیویٹ ملکیت کا رجحان بڑھنے لگتا ہے۔ دولت مند طبقہ دن بدن امیر ترین

ہوتا جاتا ہے۔ دولت میں اضافہ کی دوڑ میں ہر حکمران ایک دوسرے سے آگے بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور شہریوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی جائیداد حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ یہ طبقہ انصاف وعدل کی تعریف بھول جاتا ہے اور ریاست کا سارا نظام چند امیروں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔

Democracy میں ہر کوئی آزادی کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے عورت کسی عورت کے خوبصورت فراک کی تعریف کرے۔ سقراط کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں کوئی کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ غلطی ہو جائے تو ہر کوئی اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔ لوٹ مار شروع ہو جاتی ہے اور سب مل کر حصہ بانٹتے ہیں۔

سقراط اپنے دوستوں سے کہتا ہے میرے نزدیک اشرافیہ سب سے بہتر طرز حکومت ہے اور سب سے بدتر ڈکٹیٹر شپ۔ وہ دونوں طرز حکومت کی اچھائیاں اور برائیاں تاریخی امتیاز سے ثابت کرتا ہے چنانچہ وہ مثالی ریاست کے لیے اشرافیہ طرز حکومت یعنی Aristocracy کو لازمی قرار دیتا ہے۔

کتاب کی نویں جلد میں روح اور مسرت کی بحث چھیڑتا ہے۔ سقراط کے نزدیک روح اور مسرت کی تین بنیادی خصوصیات ہیں:

1۔ ایسی روح جو علم کی متلاشی ہے۔

2۔ ایسی روح جو وقار اور عزت کی خواہش مند ہے۔

3۔ ایسی روح جو دولت پسند ہے۔

سقراط پہلی قسم کو اعلیٰ ترین قرار دیتا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ علم کی محبت اور تلاش ہی انسان کو سچی مسرت سے دوچار کرتی ہے۔ علم کی محبت، سچی مسرت کی تلاش ظاہر و باطن میں ہم آہنگی یہی ایک سچے منصف کی تعریف ہے۔ چنانچہ خیالی ریاست میں اسی پر عمل پیرا ہو کر انصاف قائم کیا جا سکتا ہے۔

دسویں جلد افلاطون نے شاعری کی بحث کو چھیڑا ہے لیکن یہاں اس کی زبان شاعروں کے لیے تلخی کم لیے ہوئے ہے۔ وہ 50 سال سے زائد عمر کے شاعروں کو ریاست میں آنے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن شرط یہ عائد کرتا ہے کہ وہ نیک، بااخلاق اور شریف ہوں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اخلاق کے دائرے میں رہ کر شاعری کریں۔

آخر میں سقراط کہتا ہے انسانی صفات کا اصل جوہر انصاف ہے۔ دیوتا منصف انسان کا احترام کرتے ہیں اور دوسری دنیا میں اس کے سواگت کے لیے نعمت و اکرام اس کے منتظر رہتے ہیں۔

ارسطو

(Aristotle)

سکندر اعظم کا استاد، افلاطون کا شاگرد ارسطو، فزکس، زوالوجی، فلسفہ، خطابت، شاعری، تنقید، موسیقی، اخلاقیات، نفسیات، سیاست، رموز سلطنت، سائنس، جمالیات، فلسفہ، علم کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس سے اس کی آشنائی نہ ہو۔

وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حصولِ مسرت کے مواقع نہ دیے جائیں۔

(ارسطو)

....

میرے باپ نے مجھے زندگی دی لیکن ارسطو نے اس زندگی کو اچھا اور بہتر بنانے کا فن سکھایا۔

(سکندر اعظم)

....

کسی عہد کا انسان ارسطو کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(ایس۔ٹی۔کولرج)

....

''ارسطو نے اپنے فکر کی مشعل سے سارے جہان کو روشن کر دیا۔''

(جان ڈرائیڈن)

ارسطو

ایتھنز (Athens) سے اگر آپ جنوب کی طرف چلنا شروع کریں تو 200 میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر آتا ہے، جس کا نام کسی زمانے میں ستا گیریا (Stagiria) تھا۔ ارسطو اسی شہر میں شاہی طبیب نیکو ماکس (Nicomachus) کے گھر پیدا ہوا۔

جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کی ملی جلی خوشبوؤں کی فضا میں سانس لینے والا یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا آدمی ثابت ہوا۔ عظمت اور کارکردگی کی اونچی فصیل پر اس نے اپنے نام کی تختی لٹکائی۔ صدیاں گزر گئی ہیں مگر اس تختی پر لکھے اس کے نام کے حروف اب بھی ستاروں کی طرح روشن اور تابندہ ہیں۔ انسانی علم کی وہ کونسی شاخ ہے جس پر اس کے نام کا پھول نہیں مہک رہا۔ فزکس، بیالوجی، زوالوجی، فلسفہ، خطابت، شاعری، تنقید، موسیقی، ڈراما، تھیٹر، اخلاقیات، نفسیات، سیاست، رموزِ سلطنت، سائنس، جمالیات غرض ''چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی''۔

تین چراغ ایک دوسرے سے روشنی لے کر روشن ہوئے اور اب تک روشن ہیں۔ سقراط، افلاطون کا استاد تھا، افلاطون نے یہی علم سقراط سے لے کر ارسطو کو دیا اور پھر تینوں نے یہ علم وہنر انسانی نسلوں کو منتقل کیا۔ ان کا فیض قیامت تک آنے والی نسلوں میں جاری رہے گا۔

ارسطو کا باپ مقدونیہ کے بادشاہ Amyntas کے دربار سے منسلک تھا Amyntas فلپ کا باپ اور سکندر اعظم کا دادا تھا)۔ ارسطو کی پرورش بڑے شاہانہ انداز میں ہوئی۔ 18 سال کی عمر میں اسے ایتھنز میں افلاطون کی اکیڈمی میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔ افلاطون کی تربیت نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ ارسطو بہت ذہین تھا۔ افلاطون اسے اپنی اکیڈمی کا ''موتی'' کہا کرتا تھا۔ ارسطو کو اپنے استاد کے چند نظریات سے اختلاف بھی تھا، جس کا وہ دبے دبے الفاظ میں کبھی کبھی اظہار بھی کیا کرتا تھا، افلاطون ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ افلاطون کا ایک فقرہ تو ایتھنز کی گلیوں میں بہت مشہور بھی ہوا تھا:

''ارسطو وہ بچھڑا ہے جو ماں کا سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے''

واقعہ یوں ہے کہ افلاطون سے ایک بار ایک طالب علم نے ارسطو کی شکایت کی اور کہا کہ ارسطو اس کے کچھ نظریات کا مذاق اڑاتا ہے اور سر عام کہتا ہے:

''افلاطون کے مرنے سے فلسفہ مر نہیں جائے گا''

افلاطون نے شاگرد کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور کہا:

''اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل ارسطو وہ بچھڑا ہے جو ماں کا سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے۔''

بچھڑا ماں کو دولتیاں مارتا رہا۔ ماں ہنس ہنس کر بچھڑے کی دولتیاں برداشت کرتی اور پیار سے دیکھتی رہی۔ ارسطو افلاطون کے پاس 20 سال تک رہا۔ جب 347 قبل مسیح میں افلاطون فوت ہوا تو ارسطو نے اپنے استاد کی قبر کا کتبہ

لکھا۔ بعد ازاں وہ اپنے دوست اور افلاطون کے ایک شاگرد ہرمیاس کے پاس ایشیائے کوچک کی ایک ریاست Atarneus چلا گیا۔ ہرمیاس اس ریاست کا بادشاہ تھا۔ یہ وہی ہرمیاس ہے جس نے افلاطون کو اپنے پاس بلایا تھا اور پیش کش کی تھی کہ افلاطون ریاست کو اپنی مثالی ریاست (Republic) کے مطابق چلائے۔ افلاطون وہاں گیا لیکن ناکام واپس لوٹا۔

ارسطو تھیوفراسٹس (Theophratus) کے ساتھ جزیرہ Lesbos بھی گیا۔ وہاں زوالوجی اور باٹنی کے بے شمار تجزیے کیے۔ واپس آ کر ہرمیاس کی بھتیجی پیتھیاس (Pythisas) کے ساتھ شادی کی اور ہرمیاس کی موت تک وہاں تجربات میں مشغول رہا اور خوشحال زندگی بسر کرتا رہا۔ 343 قبل مسیح کے ابتدائی دنوں میں اسے مقدونیہ کے بادشاہ فلپ دوئم کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ خط کی تحریر کچھ یوں تھی:

''فلپ دوئم کی طرف سے ارسطو کو سلام۔

آپ کی اطلاع کے لیے تحریر ہے کہ دیوتاؤں نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا ہے۔ میں دیوتاؤں کا شکر گزار ہوں۔ اس بات پر نہیں کہ مجھے بیٹا عطا ہوا بلکہ اس پر کہ وہ آپ کے زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپکی تربیت اور رہنمائی میں ایک بہتر اور اچھا بادشاہ ثابت ہوگا''۔

ایک فلاسفر کو ایک بادشاہ کا یہ خط فلاسفر کی عظمت کا اعتراف تھا۔ ارسطو نے اس دعوت نامے کو قبول کیا اور فلپ دوئم کے بیٹے سکندر اعظم کا اتالیق بننا منظور کر لیا۔ ارسطو کی عمر اس وقت 30 سال تھی۔

ارسطو چند سال اپنی تجربہ گاہ میں تجربات کرتا رہا اور پھر اسے دربار سے سکندر کی باقاعدہ تربیت کا بلاوا آ گیا۔ ارسطو کو سکندر کی پیدائش پر فلپ سے کیا ہوا وعدہ نبھانا پڑا اور وہ مقدونیہ چلا گیا۔ ایک مصنف نے بادشاہ اور فلسفی کے اس بندھن کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس ملاپ اور بندھن سے دو باتیں سامنے آئیں۔ بادشاہ کا بیٹا طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور پوری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ فلسفی انسانی دماغ کے سامنے فکر وخیال کی ایک نئی دنیا دریافت کرنا چاہتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں کامیاب رہے۔''

ارسطو نے مقدونیہ جا کر Pellas کے قریب Mifza کے مقام پر اپنا سکول قائم کر لیا اور درختوں کے جھنڈ میں سکندر اور دیگر امیر آدمیوں کے بیٹوں کو تعلیم دینے لگا۔ سب ارسطو کی پتھریلی نشست کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کی گفتگو سن کر حیران ہوتے رہتے۔ ارسطو دنیا بھر کے علوم اور مسائل کی گرہیں کھولتا رہتا اور نوجوان مستفید ہوتے رہتے۔ نہ استاد روائتی انداز میں پڑھاتا تھا اور نہ شاگرد روائتی انداز میں پڑھنے کے عادی تھے۔ سکندر استاد کی باتیں سن سن کر بڑا عقل مند ہو گیا تھا اور اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔

ایک دن ارسطو نے اپنے ایک شاگرد سے پوچھا:

''بادشاہ بننے کے بعد اگر تم کچھ مسائل میں گھر جاؤ اور تخت کو کچھ خطرات کا سامنا درپیش ہو تو تم کیا کرو گے۔''

شاگرد نے جواب دیا:

''میں بزرگ اور تجربہ کار درباریوں سے مشورے لے کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

دو ایک شاگردوں نے بھی کچھ ایسے ہی جوابات دیئے۔ جب ارسطو نے یہی سوال سکندر سے کیا تو اس نے جواباً کہا:

''میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کوئی دوسرا آدمی دے سکتا ہے۔ جب ایسا وقت آ جائے تو اس سوال کا جواب میں حالات کے مطابق دوں گا۔ پتا نہیں حالات کیا ہوں اور خطرات کیا۔''

ارسطو نے سکندر کو بادشاہی رموز اور درباری صورتحال سے نمٹنے کے گر سکھائے۔ علم و فلسفے کی مسرت سے اسے آگاہی دی۔ سکندر کے دل میں عظیم یونانی شاعر ہومر (Homer) کی محبت کے بیج بوئے۔ سکندر ساری عمر ہومر کی عظمت کا قائل رہا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر جب بھی کسی فوجی مہم پر جاتا تو ہومر کی دونوں کتابیں (ایلیڈ اور اوڈیسی) بکس میں اپنے ساتھ رکھتا اور اپنی فوجوں کو میدان جنگ میں اسی طرح ترتیب دیتا تھا جس طرح ہومر نے یونانی فوجوں کو ٹرائے کی جنگ میں دکھایا تھا۔

سکندر کے والد فلپ نے ارسطو کی بہت عزت کی۔ سٹاگیریا کا شہر (جو کسی پرانے بادشاہ نے حملہ کر کے برباد کر دیا تھا) از سر نو تعمیر کرایا اور وہاں کے لوگوں کو عزت اور خوشحالی کی بے بہا دولت بخشی۔

سکندر جب سکندر اعظم بن گیا تب بھی ارسطو کے احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا:

''میرے باپ نے مجھے زندگی دی ہے لیکن ارسطو نے مجھے اس زندگی کو اچھا اور بہتر بنانے کا فن سکھایا ہے''

ارسطو جب اپنی 40 میل لمبی تجربہ گاہ میں جانوروں، مویشیوں، پرندوں، مچھلیوں اور وحشی جانوروں کی عادات وخصائل پر تجربے کر رہا تھا تو سکندر نے دو ہزار آدمیوں کو ارسطو کی حفاظت میں دے دیا تھا تا کہ وہ ارسطو کا ہاتھ بٹا سکیں۔ سکندر نے ارسطو کو بے پناہ دولت اور قیمتی تحائف سے نوازا۔ جس ملک کو فتح کیا، وہاں کے نایاب اور قیمتی مسودے اور کتابیں اکٹھی کر کے ارسطو کی خدمت میں پیش کیں، جن تک رسائی ارسطو کے بس میں نہ تھی۔

جب سکندر ایشیا فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا تو ارسطو ایتھنز چلا آیا اور وہاں اپنا سکول Lyceum قائم کر لیا۔ علم کے پیاسے جوق در جوق اس سکول کی طرف آنے لگے۔ ارسطو نے 12 سال تک Lyceum میں مختلف علوم کی تدریس کا کام جاری رکھا اور وسیع پیمانے پر ایسے مسودے اور مقالے لکھے جو طالب علموں کے لیے بھی مددگار ثابت ہوئے اور اس کے بعد آنے والی نسلوں نے بھی اس سے استفادہ کیا اور آج تک کر رہی ہے۔ ان علوم میں

1) Physics 2) Metaphyscis 3) Politics
4) De Anima (on the soul) 5) Poetics

شامل ہیں۔ فزیکل سائنس میں ارسطو نے

1) Anatomy 2) Astronomy 3) Embryology 4) Geography
5) Geology 6) Meteorology 7) Physics 8) Zoology

کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں

1) Philosophy 2) Ethics 3) Politics 4) Metaphysics
5) Economics 6) Psychology 7) Theology 8) Rhetoric

پر رسائل اور کتابیں لکھیں۔ ارسطو نے تمام علوم پر مباحث کیے، لیکچر دیئے، مسودات مرتب کیے۔ اس کے علاوہ اس نے رسومات، ادب اور شاعری پر مقالے بھی لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ ارسطو شاید واحد آدمی تھا جس نے ہر وہ علم حاصل کیا جو اس کے عہد میں موجود تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے عہد میں جاری اور موجود علم کو حاصل کیا بلکہ اس نے اس علم میں

اضافہ کر کے اسے وسیع کیا اور آگے بڑھایا۔

سکندر اعظم اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ارسطو کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید ارسطو اس کے مخالف گروپ میں شامل ہو گیا ہے۔ سکندر نے ارسطو کو خطوط لکھ کر اس بات کا اظہار بھی کیا تھا۔ سکندر کے پاس شاید اس کا ثبوت بھی موجود تھا۔ اور وہ ثبوت ارسطو کا بھتیجا کالیستھینز (Callisthenes) تھا، جسے سکندر نے غداری کے جرم میں موت کی سزا دے دی تھی۔ ایک اڑتی ہوئی خبر یہ بھی تھی کہ سکندر کی موت کے پیچھے ارسطو کا ہاتھ بھی شامل تھا، لیکن اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

سکندر کے خلاف ایک گروپ سرگرم عمل تھا اور اس کی سرگرمیاں سکندر کے مقدونیہ سے غائب رہنے کی وجہ سے اور تیز ہو گئی تھیں۔ یہ گروپ سکندر کی خاص عنایات کی وجہ سے ارسطو کے بھی خلاف تھا۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد مقدونیہ اور ایتھنز میں یہ گروہ اور مشتعل ہو گیا۔ ارسطو نے حالات کا جائزہ لیا اور ایتھنز چھوڑ کر اپنی والدہ کے شہر چلا گیا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا:

''میں ایتھنز کے لوگوں کے ہاتھوں فلسفے کو دوبارہ موت کے گھاٹ نہیں اترنے دوں گا۔''

پہلی بار وہ سقراط کے ساتھ یہ سلوک کر چکے تھے۔ ارسطو نے ایتھنز سے بھاگ کر Euboea میں پناہ لی۔ چند روز بیماری میں مبتلا رہا اور 322 قبل مسیح میں فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک شاگرد کو وصیت کی کہ مجھے میری بیوی کے پہلو میں دفنایا جائے۔

ارسطو کے علمی، تحقیقی اور تجرباتی کارنامے قابل رشک ہیں۔ ارسطو نے 147 تحقیقی مقالے، رسالے یا کتابیں لکھیں۔ جن میں سے صرف 47 اب لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ یوں تو ارسطو کا ہر مقالہ اس کی تحقیقی کارکردگی کی ایک اعلیٰ مثال ہے مگر Organon ، on the soul ، Metaphysics اور Topics بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں منطق، بیالوجی اور نفسیات کے بارے میں اس کے خیالات سے زمانہ اب تک مستفیض ہو رہا ہے۔ اس کا رسالہ Poetics دنیائے ادب میں تنقید کی پہلی کتاب ثابت ہوئی۔ جدید زمانے کی تنقید اب تک اسی کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ مشہور انگریز دانشور جان ڈرائیڈن Jhon Dryden نے ارسطو کی عظمت کو ایک فقرے میں یوں قلم بند کیا ہے:

He Made his Torch Universal Light

ارسطو کی مشعل نے ایسی عالم گیر روشنی کا روپ دھارا کہ صدیوں سے زمانہ اس کے خیالات کی چاندنی میں اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ Thompson کہتا ہے:

"For Two Thousand Years and Through out All Lands Men Have Come to Aristotle, and Found in Him Information and Instructions That Which they Desired."

(Lesbos) جزیرے میں ارسطو نے بہت کام کیا۔ انسان کو چھوڑ کر پرندوں، جانوروں اور مچھلیوں پر تجربے کیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے صرف آدمی کے جسم کو نہیں کھولا ورنہ ہر جانور اور پرندے کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا ہے۔ ارسطو کے جانوروں اور پرندوں پر تجربہ بہت کامیاب رہے۔ اس نے

1) History of Animals

2) Generations of Animals.

3) Parts of Animals

لکھ کر آنے والی انسانی نسلوں کے لیے کام بہت آسان کر دیا۔ سمندری جانوروں کی زندگی پر اس کے تجربے بہت کامیاب رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ لکھ کر اپنے وقت سے دو ہزار سال پہلے تحقیق کا ڈول ڈالا۔ انیسویں صدی تک تحقیق اسی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں چلتی رہی۔ اس نے

1) Cat Fish 2) Electric Fish

3) Torpedo 4) Angler Fish

5) Octopus 6) Sepia (Cuttle Fish)

کے بارے میں بنیادی اطلاعات فراہم کیں اور ان پر تجربے کیے۔ اس کے علاوہ اس نے زندہ رہنے والی اشیا کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا اور Animals with Blood اور Animals without blood کے خانوں میں تقسیم کیا۔ جدید سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ارسطو کے ہاں تحقیق کی کچھ اغلاط پائی جاتی ہیں لیکن اس کی بنیادی تحقیق سے انکار ممکن نہیں۔

عملی فلسفے میں ارسطو کا کام بہت اہم نوعیت کا ہے۔ اس نے آدمی، ریاست اور شہری زندگی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (Politics) میں وہ ریاست، حکومت، انسان اور معاشرے کے باہمی تعلق پر اپنے خیالات کا کھل کر جائزہ لیتا ہے۔ وہ شہری زندگی اور آدمی کے تعلق کو ایک باہمی اشتراک قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اشتراک ایک نیک عمل کی خاطر ہے تاکہ آدمی اچھی اور بہتر زندگی گزار سکے۔

فرد اور ریاست یا شہر کا یہ اشتراک اچھے کاموں کے لئے ہونا چاہیے۔ صرف اکٹھے اور مل جل کر رہنے کے لئے نہیں۔ یہ معاہدہ عمرانی موت کے خوف سے بھی کیا جاتا ہے اور ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شہری یا فرد کی زندگی کی حفاظت کرے۔

افلاطون عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیتا ہے جبکہ ارسطو کا خیال ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ عورتیں شہری زندگی میں مردوں جتنا کام نہیں کرتیں جبکہ افلاطون کا خیال ہے کہ اگر گھوڑا چھکڑا کھینچ سکتا ہے تو گھوڑی بھی چھکڑا کھینچنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ارسطو مسرت کے حصول میں عورتوں کو مردوں کے برابر جگہ دیتا ہے اور کہتا ہے:

''وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حصول مسرت کے مواقع نہ دیے جائیں''

اپنی کتاب RHETORIC میں وہ سپارٹا کی مثال دے کر کہتا ہے کہ سپارٹا کا معاشرہ اس لیے ترقی نہیں کر سکا کہ وہاں عورتوں کی حالت مردوں کے مقابلے میں بہت بدتر ہے اور عورتیں بدحالی میں جی رہی ہیں۔

ارسطو کے تحقیقی کاموں کا جائزہ بے حد مشکل کام ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو ارسطو کا کام اتنا وسیع ہے کہ آدمی دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے جبکہ دوسری وجہ ان علوم کے حوالے سے لاعلمی ہے جن پر ارسطو نے تحقیق کی۔ میں عاجز اور بے بس ہوں کیونکہ ان علوم سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے ایک عمر چاہیے۔ میں نے ارسطو کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دانا اور عقل مند آدمی کی بات پر عمل کیا ہے اس نے کہا تھا:

''کتاب سے جھگڑا مت کرو کتاب پڑھتے ہوئے الجھن میں مت پڑو۔ کتنی سمجھ میں آئی ہے سنبھال لو۔''

میں نے بھی یہی کیا ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ارسطو کو پڑھا اور جتنا ہو سکا یادداشت میں سنبھال کر رکھ لیا۔

ارسطو کی ایک کتاب (Poetics) تنقید کی بہت اعلیٰ اور مستند کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو تنقیدی نظام کی پہلی کتاب ثابت ہوئی۔ تنقیدی نظریات کی پرچھائیاں ہومر Homer کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ تنقیدی اشارے افلاطون کے مکالموں میں بھی ملتے ہیں مگر باقاعدہ تنقیدی نظام ان دونوں کے ہاں نہیں ہے۔ اس باقاعدہ نظام کی بنیاد ارسطو نے بوطیقا (Poetics) لکھ کر رکھی اور بعد میں آنے والوں نقادوں نے اس بنیاد پر اپنے اپنے محلات بنائے اور سرخرو ہوئے۔

ارسطو کا تنقید شعر پر لکھا ہوا یہ مقالہ جس کا نام اس نے Concering the art of poetry رکھا تھا۔ دراصل یہ مقالہ اس نے اپنے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے لکھا تھا۔ نقادوں کی نظر میں یہ نامکمل اور ادھورا مقالہ ہے۔ ارسطو نے اس میں کچھ باتوں کو مکمل لکھا ہے۔ کچھ پر سرسری بات کی ہے اور کچھ کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی دوسری دو کتابوں (RHETORIC) اور (politics) کے مقابلے میں بوطیقا (poetics) کا اسلوب اکھڑا اکھڑا سا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل کلاس نوٹس تھے۔ جنہیں بعد میں اکٹھا کر کے کتاب بنا دیا گیا۔ اس خامی کے باوجود بوطیقا فلسفیانہ انداز میں لکھی ہوئی تنقید کی پہلی مکمل کتاب ہے۔ یہ کتاب ادبی تنقید کا ایک مکمل نصاب ہے جس میں ارسطو طالب علموں کو ڈرامائی شاعری کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ شاعری کی تعریف، ابتدا، شاعری کی اقسام اور شاعری کی ارتقائی صورت حال پر بات چیت کرتا ہے۔ شعری ڈرامے کی تشکیل میں ضروری عناصر کی نشان دہی کرتا ہے اور شاعری پر کیے گئے نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے۔ اس وقت شاید افلاطون واحد آدمی تھا جس نے شاعری کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ارسطو نے اس کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بوطیقا کو نقادوں نے افلاطون کے تنقیدی نظریات کا جواب نامہ کہا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے مثال کے طور پر:

1۔ افلاطون شاعری کو نقل کی نقل قرار دیتا ہے۔ ارسطو مثال دے کر وضاحت کرتا ہے کہ شاعری عظیم سچائی سے تین منزلیں دور ہے لیکن ارسطو اسے ایسی نقالی قرار دیتا ہے جس میں آفاقی سچائی موجود ہے۔ شاعری کا طریقہ کار تاریخ سے زیادہ قابل قدر ہے۔ تاریخ کا مقصد صرف حقائق بیان کرنا ہے جبکہ شاعری حقائق کی انتہائی صورت کو بیان میں لاتی ہے۔

2۔ افلاطون کا خیال ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ اس مسرت سے نہیں لگانا چاہیے، جو کسی فن پارے کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ اس سچائی سے لگانا چاہیے جو نقل پیش کرتی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ ہر چیز کی مکمل نقالی ہی اصل سچائی کا سبب ہے۔

3۔ افلاطون کا خیال ہے کہ شاعری جذبات میں اشتعال پیدا کرتی ہے چنانچہ اسے قید اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ارسطو کا دعویٰ یہ ہے کہ شاعری جذبات کی تطہیر اور تزکیہ نفس کرتی ہے۔ اور جذبات کی شدت میں کمی پیدا کرتی ہے۔

ارسطو نے بوطیقا کے شروع ہی میں اپنے دائرہ کار کا اعلان کر دیا ہے۔ کتاب کے پہلے دو ابواب میں ارسطو نے نقالی اور نقالی کے ذرائع پر بحث کی ہے۔ اگلے دو ابواب میں اس نے شاعری کے آغاز، شاعری کی اقسام، المیہ اور رزمیہ اور طربیہ پر بحث کی ہے۔ باب نمبر 6 میں ارسطو المیہ پر بحث کرتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے المیہ کی نوعیت اور اصل پر

گفتگو ہے پھر اس کے عناصر پلاٹ، کردار، آرائش پر اظہار خیال کیا ہے۔ اگلے باب میں پلاٹ پر روشنی ڈالی ہے کہ اسے مکمل ہونا چاہیے یعنی اس میں ابتدائی، درمیانی اور آخری حصہ موجود ہو۔ باب نمبر 8 میں وحدت عمل اور باب نمبر 9 میں شاعری اور تاریخ کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ باب نمبر 13 اور 14 میں رحم اور دہشت کے عناصر پر گفتگو کی ہے۔ اگلے دو ابواب میں کردار پر بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ پلاٹ کے مقابلے میں کرداروں کی اہمیت بہت کم ہے۔ باب نمبر 16 میں انکشافات اور اگلے دو ابواب میں المیہ نگاروں کے لئے کچھ ہدایات اور اصول تحریر کئے ہیں۔ باب نمبر 20,21,22 میں زبان کے استعمال، اہمیت اور استعارے پر بحث کی ہے۔ آخری چار ابواب میں رزمیہ (Epic) شاعری کے، پلاٹ اور ڈھانچے پر بحث کی ہے اور تجزیہ کیا ہے۔ المیہ اور رزمیہ کا موازنہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ المیہ ہر صورت میں رزمیہ سے بہتر اور اعلیٰ قسم کی شاعری ہے۔

بوطیقا ایک نامکمل کتاب ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں ان پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصے شاید ضائع ہو چکے ہیں۔ اس نامکمل کتاب میں موجود مواد ہی مکمل تنقیدی نصاب بن کر اب تک نقادوں کو روشنی دکھا رہا ہے۔ کتاب اگر مکمل ہوتی تو پتا نہیں ارسطو کن کن مفاہیم کی نشان دہی کرتا۔

ارسطو نے اپنے عہد میں موجود تمام علوم پر کاملیت حاصل کی۔ وہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ پورے ایتھنز میں سب سے بڑی لائبریری ڈراما نگار یوری پیڈیز کی تھی، دوسری بڑی لائبریری ارسطو کی تھی۔

ارسطو کی علمی قابلیت، ذہانت، تحقیق، دانش اور فلسفیانہ صلاحیت، سائنسی، نفسیاتی، عمرانی تاریخ، تنقیدی طاقت کو ہر عہد کے انسان نے تسلیم کیا اور رہنمائی حاصل کی ہے۔ کولرج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کسی بھی عہد کا انسان افلاطون اور ارسطو کے اثر سے نہیں بچ سکتا۔

ارسطو عالمی علوم کا پروفیسر تھا۔ مغرب، یورپ اور عربوں نے اس سے استفادہ کیا۔ مشہور دانش ور THOMPSOM کے الفاظ پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

"A TEACHER OF ETERNAL VERITIES, TELLING OF SLEEP AND DREAMS, OF YOUTH AND AGE, OF LIFE AND DEATH,OF GENERATIONS AND CORRUPTION,OF GROWTH AND DECAY, A GUIDE TO THE BOOK OF NATUR, A REVEAL OF SPIRIT, A PROPHET OF THE WORKS OF GOD"

پلوٹارک

(Plutarch)

46 عیسوی کا نامور دانش ور، پادری، سفارت کار، بیوروکریٹ، شخصیت نگاری، سوانح نگاری اور انشا پردازی کا موجد۔ پلوٹارک نے صرف تاریخ نہیں لکھی اپنے ہیروز کی زندگیوں پر بھی روشنی ڈالی۔

روح کوموت نہیں آتی۔ وہ جسم میں قید ایک پرندے کی طرح ہے جسم مرتا ہے تو وہ دوسرے جسم میں جا کر پناہ لے لیتی ہے۔

(Moralia)

....

''قلوپطرہ بے حد خوبصورت تھی۔ اس کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی چالاک تھی۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہر کوئی بے تاب تھا۔ اس کی آواز نرم تھی ،سریلی تھی، اس کی آواز کو کسی چیز سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔''

....

''سکندر اعظم کو نہ دولت کی پرواہ تھی نہ وہ عیاشی کا دلدادہ تھا۔ وہ تو اقتدار اور شان وشوکت کا دیوانہ تھا۔''

(متوازی زندگیاں)

....

وہ اسٹیج پر آئے اور یوں گزر گئے جیسے ایک کردار دوسرے کردار کے لیے جگہ چھوڑ کر جا رہا ہو۔

(متوازی زندگیاں)

لوسئیس پلوٹارک

گزرے دنوں میں اکثر لکھنے والوں کا خوش حالی اور خوش بختی سے واسطہ کم کم ہی رہا۔ عالمی ادب کی تاریخ میں جھانک کر دیکھئے تو اکثر بڑے ادیب در بدر بھٹکتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ تنگدستی اور خستہ حالی سدا ان کے ساتھ رہی۔ ان کی دانش اور فکر کے دائرے پھیلتے رہے مگر بُرے حالات نے انہیں اپنی گرفت سے نہ چھوڑا۔ سقراط، روسو، میر، غالب، دوستوفیسکی، گوگول، ہرمن میلول، سدا تنگدستی کا ہی گلہ کرتے رہے مگر چند ایک ایسے خوش قسمت ادیب بھی گزرے ہیں جن کے ہاتھوں میں ہمیشہ سونے کا چمچہ رہا اور مفلسی دور کھڑی ان کا منہ تکتی رہی۔ ہوریس، ورجل، وکٹر ہیوگو، ٹالسٹائی اور ترگنیف ایسے ہی ادیب تھے۔

ورجل، ہوریس محلات میں رہے، شاعری کی، نام کمایا، زندہ جاوید ہو گئے۔ ٹالسٹائی اپنی جاگیر میں ٹھاٹ باٹھ سے رہا۔ چیخوف اور گوا گی جیسے نامور ادیب اس کے حضور نیاز مندی سے حاضری دینے جاتے رہے۔ ترگنیف ایک رئیس آدمی تھا۔ بڑا ادیب تھا، جاگیر کا مالک تھا، روس اور پیرس میں ہنسی خوشی دن گزارے۔ ایسے ہی مقدر والا ایک دانش ور، فلسفی اور مصنف پلوٹارک (Plutarch) بھی تھا۔ جو ڈلفی (یونان) مندر سے 20 میل دور اپنی جاگیر میں بنے خوبصورت سنگ مرمر کے محل میں رہتا تھا۔ نزدیک اور دور سے لوگ اسے ملنے کے لیے آتے تھے۔ بڑے ہال میں وہ اپنی سنگ مرمر سے بنی خوبصورت کرسی پر شان سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا تھا۔ علم و دانش کے موتی اس کے ہونٹوں سے گرتے رہتے تھے اور اس کے ملازم انہیں کاغذوں پر سجاتے رہتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے کاغذات کتابی شکل اختیار کر گئے اور ساری دنیا میں اس کا نام گونجنے لگا۔ یہ گونج صدیاں گزرنے کے بعد بھی سنائی دے رہی ہے۔

سوانح نگار، انشا پرداز، پادری، سفیر، بیوروکریٹ اور سفارت کار، پلوٹارک جس کا پورا نام Lucius Plutarchus تھا، یونانی تھا۔ 46 عیسوی میں یونان کے معزز خاندان میں ایک گاؤں Boetia میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں اپالو کی مشہور عبادت گاہ ڈلفی Delphi سے 20 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ پلوٹارک کی کتاب Moralia سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا خاندان بہت دولت مند تھا اور اس کا باپ اور دادا مشہور آدمی تھے۔ پلوٹارک کی پرورش بہت اچھی ہوئی۔ تعلیم و تربیت مروجہ علوم کے مطابق ہوئی۔ دو سال وہ ریاضی اور فلسفہ پڑھتا رہا۔ یونان کے بااثر لوگوں سے اس کا میل جول رہا، سیاسی لوگوں اور سینیٹرز سے اس کے تعلقات رہے۔ یونان کے علاوہ سپارٹا، اسکندریہ اور روم کی سیر و سیاحت کی اور لوگوں سے مراسم قائم کیے۔ افلاطون کے فلسفے سے اسے خاص رغبت تھی۔ مکالمات افلاطون کے زیرِ اثر اس نے اپنی تحریروں کو پروان چڑھایا۔ اس کی زندگی کے حالات کے بارے میں جو کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اس کے مکالمات اور مضامین سے حاصل ہوتی ہیں۔

ڈلفی میں اپالو کا مندر یونان کے لوگوں کے لیے مقدس زیارت گاہ تھی۔ اس مندر کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ یہاں لوگ چڑھاوا چڑھا کر اپنے اپنے مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ یہ پیش گوئیاں آسمانی

زبانوں کا درجہ رکھتی تھیں جنہیں سمجھانے کے لیے کسی خاص صاحب کرامات یا غیبی آوازوں کی تشریح کرنے والوں کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ ایڈی پس کے بارے میں کی گئی پیش گوئی کو بھی ایک اندھے (Seer) نے ہی سمجھایا تھا۔

پلوٹارک اپالو کے اس مندر میں یہی کام کرتا تھا۔ وہ یہاں پادری تھا اور اس کی ذمے داریوں میں ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ ان کی کی گئی پیش گوئیوں کے الجھے دھاگوں کو سلجھائے۔ اپالو کے مندر میں ہونے والے معجزوں کی گتھیاں پلوٹارک ہی سلجھاتا تھا۔

پلوٹارک کی زندگی کا طویل عرصہ اپنی جاگیر (Chaeronea) ہی میں گزرا۔ اس نے مصروف ترین زندگی گزاری وہ شہر کا مجسٹریٹ تھا اور اس کا محل باہر سے آنے والے سفارت کاروں سے ہر پل بھرا رہتا تھا۔ اپنے شہر کی فلاح کے لیے اس نے بے حد فلاحی کام کیے۔ اس وقت کے شہنشاہ (Hadria) نے اسے شاہی خلعت سے نوازا اور شاہی تمغے سینے پر سجانے کی اجازت بخشی۔ ان اعزازات سے اسے یونان بلکہ روم نے بھی نوازا۔ روم والوں نے اسے روم کی شہریت دی اور اسے روم کے ایک رئیس Lusius Mestrius نے Sponsor کیا۔ جس کی مناسبت سے ہی اس نے اپنا نام Lucius mestrius plutarchus رکھا۔ روم کی حکومت نے اسے کونسلر کا منصب دیا۔ پلوٹارک نے روم کی شہریت ضرور حاصل کی لیکن زندگی اس نے یونان ہی میں گزاری اور 120 عیسوی میں اور مرا بھی وہاں جہاں پیدا ہوا تھا۔ روم کے لوگوں کو فورم میں لیکچرز دینے کے لیے وہ چند دنوں کے لیے روم جاتا تھا۔ محفلوں میں اپنی ذہانت کی دھاک جما کر پھر واپس یونان آجاتا تھا۔

پلوٹارک کا عہد یونانیوں کے زوال اور رومیوں کے عروج کا عہد ہے۔ رومن فوجوں نے یونانی ریاستوں کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ لیکن پلوٹارک کا نظریہ یہ تھا کہ اس سے یونانیوں نے روم کے لوگوں کی ذہنی تربیت کی یونانیوں سے میل ملاپ نے روم کے لوگوں کو مہذب بنا دیا تھا اور رومیوں کو سنہری زمانہ دیکھنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ روم کے لوگوں کو مہذب بنانے میں پلوٹارک کی دو کتابوں MORALIA اور (PARALLEL LIVES) کا بڑا ہاتھ ہے۔ پلوٹارک کی دو ہی نمائندہ کتابیں ہیں۔ ایک کا نام MORALIA اور دوسری PARALLEL LIVES MORALIA اس کے لیکچرز اور مضامین کا مجموعہ ہے جو اس نے مختلف اوقات میں لکھے یا لیکچرز دیئے اور اس کے شاگردوں نے انہیں ضابطہ تحریر کی شکل دے دی۔ ان میں سے بہت سے مضامین ضائع ہو گئے لیکن 78 مضامین اب بھی اس کی کتاب اخلاقیات MORALIA میں محفوظ ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر پلوٹارک کے نظریات سے پوری طرح واقفیت ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ پلوٹارک کا بیشتر تخلیقی کام حالات کی نذر ہو گیا ہے پھر بھی 1300 صفحات اب بھی دو کتابوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔

MORALIA کے مضامین پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ پلوٹارک حقائق پر یقین رکھنے والا آدمی تھا۔ انتہائی سادہ طبیعت آدمی تھا۔ قدیم اقدار کا دلدارہ، جہاں جہاں وہ مضامین میں سیاست کی بات کرتا ہے وہاں وہاں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ سیاست دانوں کو عوام کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیے۔ حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ عوام کی رائے کا احترام کریں اور ان کے اچھے مشورے پر عمل کریں۔ ایک بار وہ ایک عوامی جلسے سے خطاب کر رہا تھا۔ اسی دوران بادشاہ کا ایک قاصد بادشاہ کا خط لے کر آ گیا۔ تقریر کرتے کرتے پلوٹارک نے خط کھول کر پڑھنا چاہا تو عوام میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا۔

''پہلے ہمارے ساتھ بات کرو۔ بادشاہ کا خط پھر پڑھ لینا۔'' پلوٹارک نے مسکرا کر خط بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ جب جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ چلے گئے تو خط پڑھا۔ یہ بات اگرچہ معمولی ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں عام آدمی کی کتنی عزت تھی اور وہ ان کا کتنا احترام کرتا تھا۔

پلوٹارک ایک حب الوطنی یونانی تھا۔ جہاں جہاں اس نے یونان کا ذکر کیا ہے۔ الفاظ میں اس کی محبت چھلکتی ہے۔

ان مضامین میں پلوٹارک نے مشہور تاریخ دان ہیروڈوٹس (HERODOTUS) پر بھی شدید تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ اس نے یونانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اچھے الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ پلوٹارک یونانی شاعروں اور کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہے اور یونانی ریاستوں (اگرچہ وہ اس وقت برباد ہو چکی تھیں) اور یونانی کرداروں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتا۔

شاعروں اور مصوروں کے بارے میں وہ جب لکھتا ہے تو ان کی عظمت اور ہنرمندی کو داد دیتا ہے کیونکہ اس کا یہ نظریہ ہے کہ شاعر کے اشعار اور مصور کی تصویر میں شاعر اور مصور کا اپنا کردار ہمیشہ شامل ہوتا ہے۔ اچھا شعر اور اچھی تقدیر ہمیشہ شاعر اور مصور کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔

اس کے مضامین میں افلاطون کے فلسفے خاص طور پر افلاطون کی خیالی ریاست کا بہت اثر ہے۔ ''معجزوں کا زوال'' (ON THE DECLINE OF THE ORACLES) اور (ON PEACE OF MIND) میں اس کا لب ولہجہ بہت سادہ اور سلیس ہے اور بہت ہی لطیف انداز میں اس نے معجزات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے زوال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے مضمون میں اس نے بہت شگفتہ انداز میں دماغی سکون کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

کچھ مضامین میں اس نے مزاح کا اسلوب اختیار کر کے قارئین کو ہنسنے اور قہقہے لگانے کا موقعہ دیا ہے۔ مثلاً ایک مضمون میں اس نے اوڈی سی لیس اور سرسی (CIRCE) کے ایک سور (PIG) کے درمیان ایک مکالمہ دیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء پرداز کا سہرا پلوٹارک کے سر پر رکھا جا سکتا ہے۔

پلوٹارک ایک قدامت پسند آدمی تھا۔ اس کے نظریات پر تفصیلی بحث تو ممکن نہیں لیکن ایک نظریے پر میں بات کروں گا اور وہ اس کا آواگون (INCARNATION) کے مسئلے پر یقین کامل ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد صرف جسم مرتا ہے روح کو موت نہیں آ سکتی وہ ایک جسم چھوڑ کر دوسرے جسم میں قیام کر لیتی ہے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

(MORALIA) میں ایک خط شامل ہے جو اس نے اپنی دو سال کی بیٹی کی وفات پر اپنی بیوی کو لکھا تھا۔ اس خط سے اس کے اس نظریے کی صداقت واضح ہوتی ہے۔

"THE SOUL, BEING ETERNAL, AFTER DEATH IS LIKE A CAGED BIRD THAT HAS BEEN RELEASED. IF IT HAS BEEN A LONG TIME IN THE BODY, AND HAS BECOME TAME BY MANY AFFAIRS AND LONG HABIT. THE SOUL WILL ENTER INTO OTHER BODY"

آواگون کے اس نظریے پر پلوٹارک نے بار بار اپنے مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔

پلوٹارک کے ان مضامین سے بعد میں آنے والے مصنفین نے بڑی رہنمائی حاصل کی۔ 16 ویں صدی کا فرانسیسی ناول نگار، انشاء پرداز (MONTAIGNE) سرفہرست ہے۔ اس نے اپنی انشاء پردازی کی بنیاد پلوٹارک کے اسلوب پر

رکھی اور اپنی تحریروں میں 400 سے زیادہ حوالے پلوٹارک کے مضامین کے دیئے۔ رسم و رواج، سائنس، آداب اور اعتقادات پر بحث کرتے ہوئے اس نے ہمیشہ پلوٹارک کا سہارا لیا۔ اس کے مجموعے (Essays) اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

پلوٹارک کی دوسری عالمی شہرت یافتہ تصنیف (PARALLE LIVES) ہے۔ جو سوانح عمری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ یونانی اور رومن ہیروز کی زندگیوں کی کہانی ہے۔ پلوٹارک نے 100 سے زیادہ بہادروں کی زندگی کو قلم بند کیا ہے اور اس کتاب کو آج بھی ایمرسن (R.W. Emerson) کے الفاظ میں A BIBLE OF HEROES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

100 بہادروں کی زندگیوں پر لکھی یہ کتاب کوئی تاریخی روداد نہیں بلکہ بہادروں کی زندگی اور ان کے کردار کی تفصیلی روداد ہے۔ یہ انسانوں کے اندر جھانکنے کی ایک کوشش ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ اگرچہ پلوٹارک کا شمار تاریخ والوں کی فہرست میں ہوتا ہے لیکن اس کی اس کتاب کو تاریخی انداز میں نہیں پرکھا جا سکتا۔ وہ تاریخ نہیں لکھ رہا تھا وہ تو انسانوں کے باطنی اور خارجی کردار لکھ رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ہمیشہ سچائی کی ڈور پکڑ کر کردار تک پہنچنے کی کوشش کی۔ مثلاً وہ پیریکلز کے بارے میں لکھتا ہوا کہتا ہے:

''ماضی کا ریکارڈ دیکھ کر سچائی تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ماضی کی گرد نے سچ کو ڈھانپ دیا ہے اور ہمعصر لکھنے والے بھی سچی بات کو چھپا کر رکھتے ہیں۔''

پلوٹارک نے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے ہیروز کی کردار نگاری کی۔ اس نے شخصیت اور کردار کی تشکیل میں بڑی محنت کی اور بعد میں آنے والے بائیوگرافرز اور شخصیت نگاروں کو راستہ دکھایا۔ اس کی اس ہنر مندی کی (MONTAIGNE) نے بہت اچھے الفاظ میں داد دی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"WE DUNCES WOULD HAVE BEEN LOST IF PLUTARCH HAD NOT RAISED US OUT OF THE DUST"

پلوٹارک نے متوازی زندگیاں (PARALLEL LIVES) لکھتے وقت یونانی اور رومن بہادروں کو سامنے رکھا ہے۔ ایک یونانی اور ایک رومن بہادر کو سامنے رکھا ہے اور پھر ان کے اوصاف اور خامیوں کا موازنہ کیا ہے۔ مثلاً اگر وہ یونانی بہادر سکندر اعظم کی زندگی پر لکھ رہا ہے تو رومن تاریخ سے سیزر کی زندگی کو سامنے رکھتا ہے اور پھر دونوں کا موازنہ کرتا ہے۔

پلوٹارک نے چند رومن بادشاہوں کو اپنی آنکھوں سے آتے جاتے جاتے دیکھا۔ کئی بادشاہوں کے مختصر عہد اس کے سامنے شروع ہوئے اور ختم ہو گئے۔ جب نیرو حکمران تھا تو پلوٹارک 20 برس کا تھا۔ اس نے نیرو کی حکومت اور موت دیکھی اور پھر مختصر وقت میں کئی بادشاہوں کو حکومت کرتے اور ان کی حکومت کو ختم ہوتے دیکھا۔ ان کے ظلم و ستم اور احمقانہ احکامات کے ردِعمل میں انہیں برباد ہوتے بھی دیکھا۔ وہ چار سیزر کے آگے پیچھے آنے اور جانے کے بارے میں سیزر (GALBA) کے ضمن میں لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"PASSING, AS IT WERE, ACROSS THE STAGE, AND ONE MAKING ROOM FOR ANOTHER TO ENTER"

''وہ اسٹیج پر آئے اور یوں گئے جیسے ایک کردار دوسرے کردار کے لیے جگہ چھوڑ کر جا رہا ہو۔''

پلوٹارک نے ''متوازی زندگیوں'' میں یونانی اور رومن بہادروں کو بڑے متوازن انداز میں داد دی ہے۔ ان میں ہر کلیز، السی بائی ڈیز، سکندر اعظم، پیریکلیز، قلوپطرہ، سیزر، آگسٹس، نیرو، کلائڈیس، گالبا، ویٹی لیس، انتونی، بروٹس اور دوسرے یونانی اور رومن نامور بہادر شامل ہیں۔

پلوٹارک نے اپنے ان ہیروز کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خوبیوں، خامیوں ان کے ظلم و ستم اور ان کے اچھے اور بُرے انجام پر بھی بحث کی ہے۔ ان تاریخی واقعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو ان کے بُرے انجام کا سبب بنے لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے تاریخی اداروں کو بوجھ بنا کر ان کرداروں کی شخصی تصویر کو دھندلا نہیں پڑنے دیا۔

پلوٹارک کا اسلوب بہت دلکش، سادہ اور اختصار پر مبنی ہے۔ یہ نہیں کہ اپنے اختصار سے واقعات کو نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔ وہ دلچسپ جنگوں کی تفصیل بھی دیتا ہے۔ واقعات میں داستانی رنگ بھی بھرتا ہے لیکن طوالت سے واقعے کی دلچسپی کو ختم نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی سچ کا خون کرتا ہے۔ کردار نگاری کرتے ہوئے چند جملوں میں پورے کردار کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ مثلاً وہ قلوپطرہ کے بارے میں لکھتا ہے:

''وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اس کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی چالاک تھی۔ اس کا قرب حاصل کرنے کیلئے ہر کوئی بے تاب تھا۔ کئی زبانیں بول سکتی تھی۔ اس کی آواز بہت سریلی تھی، نرم تھی۔ اس کی آواز کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔''

اسی طرح سکندر اعظم کے بارے میں اس کے کردار کو صرف ایک جملے میں بیان کر دیتا ہے۔ جو سکندر کے بارے میں ایک سچائی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

''سکندر اعظم کو نہ دولت کی پرواہ تھی نہ وہ عیاشی کا دلدادہ تھا۔ وہ تو اقتدار اور شان و شوکت کا دیوانہ تھا۔''

جیسا میں نے پہلے لکھا ہے پلوٹارک کا مقصد تاریخ نویسی نہ تھا۔ شخصیت نویسی اور کردار نگاری تھا۔ وہ ہر واقعہ میں ایک اخلاقی جواز تلاش کرتا تھا اور ہر کردار کے اندر اتر کر اس کی خوبیاں اور خامیاں تلاش کرتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

"IT IS NOT HISTORIES I AM WRITING, BUT LIVES"

اور واقعی پلوٹارک نے تاریخ نہیں اپنے ہیروز کی زندگیاں لکھی ہیں اور انہیں قیامت تک کیلئے زندگی بخش دی تھی۔

پلوٹارک نے شخصیت اور کردار کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ بعد میں آنے والے مصنفین کو بائیوگرافی لکھنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے اور ہیروز کو وقت کی گرد میں چھپنے نہیں دیا۔ بقول

بیتھوون (BEETHOVEN)

"GREAT SOULS HAVE FOUND COMFORT IN PLUTARCH'S WISDOM"

پلوٹارک کی ان تاریخی تحریروں اور تاریخی واقعات میں وہی فرق ہے۔ جو خشک اور تر میں ہوتا ہے۔ خوش رنگ اور بے رنگ منتظر میں اور زندہ آدمی اور لاش میں ہوتا ہے۔

پلوٹارک نے سوانح نگاری، کردار نگاری اور شخصیت نگاری کی بنیاد رکھی۔ بعد میں آنے والے مصنفین نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ یونان اور روم کی شخصیتوں کو جاننے کا پلوٹارک واحد ذریعہ ہے۔ سکندر اعظم، قلوپطرہ، مارک انتونی، سیزر کے خاکوں میں مصنفین نے پلوٹارک کو پڑھ کر رنگ بھرا...... (MONTAIGNE) نے ٹھیک ہی کہا ہے:

لانجائی نس

(Longinus)

پہلی صدی عیسوی کا نامور نقاد، ماہر لسانیات، صرف ونحو کا ماہر، اس کا تنقیدی مقالہ (On The Sublimity) نظام تنقید میں بہت اہمیت رکھتا ہے مغربی دنیا نے اس سے بہت استفادہ کیا۔

"WE DUNES WOULD HAVE BEEN LOST IF PLUTARCH HAD NOT RAISED US OUT OF THE DUST"

نئے لکھنے والوں کو قدیم اساتذہ کی تخلیقات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ یہ سرقہ یا چوری نہیں۔ یہ تو سانچوں سے خوبصورت برتن ڈھالنے کا کام ہے۔

....

جس طرح کسی محفل میں گانے والے سے ایک ہی راگ بار بار سن کر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اسی طرح شاعر یا تقریر میں لہجے کی یکسانیت دلچسپی کے عنصر کو کم کر دیتی ہے۔ چنانچہ شاعر کو چاہیے کہ وہ جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی تبدیلی پیدا کرے۔

....

دولت کی زیادتی، اخلاقی اور سیاسی زوال، اعلیٰ خیالات کی موت ہے۔ جب اعلیٰ فکر نہ ہو تو اعلیٰ ادب کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

(On The Sublimity)

لانجائی نس

یونانی ادبی تنقید میں افلاطون اور ارسطو کے بعد آخری اور اہم نام لانجائی نس کا ہے۔ عرصہ دراز تک اس کا تنقیدی کارنامہ On The Sublime ادیبوں اور محققوں کی نظروں سے اوجھل رہا لیکن جب یہ تنقیدی مقالہ لوگوں کے سامنے آیا تو اسے ایک نادر اور قابل قدر کتاب قرار دیا گیا۔ برٹش میوزیم لائبریری میں پڑے ہوئے نسخے (Longinus on the Sublime) پر لاطینی زبان میں مشہور دانشور (Issac Casubon) کے تعریفی الفاظ میں اسے بے مثال اور دلچسپ تنقیدی مضمون کہا گیا ہے۔ نقادوں اور دانشوروں کا خیال ہے کہ لانجائی نس سے پہلے اسی عہد کا ایک نقاد (Ceecilus) ترفع (Sublime) کے موضوع پر مقالہ لکھ چکا تھا لیکن اس مقالے میں ان عناصر پر بحث نہیں کی گئی تھی جو ترفع کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ لانجائی نس نے اس موضوع پر اپنے ایک دوست (Postumius) کو مخاطب کر کے قلم اٹھایا اور سب لائم پر یہ مقالہ لکھ دیا۔ نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ایک طرح سے سی لس کے مقالے کا جواب ہے۔

On The Sublimity کی تاریخ تحریر اور اصل مصنف کے سلسلے میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ مقالے کی تحریر کے حوالے سے دو حقدار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک فلاسفی اور زبان کا مشہور استاد لانجائی نس جس کا تعلق تیسری صدی سے تھا۔ یہ پامیریا کی ملکہ زینوبیا کا مشیر خاص تھا۔ اس نے ملک کے لیے لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک اسے (On The Sublimity) کا مصنف سمجھا جاتا رہا لیکن اطالوی سکالر آماتی نے ویٹی کن لائبریری میں اس مقالے کا وہ نسخہ دریافت کر لیا جس پر (Disonysius or Loginus) کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اس مقالے کا قدیم ترین مسودہ جو پیرس کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس پر بھی مصنف کا نام (Dionysius or Loginus) ہی لکھا ہوا ہے اور کتاب کا عنوان یونان زبان میں (Dionysius Longinus Concerning Sublimity) درج ہے۔

لانجائی نس کے مقابلے میں جو شہادتیں ملتی ہیں۔ ان کے پیش نظر اس مقالے کی تصنیف سے تیسری صدی کے کیسیس لانجائی نس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقتاً پہلی صدی کے لانجائی نس کی تصنیف ہے۔ اس کے لیے دو شہادتیں کافی ہیں۔

1۔ لانجائی نس نے اپنے مقالے میں جس ادبی انحطاط کا ذکر کیا ہے۔ خطابت اور شاعری میں جس انتشار کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ادبی انحطاط اور انتشار پہلی صدی میں شروع ہو چکا تھا۔ نئے پن کی تلاش میں ادیب اور خطیب اوچھے پن کا شکار ہو چکے تھے۔

2۔ لانجائی نس نے اپنے مقالے میں جن جن ادیبوں، شاعروں اور مقرروں کی تحریروں سے حوالے دیئے ہیں ان سب کا تعلق پہلی صدی سے ہے یا سب کے سب پہلی صدی سے پہلے کے ہیں۔ آگسٹس (Augustus) کے عہد کے بعد کا کوئی ادیب مقالے میں مثال کے طور پر نہیں آیا۔

ان دو شہادتوں کے پیش نظر لانجائی کو پہلی صدی کی شخصیت قرار دینے والے نقاد حق بجانب ہیں۔

لانجائی نس کا یہ مقالہ 44 چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ان ٹکڑوں کے بہت سے جملے اور حصے یا تو پڑھے نہیں جاسکتے یا ضائع ہو گئے ہیں۔ میں نے ان تمام ٹکڑوں کو اپنی سمجھ کے مطابق اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے سامنے (On The Sublime) کے دو انگریزی ترجمے ہیں۔ جو آکسفورڈ کے پروفیسر (A.O Dorsch) کا ہے جو Penguin Books نے 1967ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے متن کے سلسلے میں ان ہی دو کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

بقول لانجائی نس رفعت (Sublimity) کو ہم کسی فن پارے کی روح کہہ سکتے ہیں۔ لفاظی یا ظاہری شان و شوکت سے رفعت (Sublimity) کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق روح سے ہے۔ یہ سننے اور پڑھنے والے کو روحانی مسرت سے دوچار کرتی ہے۔ ظاہری زندگی میں عہدہ، بادشاہت، دولت اور اعزاز ایک شان رکھتے ہیں لیکن ادب میں ان کے ذریعے شان و شوکت پیدا کی جاسکتی ہے۔ رفعت نے ہر عہد میں روح کو بالیدگی بخشی ہے ہر خاص و عام نے (جس میں عمر کی کوئی قید نہیں) اس سے مسرت حاصل کی ہے۔

لانجائی نس نے اعلیٰ اسلوب بیان کے لئے پانچ چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے:

1۔ فکر کی بلندی
2۔ جذبہ
3۔ صنائع بدائع
4۔ محاورہ، روزمرہ، استعارہ
5۔ موثر انشا پردازی

لانجائی نس اس حصے کے آخر میں کہتا ہے کہ یہ پانچوں عناصر جذبے کے تحت ہی اپنا کمال دکھا سکتے ہیں۔ اگر جذبے حقیقی ہوں تو مصنف ان عناصر سے کوئی شہ پارہ تخلیق کرسکتا ہے۔

اعلیٰ فن پارہ بلندی فکر سے ہی پروان چڑھتا ہے۔ حقیقی اور اعلیٰ فکر کسی منصب کی سب سے بڑی صفت ہے جس سے وہ عظیم تخلیق کرتا ہے۔ لانجائی نس کے نزدیک

Sublimity is the note which rings from a great mind.

وہ (Sublimity) کو عظیم دماغ کی بازگشت قرار دیتا ہے بعض اوقات ہمیں سادہ اور بناوٹ سے عاری فن پارے میں بھی بلاغت کا جوہر نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم دماغ کارفرما ہوتا ہے۔

It is on lips of man of highest spirits that words of rare greatness are found.

لانجائی نس کا خیال ہے کہ ترفع کو بعض اوقات الفاظ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی دلیل میں اس نے ہومر کی مشہور کتاب اوڈیسی کا ایک منظر پیش کیا ہے...... یہ عالم ارواح کا منظر ہے جہاں یونانی بہادر اجکس (Ajax) مرنے کے بعد جاتا ہے اور خاموشی کی فضا میں اپنے مردہ ساتھیوں کو اِدھر اُدھر سایوں کی طرح چلتے پھرتے دیکھتا ہے۔ ہومر کی اس خصوصیت کو کئی اور نقادوں نے بھی سراہا ہے۔ المیہ نگاروں سے ہومر کا موازنہ کرتے ہوئے ایک نقاد کہتا ہے:

His Silence is Clearly a fine thing than the speeches in tragic poets.

رفعت کے لیے لانجائی نس نے شاعری یا ڈرامے کے اجزا کی ترتیب کو بہت اہم قرار دیا ہے۔ اچھا شاعر یا ڈراما نگار وہ ہے جو مختلف عناصر اور اجزا کو اس طرح مربوط شکل میں پیش کرے کہ ان میں وحدت نظر آئے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ شاعر یا ڈراما نگار میں انتخاب کا شعور ہو اسے پتہ ہونا چاہیے کہ کون سے عناصر اظہار کے لیے ضروری ہیں اور کن عناصر کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ لانجائی نس نے مشہور یونانی شاعرہ سفو اور ہومر کی مثالیں دی ہیں۔ سفو نے جذبات کے ڈھیر سے وہی جذبات چنے جو اظہار بیان کے لیے ضروری تھے۔ اور جن سے اس کی شاعری میں حسن پیدا ہوسکتا تھا۔ اسی لیے اس کی شاعری جذبات محبت کے اظہار کی بہترین شاعری ہے جہاں تک ہومر کا تعلق ہے اس نے مناظر، طوفان اور راستوں کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے غیر ضروری اور غیر اہم اجزا کو قلم زد کر دیا ہے اور صرف وہی واقعات اور عناصر اپنی کہانی کا حصہ بنائے ہیں جو وحدت کے تاثر کی نفی نہیں کرتے۔ جو شاعر یا ڈراما نگار اس بات کا خیال نہیں کرتے وہ فن پارے کی وحدت اور تاثر کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔

Amplification یعنی ''توسیع و توضیع'' کو لانجائی نس بے حد ضروری قرار دیتا ہے اس ''توسیع و توضیع'' سے مراد معمولی باتوں اور واقعات کو فنی ترتیب اور موثر انداز سے بیان کرنا ہے۔

نئے لکھنے والوں کو قدیم اساتذہ کی تخلیقات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ یہ سرقہ یا چوری نہیں۔ یہ تو سانچوں سے خوبصورت برتن ڈھالنے والی بات ہے۔ افلاطون جس کی تحریروں میں ایک خاموش ندی کا بہاؤ اور چشموں کی روانی ہے۔ اساتذہ کی تحریروں سے فیض حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔

افلاطون کے علاوہ ہیروڈوٹس کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ہومر سے بے حد متاثر تھا چنانچہ پرانے اور قدیم اساتذہ سے فیض حاصل کرنا ان کی تقلید کرنا۔ ان کے فن پاروں سے موضوعات تلاش کرنا عیب نہیں فنی پختگی کے راستے پر چلنے والی بات ہے۔

جب ہم کسی بڑے خیال یا جذبے کی اپنی شاعری یا ڈرامے میں ترجمانی کرنا چاہیں تو ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم دیکھیں کہ اگر ہومر یا افلاطون یہ بات کرتا تو کونسا پیرایہ استعمال کرتا یا ان لوگوں نے اسے کیسے بیان کیا ہے۔ اگر ہم اس راستے پر چل کر قدیم اساتذہ کی تقلید کریں گے تو ہم پر اعلیٰ اسلوب کے راستے کھل جائیں گے۔

(Image) سے مراد خیالی تصویر ہے کسی فن پارے میں بلندی اور حسن پیدا کرنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے۔

عام طور پر (Image) سے مراد خیالی تصویر ہے لیکن آج کل اس سے مراد الفاظ کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار یا وہ مناظر دکھانا ہے جو شاعر دیکھتا ہے یا بیان میں لاتا ہے۔ ''خیالی تصویر'' یا پیکر نگاری کے فن سے شاعر اپنے سامعین کو مسحور کرتا ہے اور خطیب اپنے مخاطب کے دل میں تلاطم برپا کرتا ہے۔ لانجائی نس نے مثال کے طور پر یوری پیڈیز کے مشہور المیے اورسٹیز (Orestes) کی تین سطریں دی ہیں جن میں ڈرامے کا ہیرو اورسٹیز اپنی ماں کے قتل کے بعد ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اسے چاروں طرف سانپ اور چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ جنہیں یوری پیڈیز نے خوبصورت (Image) میں بیان کیا ہے۔

لانجائی نس نے المیہ نگاروں کے ہاں ایسے خیالی تصویروں سے بنائے ہوئے مرقعوں کی بے حد تعریف کی ہے۔ اسکائی لیس اور ہومر کی تحریروں سے مثالیں دی ہیں اور پھر بات یہاں ختم کرتا ہے کہ بلاغت دراصل دماغ کی نقالی اور پیکر نگاری سے ہی نمو پاتی ہے۔

16,17,18,19.20 ان پانچوں حصوں میں لانجائی نس نے تحریروں میں صنائع بدائع (Rhetorical Figures) کے مناسب استعمال کے متعلق بحث کی ہے ۔ وہ کہتا ہے ان کا موقع محل کے لحاظ سے استعمال کسی تحریر میں (Sublimity) پیدا کرسکتا ہے ۔ ان کے استعمال میں شعوری کوشش کے وہ خلاف ہے وہ اس شعوری کوشش کو فن پارے کے خلاف سازش قرار دیتا ہے ۔ لانجائی نس کا خیال ہے کہ اگر شاعر ان کے استعمال سے پوری طرح آگاہ ہے تو نہ صرف اس کی شاعری میں ترفع کا تاثر پیدا ہوگا بلکہ صنائع کی معنویت میں بھی اضافہ ہوگا ۔ چنانچہ فن پارے میں حسن پیدا کرنے کے لیے ان کا فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ استعمال بے حد ضروری ہے ۔ خطیب کو چاہیے کہ جب وہ لوگوں سے مخاطب ہو تو ایک سے زیادہ صنائع بدائع کی تکرار سے اپنی تقریر میں جوش پیدا کرے ۔ علاوہ ازیں اپنی تقریر میں خود ہی سوال اٹھائے اور پھر خود ہی ان کا جواب دے ۔ اس سے تحریر سننے والوں کے دل میں ایک اشتعال پیدا ہوگا ۔

لانجائی نس نے صنائع بدائع کی تکرار کا ایک نقصان بھی بتلایا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ خطرہ اپنی جگہ قائم ہے کہ کبھی کبھی ان کے اس طرح استعمال سے تحریر میں جمود بھی آسکتا ہے اور رفتار میں کمی آنے کا خدشہ ہے ۔ کیونکہ بہت سے دوڑنے والوں کو اگر کسی رسی سے باندھ دیا جائے تو ان کی رفتار میں ایک حیرت انگیز کمی آنے کا خطرہ ہے ۔

(Perphrasis) سے لانجائی نس کی مراد ''لہجہ کی تبدیلی'' ہے ۔ شاعری اور تقریر میں اگر لہجہ بدل کر بات کی جائے تو اس سے تاثر پیدا ہوتا ہے ۔ جس طرح کسی محفل میں گویے سے ایک ہی راگ بار بار سننے سے طبیعت اکتا جاتی ہے ۔ اسی طرح شاعری یا تقریر میں لہجے کی یکسانیت دلچسپی کے عنصر کو کم کر دیتی ہے ۔ چنانچہ شاعر کو چاہیے کہ وہ جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی اتار چڑھاؤ پیدا کرے ۔ لانجائی نس نے وضاحت کے لیے افلاطون کی تحریر اور ہیروڈوٹس کی تحریروں سے مثال دی ہے لیکن ہیروڈوٹس کی تحریر کو سراہا ہے جو اپنی تقریروں میں لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ہمیشہ حسن پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً ایک تقریر میں وہ کہتا ہے:

''سیکتھن کے ان لوگوں پر جنھوں نے دیوی کا مندر لوٹا تھا دیوی نے ایسا عذاب بھیجا کہ وہ سب مرد عورتیں بن گئے ۔''

تقریر کے دوران مقرر کے لیے لہجے کا اتار چڑھاؤ آسان کام نہیں اور نہ ہی ہر مقرر یہ کرسکتا ہے لیکن کوشش کر کے یہ فن سیکھنا چاہیے کیونکہ خالی شور وغل سے کوئی فائدہ نہیں ۔ تقریر کا اصل حسن یہ ہے کہ جذبہ، الفاظ اور لہجہ تینوں ایک ہو جائیں ۔

الفاظ، روزمرہ اور محاورات کا استعمال سلیقے سے ہونا چاہیے، فن پارے کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال شاعری کے لیے پہلی شرط ہے ۔ موزوں الفاظ خیال کو روشنی بن کر راستہ دکھاتے ہیں ۔ چنانچہ پرشکوہ اور موزوں زبان کے استعمال سے شاعر کا واقف ہونا ضروری ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ موقع محل کا خیال نہ رکھا جائے کئی جذباتی مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں پرشکوہ زبان کی ضرورت نہیں ہوتی وہ بوجھل اور بھاری زبان کا استعمال ایک معصوم بچے کے چہرے پر المیہ کرداروں کا نقاب ڈالنے کے برابر ہوگا ۔ لانجائی نس کے الفاظ ہیں ۔

Would be like putting a big tragic mask on a tiny child.

مانوس زبان کا شاعری میں استعمال بعض اوقات فن پارے کے تاثر کو شدید کر دیتا ہے ۔

جہاں پرشکوہ الفاظ بے اثر ہو جاتی ہیں وہاں مانوس اور عام بول چال کی زبان اپنا اثر پڑھنے والوں پر چھوڑ جاتی ہے ۔

شاعری اور خطابت میں استعارے کے استعمال کے بارے میں لانجائی نس کہتا ہے کہ استعارے کا خوبصورتی سے استعمال ترفع اور اعلیٰ اسلوب کے لیے ضروری ہے ۔ اس سلسلے میں اس نے افلاطون کے ایک پیراگراف کی مثال دی ہے

جس میں افلاطون نے انسانی جسم کے مختلف حصوں سر، دل، دماغ، پھیپھڑوں، ہاتھ، پاؤں، زبان کے لیے مختلف استعارے استعمال کیے ہیں ۔ لانجائی نس کا خیال ہے کہ جب جذبات کا شدید ریلا رواں ہو تو استعاروں کی تعداد کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے ۔ سننے والا یا پڑھنے والا یہ خیال نہیں کرتا کہ مصنف نے کتنے استعارے استعمال کیے ہیں ۔ یہ بات اس نے اپنے عہد اور ارسطو کو ذہن میں رکھ کر کہی تھی ۔ اس کے عہد کے نقادوں اور دانشوروں کا خیال تھا کہ ایک پیراگراف میں زیادہ سے زیادہ دو یا تین استعاروں کا استعمال ہونا چاہیے ۔ ارسطو پہلے ہی استعارے کے استعمال پر اپنی کتاب میں بحث کر چکا تھا ۔ بہر حال لانجائی نس کا خیال ہے کہ ترفع کے لیے استعارے کا موقع محل کے مطابق استعمال ضروری ہے ۔ لانجائی نس اپنے مخاطب سے سوال کرتا ہے کہ کیا بڑے شاعروں کا کلام اغلاط سے پاک ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ بڑے شاعر اور خطیب اکثر غلطیاں کرتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں چھوٹے شعرا اور ادیب کم غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس بلندی پر چڑھنے کی جرأت ہی نہیں کرتے جہاں بڑے شعرا قدم رکھ چکے ہیں، ہومر اور دوسرے شعرا کے ہاں اغلاط کی بھرمار ہے ۔ اس کی وجہ جلد بازی، زود نویسی اور لاپرواہی کے سوا کچھ نہیں ۔ سوفیکلیز کے بارے میں لانجائی نس کہتا ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے الفاظ سے آگ جلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن قارئین کے پاس دھوئیں کے سوا کچھ نہیں پہنچتا ۔ آخر میں لانجائی نس یہ رائے قائم کرتا ہے کہ چھوٹے ادیبوں اور شاعروں کی بعض تخلیقات بڑے اساتذہ کی تخلیقات سے کہیں بہتر ہیں ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ چھوٹے شاعر اساتذہ کی طرح لاپرواہی سے کام نہیں لیتے ۔

لانجائی نس مبالغہ (Hyperpbole) کے استعمال کے حق میں ہے ۔ اس سے فن پارے میں بلاغت پیدا ہوتی ہے لیکن مبالغے کو غیر فطری نہیں ہونا چاہیے ۔ شدید جذبات اور کسی حادثے کے موقع پر مبالغے سے کام لیا جاسکتا ہے اور یہاں یہ یقیناً فطری ہوگا ۔ قصیدے اور ہجو یہ نظم میں اس کا استعمال ضروری ہے ۔ اچھے کو اچھا اور برُے کو برُا ثابت کرنے میں مبالغہ بہت مددگار ثابت ہوگا ۔

انشا پردازی کا خاص ترتیب سے استعمال ترفع کے لیے ضروری شرط ہے اس میں سے ایک آہنگ پیدا ہوگا ۔ جس سے سامعین قائل ہوں گے اور ان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوگا ۔ نیز جس طرح بانسری کا گیت گانے والے کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح انشا اور الفاظ کے خاص استعمال سے جذبات نگاری میں مدد ملے گی ۔

لانجائی نس کا خیال ہے کہ جس طرح انسانی اعضا کی الگ الگ کوئی اہمیت نہیں ۔ سب مل کر انسانی جسم بناتے ہیں اسی طرح ترفع کے مختلف عناصر بھی الگ الگ کوئی اہمیت نہیں رکھتے سب یکجا ہوں تو رفعت اور فنی حسن پیدا ہوتا ہے ۔ ترفع کے لیے ضروری ہے کہ مختلف عناصر کو ہم آہنگ کیا جائے تاکہ فن پارے میں عظمت پیدا ہو ۔ لانجائی نس نے مشہور المیہ نگار یوری پڈیز کی مثال دے کر کہا کہ وہ بڑا شاعر تھا کیونکہ اسے فن پارے میں مختلف عناصر ہم آہنگ کرنے کا فن آتا تھا ۔

Euripides is a poet by virtue of his power of composition than of his ideas....

ترفع کے لیے لانجائی نس ناہموار اور عامیہ زبان کو مضر قرار دیتا ہے ۔ وہ ایسے الفاظ کے استعمال کے سخت خلاف ہے جو جذبات سے عاری ہوں اور ان میں صرف ظاہری نمائش اور شان موجود ہو ۔

لانجائی نس کا خیال ہے کہ اصول وضوابط کی بہت زیادہ پابندی بھی ترفع کے لیے خطرناک ہے ۔ کیونکہ جب خیالات بنے بنائے سانچوں میں ڈھلنے لگیں تو فطری عظمت اور فطری رابطہ قائم نہیں رہتا ۔ گھٹیا اور مبتذل زبان اعلیٰ خیالات کو

پست کردیتی ہے اور احساس ترفع قائم نہیں رہتا۔ایک شاعر کو چاہیے کہ موضوع کی نوعیت کے مطابق زبان کا استعمال کرے۔

We should use words that suit the dignity of the subject.

لانجائی نس اپنے مقالے کے آخر میں ادبی تخلیقات کے فقدان کا ذکر کرتا ہے اور سوال اٹھاتا ہے کہ کیا ادبی فن پاروں کے زوال کا سیاسی یا اخلاقی زوال سے کوئی تعلق ہے؟ اس کے عہد کے ایک فلسفی کی رائے میں اعلیٰ تخلیق فن پاروں کا زوال دراصل سیاسی زوال کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔اس کے مطابق اعلیٰ ادب اور خطابت جمہوریت کے زمانے ہی میں فروغ پاتے ہیں۔جمہوریت کا زمانہ عظیم روح کی پرورش کرتا ہے لیکن لانجائی نس اس سے اختلاف رکھتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ادبی فقدان کی اصل وجہ اخلاقی اور روحانی بدحالی ہے جب لوگ عیش اور دولت کے اسیر ہو جائیں تو وہ کمینے، ذلیل اور عیش پسند ہو جاتے ہیں۔دولت کی زیادتی انہیں کاہل اور بے حیا بنا دیتی ہے یہی اخلاقی زوال ہے جو اعلیٰ خیالات کی موت ہے۔جب اعلیٰ فکر نہ ہو تو اعلیٰ ادب کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔آزاد فضا میں انسان اپنے آپ کو سفلی جذبات اور پست خواہشات کا غلام بنا لیتا ہے امیروں کے بچے گستاخ اور خود سر ہو جاتے ہیں۔یہ سب کچھ آزادی کے ہاتھوں ہوتا ہے جو جمہوریت کی عطا ہے چنانچہ ایسے ماحول میں کوئی نہ کوئی پابندی ضروری ہے کیونکہ جمہوری عہد کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

بلائی ٹس

(Bilitis)

بلائی ٹس کا زمانہ 7 سو قبل مسیح کا زمانہ کہا جاتا ہے لیکن محققین اور تاریخ دان اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں یہ ایفروڈائٹی کے مندر کی پجارن تھی۔اسے یونانی شاعرہ سیفو کا ہمعصر کہا جاتا ہے۔

گیت

میں بستر کو ویسے ہی رہنے دونگی
جیساوہ چھوڑ کر گئی ہے
(بے ترتیب، شکن آلوداور سلوٹوں سے بھرا ہوا)
تا کہ اس کے جسم کا نقشہ بستر پر بنا رہے۔
کل تک میں غسل نہیں کروں گی
کوئی لباس نہیں پہنوں گی
بال نہیں بناؤں گی
مجھے ڈر ہے اس کے بدن کا لمس ختم نہ ہو جائے
میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی
نہ شام کو اپنے چہرے پر غازہ ملوں گی
نہ ہونٹوں پر سرخی لگاؤں گی
کہیں اس کے بوسے کا اثر ختم نہ ہو جائے
میں کھڑکیاں دروازے بند رکھوں گی
اس ڈر سے
کہ کہیں اس کی یادیں ہوا میں تحلیل نہ ہو جائیں

بلائی ٹس

بہت پرانی بات ہے کسی نے کہا تھا کہ دنیا کے اس ڈرائنگ روم میں لگی تصویروں میں سب سے زیادہ حسین اور دلکش تصویر عورت کی ہے اور اسی سے اس ڈرائنگ روم کے حسن کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ مصرع میری اس بات کی تائید کرتا ہے کہ:

''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''

قدرت کے اس کارخانے سے جو چیز بھی بن سنور کر بازار حیات میں آتی ہے اس میں عورت کے سلیقے کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ جس محفل میں چلے جایئے جس چیز کو دیکھئے، جس فن پارے پر نظر ڈالئے یہ سر نکال کر وہاں موجود ہوتی ہے۔ صرف ادب کا میدان ہی لے لیجئے یہ پورے قد کے ساتھ وہاں چہل قدمی کرتی نظر آئے گی۔ سیفو، میرا بائی، حبہ خاتون، جارج ایلیٹ، برانٹے سسٹرز، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور بانو قدسیہ غرض نام بولتے جایئے صفحہ بھرتا جائے گا۔ ان خواتین میں ایک خاتون بلائی ٹس (Bilitis) بھی ہے۔ جس کا زمانہ 7 سو قبل مسیح کا عہد ہے اور یہ مشہور یونانی شاعرہ سیفو کی ہم عصر تھی اور اس کے ہونے یا نہ ہونے پر ادبی تاریخ میں دلائل موجود ہیں۔ بلائی ٹس (Bilitis) کا زمانہ بقول فرانسیسی مصنف پیری لوئی 7 سو قبل مسیح کا زمانہ ہے اور جیسے کہ بلائی ٹس کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے بلائی ٹس اپنے زمانے کی مشہور شاعرہ تھی۔ عہد جدید بلائی ٹس اور اس کی شاعری سے ایک عرصہ تک لاعلم رہا۔ اس کا نام اور اس کا تخلیقی کارنامہ گمنامی کی گرد میں پڑا سسکتا رہا۔ 1876ء کا سال بلائی ٹس کی مقبولیت کا سال ثابت ہوا اور اس کا سہرا جرمنی کے پروفیسر (M.Heim) کے سر جاتا ہے۔

پروفیسر (M.Heim) پرانے آثار قدیمہ اور پرانے کھنڈرات میں بہت دلچسپی رکھتے تھے سالہا سال انہوں نے پرانی اینٹوں سے گفتگو کی۔ قدیم کھنڈرات پر لکھے تاریخی واقعات کا کھوج لگاتے رہے اور یہ کھوج لگاتے لگاتے وہ (Pale-o-Limsso) پہنچ گئے۔ یہ علاقہ موجودہ پورٹ سعید کے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ پرانے نوادرات کو تلاش کرتے کرتے وہ ایک کنوئیں کی تہہ میں اتر گئے، اس کنویں میں انہیں ایک دروازہ نظر آیا۔ پروفیسر صاحب نے وہ دروازہ کھلوایا اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر انہیں ایک مزار نظر آیا اور دیواروں پر لکھی ہوئی نظمیں۔ پروفیسر (Heim) یونانی زبان کے ماہر تھے۔ پتا چلا کہ یہ مزار یونانی شاعرہ بلائی ٹس کا ہے اور دیواروں پر لکھی نظموں کی وہی خالق ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ نظمیں کاغذ پر نقل کر لیں۔ یہ کل سو نظمیں تھیں۔ جرمنی جا کر انہوں نے ان نظموں کا جرمن زبان میں ترجمہ کر لیا اور 1896ء میں کتاب چھاپ دی۔ اپنے مواد، اسلوب اور ماحول کی مناسبت سے یہ نظمیں اپنی مثال آپ تھیں۔ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو گیا۔

فرانس کے مشہور مصنف پیری لوئی نے سب سے پہلے ان نظموں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اسی سال ایک فرانسیسی خاتون (Jean Berthory) نے ان نظموں کو شعری زبان دی۔ 1897ء میں دوبارہ ان کا جرمنی میں ترجمہ ہوا۔ سویڈن

اور (Czech) میں بھی ان کا ترجمہ کیا گیا لیکن انگریزی زبان میں ان نظموں کا ترجمہ 1904ء میں ہوا۔ ان نظموں کو نثری زبان دینے والے ڈاکٹر ہیوریس براؤن تھے۔ 1919ء میں مچل بک (Mitchell Buck) نے بڑی مہارت سے پیری لوئی کے ترجمے کو سامنے رکھ کر انہیں نظموں کا روپ دیا اور اس کتاب کا نام ''بلائی ٹس کے سوگیت'' رکھا۔ میں نے اردو زبان میں پہلی بار بلائی ٹس کو قارئین سے متعارف کرایا ہے اور ترجمے کے لیے میرے سامنے مچل بک (Mitchell Buck) کی کتاب ہے۔

مچل بک نے اپنے ترجمے میں پہلے دو صفحے کا ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ساری کی ساری نظمیں پیری لوئی کی لکھی ہوئی ہیں۔ بلائی ٹس نام کی کوئی خاتون شاعرہ سیفو کے زمانے میں نہیں گزری۔ پیری لوئی نے شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ نظمیں خود ہی لکھی ہیں...... مچل بک کی یہ دلیل بہت کمزور ہے۔ جب پیری لوئی نے یہ نظمیں جرمن زبان سے ترجمہ کیں تو وہ ایک مقبول مصنف بن چکا تھا۔ اسکا ناول ''ایفروڈائٹ'' کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ نظمیں پیری لوئی کی ہیں تو پھر وہ نظمیں کس کی ہیں جن کا پروفیسر (M.Heim) نے یونانی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور جو ڈچ اور سویڈن میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ یہ نظمیں بلائی ٹس ہی کی ہیں اور اگر نہیں بھی ہیں پھر بھی ان نظموں کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آسکی۔ نظموں کے اسلوب کی روانی، دلچسپی، عورت کی نفسیات، نظموں کا مواد، لہجے کی دلکشی، زبان کی شائستگی اور روانی ان تمام چیزوں نے مل کر ان نظموں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

میں جب ان نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے ان نظموں کے سحر نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بلائی ٹس کی ہر نظم ایک کہانی اور ایک افسانہ ہے، جس میں ابتدا، درمیان اور انجام تینوں کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ ہر نظم کسی نہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور واقعات کے کردار ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

بلائی ٹس کی یہ نظمیں ایک عورت کے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمری کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں، جس بے تکلفی، جرأت اور بے ساختہ پن سے بلائی ٹس نے اپنے لمحے لمحے کی کیفیت کو شعری روپ دیا ہے شاید آج کی عورت بھی یہ جرأت نہ کر سکے ان نظموں کا ایک سماجی اور معاشرتی پس منظر ہے۔ 7 سو سال قبل مسیح کا یونان جنگ اور بیرونی حملوں کی لپیٹ میں آیا ہوا یونان تھا۔ یونان کی سرحدوں پر ایرانی حملے مسلسل ہوتے تھے۔ ایران کی سلطنت اس زمانے میں مضبوط فوجی سلطنت تھی اور یونانی فوجیں باوجود جذبہ حب الوطنی کے ایران کو شکست دینے کی اہل نہ تھیں۔ اس زمانے کے ڈراما نگاروں کے ہاں لڑائیوں کے نقشے اور شکست کے مناظر اس چیز کا ثبوت ہیں، بھلا ہو سکندر اعظم کا جس نے ایران کو شکست سے دوچار کیا اور یونانی حکومت کا پرچم ایران میں لہرا دیا۔ یونانیوں کے قوانین اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر یونانی کو فوج میں شامل ہو کر جنگ لڑنی چاہیے۔ چنانچہ یونان کے 90 فیصد مرد فوج میں اپنا نام لکھواتے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ شہروں میں صرف عورتوں کا ہجوم رہ جاتا تھا۔ ان حالات میں عورت نے مختلف مشاغل ڈھونڈ لئے اور عورت سے عورت کا عشق زور پکڑ گیا۔ بلائی ٹس کی یہ نظمیں (She - to - She) کے تعلقات اور جذباتی تعلق کی آئینہ دار ہیں۔ سیفو سے یہ کام شروع ہوا اور بلائی ٹس نے اس کاروبار میں اپنا حصہ ڈالا۔ سیفو اور بلائی ٹس نے جوان لڑکیوں کو شاعری کا فن سکھانے کے لئے سکول کھول رکھے تھے اور اپنی اپنی پسند کی لڑکیاں ان سکولوں میں اکٹھی کر لی تھیں۔ بعض اوقات کسی خاص لڑکی پر دونوں کا جھگڑا بھی ہو جاتا تھا اور دشمنی آخری منزل تک پہنچ جاتی تھی۔ بلائی ٹس کو ایک جھگڑے کی وجہ سے اپنا شہر بھی چھوڑنا

پڑا تھا ان تمام جھگڑوں، جذباتی لڑائیوں کا ذکر بلائی ٹس کی نظموں میں موجود ہے۔

بلائی ٹس پمفیلیا کے دریا (Melas) کے کنارے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک یونانی تھا اور ماں فونی سیسن تھی۔ اس کی قبر پر لگے تین کتبے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کی قبر پر لگا پہلا کتبہ کچھ یوں ہے:

جس ملک میں موسم بہار سمندروں کے بطن سے جنم لیتا ہے
جہاں تہہ در تہہ بھوری چٹانیں
دریاؤں کو جنم دیتی ہیں
میں بلائی ٹس (Bilitis)
اس ملک میں پیدا ہوئی
میری ماں فونی سیسن
اور باپ یونانی تھا
ماں نے مجھے Byblos کے گیت سکھائے
جو نمودِ سحر کی طرح اداس تھے
سیفو سے میری شناسائی تھی
میں نے محبت کی اور محبت کے گیت گائے
اے پاس سے گزرنے والے
میں نے اگر زندگی ڈھنگ سے گزاری ہے
تو اپنی بیٹی سے میرا ذکر ضرور کرنا
میرے لئے کالی بکری کی قربانی نہ دے
شراب کے نذرانے کے طور پر بکری کے تھنوں کو محبت بھرے انداز سے میری قبر پر نچوڑ دے

بلائی ٹس کی نظموں سے اس کی کہانی کچھ یوں بنتی ہے کہ وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ اس گاؤں میں رہتی تھی جو کھاری جھیلوں، اداسی اور خاموشی سے گھرا ہوا تھا۔ بلائی ٹس کا بہترین مشغلہ بھیڑوں کو چراگاہوں میں لے جانا، چرخہ کاتنا اور پھول چن کر دیوی کے پیروں میں نچھاور کرنا اور گیت لکھنا تھا۔ وہ اپنی نظموں میں ماں کا ذکر بار بار کرتی ہے لیکن باپ کا ذکر اور نام کہیں نہیں لیتی۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ بلائی ٹس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی ماں کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ بلائی ٹس کا بچپن کھلی فضا، جنگل اور دریا کے کنارے گزرا۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں دوڑتی، پھولوں کے ہار پروتی، چشموں پر جاتی، جل پریوں کی کہانیاں سنتی اور پریوں کو دیکھنے کی خواہش اسے بے چین رکھتی۔ وہ چشمے پر نذرانے چڑھاتی ہے تاکہ اسے جل پری نظر آجائے۔ یہ سارا کچھ بلائی ٹس کی نظموں میں موجود ہے۔ وہ بڑے بوڑھوں سے یہ کہانیاں سنتی تھی۔ اس کی ایک نظم دیکھئے جس کا عنوان ''بوڑھا اور جل پری'' ہے:

''ہاں میں نے جل پریوں کو دیکھا ہے'' اندھے بوڑھے نے کہا
وہ Physos کے پرے تالاب پر کھڑی تھیں۔
پانی ان کے گھٹنوں کے اوپر اوپر تھا

ان کی گردنیں لمبے بالوں میں سے چمک رہی تھیں
ان کے ناخن جھینگر کے پروں کی طرح باریک تھے
ان کے سینوں پر پھولوں کے پیالے دھرے تھے
وہ پانی کی سطح پر انگلیاں چلا رہی تھیں
جیسے نادیدہ ٹوکری سے کنول کے پھول نکال رہی ہوں
ہوا ان کی کھلی ٹانگوں میں سے گزر رہی تھی
اور پانی کے دائرے دائرے آہستہ آہستہ بڑے ہو رہے تھے

اس دور کی نظموں میں فطرت کا حسن لفظ لفظ میں رچا ہوا ہے۔ درخت، پھول، تالاب، جھینگر، چڑیاں، کبوتر اور فطرت کے خوبصورت مناظر بھرے پڑے ہیں۔ جب وہ ان مناظر کو نظموں میں سموتی ہے تو فطرت کا ایک ایک ذرہ اپنے فطری حسن سمیت ہم سے ہمکلام ہونے لگتا ہے:

ہلکی پھوار، خاموشی، اور نفاست ہر چیز کو بھگو رہی ہے
بارش اب بھی ہو رہی ہے
میں ننگے پاؤں باہر جاؤں گی
تاکہ جوتی کیچڑ میں خراب نہ ہو
پھولوں سے لدی شاخیں
پانی سے تر پھول خوشبو سے معطر ہیں
جو مجھے بے حال اور مسحور کر رہے ہیں
یہ پھول راہوں میں نہیں روندے جانے چاہئیں
انہیں کیچڑ میں نہیں ملنا چاہیے
شہد کی مکھیوں کے لیے انہیں بچانا ہوگا
جھینگر اور گھونگے پانی کے گڑھوں میں
اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں
میں ان پر پاؤں نہیں رکھوں گی
نہ ہی اس سنہری چھپکلی کو خوفزدہ کروں گی
جو پلک اٹھا کر مجھے دیکھ رہی ہے

اور پھر بچپن نے جوانی کی چھت پر جا کر انگڑائی لی اور بلائی ٹس جوان ہوگئی اور اس کے گیتوں کا لہجہ بدل گیا اور وہ جسم کی پرستار بن گئی اور اپنے محبوب کی بانہوں میں جھولنے لگی۔ وہ کہتی ہے:

جب وہ واپس آیا میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا
''ڈرو نا۔ ہمیں کسی نے نہیں دیکھا''
''رات اور چاند نے'' میں نے کہا

اور پھر چاند نے جھیل کے پانی سے کہہ دیا
جھیل کے پانی نے یہ بات کشتی کے چپوؤں سے کہہ دی
چپوؤں نے کشتی سے
کشتی نے مچھیرے سے
بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا
لیکن مچھیرے نے ایک عورت سے کہہ دی
اب عورت میری ماں بہنوں سے کہہ دے گی
اور پورا (Hellas) جان جائے گا

بلائی ٹس نے نوجوانوں کو پیار کیا لیکن انکی طرف سے وفا کا دان نہ ملا اور پھر بلائی ٹس دوسری عورتوں کی طرح لڑکیوں کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ وہ اپنی نظم میں لکھتی ہے:

وہ مجھے انمول خزانے کی طرح کھیت میں سدا بہار درخت کے نیچے ملی تھی۔
گردن سے پیروں تک وہ گاؤن نما فراک میں ملبوس تھی۔
''میرا کوئی ساتھی نہیں'' اس نے کہا
''اور میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہوں''
میں نے کہا'' میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلتی ہوں
اگرچہ وہ جزیرے کے دوسری طرف ہے
جب تک تم مجھے گھر سے نکال نہیں دو گی
میں تمہارے ساتھ رہوں گی
تمہارے نرم ہاتھ اور آنکھیں نیلی ہیں
جو مجھے پسند ہیں۔''
میرے پاس کوئی سامان نہیں
بس Astarte دیوی کی یہ ننگی تصویر ہے
جو میرے نیکلس میں لٹک رہی ہے
میں اسے تمہارے کمرے میں رکھ دوں گی
اور ہر رات عقیدت کے پھول اس کے پاس رکھوں گی''

ایک خوبصورت لڑکی Mansidika اس کی محبوبہ تھی۔ یہی وہ لڑکی تھی جو اس کے اور بقول بلائی ٹس سیفو کے درمیان لڑائی کا باعث بنی اور بلائی ٹس کو اپنا شہر چھوڑنا پڑا۔ بلائی ٹس نے جوانی بہت ہنگامہ خیز محفلوں میں گزاری اس کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات کی طرح گزری اور زندگی کے پل پل کو خوش و خرم انداز میں گزارا اور ماں کی وہ نصیحت بھول گئی جو وہ بلائی ٹس سے اکثر کیا کرتی تھی۔

میری ماں مجھے سائے میں نہلاتی ہے

چمکتے سورج میں مجھے لباس پہناتی ہے
دیئے کی روشنی میں میری چٹیا بناتی ہے
لیکن اگر میں چاندرات میں گھر سے باہر جانے لگوں
تو میرے کمر بند میں دو مضبوط گرہیں دے دیتی ہے
اور مجھے کہتی ہے
کنواری دوشیزاؤں سے کھیلا کرو
بچوں کے ساتھ دھوم مچاؤ
لیکن کھڑکی سے جھانک کر کبھی نہ دیکھو
نوجوان لڑکوں کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا
اور نہ کبھی بیوہ عورتوں کی باتوں میں آنا......''

بلائی ٹس نے ماں کی نصیحت کی طرف دھیان نہ دیا اور اپنی ہری بھری کھیتی برباد کر بیٹھی ......وہ خانقاہ میں گیت گاتی تھی۔ رقص کرتی تھی اور لوگ اس کے حسن اور شاعری کی داد دیتے تھے۔ مگر جب ادھیڑ عمری کے سائے اس پر پڑنے لگے تو سب نے آنکھیں پھیر لیں اور وہ شاعری میں گئے وقت کو یاد کرتی رہی۔

بلائی ٹس کی نظموں کی بے شمار خصوصیات ہیں۔ ان میں اس عہد کی عورتوں اور مردوں کی سائیکی بھی ہے۔ ماحول کے ہنگامہ خیز مناظر بھی ہیں۔ غربت اور افلاس کی عورتوں کی حالت زار بھی ہے اور گدھ صفت مردوں کی ذہنیت بھی ہے کہ وہ کس طرح عورتوں کی بھیڑ بکریوں کی طرح خرید وفروخت کرتے تھے۔ بلائی ٹس نے اپنی نظموں میں اس مکروہ اور غلیظ رسم کی طرف اشارے کئے ہیں جو ان نظموں کی اہمیت کو بڑھا دیتے ہیں

ایک نظم گدھ دیکھئے:

''کون''

''میں عورتوں کا بیوپاری Plango ہوں۔ دروازہ کھولو
اس بار میں تمہارے لئے خوش بختی کے نذرانے لایا ہوں۔
دیکھو پہلا نذرانہ یہ دوشیزہ Phanion ہے
یہ قد میں ذرا چھوٹی ہے
مگر خوبصورت ہے
اسے 80 گیت آتے ہیں
اور یہ رقص کی ماہر ہے
ذرا گھومو، ہاتھ اوپر اٹھاؤ
بال کھولو، پیر دکھاؤ، مسکراؤ
اب اسے دیکھو
اس کی قیمت

ایک Mina
ٹھیک ہے سودا پکا۔ جاؤ اندر جا کر نہاؤ، کپڑے بدلو
یہ لو ایک Mina۔ جاؤ خدا حافظ''

بلائی ٹس کی ہر نظم ایک افسانہ، ایک کہانی، ایک حکایت ہے اور یہ سب ایسی کہانیاں ہیں جن میں بلائی ٹس کے عہد میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں۔ بلائی ٹس جب اپنی زندگی سے تھک گئی اس کی جوانی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور اسے دیکھنے والوں نے آنکھیں پھیر لیں تو اس نے محبت کی دیوی کے نام آخری گیت لکھا اور شاعری چھوڑ دی۔

آخری گیت

اے بے رحم سنگدل دیوی ایفروڈائٹی
کیا تیری یہی مرضی تھی کہ میرا خوبصورت چہرہ
اور گھنیرے بال چند دنوں میں ساتھ چھوڑ دیں
میں اب مُردوں سے بھی بدتر ہوں
آئینے میں چہرہ دیکھتی ہوں
نہ وہ مسکراہٹ ہے نہ ہی آنسو
کیا یہی چہرہ تھا جس نے Mnasidika کو چاہا تھا
میں نے اپنے تراشے ہوئے بال
آزار بند میں باندھ لئے ہیں
اے لافانی Eros میں یہ تجھے پیش کرتی ہوں
اور ہمیشہ تمہاری مداح رہوں گی
مقدس بلائی ٹس کا یہ آخری گیت ہے

یہ آخری گیت لکھ کر وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔ سہیلیوں نے اسے بڑی محبت سے دفنایا۔ خوشبو کی شیشی، نیکلس، آئینہ اس کے تابوت میں رکھ دیا۔ اور محبت کے گیت گانے والی ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی بھلا ہو پروفیسر M.Heim کا جنہوں نے اس کا مزار تلاش کر کے اور نظموں کا ترجمہ کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔

آخر میں بلائی ٹس کی ایک نظم دیکھئے جو 2700 سال گزرنے کے بعد بھی آج کی نظم لگتی ہے۔

میں بستر کو ویسے ہی رہنے دوں گی۔ جیسا وہ چھوڑ کر گئی ہے
(بے ترتیب۔ شکن آلود اور سلوٹوں سے بھرا ہوا)
تا کہ اس کے جسم کا نقشہ بستر پر بنا رہے
کل تک میں غسل نہیں کروں گی
کوئی لباس نہیں پہنوں گی۔ بال نہیں بناؤں گی
مجھے ڈر ہے کہیں اس کے بدن کا لمس ختم نہ ہوجائے
میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی نہ شام کو

اپنے چہرے پر غازہ ملوں گی
نہ ہونٹوں پر سرخی لگاؤں گی
کہیں اس کے بوسے کا اثر نہ ختم ہو جائے
میں کھڑکیاں دروازے بند رکھوں گی

اس ڈر سے
کہ کہیں اس کی یادیں ہوا میں تحلیل نہ ہو جائیں۔
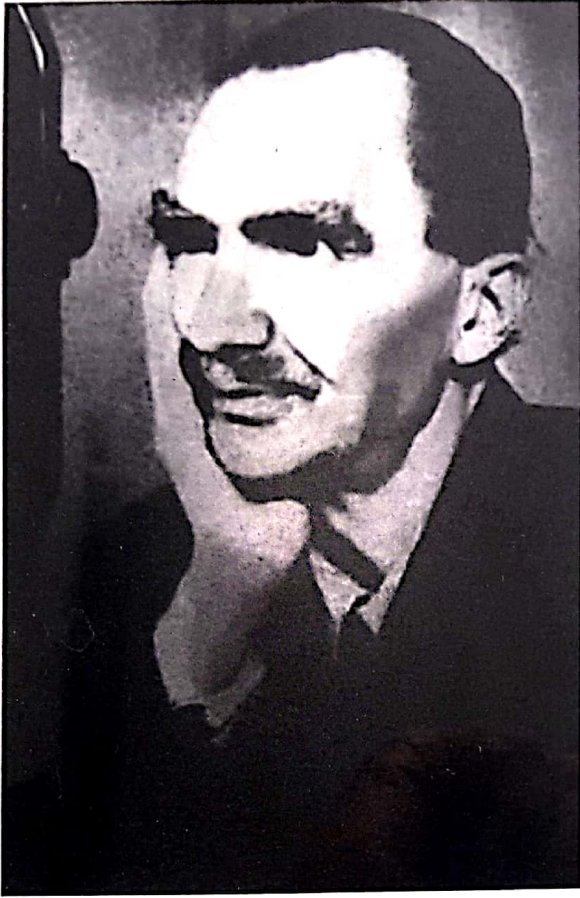
کازان زاکیز
(Nikos Kazantzakis)

بیسویں صدی کا جدید یونانی شاعر ناول نگار جو عالمی شہرت رکھتا ہے ''زوربا، دی گریک'' اس کا مقبول ناول ہے۔ ''اوڈی سی، اے ماڈرن سیکوئل'' اس کا مثالی شعری کارنامہ ہے۔

''انعام تو مجھے مل گیا لیکن کازان زاکیز اس انعام کا مجھ سے سوگنا زیادہ حق دار ہے۔''

(نوبل انعام ملنے پر کامیو کا اعتراف)

....

''اوڈی سی، اے ماڈرن سیکوئل'' انسانی دماغ کا ایک لافانی کارنامہ ہے۔ جس میں روحانی تجربات کو یکجا کیا گیا ہے۔''

(Preve Luis)

....

''اب مجھے کوئی خوف نہیں، کوئی خواہش نہیں۔ اب میں آزاد ہوں۔''

(کازان زاکیز کی قبر کا کتبہ)

....

''وہ ہمیشہ سفر پر رہتا تھا۔ سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ دانتے کا چھوٹا سا مجسمہ رہتا تھا جو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہا۔''

(ہیلن کازان زاکیز)

کازان زاکیز

1957ء میں نوبل انعام کے لیے دو لکھنے والوں کے درمیان ووٹ ڈالے گئے۔ البر کامیو (Alber camus) نے ایک ووٹ زیادہ حاصل کیا اور نوبل انعام کا حق دار قرار پایا۔ ایک ووٹ سے شکست کھانے والا یونان کا جدید مصنف کازان زاکیز (Kazantzakis) تھا۔ انعام لیتے وقت کامیو نے کہا۔

''انعام تو مجھے مل گیا ہے لیکن کازان زاکیز اس انعام کا مجھ سے سوگنا زیادہ حق دار ہے۔''

یونان کے مہان لکھاری ہومر سے عمر میں تقریباً پونے دو ہزار سال چھوٹا کازان زاکیز سمجھ لیں دوسرا جدید ہومر تھا یا یوں کہہ لیں کہ قدیم ہومر سے کچھ لکھنے کا کام باقی رہ گیا تھا، چنانچہ وہ کازان زاکیز کے روپ میں دوبارہ پیدا ہوا اور جدید یونانی زبان میں شاہکار لکھ ڈالے۔

ہومر نے (Odyssey) لکھی کازان زاکیز نے اس سے تین گنا بڑی The odyssey a modern sequel لکھ دی۔ ہومر کو یونان سے بہت پیار تھا۔ وہ قدیم یونان کی تہذیب اور ثقافت کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ کازان زاکیز نے بھی اس محبت کی ڈور تھامے رکھی اور جب اپنی جائے پیدائش (Crete) چھوڑ کر دنیا کے سفر پر نکلا تو کہا:

''جب میں مر جاؤں تو مجھے (Crete) میں دفن کیا جائے۔''

کازان زاکیز نے ہومر کی طرح یونان کی زندگی، ثقافت اور تہذیب پر بے شمار کتابیں لکھیں اور اس زمین اور زمین کے لوگوں سے رشتہ قائم رکھا۔

کازان زاکیز جدید یونان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مصنف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جدید زبان کی وجہ سے ابتدا میں اسے یونان سے باہر بہت کم پڑھا گیا لیکن جب اس کے تراجم بیرونی زبانوں میں ہوئے تو اس کی بہت پذیرائی ہوئی (اس نے بے شمار ناول اور کتابیں فرانسیسی زبان میں لکھیں کیونکہ عمر کا ایک طویل عرصہ اس نے فرانس میں گزارا۔)

کازان زاکیز کریٹے میں فروری 1818ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت یونان پر عثمانیہ خاندان کی حکومت تھی۔ اس کے نام کا ایک حصہ ترکی زبان کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ Kazantzakis ترکی زبان کے لفظ Kazanci سے لیا گیا ہے۔ Kazan کا مطلب انگریزی زبان میں Cauldron اور اردو میں پتیلا یا دیگ ہے اور Ci کا مطلب Agent Suffix ہے۔ Kazanci کا مطلب دیگ بنانے والا، مرمت کرنے والا یا بیچنے والا ہے۔

کازان زاکیز کی ابتدائی تعلیم کریٹے میں ہوئی اور پھر وہ 1902 میں قانون پڑھنے ایتھنز (Athens) چلا گیا۔ 1907ء میں فلسفہ پڑھنے پیرس چلا گیا اور 20 ویں صدی کے مشہور فلسفی ہنری برگسان (Henri Bergson) کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ برگسان کے نظریات کا اثر ساری زندگی اس کی تحریروں پر رہا۔ برلن میں قیام کے دوران وہ لینن کے خیالات کے زیر اثر آ گیا۔ سوویت یونین کا دورہ کیا۔ حزب مخالف کے قائد اور مصنف وکٹر سرگی (Victor Serge) کے

ہاں قیام کیا لیکن سوشلسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ کازان زاکیز کی زندگی کا یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے قومی جذبات اور نظریات نے آفاقی جذبات اور نظریات کا روپ دھار لیا۔

کازان زاکیز نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ وہ پاؤں میں سفر کی پازیب پہن کر پیدا ہوا تھا۔ ہر وقت سفر، سفر اور سفر۔ اس نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے:

I am a marine of odysseus.

اوڈی سی لیس کے جہاز کا یہ ملاح کبھی ٹک کر گھر نہ بیٹھا۔ چین، جاپان، روس، سپین، انگلستان، فرانس اور دوسرے ممالک کے سفر کیے اور شاندار دلچسپ سفر نامے لکھے۔ اس کی بیوی ہیلن (Helen) اس کی بائیوگرافی میں لکھتی ہے۔

''وہ ہمیشہ سفر پر رہتا تھا۔ سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ دانتے (Dante) کا چھوٹا سا مجسمہ رہتا جو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہا۔''

کازان زاکیز نے سٹالن کا عروج و زوال دیکھا۔ 1945ء میں یونانی حکومت میں وزیر بے محکمہ رہا۔ 1946ء میں یونان کی رائٹر کلب کا صدر منتخب ہوا۔ 48-1947 کے دوران UNEC میں کام کیا۔ 1957ء میں اسے بہت سی بیماریوں نے گھیر لیا مگر سفر کا شوق نہ چھوڑا اور وہ بیماری کے باوجود جاپان اور چین کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ واپسی پر لیوکیمیا کی بیماری شدید ہوگئی اور وہ جرمنی میں فوت ہوگیا۔ وصیت کے مطابق اسے کریٹے میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر کا کتبہ اسی کے لکھے ایک جملے کو بنادیا گیا۔

اس کی قبر کا کتبہ آج بھی اس کے منفرد خیال اور سوچ کی ترجمانی کر رہا ہے۔

''اب مجھے کوئی خوف نہیں، کوئی خواہش نہیں اب میں آزاد ہوں''

کازان زاکیز کی تخلیقی زندگی بہت بھرپور ہے وہ ایک ان تھک لکھنے والا تھا جس کی ایک مثال اس شعری تصنیف The Odyssesy- A Modern sequel۔ جو 24 کتابوں پر مشتمل اور اشعار کی تعداد 33,333 ہے۔

کازان زاکیز نے 1906ء میں اپنی تخلیقی زندگی کا سفر شروع کیا۔ پہلی کہانی Serpent And Lily تھی۔ پیرس کے قیام کے دوران ایک المیہ "The Master Builder" لکھا۔

کازان زاکیز نے گوئٹے کے ڈرامے ''فاؤسٹ'' اور دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کا جدید یونانی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کے علاوہ بے شمار مضامین، ناول، ڈرامے لکھے لیکن 1924ء میں اس نے اس شاہکار کی بنیاد رکھی جو اس کا اعلیٰ ترین شعری کارنامہ ہے اور اس کا نام (The Odyssey A Modern Sequel) ہے۔ جس کے بارے میں اس کے ایک نقاد کا کہنا ہے:

''یہ انسانی دماغ کا ایک لافانی کارنامہ ہے جس میں روحانی تجربات کو یکجا کیا گیا ہے۔''

اس نقاد کا نام Preve Lakis ہے جو خود بھی اپنے عہد کا ایک نامور مصنف تھا۔

کازان زاکیز کی یہ طویل ایپک (Epic) ہومر کی اوڈی سی کی (Extention) ہے جس میں کازان زاکیز نے خود کو اوڈی سی لیس میں ڈھال کر کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

اس Epic کی کہانی ہومر کے فریم ورک کے عین مطابق ہے۔ 24 کتابوں پر مشتمل ہے اور ہومر کی Epic سے تین گنا زیادہ طویل ہے۔

اوڈی سی لیس ہیلن (Hellen) کو ٹرائے کی تباہی کے بعد واپس لاتا ہے۔ سمندری مصیبتیں برداشت کر کے اپنی ریاست میں واپس آتا ہے۔ بیٹے کے ساتھ مل کر دشمنوں کا خاتمہ کرتا ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کرتا ہے لیکن ایک بے چینی بے تابی ہر پل اسے گھیرے رکھتی ہے۔ وہ سفر کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ قیام اور ٹھہراؤ اسے زہر لگتا ہے۔ اوڈی سی لیس کی یہ بے تابی اور دوبارہ سفر پر جانے کا جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب اس کی بیوی پینی لوپ (Penelope) بھی اس کی تنہائی میں ایک وحشت اور جبر محسوس کرتی ہے۔ اوڈی سی لیس کو بھی محسوس ہوتا ہے جیسے

"His Own Native Land is the most Lethal Mask of Death, A Confing Prison with an aging wife and prudent son"

اوڈی سی لیس کو اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے ٹرائے میں اس کے ہاتھوں سے مارے جانیوالے لوگوں کی روحیں، وہ عورتیں جن کے ساتھ وہ سویا، ان کے بچے، جن آدمیوں کو اس نے قتل کیا۔ ان تمام لوگوں کی روحیں ہاتھوں میں مشعلیں لے کر اس کے محل کو جلانے کیلئے آرہی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک رات بغیر اپنے بیٹے اور بیوی کو ملے اگا تھا ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیتا ہے اور ایک انجانے سفر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

سب سے پہلے وہ سپارٹا (Sparta) جاتا ہے۔ جس ہیلن کو اس نے ٹرائے کے پیرس سے چھڑا کر میلینس کو واپس کیا تھا اسے اغوا کرتا ہے۔ واپس ٹرائے لے جاتا ہے۔ بادشاہت کے خلاف بغاوت ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کریٹے سے مصر کی طرف روانہ ہوتا ہے جہاں مزدوروں کی ہڑتال ہے۔ دریائے نیل کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اس کے ساتھی کیمپ لگاتے ہیں مگر وہ خود پہاڑی پر چڑھتا ہے تاکہ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر خدا کی طرف دھیان لگا سکے۔ پہاڑی سے اتر کر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق شہر آباد کرتا ہے۔ جسے ایک شدید زلزلہ برباد کر دیتا ہے۔ اوڈی سی لیس اپنی ناکامیوں پر نوحہ کناں ہے۔ اپنے ساتھیوں کی قربانی دے کر اپنے جذبے کا اظہار کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ شاید اس طرح اسے خدا مل جائے۔ اب وہ سنیاسی، زاہد اور فقیر بن چکا ہے۔ اس کی ملاقات (Motherth) سے ہوتی ہے۔ جو گوتم بدھ کا دوسرا جنم ہے۔ جنوبی افریقہ کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ وہاں ایک دیہات میں رہنا شروع کرتا ہے اور پھر ایک آئس برگ اس پر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ موت اسے اگا تھا میں تین اشکال میں نظر آئی تھی۔ وہ موت سے بچ کر وہاں سے بھاگا تھا۔ آخر مدت نے اسے آ پکڑا اور وہ دائمی نیند سو گیا۔

کازان زاکیز کی یہ (Epic) اپنے شعری حسن، فنی باریکیوں، فکری مواد کی بنا پر اس کا ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے جو جدید یونانی ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ کازان زاکیز نے اس طویل ایپک پر 14 سال صرف کئے۔ 1924ء میں شروع کی اور یہ 1938 میں چھپ کر لوگوں کے سامنے آئی۔ کازان زاکیز نے سات بار اسے مختلف انداز میں لکھا اور نوک پلک درست کی۔ انگریزی زبان کے قارئین کیلئے اسے Kimon Friar نے 1958ء میں ترجمہ کیا۔ اردو زبان کے قارئین اس ایپک سے بہت کم تعداد میں واقف ہیں۔ اس طویل ایپک کو کسی نے ابھی تک ترجمہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

عالمی ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین سے کازان زاکیز کا تعارف اس کے اہم ترین ناول Zorba the greek نے کرایا۔ ادب کے نقادوں نے اس ناول کو بہت سراہا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے۔ ''زوربا، دی گریک'' کا انگریزی میں ترجمہ 1946ء میں کیا گیا۔ یہ ناول ایک ایسے دانشور اور مصنف کی کہانی ہے جو zorba کی ذہانت فوک wisdom اور گفتگو کے سامنے کتابوں کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور زندگی اور فلسفہ زندگی زوربا کی باتوں سے سیکھتا

ہے۔مصنف کی ملاقات زوربا سے خزاں کے موسم میں ایک کیفے میں ہوتی ہے۔مصنف دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' پڑھنے کے لیے کھولتا ہے کہ 60 سال کا ایک بوڑھا zorba نوکری کی تلاش میں اس کے پاس آتا ہے۔مصنف اس کے نظریات، بات چیت، عادات سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اسے ملازم رکھ لیتا ہے۔کریٹے کے سفر کے دوران زوربا مختلف موضوعات پر اپنی رائے دیتا ہے۔

کریٹے پہنچ کر کان میں کام شروع ہوتا ہے (کہانی بیان کرنے والا اور مصنف دونوں ایک ہی شخصیت ہے جو مزدوروں کے قریب ہوکر ان کے حالات جاننا چاہتا ہے۔وہ ان مزدوروں کیساتھ نرم لہجے میں بات کرنا چاہتا ہے مگر زوربا اسے منع کر دیتا ہے۔

''یہ بہت وحشی ہیں ان کے ساتھ سختی سے بات کرو یہ تمہاری تابعداری کریں گے لیکن اگر پیار سے بات کرو گے تو تمہاری آنکھیں نکال دیں گے''

زوربا خود بھی کام میں مصروف رہتا ہے جب وہ کام کرتا ہے تو صرف کام کی طرف دھیان دیتا ہے۔وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کے کام میں رکاوٹ نہ بنے۔زوربا بہت بولتا ہے اور طویل گفتگو کرتا ہے۔دانش ور مصنف کو زوربا کی باتوں سے وہ حاصل ہوتا ہے جو کتابیں اسے نہ دے سکیں۔اور پھر پہاڑی سے وادی میں لوٹ جانے کے لیے مصنف زوربا سے جدا ہوتا ہے۔یہ احساس لے کر کبھی زوربا کو نہیں بھلا سکے گا اور اسے ہمیشہ زوربا کی یاد آئے گی۔

زوربا کا اپنا تجربہ اپنا مشاہدہ اور اپنا نظریہ حیات ہے مثلاً مصنف اس سے پوچھتا ہے

''تمہارا پسندیدہ کھانا کونسا ہے؟''

''ہر کھانا مجھے پسند ہے''

اور پھر بات کو آگے بڑھا کر کہتا ہے

''دنیا میں ہر چیز اچھی ہے ایک کو اچھا اور دوسرے کو برا کہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

''خوشی کیا ہے؟''

زوربا جواب دیتا ہے:

''جام شراب، بھنا ہوا مرغ، گرم انگیٹھی، سمندر کی لہروں کا گیت، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

اور اس خوشی کو زوربا نے پھر کہا۔

''ایک صبر کرنے والا دل ہی محسوس کر سکتا ہے''

یہ ناول بہت پسند کیا گیا۔1964ء میں اس پر ایک فلم بھی بنی۔ٹیلی ویژن پر ڈرامائی شکل بھی دی گئی اور اس ناول پر ایک میوزیکل ڈراما بھی بنایا گیا۔

کازان زاکیز نے بے شمار سفرنامے بھی لکھے، کئی ناول لکھے، کئی ڈرامے لکھے۔اس کا باپ آزادی کی تحریک کا ممبر تھا۔

کازان زاکیز نے بھی سیاست کا رخ کیا مگر جلد ہی کنارہ کش ہوگیا۔وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے۔

''یہ دیکھ کر کہ میں سیاسی میدان کا ایک بڑا کھلاڑی ہوں میں نے یہ میدان چھوڑ دیا اور لکھنے کی طرف توجہ دی۔میں اپنے باپ کے نظریات کو اپنے ناولوں کا حصہ بنانا چاہتا تھا''

یوں تو کازان زاکیز نے بے شمار ناول اور ڈرامے لکھے ہیں۔دانتے اور گوئٹے کے تراجم کیے ہیں۔سوشل موضوعات

پر مضامین لکھے ہیں۔مگر اس کی عالمی شہرت اس کی چار کتابوں سے بنی

1) The odyssey, a modren sequel
2) Zorba the greek
3) Freedom or death
4) The last temptation of christ

اس کا ناول آزادی یا موت جدوجہد آزادی کی تحریک کے بارے میں ہے اور اس میں اس نے باپ کے نظریات اور عملی سرگرمیوں کو موضوع بنایا ہے۔

The last temptation روح اور جسم کی کش مکش کا قصہ ہے۔کازان زاکیز نطشے، برگساں اور گوتم بدھ کے نظریات کا پیروکار تھا اس کے اس ناول میں ان کا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ روح اور بدنی ضرورتوں کی جنگ بھی جاری ہے۔کازان زاکیز کا خیال ہے کہ کرائسٹ کی کچھ جذباتی اور نفسانی ضرورتیں بھی تھیں کیونکہ وہ انسان تھے۔برائی، گناہ اور ثواب کی کش مکش اس ناول میں ساتھ ساتھ چلتی ہے یہ ناول چھپا تو مذہبی حلقوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں چرچ اس کے خلاف ہو گئے اور چاروں طرف ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔جب کریک کے حلقوں نے اس کے خلاف فتوے دیئے تو اس نے جواب دیا:

"You gave me curse, holy father, give you a blessing"

لیکن احتجاج ختم نہ ہوا اور vatican سٹی نے یہ کتاب ban کر دی تو کازان زاکیز نے صرف ایک بات کہی۔

''اے خدا میں انصاف طلب کرنے کے لیے تیرے دربار میں اپیل کرتا ہوں''

کازان زاکیز بحیثیت شاعر اور بحیثیت ناول نگار دنیا کے ادب میں بڑا اہم مانا جاتا ہے۔اس کی شاعرانہ عظمت سے روشناس ہونے کے لیے اس کی epic کا مطالعہ بہت ضروری ہے جس میں اس نے ہومر homer کی طرف شاعرانہ باریکیوں سے نظر نہیں چرائی بس پرانی زبان کو چھوڑ کر جدید یونانی زبان کا سہارا لیا ہے۔24 حصوں میں تقسیم اس epic کا کوئی حصہ نکال لیں شعری سخن کہیں ماند نہیں پڑتا۔اس ایپک کو اس نے سات بار لکھا اور 12 سال کا عرصہ اس میں صرف کیا اور یہ محنت اس کی ایک ایک سطر میں دکھائی دیتی ہے۔

بحیثیت ناول نگار اس نے یونان کی ثقافت تہذیب اور ماحول کو برقرار رکھا ہے زوربا دی گریک میں کان کے مزدوروں کی زندگی کے نقشے، فطرت کی عکاسی اور وہ بھی زوربا کی زبانی (جو بادشاہ ہے) مشاہدے اور تجربات کازان زاکیز کی اپنی فکری چھاپ۔یہ سب چیزیں ہیں جو اسے بڑا ناول نگار بناتی ہیں۔

کازان زاکیز کا سارا کام اگر سامنے رکھا جائے اور اسے پرکھا جائے تو کامیو کی اس بات پر یقین کرنا پڑتا ہے جو اس نے نوبل انعام لیتے وقت کہی تھی کہ

''انعام تو مجھے مل گیا ہے لیکن کازان زاکیز اس انعام کا مجھ سے سو گنا زیادہ حق دار ہے''

ورجل

(Publius Vergilius Maro)

پہلی صدی قبل مسیح کا عظیم رومی شاعر جسے اہل روم ہومر سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ ایلیڈ اس کی مشہور زمانہ ایپک ہے۔ وہ ہومر سے متاثر تھا۔ دانتے اسے اپنا گرو اور استاد تسلیم کرتا ہے۔

میرے نقاد مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ہومر سے خیال اور شعر چراتا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ کام وہ خود کیوں نہیں کرتے۔ اگر وہ کریں تو انہیں پتہ چل جائے کہ ہرکولیس کے ہاتھ سے تلوار چھیننا آسان ہے لیکن ہومر سے مصرع چرانا ناممکن ہے۔

(ورجل)

....

اے یونانیو سنبھل جاؤ
ایلیڈ سے بڑی نظم
پیدا ہو چکی ہے

(ورجل)

....

میری مثال اس سفید ریچھنی کی ہے جو اپنے بچے کو چاٹ چاٹ کر سفید بناتی ہے۔ میں بھی اپنے مصرع کو بار بار لکھ کر خوبصورت بناتا ہوں۔

(ورجل)

ورجل

ورجل انگریزی اور ساری دنیا میں اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ روم (Rome) میں پیدا ہونے والے اس شاعر کا اصل نام Publius Vergilius Maro تھا۔ ورجل کو روم کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور مقبولیت میں اسے نقاد ہومر کے پائے کا شاعر تسلیم کرتے ہیں بلکہ کچھ نقاد (جن کا تعلق روم سے ہے) تو اسے ہومر سے بھی بڑا شاعر مانتے ہیں جو شاید ان کا جذباتی فیصلہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عظیم شاعر تھا۔ وہ ایسا شاعر تھا جس سے دانتے اور ملٹن جیسے شاعروں نے اثر قبول کیا۔

روم میں ورجل کو ایک پیر اور روحانی شخصیت کا درجہ حاصل تھا۔ عقیدت کا یہ سلسلہ اس کی پیدائش سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ روم میں اس کی پیدائش کے بارے میں ایک ایسی کہانی مشہور ہو گئی جس پر ہر چھوٹا بڑا یقین کرتا تھا۔

ورجل ایک کسان کا بیٹا تھا۔ اس کسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک زمیندار کا نوکر تھا۔ اپنی ذہانت اور کاروباری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس نے شہد کی مکھیاں پال کر، بھیڑ، بکریوں کی تعداد میں اضافہ کر کے زمیندار کو بڑا مالی فائدہ پہنچایا۔ زمیندار نے خوش ہو کر اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی جو ورجل کی ماں بنی۔ جب ورجل اس کے پیٹ میں تھا تو اس نے خواب دیکھا کہ اس نے بچے کی بجائے ایک سبز شاخ کو جنم دیا ہے، جوں ہی وہ شاخ زمین پر گری، گرتے ہی ایک تن آور درخت بن گئی جس پر دیکھتے ہی دیکھتے پھل اور خوبصورت رنگوں کے پھول کھل گئے۔ دوسرے دن وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایک دوسرے گاؤں جا رہی تھی، اچانک اسے درد شروع ہو گئے وہ ایک درخت کے پیچھے چھپ کر لیٹ گئی اور یوں ورجل کی پیدائش ہوئی۔ ورجل بالکل نہیں رویا۔ اس کے چہرے پر ایک نور تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ورجل کی ماں نے اس جگہ جہاں ورجل پیدا ہوا تھا ایک شاخ زمین میں گاڑھ دی اور شاخ فوراً خواب والا درخت بن گئی۔ جسے لوگوں نے ''شجر ورجل'' کہنا شروع کر دیا۔ حاملہ عورتوں نے اس درخت کو عقیدت سے پوجنا اور اس کے پاس آ کر منتیں ماننا شروع کر دیں۔ درخت پر پھول ہر موسم میں کھلتے رہتے تھے۔ یہ کہانی عقیدت مندوں نے بنائی ہو یا محبت میں پھیلائی ہو، ایک بات اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ ورجل کی شاعرانہ عظمت کے پھول واقعی اب تک کھلے ہوئے ہیں اور اسکی شہرت کے درخت پر کھلے پتے صدیاں گزر جانے کے بعد بھی سرسبز اور تر و تازہ ہیں۔

ورجل کا بچپن دیہاتی ماحول میں گزرا۔ ہوش سنبھالا تو اس کے اردگرد بکریوں، بھیڑوں، گائے، بھینسوں اور گھوڑوں کا ایک ہجوم تھا۔ ورجل نے اس ماحول سے بہت کچھ سیکھا اور اسے اس نے اپنی شاعری میں استعمال کیا۔

ورجل بڑا شرمیلا، ڈرپوک اور بزدل تھا۔ اسے لڑائی جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ایک محبت کرنے والا صلح پسند انسان تھا۔ اسے دیہاتیوں کے لطائف اور چٹکلوں سے دلچسپی تھی۔ اس کے دوست اور جاننے والے اسکی بزدلی، شرمیلے پن سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کا نام ورجل کی بجائے (Virgin) یعنی کنواری اور شرمیلی لڑکی رکھ دیا تھا۔ وہ بہت آہستہ آواز میں بات کرتا تھا۔ لہجے میں بڑا کورا پن تھا۔ کبھی کبھی گمان ہوتا تھا جیسے کوئی ان پڑھ آدمی باتیں کر رہا ہے۔

ورجل کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ وہ جس سکول میں پڑھتا تھا وہاں کے ایک استاد کا نام بالستا (Ballista) تھا۔ بالستا کو چوری چکاری کا شوق تھا۔ وہ راہ چلتے مسافروں کو لوٹتا تھا، ایک دن اس کی چوری پکڑی گئی۔ لوگوں نے اسے پتھر مار مار کر مار دیا۔ ورجل نے پہلی بار ایک قطعہ اپنے اس استاد کے بارے میں کہا۔ قطعہ یہ تھا:

پتھروں کے اس ڈھیر کے نیچے
بالستا نامی چور دفن ہے
اب مسافر بلا خوف وخطر
اپنے اپنے راستے پر آ جا سکتے ہیں

اس کے بعد اس نے چھوٹی چھوٹی کئی نظمیں لکھیں، ان میں سے صرف ایک نظم دلچسپ کہانی کیوجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی۔ اس نظم کا عنوان کیولکس (Culex) ہے۔ اس کہانی کا کردار بھی دیہاتی زندگی سے لیا گیا ہے۔ ایک چرواہا تھک ہار کر دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ اسے نیند آ گئی۔ اسی دوران ایک سانپ اس کی طرف بڑھا۔ سانپ چرواہے کو ڈسنا چاہتا تھا کہ ایک چھوٹی سی چمگادڑ نے چرواہے کے منہ پر کاٹ لیا۔ چرواہا اٹھ کر بیٹھ گیا اور سانپ کو مار کر اپنی جان بچالی۔ اس کارروائی میں چمگادڑ بھی مر گئی۔ چرواہے نے چمگادڑ کو دفن کر دیا، اسکی باقاعدہ قبر بنادی اور اس پر کتبہ لگا دیا۔ ورجل کی اس نظم کے آخری مصرعے کچھ یوں ہیں:

اے ننھی جان
تو چرواہے کی عقیدت کی مستحق ہے
وہ تجھے سلام کرتا ہے کہ تو نے اس کی زندگی بچائی
اور اب وہ تیری تجہیز وتکفین کی
پوری رسومات ادا کرتا ہے

ورجل نے پہلے پندرہ سال کری مونا (Cremona) میں گزارے پھر میلان اور پھر روم! وہ لمبا چوڑا جوان تھا لیکن معدے کا مریض تھا۔ مسوڑوں میں تکلیف تھی۔ سردرد کی شکایت تھی۔ بہت کم کھاتا تھا۔ بہت کم شراب پیتا تھا۔ روم میں وہ اپنے امیر دوست Maecenas کے پڑوس میں رہتا تھا۔ یہی دوست تھا جس نے اس کی ملاقات آگسٹس سے کرائی اور یہ ملاقات ورجل سے دنیا کی ایک عظیم نظم لکھوانے کا باعث بنی۔

ورجل کی ابتدائی شاعری کی دو اہم کتابیں The Eclogues اور The Georgics ہیں۔ شاعری کا پہلا انتخاب The Eclogues میں دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتی ہوئی نظمیں ہیں۔ 42 قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جب Philippi میں لڑے جانے والی جنگ جیتی تو علاقے کو بہت نقصان پہنچا۔ آفت زدہ علاقے میں ورجل کا علاقہ منتوا (Mantua) بھی تھا۔ ان نظموں میں ورجل نے واقعات کو ڈرامائی شکل دی ہے۔ کسانوں کی تباہ حالی اور علاقے پر جنگ کے اثرات کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ چراگاہوں اور چرواہوں کے بارے میں نظمیں ہیں۔ کچھ نظمیں محبت کے جذبے کی عکاسی کرتی ہیں۔ کچھ نظموں میں ہم جنس پرستی کی فضا موجود ہے۔ ورجل نے ان نظموں سے لاطینی زبان میں Pastrol Poetry کی بنیاد رکھی ہے۔

شاعری کا دوسرا مجموعہ The Georgics غالباً (37 ق۔م) میں چھپا۔ ورجل یونانی شاعر ہیسڈ (Hesiod) سے

بہت متاثر تھا۔ ہیسڈ نے نظموں کی ایک کتاب لکھی جس کا نام Works and Days تھا۔ ان نظموں میں ہیسڈ نے کسانوں کو دنوں کے حساب سے کھیتوں میں کام کرنے کے طریقے بتلائے تھے۔ اس نے سمجھایا تھا کہ کسان کس طرح کام کر کے زمین سے بہتر فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ورجل نے بھی اپنی ان نظموں میں یہی طریقہ اپنایا ہے۔ اس نظم کا عنوان Georgics تھا جس کا یونانی میں مطلب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یونانی میں اس کا ترجمہ (On Working the Earth) ہے۔ اس کتاب کے کئی حصے ہیں۔ اس کے چار حصے فصلیں اگانے اور درختوں کی دیکھ بھال کے بارے میں ہیں۔ دو حصوں میں ورجل نے مویشی اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کے طریقے بتلائے ہیں۔ ایک پورا حصہ شہد کی مکھیاں پالنے اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے بارے میں ہے۔ اس کی کچھ نظمیں دیومالائی مناظر پیش کرتی ہیں۔ دیوتا آرفیس (Orpheus) کے عالم ارواح میں جانے کی تفصیل ہے۔ ایک نظم ورجل کے دوست شاعر Gallus کے بارے میں ہے، جس نے بادشاہ کی ناراضگی کے بعد خودکشی کرلی تھی۔ کچھ نظموں میں ورجل کی اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل شامل ہے۔ 31 ق۔م میں جب آگسٹس Octavian انٹونی اور قلوپطرہ سے جنگ جیت کر واپس آرہا تھا تو ورجل کے دوست Maecensa نے بادشاہ سے ورجل کی ملاقات کرائی اور اسے اپنی نظم کے چار حصے سنانے کے لیے کہا اور اس طرح ورجل کی رسائی دربار تک ہوگئی۔

ورجل کا اہم ترین کارنامہ اس کی طویل نظم اینیڈ ہے۔ اس نظم کو روم میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کو یونان میں حاصل ہے۔ یونان میں لوگ ہومر کو پیغمبرانہ صفات کا حامل فنکار سمجھتے تھے۔ اس کی نظم ایلیڈ کو سکولوں کے نصاب میں شامل کیا گیا اور ہومر کے بارے میں نقادوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ

"Homer is Greece and Greece is Homer."

ہومر نے اپنی اس لافانی نظم میں یونانیوں کے جنگی کارناموں کی تفصیل پیش کی۔ یونانی تہذیب اور ثقافت کے نقشے پیش کیے۔ میدان جنگ میں انکی شجاعت، بہادری اور جرأت کے گیت گائے اور دنیائے ادب کو اکلیز، اوڈیسی لیس، آگامم نان، اجکس اور میلینیس جیسے کرداروں کی جانفشانی کی داستان بیان کی اور یونانی دیوتاؤں کی شان میں اشعار لکھے۔ میدان جنگ کی تفاصیل بیان کیں۔ سکندر اعظم کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ جب بھی کسی محاذ پر جاتا تھا ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کو ساتھ رکھتا تھا اور میدان جنگ میں اپنی فوجوں کو اسی طرح ترتیب دیتا تھا جس طرح ہومر نے ان نظموں میں ترتیب دیا ہے۔

روم کے بادشاہ آگسٹس کی بڑی خواہش تھی کہ ورجل ایسی ہی کوئی نظم لکھے جس میں روم کی عظمت، ثقافت اور روم کے قومی ہیروز کے گیت گائے جائیں اور اس نظم کو بھی وہی رتبہ حاصل ہو جو ہومر کی نظموں کو یونان میں حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے ورجل کو یہ نظم لکھنے کا کام سونپا اور ورجل نے اس عظیم نظم لکھنے کا کام شروع کر دیا۔

ورجل کے سامنے ہومر کی نظم ایلیڈ اور اوڈیسی جیسے دو پہاڑ کھڑے تھے اور اکلیز جیسا مثالی کردار موجود تھا۔ وہ رومی سلطنت کی بنیاد رکھنے والا کون سا ہیرو منتخب کرے۔ چنانچہ اس کی نظر اینیاس (Aeneas) پر گئی۔ Troy کی تباہی اس عہد کی تاریخ کا سب سے تباہ کن واقعہ تھا۔ یونانیوں نے ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شہر جلا دیا۔ عورتوں مردوں کو غلام بنالیا۔ کچھ بچے کھچے شرفا ٹرائے سے جان بچانے میں کامیاب ہوگئے اور شہر سے بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک اینیاس بھی تھا۔ ورجل نے اس کو اپنا ہیرو بنالیا۔ یہ وہ ہیرو تھا جس نے روم کی بنیاد رکھی اور قومی ہیرو بن گیا۔

نقاد اینیڈ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کا تجزیہ یہ ہے کہ پہلا حصہ ہومر کی اوڈی سی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اوڈی سی لیس کی طرح اینیاس کی دربدری کے مختلف مقامات ہیں جہاں وہ مشکلات کا شکار ہوتا ہے اور بڑی جدوجہد اور رکاوٹیں دور کر کے رومی سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نظم کا دوسرا حصہ ہومر کی ایلیڈ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس میں اکلیز کی طرح ورجل اپنے ہیرو اینیاس کی بہادری کے گن گاتا ہے۔

اینیڈ کی کہانی اینیاس کے ٹرائے سے فرار اور اس کی سمندری آوارہ گردی، مختلف مقامات پر جنگوں میں اس کی کامیابی، آہستہ آہستہ فوج میں اضافہ اور پھر ایک طاقت ور، باصلاحیت، جنگی فوج کی تشکیل، مختلف ریاستوں پر اس کا غلبہ اور پھر رومی سلطنت کی بنیاد۔ ان سارے کارناموں میں اینیاس کی بہادری، جوانمردی اور شجاعت مرکزی حیثیت میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

اینیڈ دراصل ٹرائے سے بھاگے ہوئے فوجیوں کی ایک گھر کی تلاش کی جدوجہد ہے۔ وہ سمندری طوفانوں کے رحم و کرم پر سفر کرتے رہتے ہیں اور سمندری طوفان ان کا وہی حشر کرتے ہیں جو انہوں نے اوڈی سی لیس کا کیا تھا۔

سمندری طوفان ایک بار انہیں دھکیل کر کارتھیج (Carthage) کے ساحل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہاں کی ملکہ ایک خوبصورت عورت ڈیڈو (Dido) ہے جو رومیوں کی سخت دشمن ہے۔ وہ رومیوں کے اس جدِ امجد اینیاس کا استقبال کرتی ہے۔ دیوتاؤں کی سازش کے تحت ڈیڈو اسے دل دے بیٹھتی ہے۔ وہ خود بھی حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی مگر اینیاس کی مردانہ وجاہت سے وہ بہت متاثر ہوتی ہے۔ اظہارِ عشق کے لئے ایک موقع تلاش کرتی ہے اور شکار پر جانے کا پروگرام بناتی ہے۔

شکار پارٹی روانہ ہوتی ہے، جنگل میں اچانک طوفان آجاتا ہے شدید بارش سے بچنے کے لئے ڈیڈو اور اینیاس ایک غار میں پناہ لیتے ہیں۔ ہیرو کی پاکیزگی، ملکہ کا حسن اور دونوں دلوں میں جذبات کی بھڑکتی آگ، ملکہ ایک دوشیزہ بن جاتی ہے۔ اپنی عزت، وقار اور انا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہیرو فلمی ہیرو کی طرح جذبات کی رو میں بہہ جاتا جیوپٹر کی غائبانہ آواز اسے خبردار کرتی ہے:

''خبردار اینیاس۔ تم ایک بڑے مقصد کی تلاش میں نکلے ہو۔ تمہیں روم کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنا ہے۔ ڈیڈو کی محبت میں گرفتار ہو کر منزل سے بھٹک نہ جانا۔ مانا کہ ملکہ بہت حسین ہے، تم سے محبت کرتی ہے مگر یاد رکھو۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

اینیاس غائبانہ آواز کے مشورے پر عمل کرتا ہے اور ڈیڈو کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔ ڈیڈو اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہے۔ سلطنت اس کے قدموں میں رکھ دیتی ہے لیکن اینیاس اس سے صرف ایک بات کہتا ہے۔

''سفر میری زندگی ہے اور قیام موت''

وہ ملکہ کو چھوڑ کر آگے سفر شروع کر دیتا ہے۔ ملکہ ڈیڈو جدائی برداشت نہیں کرتی اور آگ میں کود کر خودکشی کر لیتی ہے۔

اینیاس آگے بڑھتا ہے۔ اوڈی سی لیس کی طرح عالم ارواح میں جاتا ہے۔ اوڈی سی لیس اپنی ماں سے ملنے گیا تھا۔ اینیاس اپنے باپ سے ملاقات کرتا ہے۔ باپ اسے جلد روم کی سلطنت بنانے کی نوید دیتا ہے۔ عالم ارواح سے واپس آکر اینیاس سسلی اور اٹلی کی طرف سفر شروع کرتا ہے اور بے شمار مشکلات کے بعد روم کی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔

ورجل کی یہ نظم پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہومر قدم قدم پر اس کے ساتھ رہا ہے۔ ورجل کے کہانی میں تشکیل دیئے ہوئے مناظر بالکل ہومر کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ اس نے یا تو کہانی میں ہلکی سی تبدیلی کی ہے یا چلتے مناظر میں ایک ہلکا سا Twist دے دیا ہے۔ مثلاً اوڈی سی کا جہاز ایک ساحل پر رکتا ہے۔ بادشاہ کی بیٹی اس سے محبت کرنے لگتی ہے (ورجل نے ملکہ ڈیڈو کو اینیاس کی محبت کا شکار دکھایا ہے) اوڈی سی لیس بادشاہ کے دربار میں اپنی ساری کہانی سناتا ہے۔ ورجل کا ہیرو بھی ٹرائے کی بربادی اور وہاں سے فرار ہونے کا سارا قصہ سناتا ہے۔

اوڈی سی لیس عالم ارواح میں اپنی ماں سے ملاقات کرنے کے لیے جاتا ہے۔ ورجل کا ہیرو ماں کی بجائے باپ سے ملنے جاتا ہے۔ اوڈی سی لیس کی منزل اپنے گھر پہنچنا ہے۔ اینیاس کی منزل رومی سلطنت کی بنیاد رکھنا ہے۔ اوڈی سی لیس کی محبوبہ اسے دعائیں دے کر رخصت کرتی ہے۔ اینیاس کی محبوبہ ملکہ ڈیڈو اسے رخصت نہیں کرتی۔ آگ میں جل کر خود دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ورجل کی نظم کی اپنی ایک حیثیت، اپنا ایک انداز، اپنا اسلوب ہے اور یہی چیز اسے ہومر سے مختلف کرتی ہے۔

ورجل ایک رومینٹک شاعر تھا۔ اس کا اسلوب رومانوی اور ہومر کا مزاج کلاسیکی تھا۔ ہومر چیزوں کو ظاہری آنکھ سے دیکھتا تھا ورجل نے چیزوں کو خیال کی آنکھ سے دیکھا۔ نقادوں نے ورجل کے اسلوب کو خالصتاً رومانوی قرار دیا ہے اور ہومر کے اسلوب کو کلاسیکی۔ یہی فرق ہے جو دونوں کے درمیان ایک لکیر کھینچتا ہے۔

ہومر کی طرح اس نظم میں بھی ہر حصے کا آغاز دیوتاؤں کی تعریف و توصیف سے ہوتا ہے۔ کتاب نمبر 7 میں اینیاس ڈیڈو سے جدا ہو کر اٹلی میں آتا ہے۔ جہاں بادشاہ کی بیٹی لاوینیا (Lavinnia) سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ لاوینیا، اینیاس کے آنے سے پہلے (Rutulians) کے بادشاہ ٹرنس (Turnus) سے شادی کا وعدہ کر چکی ہے لیکن اینیاس کے آنے سے بازی پلٹ جاتی ہے اور لاوینیا اس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے اور پھر وہی ہوتا ہے جو ولن اور ہیرو کے تصادم میں ہوتا ہے۔ ٹرنس کو اینیاس مار دیتا اور لاوینیا سے شادی کر لیتا ہے محبت کو منزل مل جاتی ہے اور رومن سلطنت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے اور اینیاس کا خواب پورا ہو جاتا ہے۔

نقادوں کی نظر میں ورجل کی اینیڈ کا ہیرو اینیاس اپنی صفات اور چند نشانیوں کی بنا پر آگسٹس سے مشابہت رکھتا ہے۔ اینیاس کو آپ رومن سلطنت کا بانی کہہ سکتے ہیں اور آگسٹس کو ایک ایسا بادشاہ کہہ سکتے ہیں جس نے روم کی سلطنت کو دوبارہ دریافت کیا اور اس کی تشکیل نو کی۔

جہاں تک نظم کی کہانی، کرداروں کی تشکیل اور واقعات کی بنت کا تعلق ہے ورجل کسی صورت میں بھی ہومر سے نہ بچ سکا۔ اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ورجل نے ہومر کے اسلوب اور شاعری سے استفادہ کیا ہے لیکن ورجل نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ:

اے یونانیو، سنبھل جاؤ
ایلیڈ سے بڑی نظم کی
پیدائش ہو چکی ہے

لیکن یہ بات شاید درست نہیں۔ رہی بات ہومر سے استفادہ کرنے کی تو خود ورجل نے اس بات کی نفی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے جس میں ہومر کی عظمت کا اعتراف بھی شامل ہے۔

ورجل نے صاف الفاظ میں کہا:

''میرے نقاد مجھ پر یہ الزام کیوں لگاتے ہیں کہ میں ہومر سے خیال اور شعر چراتا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو دوسرے لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اگر وہ کریں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ ہرکولیس کے ہاتھ سے اس کی تلوار چھیننا آسان ہے لیکن ہومر سے مصرع چرانا ناممکن کام ہے۔''

یہ ساری غلط فہمی اور الزامات کی بوچھاڑ شاید اس لیے بھی ہوئی کہ ہومر ایک وسیع تجربہ رکھنے والا شاعر تھا جبکہ ورجل نے اپنی نظم کوٹھری میں بند ہو کر لکھی۔ اسے میدان جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میدان جنگ کے جو واقعات ہومر کی نظموں میں ملتے ہیں وہ ورجل کے ہاں ناپید ہیں۔

نپولین بوناپارٹ نے دونوں شاعروں کو بہت دھیان سے پڑھا تھا۔ وہ بھی سکندر اعظم کی طرح ہومر کی دونوں نظموں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ اپنے ایک خط میں دونوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جہاں تک میدان جنگ میں فوجوں کو منظم کرنے کی بات ہے یہ ہومر کے ہاں بڑے موثر انداز میں ملتی ہے۔ وہ یہ مناظر اس طرح بیان کرتا ہے جیسے وہ میدان جنگ میں لڑنے والا ایک سپہ سالار ہے۔ جہاں تک ورجل کا تعلق ہے اسے آپ کسی سکول یا کالج کا ڈرل ماسٹر کہہ سکتے ہیں۔ اسے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ورجل ہومر سے متاثر ہے۔ اس سے اس نے بہت استفادہ کیا ہے لیکن سب کچھ اپنے انداز اور اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آنے والا عظیم شاعر دانتے اسے اپنا گرو، اپنا شاعر، اپنا راہنما مانتا ہے۔ ورجل کے زیر اثر انگریزی شاعر ملٹن بھی آتا ہے۔ جس کی مشہور زمانہ نظم جنت گم شدہ (Paradise Lost) پر ورجل کے اثرات نمایاں ہیں۔ ورجل نے بعد میں آنے والے تمام شاعروں کو متاثر کیا۔ وہ اگر ہومر سے بڑا شاعر نہیں تو اس کے مقابلے کا شاعر ضرور ہے۔

ورجل اپنی اس نظم سے مطمئن نہیں تھا وہ اسے مزید بہتر بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود کہا کرتا تھا:

''میری مثال اس سفید ریچھنی کی ہے جو اپنے بچے کو چاٹ چاٹ کر سفید بناتی ہے میں بھی مصرع لکھ کر اسے بار بار درست کرتا ہوں۔''

وہ نظم کا مسودہ لے کر اٹلی کے دیہاتوں میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ نظم آگسٹس کو سناتا وہ اس کی نوک پلک درست کرنا چاہتا تھا۔ اسی سفر کے دوران اسے شدید بخار ہو گیا۔ بذریعہ بحری جہاز اٹلی سے گزرتے ہوئے بیماری اور بڑھ گئی اور وہ Brundisium کی بندرگاہ پر اتر گیا اور اسی مقام پر 21 ستمبر 19 قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا۔ مرنے سے پہلے اس نے دوستوں کو وصیت کی تھی کہ اس نظم کو جلا دیا جائے کیونکہ یہ نامکمل ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے آگسٹس کے سامنے پیش کیا جا سکے لیکن جب یہ نظم چھپی تو لاطینی شاعری میں ایک انقلاب آ گیا اور اسے سکولوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ سب نے اسے عظیم شاعر تسلیم کر لیا۔ برسوں بعد عیسائیت کے پیروکاروں نے اسے عظیم شاعر قرار دے دیا کیونکہ اس نے اپنی شاعری میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی پیش گوئی کی تھی (یہ پیش گوئی اس نے اپنی کتاب Eclogue کے چوتھے حصے میں کی تھی) قرون وسطیٰ میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی نظم کا پرانے عہد نامے کے برابر احترام کیا جانے لگا۔

روم کی طرف جانے والی ایک پرانی سرنگ میں ورجل کی قبر دریافت کی گئی تھی اس پر بعد میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر

کر دیا گیا۔ یہ جگہ Naples سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے مزار پر بہت سے عقیدت مند آتے ہیں۔ ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ بھی حاملہ عورتیں۔ وہ اس مزار کو شجر ورجل جان کر چومتی ہیں اور ورجل جیسے بچے کو جنم دینا چاہتی ہیں۔ مزار پر آنے والوں میں عیسائی زائرین کی تعداد زیادہ ہے۔ روم والوں کے نزدیک وہ پیغمبرانہ صفت رکھنے والا شاعر تھا۔ عام قارئین کے لئے اس کی عظمت بے مثال تھی۔ ورجل کی ماں نے جس شاخ کو خواب میں جنم دیا تھا وہ اب تک درخت بن کر بہار دکھا رہی ہے۔ درخت کے پتے اب بھی ہرے اور پھول اب بھی اپنی مہک قائم رکھے ہوئے ہیں۔

هورلیس

(Horace)

65 قبل مسیح کا عظیم اطالوی شاعر، اہل روم ورجل کے بعد اسے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ورجل نے اس کی سرپرستی کی۔ ہورلیس جتنا بڑا شاعر تھا اتنا ہی بڑا نقاد تھا۔

''میں نے شاعری کا وہ پائیدار مینار تعمیر کیا ہے جو بلندی میں اہرام مصر سے بھی اونچا ہے۔
چنانچہ میں ایک دم نہیں مروں گا۔ قیامت تک تھوڑا تھوڑا مرتا رہوں گا۔''

....

سنگ مرمر کی میز پر شراب رکھی ہے۔ جس میں شفاف سمندر کا پانی ملا ہوا ہے۔ ساتھ شراب کی صراحی رکھی ہے جو مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ میں ساری رات شراب پیتا ہوں۔ دن چڑھے سو کر اٹھتا ہوں۔ میں دنیا کا خوش قسمت انسان ہوں۔

....

بُرا شاعر جونک کی طرح ہوتا ہے جسے چمٹ جائے خون چوس کر ہی بدن سے الگ ہوتا ہے۔
ایسے شاعر سے بچنا چاہیے۔

....

شاعروں کو ہومر سے کرداروں کی تشکیل کا فن سیکھنا چاہیے۔

(ہوریس)

ہوریس

کہتے ہیں ایک بڑا شاعر دوسرے اُبھرتے ہوئے شاعر کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ ایک شاگرد نے اپنے استاد سے پوچھا:

''بڑا شاعر ایسا کیوں کرتا ہے؟''

استاد نے جواب دیا۔

''اس لیے کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں'' لیکن کبھی کبھی بڑے شاعر جنہیں دوسرے ابھرتے ہوئے شاعر سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا اور وہ نئی کونپل کے پھلنے پھولنے پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے اور نئی عمر کے نوخیز تخلیقی دماغ کو اپنا آپ منوانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ورجل (Virgil) نے ہوریس (Horace) کے ساتھ ایسا ہی کیا۔

جب ورجل کا نام گونج رہا تھا اور اس کی شاعری کی مہک دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی تو ہوریس پر اس کی نظر پڑی۔ ورجل اس کے شعری ہنر سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اسے اپنے رئیس دوست (Maecenas) سے متعارف کرا دیا۔ (Maecenas) لکھنوی نوابین کی طرح ادب کا دلدادہ تھا۔ جب بھی اس نے کسی میں تخلیقی جوہر دیکھا اسے مالا مال کر دیا اور تخلیق کے لئے کھلا میدان دے دیا اور فنکار کو غم روزگار سے آزاد کر دیا۔ ہوریس کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اسے روم سے کچھ فاصلے پر ایک جاگیر عطا کر دی، جہاں ہوریس نے اپنے لئے ایک عالی شان رہائش گاہ بنوائی۔

24 کمروں کا ایک محل بنوایا گیا جس میں نہانے کے لئے تین تالاب تھے۔ روم میں عیش و عشرت کے جو سامان تھے اس محل میں فراہم کئے۔ اپنی شاعری کے لئے اس نے کچھ فرضی اور کچھ حقیقی محبوبائیں بنا لیں اور ایسی رومانوی شاعری کی جو ورجل کی سادہ اور قدرے روکھی شاعری سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ بادشاہ کے نام شاعری میں خطوط لکھے۔ فن شاعری کے نام سے تنقیدی نظام مرتب کیا جو تنقیدی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی اس جاگیر میں اس نے پورے روم کی زندگی کو آراستہ کر لیا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اپنی شاعری سے کیا اور ایسے کردار اور فضا شاعری میں سمو دی جسے پڑھ کر روم کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ فلسفی، فاحشہ عورتیں، بے وفا بیویاں، دوسری عورتوں کے لئے بے قرار شوہر، مکار تاجر، ہوس پسند مصنف، فضول شاعر اور خوشامدی لکھاری، بس ایک نظر اس کی شاعری پر ڈالیں پورا روم سانس لیتا نظر آئے گا۔ وہ کہا کرتا تھا ''شاعری سکون کے لمحات میں یاد رکھا ہوا جذبہ ہے'' میں نے یہ جذبہ سنبھال کر رکھا تھا اور اب میں اسے شاعری بنا رہا ہوں۔

ہوریس دعویٰ کیا کرتا تھا ''میں نے شاعری کا وہ پائیدار مینار تعمیر کیا ہے جو بلندی میں اہرام مصر سے بھی اونچا ہے۔ چنانچہ میں ایک دم سے نہیں مروں گا۔ قیامت تک تھوڑا تھوڑا مرتا رہوں گا''۔

روم کا مشہور شاعر اٹلی کے جنوبی مشرقی علاقے وینوسیا (Venosia) کے مقام پر 65 (ق م) میں پیدا ہوا۔ یہ زمانہ

جولیس سیزر کے عروج کا تھا۔ ہوریس اپنی ابتدائی تعلیم روم میں مکمل کر کے فلسفہ پڑھنے کے لئے ایتھنز (Athens) چلا گیا جہاں ہومر (Homer) کے طلسم میں ایسا گرفتار ہوا کہ دن رات اس کی کتابوں کو اپنے قلب وذہن میں اتارتا رہا۔ ہوریس ایک متوازن ذہن کا مالک تھا۔ اس کی عشقیہ شاعری بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ ہر حالت میں خوش رہتا تھا۔ ہر آدمی سے مل کر مسرت حاصل کرتا۔ مشکل وقت میں ہنسنا کھیلنا اس کی عادت تھی۔

ہوریس کی عمر جب 21 سال تھی تو روم کی سیاسی حالت میں اچانک تبدیلی آئی ۔ سیزر کے قتل کے بعد بروٹس (Brutus) نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ ہوریس نے بروٹس کا ساتھ دیا۔ شاعر سپاہی بنا۔ میدان جنگ میں قلم چھوڑ کر تلوار کے جوہر دکھائے لیکن فیلپی (Philipi) کے مقام پر اس کی حامی فوجوں کو بُری طرح شکست کھانا پڑی اور اس کے ساتھ ہی ہوریس کو ایک بُرے عہد کا منہ دیکھنا پڑا۔ اٹلی میں اس کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ کچھ وقت اس نے مسافت میں کاٹا اور پھر مشہور شاعر ورجل اور بادشاہ آگسٹس کی وجہ سے اسے روم آنے کی اجازت مل گئی۔ شراب اور شاعری دونوں اس کی کمزوریاں تھیں وہ کہا کرتا تھا کہ

''شراب کا جام میرے ساتھ ہی پیدا ہوا''

اپنی جاگیر میں اس نے بےفکری کی زندگی میں گزاری، اس نے اپنے کمرے کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

''سنگ مرمر کی میز پر شراب رکھی ہے۔ جس میں شفاف سمندر کا پانی ملا ہوا ہے۔ ساتھ شراب کی صراحی رکھی ہے جو مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ میں ساری رات شراب پیتا ہوں۔ دن چڑھے سو کر اٹھتا ہوں۔ میں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہوں''۔

ہوریس کے نزدیک غم کا لفظ بالکل اجنبی تھا۔ اردو شاعر مرزا سودا کی طرح غم و آلام اس کے آنگن میں قدم دھرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ہوریس کی فطرت میں دکھ سہنے کی ہمت تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ہی فقرہ رہتا تھا۔

You Must do ... must Sumit to ... must ...face ...must endure.

اس نے اس فلسفے پر ساری زندگی عمل کیا اور خوش رہا۔ انسانوں کو اچھی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا رہا۔ اس کی شاعری اس کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر بڑے اہم اصولوں کا مجموعہ تھا۔ مثلاً

1- He is master of himself and happy who as the day ends can say, I have Lived , tomarrow come loud come sun shine.

2- Life's brief space long hope.

3- The swift moose can repair their losses in the sky when weare gone where the great dead have passed, are dust and shadow.

لفظوں کو بحر میں لکھنا اس کی کمزوری تھی۔ وہ ساری زندگی کاغذ پر الفاظ سے کھیلتا رہا۔ اس نے جو کچھ لکھا۔ اشعار میں لکھا۔ باتیں، نصیحتیں، مشورے، خط و کتابت سب کے لئے شاعری کا پیرایہ اختیار کیا۔ اس سے شاعری کو نقصان بھی ہوا لیکن وہ شاعری کی عادت ترک نہ کر سکا۔ شاعری میں ان خامیوں کا اسے خود بھی احساس تھا اپنی ایک نظم کے ایک مصرعے میں وہ کہتا ہے کہ فضول گپ شپ نے میری شاعری کو برباد کر دیا ہے۔

ہوریس نے ان خامیوں کے باوجود جو کہا بہت محنت سے کہا۔ وہ زبان کے سلسلے میں بہت محتاط تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ

شاعر کو اپنے اشعار پر اتنی ہی محنت کرنی چاہیے جتنی شہد کی مکھی شہد جمع کرنے کے لیے کرتی ہے۔

شاعری میں فنی باریکیوں کی اس نے خود بھی پابندی کی اور نوجوان شاعروں کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت کی۔ شاعری میں وہ اختصار کا قائل تھا۔ اس نے جہاں جہاں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اختصار پر زور دیا ہے اور اس پر خود بھی عمل کیا۔ اس نے ساری زندگی شاعری کی لیکن نتیجہ ایک مختصر سا دیوان ہے۔ اس کے ہر مصرعے میں اس کی محنت و کاوش کی مہر ثبت ہے۔ کوئی انگلی رکھ کر خامی کی نشاندہی شاید ہی کر سکے۔ اس اختصار کی عادت نے اسے لاطینی زبان کا ناقابل فراموش شاعر بنا دیا ہے۔ اپنے دوست (Pieaso) کے بڑے بیٹے کو بھی اس نے اسی اختصار کی نصیحت کی جس پر وہ ساری عمر عمل کرتا رہا۔

ہوریس نے رومانی گیتوں کے علاوہ ہجویہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں وہ اپنے عہد کے شاعروں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ شاہ روم آگسٹس کے لئے لکھی ہوئی نظم بھی ان نظموں میں سے ایک ہے۔ نظم کے شروع میں اس نے بادشاہ اور دربار کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد اپنے عہد کے ادب اور شعرا پر تنقید کی ہے۔ ان شعرا کو بُرا بھلا کہا ہے جو قدیم یونانی اور رومی ادب کی قدر نہیں کرتے۔ ہوریس نے اس نظم میں یونانی اور رومی ادب کا موازنہ کیا ہے اور پھر شاعروں کو مشورہ دیا کہ وہ ان سے استفادہ کریں۔

ہومر اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اس کی شاعری کو اگر ہومر کا فیض کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ایڈیسن (Addison) نے ہومر کی ادبی خدمات پر مضمون لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ہومر نے اپنے بعد آنے والے تمام شاعروں پر دیرپا اثر چھوڑا ہے اور ان میں پیش پیش ہوریس ہے۔

ہوریس اپنی اس نظم میں تھیٹر کے تماشائیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ڈرامائی شاعری کے علاوہ دوسری شاعری کی طرف بھی توجہ دیں۔ آخر میں آگسٹس کے ادبی ذوق کی داد دیتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اچھے شاعروں کی سرپرستی کرے اور بُری شاعری کو فروغ نہ پانے دے۔

ہوریس دوسری ہجویہ نظم ہے اس میں اپنی زندگی کے بارے میں باتیں کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اب غنائیہ شاعری کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ نظم کے آخری حصے میں اس نے اپنے عہد کے ایسے شاعروں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو شعر لکھتے ہوئے محنت اور کاوش نہیں کرتے۔ شاعری کے فن پر اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان ہے کہ اعلیٰ ترین الفاظ کا منظم طریقے سے استعمال ہی اچھی شاعری ہے۔ ہوریس کا اصلی تنقیدی کارنامہ اس کی مشہور تصنیف ''فن شاعری'' ہے۔

(ARS POETICA)

''فن شاعری'' کے سن تصنیف کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ ہوریس کی آخری تصنیف ہے۔ اس کی وجہ تصنیف کچھ یوں ہے کہ (Piso) خاندان کے ساتھ ہوریس کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اس خاندان کے سربراہ (Lueius Piso) کے دو بیٹوں کو شاعری کا شوق چرایا تو انہوں نے ہوریس کی طرف رجوع کیا اور رہنمائی چاہی۔ ہوریس نے یہ نظم ان کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس نظم میں اس نے شاعری کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اچھی اور بُری شاعری کا موازنہ کیا ہے، دونوں نوجوان شاعروں کو بتلایا ہے کہ شاعری شروع کرنے سے پہلے انہیں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اچھی شاعری کے لئے کیا باتیں ضروری ہیں۔

اگر چہ یہ نظم اس نے ان لڑکوں کے لئے لکھی ہے لیکن تنقیدی تاریخ میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی اور ہورلیس کا نام افلاطون اور ارسطو کے ساتھ لیا جانے لگا۔

لاطینی نقادوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نے ارسطو اور افلاطون کے تنقیدی نظریات سے بڑا کچھ حاصل کیا۔ اس نے کسی فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے اصول بنائے۔ ہورلیس نے وحدت اور زبان کو کسی شاہکار کے لئے ضروری قرار دیا۔ قارئین کو کسی فن پارے کا معیار مقرر کرنے کا گُر بتلایا۔ ان کے ذوق کی درستی کی اور شاعروں کو مشورہ دیا کہ انہیں عامیانہ شعر کہنے سے پرہیز کرنا چاہیے، خواہ ان کے قارئین کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ الفاظ کے استعمال کے بارے میں شاعروں کو آگاہ کیا اور غیر ملکی اور قدیم زبانوں سے استفادہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ موزونیت، زبان، وحدت، خارجیت، اخلاق، اصلاح اور تفریح کو شاعری کے اہم اجزا قرار دیئے۔ اپنے شعری مقالے ''فن شاعری'' کا آغاز کرتے ہوئے اس نے (Piso) خاندان کے نوجوانوں کو سب سے پہلے یہ مشورہ دیا ہے کہ وحدت کسی فن پارے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ متناسب اجزا اور وحدت ہی دو ایسے عناصر ہیں جن سے کوئی فن پارہ شاہکار بنتا ہے۔ جس طرح انسان کے دھڑ پر گھوڑے کا سر نہیں رکھا جا سکتا یا حسین عورت کے سر کے نیچے مچھلی کا دھڑ نہیں جوڑا جا سکتا اسی طرح کسی نظم کی خوبصورتی اس میں ہے کہ وہ شروع سے لے کر آخر تک خوبصورت مصرعوں سے مزین ہو۔ شاعر کو چاہیے کہ ایک ایک مصرعے کو حسین خیالات اور مناسب زبان سے آراستہ کرے۔ اعلیٰ ترین الفاظ کو مناسب اور صحیح مقام پر استعمال کرے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کوئی فن پارہ شروع تو بہت خوبصورت انداز میں ہوتا ہے لیکن جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس میں حسن کم اور بدصورتی بڑھتی رہتی ہے۔ کبھی شاعر ہوائی باتیں کرتا ہے کبھی وہ زمین پر رینگنے لگتا ہے۔ ہورلیس نظم یا تصویر کو ہر لحاظ سے خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔ تصویر کو جس زاویہ سے دیکھا جائے نظم کا مصرع پڑھا جائے وہ خوبصورت لگے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب نظم یا تصویر کے ہر حصے پر پوری توجہ دی جائے تا کہ وحدت اور خوبصورتی برقرار رہے۔

ہورلیس کے نزدیک موضوع کا انتخاب سب سے اہم چیز ہے۔ لکھنے والے کو اپنی قابلیت کے مطابق موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے اگر اسے اپنے موضوع کا علم ہوگا تب ہی وہ اپنے خیالات کو قاری تک پہنچا سکے گا۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنے موضوع کا انتخاب کرنے میں کچھ وقت صرف کرے۔ موضوع کے بارے میں مواد اکٹھا کرے۔ خیالات کو ترتیب وار منظم کرے اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا فن پارہ موثر ہوگا۔ موضوع کو جانے بغیر اگر اس نے شاعری شروع کی تو نہ الفاظ اس کے بس میں رہیں گے اور نہ ہی خیالات ......(انگریزی شاعر ملٹن (Milton) نے شاید اس گر کو پالیا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی لافانی نظم گمشدہ شروع کرنے سے پہلے ایک طویل عرصہ موضوع کے لئے انتخاب اور تیاری پر صرف کیا)۔

ہورلیس نے شاعروں کو مشورہ دیا ہے کہ انہیں اپنی طاقت کے مطابق وزن اٹھانا چاہیے یعنی اس موضوع کا انتخاب کریں جس کے ساتھ وہ انصاف کر سکیں انہیں پتا ہونا چاہیے کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھا رہے ہیں ان کے بیان میں کون سی باتیں ضروری ہیں اور کن باتوں کا بیان ضروری نہیں اور پھر کون سی بات کن الفاظ میں کہی جائے۔ الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں ہورلیس شاعروں کو مشورہ دیتا ہے کہ انہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو شعر کی معنویت میں اضافہ کریں۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اسلوب میں جان پڑ سکتی ہے۔ پرانے الفاظ کے استعمال پر ہورلیس نے کوئی پابندی عائد نہیں کی لیکن اس بات پر زور دیتا ہے کہ انہیں استعمال اس طرح کیا جائے کہ ان میں تازگی

آ جائے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ عام الفاظ کو بھی اس طرح استعمال کرے کہ ان سے فن پارے میں نئے معنی پیدا ہو جائیں۔ نئے الفاظ کو قاری اسی صورت میں قبول کرے گا اگر وہ سلیقے سے استعمال کئے گئے ہوں۔ ہورلیس کہتا ہے کہ جس طرح درخت کی چھال درخت سے الگ ہو کر سوکھ جاتی ہے اسی طرح الفاظ بھی پرانے ہو کر مر جاتے ہیں۔ شاعروں کو چاہیے کہ وہ نئے اور پرانے الفاظ کو اپنی شاعری میں اعتدال کے ساتھ استعمال کریں۔ دھواں نہیں روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ شاعروں کو ہومر سے کرداروں کی تشکیل کا فن حاصل کرنا چاہیے۔ قدیم ادبی روایات سے نئے لکھنے والوں کو رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ فن پاروں میں وحدت کیسے پیدا کی جاتی ہے، نظم کے ابتدائی، درمیانی اور آخری حصے کو کیسے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ یونانی ادب کو ہورلیس مستند مانتا تھا۔ اس لئے وہ شاعروں کو مشورہ دیتا ہے

You must give days and nights to the study of Greek model.

بُرا اور جنونی شاعر ہورلیس کے نزدیک طاعون اور یرقان کے مریض کی طرح ہے۔ ایسے شاعر اپنے آپ میں مست سر اٹھا کر چلتے رہتے ہیں۔ اور پھر کنوئیں میں گر جاتے ہیں۔ مدد کے لئے پکارتے ہیں تو کوئی انہیں بچانے نہیں آتا۔ ایسے شاعر کو خودکشی کرنے کی پوری اجازت ہے کیونکہ ایسا شاعر اگر کسی شریف آدمی کو مل جائے تو اسے اس وقت تک اپنی شاعری سناتا رہے گا جب تک سننے والا مر نہ جائے۔ ایسے شاعر سے بچنا چاہیے۔

ایسا شاعر جونک کی طرح ہے جسے چمٹ جائے اس کا خون چوس کر ہی بدن سے الگ ہوتا ہے۔ ہورلیس کے نزدیک اچھے نقاد کا بڑا مقام ہے اس کا خیال ہے کہ ایک نقاد ہی فن پارے کی قدر و قیمت متعین کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مخاطب (Piso) کے بڑے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ کبھی دوستوں کو اکٹھا کر کے اپنی شاعری نہ سنائے کیونکہ دوست اس کو بے جا داد دیں گے اور برے شعر کی بھی تعریف کریں گے چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ کسی اچھے نقاد کو اپنی نظم سنائے تا کہ وہ برائیوں کی نشاندہی کر سکے۔ ہورلیس آگے چل کر کہتا ہے کہ بُری شاعری کا نہ چھپنا اچھا ہے۔ وہ مشورہ دیتا ہے کہ ایسی شاعری نقاد کو دکھا کر اپنے میز کی دراز میں رکھ لو اور 9 سال بعد اسے پھاڑ دو اس لئے کہ جو چیز ابھی نہیں چھپی وہ تمہارے نام کو بدنام نہیں کرے گی اگر چھپ جائے تو اسے واپس لینا بہت مشکل ہے۔ ہورلیس کہنا یہ چاہتا ہے کہ بُرے اشعار کہنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر کہہ لیے جائیں تو انہیں چھپوانے کی بجائے تلف کر دینا چاہیے۔

ہورلیس نے شاعری اور تنقید دونوں میں کلاسیکی مزاج کا اسلوب اپنایا اور ان پر اس کی شخصیت کا اثر موجود ہے۔ تنقید میں اس نے قدیم اور اپنے عہد کے آزمودہ فن پاروں کو ایک معیار قرار دیا۔ شاعری میں کلاسیکی طرزِ اسلوب اختیار کیا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ شاعری اور تنقید دونوں میں اس کا انداز بے ساختہ ہے۔ وہ خطیب یا فلسفی بننے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوستانہ ماحول میں اپنی بات کہنے کا عادی ہے۔

اس نے آگسٹس اور سیزر کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس کی شاعری میں روم کی زندگی کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اسے روم سے عشق تھا۔ چنانچہ وہ بار بار یہ کہتا تھا کہ ''شور اور دھوئیں کے باوجود مجھے روم سے عشق ہے۔'' اس کی شاعری اور تنقید دونوں میں اس کا تیکھا تنقیدی لہجہ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اصلاحی رویہ بھی۔ سینکڑوں ایسے جملے مل جاتے ہیں جن سے اس کے عہد کی تصویریں نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس نے روم کی گلی گلی میں جھانک کر اکٹھا کیا ہے۔ وہ عہدِ حاضر اور عہدِ قدیم دونوں کی کمزوریوں اور غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ تنقید میں قدیم اساتذہ کے کمزور اشعار اور فن پاروں کی مثالیں دیتا ہے۔ اپنی ہجویہ شاعری میں وہ صاف صاف کہتا ہے کہ میرے عہد کی

جوان لڑکیاں گھر داری کی بجائے ہیجانی اور جنسی رقص سیکھنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ رومیوں کو بلند عمارات بنانے کا بڑا جنون تھا۔ وہ کاشتکاری چھوڑ کر عمارات سازی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہوریس کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ اب روم میں صرف چند ایکڑ زمین کاشت کاری کے لیے رہ گئی ہے باقی ساری زمین پر عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ رومیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ رومن قوم بے وقوف ہے غلطی اور گناہ کا الزام حالات پر دھرتی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں ان کے ذہن کے اندر موجود ہیں۔ وہ اپنی نسل سے کہیں کہیں بیزار نظر آتا ہے اور اس کا الزام والدین کو دیتا ہے لیکن پھر خود ہی کہتا ہے کہ ہم بھی اپنے والدین سے کوئی زیادہ اچھا کام نہیں کریں گے بلکہ اس سے بھی بُری نسل دے کر جائیں گے۔

اووڈ ناسو

(Ovid Naso)

43 قبل مسیح کا مقبول اطالوی شاعر، ہوریس کا ہمعصر تھا۔ دربار تک رسائی حاصل کی مگر آخری عمر جلا وطنی میں گزری۔ رومانوی اور جنسی شاعری میں بہت کمال دکھائے۔ جلا وطن ہوا تو سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع کیا۔

گیت

محبت نے میرے آنسوؤں کو
اداس کیفیت میں بہنے کا ہنر سکھایا ہے
اور میرے دل کو ماتمی گیت سے روشناس کرایا ہے
میں آتش بجاں ہوں
میں جل رہی ہوں۔ اور آگ تیز ہو رہی ہے
مجھے موسیقی بھی سکون نہیں دے سکتی
موسیقی انہیں سکون بخشتی ہے
جن کے ذہن منتشر نہ ہوں
مجھے تنہائی بھی نہیں بہلا سکتی
مجھے لزبین کھیل بھی سکون نہیں بخشے گا
محبت کے ساتھ بھی کیا کیا یادیں جڑی ہوتی ہیں
میں جتنا بدحواس ہو رہی ہوں
میری محبت کی شدت اتنی ہی بڑھ رہی ہے

(سیفو کا خط محبوب کے نام)

اووڈ ناسو

قبل مسیح کے تین بڑے اطالوی شاعر تقریباً ایک ہی عہد میں پیدا ہوئے۔ ایک دوسرے سے ملے، ایک دوسرے کی ستائش کی، ایک دوسرے کو آگے بڑھنے کا موقع دیا اور دنیا کے ادب پر اپنے اپنے اثرات چھوڑے جواب تک موجود ہیں۔ یہ تین عظیم شاعر ورجل، ہوریس اور اووڈ (Ovid) تھے ان میں ورجل، ہوریس سے اور ہوریس اووڈ سے سینئر تھا۔ ایک اور عجیب اتفاق ان تینوں کی سرپرستی ادب شناس Maecenas نے کی۔

یہ Maecenas بھی غضب کا ذہین آدمی تھا، تخلیقی جوہر دیکھ کر شاعروں پر فدا ہو جاتا تھا۔ ورجل سے ملاقات ہوئی تو اسے گلے سے لگا لیا۔ پہلے تو پورے شہر سے اسے مقبولیت کی سند دلائی پھر بادشاہ کے کان میں اس کی شاعری کی بات ڈالی اور اسے مجبور کیا کہ وہ ورجل کی مشہور نظم Georgics کی دو ہزار سطریں سنے۔ بادشاہ نے چار دن ورجل کی شاعری سنی اور اسے درباری شاعر بنا لیا۔ سب کچھ دیا اور اس سے مشہور رزمیہ ''ایلیڈ'' لکھوائی اور اسے وہی درجہ دیا جو ہومر کو یونانیوں نے دیا۔ ورجل نے ہوریس کا تعارف اپنے سرپرست Maecenas سے کرایا۔ ہوریس کو اس نے پوری مراعات دیں اور ہوریس کو درباری شاعر بنا دیا۔ ہوریس نے اس سے اووڈ (Ovid) کا تعارف کرایا اور اووڈ پر اس کی نوازشیں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ ایسا ادب شناس اور شاعر پرور رئیس دنیا میں شاید کم کم ہی دکھائی دیتا ہے اور ورجل اور ہوریس جیسے شاعر بھی جو بلا خوف و خطر نئے لکھنے والوں کو تھپکی دے کر آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہوں۔

اووڈ ناسو (Ovid Naso) کی رسائی بھی بادشاہ آگسٹس تک ہوئی۔ عزت اور شہرت پائی مگر اس کی ایک چھوٹی سی غلطی نے اُسے بادشاہ کی نظروں سے گرا دیا اور اس کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اووڈ خود کہتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ تھا۔ عزت، دولت اور شہرت مگر "A Poem and A Mistake" نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس کا جرم قتل کے برابر تھا۔

اووڈ مشرقی روم کے ایک شہر سلمو (Sulmo) میں 43 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم روم میں حاصل کی۔ اس کے باپ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے مگر اووڈ کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اس کا باپ فوت ہوا تو اووڈ اس نمک کی کان کی طرف روانہ ہوا جہاں ہر آدمی جا کر نمک کا ہو جاتا ہے۔ اس کان کا نام یونان تھا۔ اووڈ اپنے بھائی کو لے کر ایتھنز گیا اور اس کے ساتھ وہی ہوا جو ہوریس کے ساتھ ہوا تھا۔ ہوریس خطابت پڑھنے ایتھنز گیا تھا لیکن ہومر کی کتابیں بغل میں دابے واپس روم آ گیا۔ خطابت بھول کر شاعری کرنے لگا۔ اووڈ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہومر کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ اووڈ نے خطابت کی کتابیں پھینک دیں اور ہومر کے ساتھ دن رات بسر کرنے لگا کیونکہ ہوریس کی بات اس کے کان پڑ گئی تھی کہ

" Spend your Days and Nights with Homer."

ہومر کی کتابیں اووڈ نے اپنے دل و دماغ میں اتاریں اور شاعر بن کر روم واپس آ گیا اور شاعری شروع کر دی۔ 20 سال کی عمر میں اس کا بھائی فوت ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی جدائی میں نظمیں لکھ کر شاعری کا آغاز کیا۔ یہ سب کچھ اووڈ

نے 18 سال کی عمر میں کیا۔

اووڈ نے اپنی شاعری سے روم کے ادب شناس طبقے کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ روم کی مشہور ادب شناس محفلوں میں اس کا آنا جانا شروع ہوا۔ ہوریس کو اس کی شاعری نے بہت متاثر کیا اور ہوریس کے ذریعے ہی اس کی ملاقات ورجل سے بھی ہوئی اور اس طرح اووڈ کی شہرت محفل پھیلنے لگی اور لوگ اس کے نام سے آشنا ہو گئے۔

اووڈ کے زمانے کا روم شور، دھوئیں اور عیش پرستی کی دھند میں لپٹا ہوا روم تھا۔ محلات اور گلی کوچوں میں جنسی نشاط پرستی کا نقارہ بج رہا تھا۔ بادشاہ اس کے درباری اور روم کے شہری اس دھند میں اپنی بساط کے مطابق لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ عیاش شوہر، بے وفا بیویاں، ناکام عاشق اور روم کی عورتیں، جدید نسل، لڑکے، لڑکیاں سب کے سب اس جنسی اور عیش پرستی کی دلدل میں ناکوں ناک دھنسے ہوئے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کا بھی یہی حال تھا۔ دربار اور رئیسوں کی محفلوں میں رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ بھی اسی رو میں بہہ گئے تھے۔ ورجل اور ہوریس اس طوفان بدتمیزی سے پرے پرے رہے۔ ہوریس نے سنجیدہ رومانوی کیفیت میں رہتے ہوئے اچھی شاعری کی لیکن اووڈ کا اپنا انداز اور اسلوب تھا۔ اس نے روم کے ادبی منظر میں نمایاں ہونے کے لئے روم کے لوگوں کی پسند کو مدنظر رکھا اور وہی کچھ لکھا جو وہ پسند کرتے تھے لیکن اس پسند میں بھی اس نے ادبی معیار اور جمالیات کی ڈور ڈھیلی نہ ہونے دی۔ اس نے عیب کیا مگر ہنر کے ساتھ۔

اووڈ نے ابتدا میں عشقیہ اور محبت کے جذبات سے لبریز شاعری کی جس کا ریکارڈ بہت کم دستیاب ہے لیکن اس کی پہلی اہم نظموں کی کتاب (Herodies) ہے جس کا انگریزی ترجمہ ہیروئن (Heroions) ہے۔

اس کتاب میں ان دیومالائی ہیروئن کے خطوط ہیں جو کرب اور دکھ کی کیفیت میں انہوں نے اپنے بچھڑے ہوئے عاشقوں کو لکھے ہیں اور انہیں وصال کا زمانہ یاد دلا کر دوبارہ واپس آکر ہجر کی کیفیت کو ختم کرنے کی درخواست کی ہے۔ ان خطوط میں اووڈ نے بہت اعلیٰ شاعری کی ہے اور کرب کی کیفیت میں درد و غم اور ہجر کی رات کا بہت اچھا منظر پیش کیا ہے۔

میں یہاں مثال کے طور پر چند لائنیں ایک خط سے پیش کرتا ہوں جو مشہور شاعرہ سیفو (Sappho) نے (Phaon) سے مخاطب ہو کر کہی ہیں:

محبت نے میرے آنسوؤں کو
اداس کیفیت میں بہنے کا ہنر سکھایا ہے
اور میرے دل کو ماتمی گیت سے روشناس کر دیا ہے
میں آتش بجاں ہوں
میں جل رہی ہوں اور یہ آگ تیز ہو رہی ہے
مجھے موسیقی بھی سکون نہیں دے سکتی
موسیقی انہیں سکون بخشتی ہے
جن کے ذہن منتشر نہ ہوں
مجھے تنہائی بھی نہیں بہلا سکتی
مجھے لزبین (Lesbian) کھیل بھی
سکون نہیں بخشتے

محبت کے ساتھ بھی کیا کیا یادیں جڑی ہوتی ہیں
تمہیں یاد ہے
تمہیں موسیقی بھری صداؤں میں کوئی دلچسپی نہ تھی
میرا ہر لفظ تمہارے کانوں میں
موسیقی بن کر داخل ہوتا تھا
تم اپنے بوسوں سے میرے لب بند کر دیتے تھے
اور تم اس بوسے کو موسیقی سے زیادہ
اہمیت دیتے تھے
تم اس سے لطف اندوز ہوتے تھے
شاید اب بھی اس کی یاد
تمہارے ذہن میں ہو
اور تم یہ لطف دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہو

....

آؤ میری بانہوں میں پھر چلے آؤ
اور ان کی گرمی میں پگھل جاؤ
مجھ سے وہ محبت حاصل کر لو
جو شاید تم مجھے کبھی نہ دے سکو
دیکھو جب میں یہ خط لکھ رہی ہوں
خط کے الفاظ میرے آنسوؤں سے بھیگ گئے ہیں
میں جتنا بدحواس ہو رہی ہوں
میری محبت کی شدت اتنی ہی بڑھ رہی ہے

اس کتاب میں 15 خطوط ہیں جو اعلیٰ درجے کی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس میں دیومالائی مشہور عورتوں اور دیویوں کے خطوط موجود ہیں۔ اس میں اوڈی سی لیس کی بیوی پینی لوپ (Penelope) بھی ہے، ہیلن (Helen) بھی ہے ورجل کی ایپک کی ہیروئن ڈیڈو (Dido) اور میڈیا (Medea) بھی۔ ان میں کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں لکھے ہوئے خطوط کے جوابات بھی شامل ہیں

ان خطوط کی نقادوں نے بہت تعریف کی ہے ان خطوط میں محبت کرنے والوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے اور دیومالائی کرداروں کی داخلی کیفیت پر شاعرانہ انداز میں گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ سنسکرت کے شاعر کالی داس کی ''میگھ دوت'' یاد کیجئے جس میں کالی داس بادل کو نامہ بر بنا کر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہے اور اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔

ہیروئن کے بعد اووڈ کا اہم ترین کارنامہ The Amores ہے جسے انگریزی زبان میں The Lovers کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عشقیہ شاعری کی یہ نظمیں تین جلدوں پر مبنی ہیں۔ یہ سب نظمیں اووڈ نے اپنی خیالی محبوبہ Corinna سے

مخاطب ہو کر لکھی ہیں۔ یہ تمام نظمیں عاشق اور محبوب کے تعلقات کے اِرد گرد گھومتی ہیں۔ کل پندرہ نظمیں ہیں۔ پہلی نظم میں اووڈ نے کیوپڈ کی ایک چوری کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایپک لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کیوپڈ ایپک کا عروضی میزانیہ چرا کر لے گیا اور اسے عشقیہ شاعری کی طرف متوجہ کر دیا۔ اگلی نظم میں وہ اپنی محبوبہ سے تعارف کراتا ہے۔ ایک نظم میں وہ Corinna کو گراں قدر تحائف کے بدلے محبت بیچتے ہوئے دکھاتا ہے۔ ایک نظم میں وہ محبوبہ سے ملنے کا منصوبہ بناتا ہے لیکن مل نہیں سکتا۔ ایک نظم میں وہ Corinna کے بالوں کو رنگ کر کے بالوں کو برباد کرنے کا منظر دکھاتا ہے۔ دوسری کتاب میں بھی ایسے ہی واقعات پر مبنی نظمیں ہیں۔ اس میں ایک خطرناک نظم یہ بھی ہے کہ اووڈ اپنی محبوبہ کی نوکرانی کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتا ہے اور محبوبہ کو پتا چل جاتا ہے۔ اس میں ایک نظم Corinna کے توتے کی موت پر لکھا ہوا نوحہ ہے۔ محبوبہ کی بیماری پر ایک نظم ہے۔ ایک نظم حمل ضائع کرنے پر ہے۔ ایک نظم میں وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے Corinna سے محبت کیوں کی اور آئندہ اس سے تعلقات نہ رکھنے کا ارادہ کرتا ہے۔

تیسری کتاب کی بیشتر نظمیں دکھ، درد، کرب، ہجر میں کہی ہوئی نظمیں ہیں۔ نقادوں نے ان نظموں کی تعریف کی ہے۔ یہ سب نظمیں Corinna کے فراق میں کہے ہوئے نوحے ہیں جو اس محبوبہ کی جدائی میں کہے گئے ہیں جو شاید وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔

اووڈ نے سو اشعار کی ایک نظم Women's Facial Cosmetics لکھی ہے۔ جس میں وہ عورتوں کو اپنے چہرے تر و تازہ رکھنے کے گُر بتلاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتلاتا ہے کہ وہ پہلے محفل کے آداب سیکھیں پھر ان مرکبات پر عمل کریں جو اس نے بتلائے ہیں۔

اووڈ کی وہ کتاب جس نے روم کے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا وہ ArsAmatoria تھی جو آج بھی انگریزی نام The Art of Love سے جانی جاتی ہے اور شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے عورتوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے مردوں کو مختلف طریقے بتلائے ہیں۔ یہ کتاب اس نے مردوں سے خطابیہ انداز میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے آپ کو "نصاب محبت کا استاذ" کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ وہ مردوں سے مخاطب ہو کر انہیں محبوب ڈھونڈنے کی جگہوں سے روشناس کراتا ہے۔ اووڈ کہتا ہے کھیل کے میدان، تھیٹر، محفلیں، ایسے مقام ہیں جہاں انہیں محبوب آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے اور پھر انہیں وہ طریقے بتلائے ہیں جن سے وہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ تحفے تحائف دے کر، ملاقات کر کے، مختلف انداز محبت کا استعمال کر کے، تعریف کر کے، تعلقات کو خفیہ رکھ کے۔ تیسری کتاب میں وہ عورتوں سے مخاطب ہے اور انہیں ان تمام باتوں کا توڑ سمجھاتا ہے جو وہ پہلی دو کتابوں میں کہہ چکا ہے۔ اووڈ نے عورتوں کو مردوں سے بچنے اور انہیں محبت میں پھنسانے کے مختلف طریقے بتلائے ہیں۔ اس نے انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ مردوں کی تعریف کی طرف دھیان نہ دیں۔ ایک کی ہو کر نہ رہیں۔ مختلف عمر کے مردوں سے دوستی رکھیں۔ درد بھری اور اداس شاعری کا مطالعہ کریں۔ مختلف کھیلوں میں دلچسپی لیں، محبت کر کے اسے ادھورا چھوڑنے کی عادت اپنائیں۔ بے وفائی کے ہنر سے واقفیت رکھیں۔ کتاب کے آخر میں وہ اِس امید کا اظہار کرتا ہے کہ عورتیں اس کتاب کا ایک ایک لفظ ذہن میں رکھیں گی اور اسے پھیلائیں گی اور کہیں گی کہ

"Ovid was our Teacher"

اووڈ کی یہ کتاب دیکھ کر سنسکرت زبان کی "کماسترا" اور امارو کی نظمیں "نگار خانہ" کا خیال آتا ہے۔ جن میں یہی تمام

موضوعات شامل ہیں جو اووڈ نے اپنی ان کتابوں میں ی کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ وہی انداز محبت، وہی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کے مختلف انداز، وہی عورتوں کو مردوں سے بچنے اور انہیں محبت کے جال میں پھنسا کر برباد کرنے کے طریقے، فرق صرف یہ ہے کہ اووڈ نے دیو مالائی عناصر کا سہارا لیا ہے اور اپنی شاعری میں ایک ماتمی اور مرثیے کے انداز کو قائم رکھا ہے۔

اووڈ نے اپنی ان کتابوں سے ملتی جلتی ایک اور کتاب بھی The Cure for Love بھی لکھی، جس میں محبت کی بگڑی صورت درست کرنے کے طریقے اور محبت کرنے والوں پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ مثلاً اووڈ محبت میں خودکشی کرنے کے خلاف ہے۔ محبت میں کاہلی اور سستی کا قائل نہیں۔ محبت میں حسن کے خلاف ہے۔ محبوبہ اور محبوب کو پرانے خطوط نذر آتش کرنے کا مشورہ دیتا ہے تاکہ وہ بدنام نہ ہوں۔

اووڈ کو ان کتابوں سے بڑی شہرت ملی لیکن اس کی بدنامی بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ اس کا اپنا دل بھی اس انداز کی شاعری سے اکتا چکا تھا اور شاید کچھ شرفا اور با اخلاق شہریوں نے اس پر آوازے بھی کسنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اپنی کتاب (Tristia) میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"کیا تم اپنی جنسی اور فضول رومانی شاعری ترک نہیں کر سکتے۔ اب تک اس موضوع میں الجھے ہوئے ہو، محفلوں میں اور گلی محلے میں تمہاری شاعری کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ جب تم گلیوں سے گزرتے ہو تو لوگ تمہاری طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں "دیکھو یہ وہی شخص ہے جو محبت اور جنس کی آگ میں جل رہا ہے"۔ کیا تمہیں یہ باتیں سن کر شرم نہیں آتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم کسی سنجیدہ موضوع کی طرف توجہ دو۔ مثلاً کوئی المیہ لکھو، جس سے تم ایک عرصے سے بھاگ رہے ہو۔ کوئی بڑی کتاب لکھو یا کوئی رزمیہ لکھو۔"

جنسی نظموں سے توجہ ہٹانے کے لیے جو خیال اووڈ کے ذہن میں آیا اس کے پیچھے ایک اور واقعہ تھا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا اور وہ روم سے بادشاہ آگسٹس کے حکم پر اس کی جلاوطنی تھی۔ آگسٹس کے حکم پر اسے 8 عیسوی میں جلاوطنی کی سزا دی گئی اور اسے کالے پانی (Black-Sea) کے ساحل Tomis بھیج دیا گیا جہاں سے وہ دوبارہ واپس روم نہ آ سکا اور 18 عیسوی میں وہیں فوت ہو گیا۔ جلاوطنی کی وجہ اسکی نظم اور ایک غلطی تھی۔

اووڈ نے تین شادیاں کیں، دو بیویوں کو طلاق دے دی لیکن تیسری بیوی جلاوطنی میں بھی اس کے ساتھ رہی۔ اس تیسری بیوی کی شاہی خاندان سے کچھ عزیز داری تھی چنانچہ اس عزیز داری کی وجہ سے اووڈ کا دربار میں آنا جانا رہا لیکن اسکی جنسی شاعری آگسٹس کے اخلاقی قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ جلاوطنی کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ دوسری وجہ اس سے زیادہ خطرناک تھی۔ ایک گروہ جس میں کچھ شاہی افراد بھی شامل تھے آگسٹس کے خلاف سازش میں مصروف تھا اور چاہتا تھا کہ موقع پا کر بادشاہ کا تختہ الٹ دے۔ اووڈ کو اس سازش کا علم تھا لیکن اس نے بادشاہ کو آگاہ نہ کیا۔ سازش پکڑی گئی، تمام سازشی افراد کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اووڈ کی شاعری کا خیال کرتے ہوئے آگسٹس نے اسے تاحیات Tomis میں رہنے کی سزا دے دی۔ اووڈ اس کے لیے آگسٹس کو بُرا بھلا نہیں کہتا۔ خود کو اس کا الزام دیتا ہے اور کہتا ہے "میری شاعری اور میری ایک غلطی مجھے لے ڈوبی۔"

Tomis میں اووڈ نے بہت بُرا وقت گزارا۔ بڑے دکھ جھیلے، وہاں بیٹھ کر دوستوں اور رشتے داروں کو بہت خط لکھے اور انہیں مجبور کیا کہ وہ آگسٹس سے کہہ کر معافی نامہ جاری کرا دیں مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی اور وہ Tomis ہی میں

بے بسی کی حالت میں فوت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اپنی قبر کا کتبہ لکھ گیا جو اب تک لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کتبے کے الفاظ یہ ہیں:

یہاں اووڈ ناسو شاعر دفن ہے
جس نے محبت کے گیت گائے
اے گزرنے والے
اگر تم نے بھی کبھی محبت کی ہے
تو صرف اتنا کہہ دے
کہ اووڈ ناسو کی ہڈیوں کو
قبر میں سکون ملے

اس کی قبر صدیوں تک لاوارث پڑی رہی۔ 1930 میں رومانیہ کے لوگوں نے اس علاقے کا نام اس کے نام کی مناسبت سے (Ovid) رکھ دیا اور Tomis شہر میں اووڈ کا ایک مجسمہ لگا دیا۔ رومانیہ کے لوگ اس کے نام پر اب بھی اپنے نام رکھتے ہیں۔

جلاوطنی میں رہ کر اووڈ نے وہ شاعری کی جو اسے اب تک دنیا میں ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ وہ اب ایک بدحال اور بُری زندگی بسر کر رہا تھا مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہا۔ Tomis کا موسم بڑا شدید برفیلا تھا۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی مگر اووڈ کی تخلیقی آگ اس برف سے نہ بجھ سکی۔ وہ وہاں کے حالات پر اپنی کتاب Tristia میں لکھتا ہے:

''یہاں سارا سال برف پڑتی ہے۔ شروع ہوتی ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ بس جمتی رہتی ہے۔ کوئی سورج، کوئی بارش اسے پگھلا نہیں سکتی۔ جنوب کی طرف سے آنے والی شدید ہوائیں اسے اور پتھر بنا دیتی ہیں۔ یہ سالہا سال جمی رہتی ہے۔ ہوا اس قدر طوفانی ہے کہ وہ عمارتوں کو اڑا کر لے جاتی ہے مگر برف کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لوگ سارا بدن کپڑوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں صرف چہرہ کھلا ہوتا ہے ان کے بال برف کی لڑیاں بن جاتے ہیں اور برف داڑھی پر لٹکتی رہتی ہے۔ بوتلوں سے نکلتی شراب جام کی طرح کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ شراب پیتے نہیں، شراب کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کھاتے ہیں۔''

اس جلاوطنی میں اووڈ نے Fasti نامی طویل نظم لکھی جو رومن کلینڈر کے بارے میں ہے جس میں میلوں اور تقریبات کا ذکر ہے۔ دوستوں اور رشتے داروں کو خطوط لکھے جو کتابی شکل میں چھپے اور اس کتاب کا نام Letters from the Black Sea تھا۔ مچھلیوں کے بارے میں کتاب On Fishing لکھی اور درختوں کے بارے میں کتاب The Walnut Tree لکھی اور ایک کتاب خوابوں اور ان کی تعبیر کے بارے میں لکھی جس کا نام The Dream ہے، لیکن ان میں سے اہم ترین دو کتابیں (Sorrows) Tristia اور اس کی اہم کتاب Metamorphoses ہے جس کا انگریزی نام Transformations ہے۔

Metamorphoses اووڈ کی پندرہ جلدوں پر مشتمل وہ عظیم کتاب ہے جسے دنیا نے بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا ہے اور اسے آج تک ادبی نقاد تحسین سے نواز رہے ہیں۔ اس کتاب میں تقریباً 250 دیومالائی واقعات

کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں آرفیس میڈیا Pygmalion، نارکیسیس Narcassius۔ رومولیس، اکلیز، پوموتا اور اسی طرح ان تمام افراد کی کہانیاں شامل ہیں جو دیومالائی کہانیوں میں کسی نہ کسی موڑ پر اپنی جون بدلنے پر مجبور ہوئے۔ یہ کتاب اپنی اعلیٰ شعری صفات اور شاعری کے فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شاید انہی اعلیٰ شاعری صفات کو دیکھ کر دانتے (Dante) نے اووڈ کو ورجل، ہورلیس کے بعد تیسرا بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ اووڈ کو اپنی اس تخلیق کے بارے میں شاید علم تھا۔ چنانچہ اس نے Tristia میں کہا ہے:

''میں نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ میرے اس کام کو جیوپیٹر کا غصہ، کوئی تلوار، آگ کا طوفان، وقت کا دھارا ختم نہیں کر سکتا۔ موت کا خونخوار ہاتھ میری زندگی کا نام و نشان مٹا سکتا ہے۔ اس شاہکار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمام ستاروں میں یہ شاہکار، روشن ستارہ بن کر چمکتا رہے گا۔ میرا نام قیامت تک لوگوں کی زبان پر رہے گا۔ میں ہر عہد میں زندہ رہوں گا''۔

43 (ق۔م) میں پیدا ہونے والا روم کا عظیم شاعر اووڈ 18 عیسوی میں انتقال کر گیا۔ آج روم کی عظمت دنیا بھول چکی ہے۔ آگسٹس کا نام کوئی نہیں لیتا لیکن آگسٹس کا جلاوطن کیا ہوا عظیم شاعر اووڈ زندہ ہے اور اسے ساری دنیا اس کے کام کے حوالے سے جانتی ہے۔
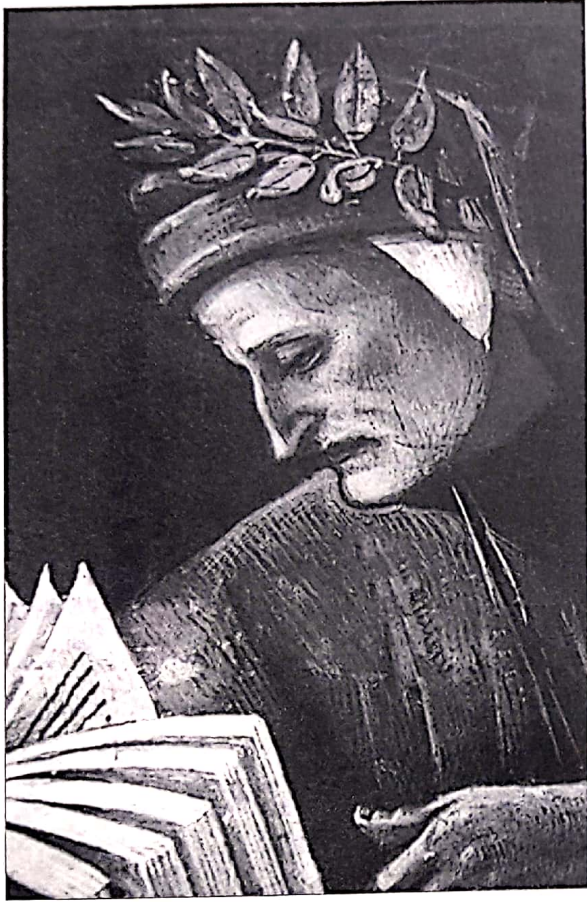
دانتے

(Dante Alighieri)

تیرہویں صدی کا عظیم اطالوی شاعر، ''ڈیوائن کامیڈی'' لکھ کر عالمی شہرت حاصل کی۔ اس عظیم شعری کارنامے سے پوری دنیا کے ادب نے استفادہ کیا۔ اس کی بائیوگرافی ''حیاتِ نو'' بھی ایک عظیم نثری شاہکار ہے۔

جب وہ سامنے سے آتی دکھائی دی تو اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے دنیا میں اب میرا کوئی دشمن نہیں۔ سب دوست ہیں میرے اندر سخاوت کا دیا جل گیا۔ اور میں نے سب کو معاف کر دیا۔ اس وقت مجھ سے اگر کوئی آدمی سوال کرتا کچھ بھی پوچھتا تو میرا ایک ہی جواب ہوتا۔ ''محبت''

(حیاتِ نو)

زندگی آدھی گزر گئی
میری آنکھ ایک تاریک جنگل میں کھلی
لیکن سیدھا راستہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا
میں کیسے بیان کروں
وہ گھنا اندھیرا، خوفزدہ کرنے والا جنگل
میرے حافظے کی سانس رُک گئی
اور میرے خون میں خوف جم گیا
میں یہاں کیسے آ گیا مجھے بالکل نہیں پتا
کیونکہ میں تو گہری نیند سو رہا تھا

(ڈیوائن کامیڈی)

دانتے

میر تقی میر کو بچپن میں ملے دکھ درد، بے بسی، اداسی، تنہائی، سوتیلی ماں، سوتیلے بھائی، سیاسی اور ملکی انتشار، بے روزگاری اور در بدر کی ٹھوکریں شاعر بنا گئیں لیکن حالات کی اس دھند میں کہیں ایک چہرہ میر کو نظر آ ہی گیا جو ساری زندگی دیا بن کر انہیں راستہ دکھاتا رہا اور میر تقی میر پر ایک بے خودی طاری رہی۔

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے
ہم رہے عمر بھر شرابی سے

لیکن دل کا کٹورا خون سے اس وقت بھرتا ہے جب عشق کے دیوتا کیوپڈ کا تیر لاعلمی میں کسی دل کو ریزہ ریزہ کر دے۔ یہ تیر ہر کسی کے مقدر میں نہیں اور یہ نغمہ ہر ساز پر نہیں گایا جاتا۔ اس کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں اور کیوپڈ یہ تیر الگ باندھ کر رکھتا ہے۔ جب کوئی خوش قسمت دکھائی دے تو کیوپڈ کمان سیدھی کر کے تیر چھوڑ دیتا ہے۔ میر تقی میر اور دانتے (Dante) ایسے ہی خوش قسمت انسان تھے۔ دونوں کارِ جہاں میں ناکوں ناک دھنسے رہے سیاسی کارگزاریاں بھی نبھائیں، زندگی بھر بھاگ دوڑ نے بھی پیچھا نہ چھوڑا، مگر دل پر لگی چوٹ کی ٹیسیں کم نہیں ہونے دیں۔ میر نے نوکریاں کیں، بے روزگاری کے دکھ جھیلے، سفیر بنے، فقیری کی، لڑائیاں لڑیں مگر اس درد کی ساری عمر حفاظت کی، جو کسی نے پلے باندھا تھا۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

دانتے دس سال کی عمر میں اپنے باپ کیساتھ فلورنس کے ایک امیر آدمی پورٹیناری (Portinari) کے گھر ایک تقریب میں گیا۔ وہاں صاحب خانہ کی 9 سالہ بیٹی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ دانتے کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ دانتے کو کیوپڈ کے تیر نے دیوانہ بنا دیا اور وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا۔ 20 سال بعد وہ اپنی بائیوگرافی New Life میں لکھتا ہے:

''وہ جب اپنے سرخ قیمتی لباس میں میرے سامنے آئی اور پُروقار خوبصورتی کا جلوہ دکھایا تو دل کی دھڑکن رُک گئی۔ ایک آواز آئی: دیکھو نادان یہی ہے جو تیرے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے گا اور ساری زندگی تجھ پر قابض رہے گا۔''

اس 9 سالہ لڑکی کا نام بیاترس (Beatrice) تھا، جس کی محبت دانتے کے ساتھ ساتھ رہی اور اسے دنیا کا عظیم شاعر بنا گئی۔ دانتے ساری زندگی میر تقی میر کی طرح دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے سرشار رہے اور اس سرشاری میں آسمانوں کی سیر کرتے رہے۔

فلورنس (Florence) شہر جس کا لغوی مطلب تو پھولوں کا شہر ہے لیکن دانتے کے لیے یہ کانٹوں کی سیج ثابت ہوا۔ 1265ء میں یہ گویلیف (Guelfs) خاندان کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ گھرانہ خوشحال تھا۔ عزت، دولت،

زمینداری سب کچھ تھا مگر یہ اچھے دن جلدی گزر گئے ۔ دانتے 5 سال کا تھا تو ماں مرگئی ، باپ نے دوسری شادی کرلی ۔ جب 12 سال کا ہوا تو باپ بھی چل بسا۔ سوتیلی ماں نے اس کی دیکھ بھال کی ، اچھی تعلیم دلائی ، 10 سال کی عمر میں کیوپڈ کے تیر کا نشانہ بن گیا ۔ بیاترس سے ملاقات ہوگئی ۔ جس کی شکل ساری عمر اس کے دل کی کھونٹی پر لٹکی رہی اور

بقول Gorothy L Sayers

"It was the Mirror in Which at the Height of his Powers and to the end of his Days he Beheld all heaven and Earth Reflected."

یہ آئینہ جس میں دانتے کو زمین اور آسمان دکھائی دیتے تھے ، کبھی دھندلا نہ ہوا بلکہ دانتے کو اتنی طاقت بخشی کہ اس نے لافانی طویل نظم The Divine Comedy جیسا شاہکار دنیا کو دیا۔ مگر فلورنس کے سیاسی انتشار نے اسے گھر سے بے گھر کردیا۔ فلورنس نے اسے ایسا دھکا دیا کہ جیتے جی واپس نہ آسکا۔ مرنے کے پچاس سال بعد آیا بھی تو کفن اوڑھ کر صرف قبر میں دفن ہونے کے لیے۔

دانتے کے زمانے کا فلورنس سیاسی لحاظ سے دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ دونوں گروہوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی ۔ ان دو گروہوں کے نام سفید (White) اور سیاہ (Black) تھے ۔ یہ آزادی اور خودمختاری کی جنگ تھی ۔ اٹلی میں یہ جنگ وقفے وقفے سے تقریباً 50 سال تک جاری رہی ۔ 1248 میں (Ghibellines) یعنی سیاہ گروپ نے فریڈرک دوئم کی مدد سے گویلیف کو فلورنس سے نکال دیا۔ 1250ء میں فریڈرک فوت ہوا تو گویلیف سفید پھول سینے پر سجا کر اور ہاتھ میں تلوار لے کر فلورنس واپس آگئے ۔ 1258 میں سیاہ جھنڈے والوں نے گویلیف کا تختہ الٹ دیا۔ 1267 میں گویلیف پھر لوٹ آئے ۔ 1287 میں سیاہ گروپ نے پھر حملہ کیا اور اپنی مضبوط حکومت بنالی ۔ دانتے کا تعلق سفید گروپ سے تھا جبکہ اس کی بیوی کا سارا خاندان سیاہ گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔

بیاترس سے ملاقات کے بعد دانتے عشق کا روگ دل میں لیے دنیاوی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اپنے زمانے کے مشہور سیاست دان ، شاعر ، عالم ، استاد برونتو لائی نی کی شاگردی اختیار کی ۔ فلسفہ ، مذہب اور دینی اخلاقیات کی تعلیم چرچ اور پیرس سے حاصل کی ۔ فوج میں نوکری کی ، سرکاری عہدوں پر فائز رہا۔ اسی دوران بیاترس سے اس کی بازار میں کئی بار ملاقات ہوئی لیکن دانتے اس سے کبھی ہم کلام نہ ہوا۔ ایک بار ایک پارٹی میں بیاترس سے دوبارہ اس کا آمنا سامنا ہوا لیکن وہ اسے دیکھ کر ایسا بدحواس ہوا کہ ساکت ہوگیا۔ دانتے کا دوست سمجھا شاید دانتے فوت ہوگیا ہے ۔ بیاترس کی شادی ہوچکی تھی اس نے کئی بار دانتے کا مذاق بھی اڑایا۔ بیاترس کا خاوند Folco Portinari 1289 میں فوت ہوگیا اور 1290 میں بیاترس مرگئی ۔ دانتے کو محسوس ہوا جیسے فلورنس شہر ہی مرگیا ہے اور سارے جہاں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ بس یہ موڑ تھا جہاں سے دانتے کا اصل تخلیقی عمل شروع ہوا۔

دانتے کی ساری تخلیقی زندگی محبت کے مرکزی نقطے کے گرد گھومتی ہے ۔ بیاترس کی محبت کو وسیلہ بنا کر اس نے اپنے فلسفہ حیات ، شاعری اور اعلیٰ تخلیقی شاہکاروں کی بنیاد رکھی ۔ دانتے کو ایک بار بیاترس نے بازار سے گزرتے ہوئے اشاروں میں سلام کیا تھا۔ بس یہ سلام اسے لے ڈوبا۔ اپنی کتاب Vita Nuova یعنی New Life میں وہ لکھتا ہے:

''جب وہ سامنے سے آتی دکھائی دی تو اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے دنیا میں اب میرا کوئی دشمن نہیں ۔ سب دوست ہیں ۔ میرے اندر سخاوت کا دیا جل گیا اور میں نے سب کو معاف کردیا ہے۔ اس وقت مجھ سے اگر کوئی آدمی کوئی بھی سوال کرتا کچھ بھی پوچھتا میرا ایک ہی جواب ہوتا...... محبت''۔

دانتے کی بائیوگرافی حیات نو The New Life کا شمار دنیا کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے ۔ دانتے نے اس کتاب میں تفصیل سے اپنی زندگی کے نئے رُخ کی نشان دہی کی اور بتلایا ہے کہ مجھے نئی زندگی دینے والی صرف ایک ہستی ہے جس کا نام ہے بیاترس۔

بیاترس جب زندہ تھی تب بھی دانتے کی شاعری میں مرکزی حیثیت سے اپنا اظہار کرتی رہی ۔ جب مرگئی تو دانتے نے اسے اپنی شاعری میں لافانی بنادیا۔ اس کا ثبوت اس کی لافانی نظم (The Divine Comedy) ہے جو ورجل کے ساتھ ساتھ دانتے کی نظم میں موجود ہے ۔ بلکہ جس سرحد میں ورجل داخل نہیں ہوتا وہاں بیاترس دانتے کی راہنمائی کرتی ہے ۔ اس عظیم شاہکار کی تحریک بھی دانتے کو بیاترس ہی نے دلائی ۔ ''حیات نو'' میں دانتے نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اسے بیاترس خواب میں نظر آئی اور میں نے اپنی نظم کی بنیاد رکھنے کے بارے میں سوچا۔ وہ بیاترس کو Marellous Vision کا نام دیتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اسے لکھنے ، بولنے اور سوچنے کی طاقت بیاترس ہی نے دی اور پھر میں نے اس دنیا سے رخصت ہونے والی عورت کی محبت میں وہ شعری مینار تعمیر کیا جو دنیا میں کسی انسان نے کسی عورت کے لیے تعمیر نہیں کیا۔ بقول اس کے ایک نقاد:

He Glorified dead Beatrice

دانتے نے بیاترس کو تصوف کے رنگ میں رنگ دیا۔ اسے انسانی مقام سے اٹھا کر بندگی کے تخت پر بٹھا دیا ہے۔ وہ اسے پروقار ، حسن ، خیر اور سچائی سے تعبیر کرتا ہے اور اسے God Bearing Image کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

دانتے کی نظم ڈیوائن کامیڈی کے تین حصے ہیں۔

1- Hell (inferno)
2- Purgatory (Purgatorio)
3- Paradise (Paradiso)

دانتے کے آسمانی سفر میں پہلے دو حصوں میں ورجل اس کا راہنما ہے لیکن جب جنت کا دروازہ آتا ہے تو بیاترس ظاہر ہوتی ہے اور ورجل دانتے کو بیاترس کے سپرد کرتا ہے تاکہ دانتے کو جنت کی سیر کرائے ۔ یہ عظیم نظم دانتے نے جلاوطنی کے زمانے میں لکھی۔

بیاترس کی موت کے بعد دانتے کا فلورنس میں رہنا محال ہوگیا۔ اس کی مخالفت سیاسی حلقوں میں عروج پر پہنچ چکی تھی ۔ اس کے سیاسی نظریات حکمرانوں اور درباریوں کے لیے بہت تکلیف دہ بن چکے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ دانتے سرتاپا مذہبیت کی چادر میں لپٹا ہوا تھا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پاپائیت کے سخت خلاف تھا اور بادشاہت کے حق میں تھا۔ چنانچہ حکومت کے ارکان اس کے سخت مخالف ہوگئے ۔ وہ اسے گرفتار کرکے جیل میں ڈالنے ہی والے تھے کہ دانتے فلورنس سے بھاگ گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ دانتے کی جان بچ گئی ورنہ بقول کارلائل:

''حکومت اسکی جانی دشمن بن چکی تھی ۔ حکومت نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ دانتے نامی شاعر جسے جہاں بھی ملے اسے زندہ جلادیا جائے ۔''

چنانچہ دانتے جلاوطنی میں فلورنس کی یاد میں آنسو بہاتا رہا۔ زندہ کبھی فلورنس واپس نہ آیا۔ مرنے کے پچاس سال بعد فلورنس والوں نے اسکی عظمت کو تسلیم کیا۔ اس کی ہڈیوں کو اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا اور اہل وطن اس کے گن گانے لگے۔

دانتے کی لافانی نظم ڈیوائن کامیڈی عالمی ادب کے صف اول کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے ۔ دنیا کی ہر زبان میں

اس کے تراجم ہو چکے اور بے شمار شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے ہر لفظ میں ایک تقدس چھپا ہے۔ جس نے نہیں پڑھی وہ بھی اس کی عظمت کا قائل ہے اور اسے لافانی ادب پارہ مانتا ہے۔ والٹیئر کا کہنا ہے کہ یہ نظم بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ اسے مکمل طور پر سمجھا نہیں گیا لیکن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہی (Divine Comedy) کی عظمت کی دلیل ہے۔

دانتے دراصل ایک ایسے معاشرے کا خواہش مند تھا جہاں دولت، لالچ، قتل وغارت یا منافقت کی حکمرانی نہ ہو۔ جہاں انسان عدل وانصاف کی چھتر چھایا میں بے فکری کی زندگی گزرے۔ جہاں حسن، محبت اور سچائی انسانوں کا شعار ہو۔ یہ خیال شاید دانتے کے ذہن میں فلورنس میں رائج قتل وغارت اور لالچی حکمرانوں کو دیکھ کر آیا۔ وہ پاپائیت کی حکمرانی سے تنگ آ چکا تھا اور اس کے ذہن میں صرف خدا کی حکمرانی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی نظم کے لیے یہی موضوع منتخب کیا۔ مسئلہ درپیش یہ تھا کہ وہ اس سفر میں اپنا راہنما کسے بنائے۔ اس کی نظر اپنے گرو، اپنے استاد، اپنے شاعر، اپنے رہنما ورجل پر گئی جسے وہ ذہنی طور پر اپنا سب کچھ مانتا تھا۔ وہ ورجل کے بارے میں کہہ چکا تھا:

" Virgil my Guide , my Poet, my Teacher "

چنانچہ اس نے اس سفر میں ورجل کو اپنا رہنما بنایا۔

ڈیوائن کامیڈی کے موضوع پر دانتے نے جلاوطنی کے زمانے میں بہت کام کیا۔ دانتے کو پوری طرح علم تھا کہ آدمی بقول ارسطو سوشل اینیمل ہے۔ اسے پوری طرح سدھارنے کے لیے ایک مثالی معاشرے کی ضرورت ہے۔ جس میں انصاف ہو، امن ہو اور ہر انسان کو مساوی حقوق دستیاب ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا اگر انہیں برائیوں سے آگاہی ہو اور وہ ایک مرکز ایک آفاقی طاقت کی پہچان رکھتے ہوں۔ وہ ایسی ہی سلطنت کا متلاشی تھا۔ اس کے ذہن میں روم کی وہی مثالی سلطنت تھی جس کا ذکر ورجل اپنی طویل ایپک اینیڈ میں کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہی حکومت تھی جسے وہ ''خدا کی بادشاہت'' کا نام دیتا ہے۔ اور یہ بادشاہت چرچ کے وسیلے سے نہیں بادشاہت کے ذریعے حاصل ہو سکتی تھی۔ اسی لیے وہ بادشاہت کے حق میں اور پاپائیت کے خلاف تھا۔

ڈیوائن کامیڈی کو دانتے نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ 1 جہنم۔ 2۔ اعراف۔ 3 بہشت

اس مضمون میں تینوں حصوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ میں صرف ''جہنم'' (Hell) کی مختصری تفصیل پیش کروں گا۔

ایپک کا آغاز دانتے کی پریشانی سے ہوتا ہے۔ وہ سیدھا راستہ کھو چکا ہے اور ایک ایسے راستے پر جا نکلتا ہے جو اسے ایسے جنگل میں لے جاتا ہے جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے، وہ وہاں سے نکلنا چاہتا ہے، وہ ایک خوبصورت پہاڑی پر چڑھتا ہے لیکن ایک چیتا اس کا راستہ روک لیتا ہے۔ وہ پریشان اور مایوس ہو کر اداس آواز میں کہتا ہے:

زندگی آدھی گزر گئی تو
میری آنکھ ایک تاریک جنگل میں کھلی
لیکن سیدھا راستہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا

....

میں کیسے بیان کروں
وہ گھنا اور اندھیرا، خوفزدہ کرنے والا جنگل

میرے حافظے کی سانس رُک گئی تھی
اور میرے خون میں خوف سا جم گیا تھا۔

....

میں یہاں کیسے آ گیا، مجھے بالکل نہیں پتا
کیونکہ میں تو گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا
جب میں نے آنکھ کھولی
تو میں اس تنگ اور تاریک راستے میں تھا
میں نے پھر آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھا
صبح طلوع ہو چکی تھی
جس کے شانوں سے روشنی جھلک رہی تھی
وہ روشنی جس میں انسانوں کے نرم قدم
اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں
میں چلتا رہا لیکن اب میں
تاریک جنگل میں ہوں

....

اسی دوران اسے ایک سایہ نظر آتا ہے جسے دیکھ کر دانتے ڈرتا ہے لیکن جب وہ قریب آتا ہے تو وہ ایک انسان ہے دانتے اسے دیکھ کر کہتا ہے:

تم بھوت ہو یا انسان
تم جو کوئی بھی ہو میری مدد کرو
مجھ پر رحم کرو میں راستہ بھول گیا ہوں
وہ سایہ دانتے کو دیکھ کر کہتا ہے
اب نہیں لیکن کبھی میں انسان تھا
میرے والدین (Mantuan) کے شہری تھے
میں شاعر تھا میں نے شعر لکھے
ٹرائے کی بربادی کے بعد
جب لوگ وہاں سے نکلے
تو میں نے ان کی شان میں شعر لکھے

دانتے اس سائے کی باتیں سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا:

کیا تم ورجل نہیں ہو
جس نے پروقار اور عالی شان شاعری کی

اے قابل احترام شاعر
میری بے پناہ محبت اور عقیدت تمہارے لیے ہے
میں تمہارے روبرو عقیدت میں
اپنا سر خم کرنا چاہتا ہوں

....

دانتے کی ورجل سے یہ ملاقات بڑی مفید ثابت ہوئی۔ دانتے نے اسے اپنا رہنما بنالیا۔ اس طرح وہ ورجل کو ساتھ لے کر دوزخ کی یاترا کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ وہ جہنم کے نچلے حصے کی طرف اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔ جہنم میں داخلے پر سب سے پہلے ان کی ملاقات قسمت کا حال بتانے والے نجومیوں سے ہوتی ہے۔ دانتے نے ان کی وضع قطع کچھ اس طرح دکھائی ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نجومی مستقبل کا حال نہیں جانتے۔ انہیں پیچھے کا حال معلوم ہے۔
آگے دیکھنے کی طاقت ان میں بالکل نہیں
ان کی گردنیں پیچھے کی طرف مُڑی تھیں
وہ آگے کی بجائے پیچھے چل رہے تھے
کیونکہ وہ آگے دیکھنے سے قاصر تھے

جہنم میں گناہ گار روحوں کا ہجوم تھا اور یہ 9 حصوں میں تقسیم تھیں اور یہ حصے ایک دوسرے کے اوپر بنے ہوئے تھے۔ پہلے حصے کے دروازے سے داخل ہونے لگا تو دانتے نے دیکھا دروازے پر لکھا تھا کہ اب تم آہوں اور آنسوؤں کے شہر میں داخل ہورہے ہو۔ اس شہر میں جو چلا گیا وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

اس میں وہ فرشتے ہیں جنہوں نے حکم خداوندی سے انکار کیا وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے خدا کا اقرار کیا نہ انکار کیا، بلکہ ساری زندگی شکوک میں مبتلا رہے۔ یہ سب لوگ ہاتھ باندھ کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے اور نا قابل فہم الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے تھے اور ان کے منہ سے نکلی ہوئی آوازیں ساری فضا کو داغدار کر رہی تھیں۔

ورجل اور دانتے چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانچ ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ان میں کشتیاں کھڑی تھیں جن پر روحیں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ دانتے نے ورجل سے پوچھا:

''یہ کشتیاں کہاں جارہی ہیں''

''یہ ملاح انہیں لے کر جہنم کے مختلف حصوں میں جارہے ہیں''

ورجل یہ کہہ کر کشتی بان شارون کے پاس گیا اور کہا:

''میں حکم الٰہی سے اس فانی انسان کو جہنم کی سیر کرا رہا ہوں''

جہنم کے ایک ڈھلوان راستے سے گزر کر وہ ایک ایسی جھیل کے پاس پہنچتے ہیں جہاں ایک شیطان ناف تک جھیل میں ڈوبا ہوا کھڑا ہے ارد گرد روحیں درد اور کرب میں مبتلا ہیں۔ روحیں الٹی لٹکی ہوئی ہیں اور آہ و فغاں اور درد کی شدت سے رو رہی ہیں۔ دانتے نے ورجل سے پوچھا:

''میرے پیر و مرشد۔ یہ کون ہیں''

ورجل نے جواب دیا: ''یہ زنا کے گناہ کے مرتکب ہیں ان کی سزا کا خاتمہ نہیں ہوگا''۔

کچھ لوگ انہیں ایسے بھی نظر آئے جن کے چہرے جلے ہوئے تھے بس جبڑے ہل رہے تھے۔ دانتے کے پوچھنے پر ورجل نے جواب دیا یہ سب شرابی لوگ ہیں۔ دانتے نے دیکھا کہ ان پر پیپ اور غلاظت کی بارش ہورہی تھی اور وہ یہ پیپ پی رہی تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے عیاشی اور فضول خرچی کو اپنا وتیرہ بنا رکھا تھا۔

دانتے نے جہنم کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے اور گناہ گاروں کی مختلف اقسام کو ان حصوں میں دکھایا ہے۔ جہنم کا ایک مرکزی حصہ ہے جسے وہ دارالحکومت کا نام دیتا ہے۔ اس کے دروازے سے کوئی ایسا شخص داخل نہیں ہوسکتا جو گوشت پوست رکھتا ہو یا اس زمین کی مٹی اس کے جسم پر لگی ہو۔ اس میں صرف مرنے کے بعد روحوں کو داخل ہونے کی اجازت ہے۔

جہنم کے ایک حصے میں غلاظت، خون، پیپ اور کیچڑ میں لپٹی ہوئی روحیں دریا کے پانی پر بے چینی کی حالت میں دوڑی پھر رہی ہیں۔ ایک دوسری کو نوچ رہی ہیں، لڑ رہی ہیں۔ ورجل دانتے کو بتلاتا ہے کہ یہ مسلسل گناہوں میں مصروف رہنے والی روحیں ہیں، جنہوں نے دنیا کو صرف گناہوں کی آماجگاہ سمجھا تھا۔

ایک حصے میں خون کے دریا میں روحیں ابل رہی تھیں اور دریا سے باہر نکل رہی تھیں لیکن دریا کے کنارے گھوڑوں پر سوار کچھ فرشتے دوڑ رہے تھے ان کا کام یہ تھا کہ وہ ان روحوں کو دوبارہ دریا میں پھینک دیں جو دریا سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے باہر نکل رہی تھیں۔

دانتے اس منظر سے لرز گیا، ورجل سے ان کے بارے میں پوچھا تو ورجل نے جواب دیا:

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا نہ ہمسایہ اور پڑوسی کے آرام کا خیال رکھا۔ نہ ہی خدا کے احکامات کو مانا بلکہ رشتے داروں اور پڑوسیوں کے حقوق پورے نہ کیے اور ان پر تشدد سے کام لیا۔ پھر ورجل کے اشارہ کرنے پر دانتے نے ایک طرف نظر دوڑائی۔ وہاں گرم ریت پر آگ کے الاؤ جل رہے تھے۔ ورجل نے کہا:

یہ سود خوروں اور ناجائز منافع کمانے والوں کا گھر ہے جہاں وہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے۔ خدا نے انسان کو زمین پر ہل چلانے، فصلیں اگانے کا حکم دیا تھا مگر ان لوگوں نے رزق حلال کی بجائے حرام کو سینے سے لگایا۔

اس کے بعد ورجل اور دانتے چلتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے جس میں اندھیرا تھا، شاخیں اور لمبی سوکھی ٹہنیاں لٹک رہی تھیں۔ دور تک روشنی کا نام و نشان نہ تھا۔ دانتے ایک درخت کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک ٹہنی اس کے سامنے آگئی۔ دانتے نے وہ ٹہنی توڑ دی۔ جوں ہی دانتے نے ٹہنی توڑی درخت درد سے چلا اٹھا اور ٹہنی سے خون بہنے لگا پھر درخت رو کر بولا ''تم نے تو مجھے زخمی کر دیا ہے۔''

دانتے نے حیران ہو کر ورجل کی طرف دیکھا۔ ورجل نے کہا یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے خودکشی کی ہے۔ اپنی زندگی اپنے ہاتھ سے ختم کی ہے۔ انہیں شاخیں اور ٹہنیاں بنا کر یہاں لٹکا دیا گیا ہے تاکہ یہ ہمیشہ آہ و فغاں کرتے رہیں۔

جنگل سے نکل کر وہ ایک ندی کے دہانے پر پہنچے جہاں ندی میں پانی کی بجائے گرم ریت ابل رہی تھی اور اس میں دھوکے باز اور فریب کاروں کی طرح بھونے جارہے تھے۔ اس ندی کی رکھوالی درندے کر رہے تھے۔ ورجل نے ایک درندے کو اپنے پاس بلایا اور پھر دونوں اس پر سوار ہو کر ایک طرف چل دیئے اور ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں گوشت بھوننے کی بدبو آرہی تھی اور چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ورجل نے بتلایا یہاں وہ لوگ بھونے جارہے ہیں جنہوں نے خدا کی دی ہوئی عقل کا غلط استعمال کیا اور اسے تخریبی کاموں میں استعمال کیا۔ دانتے اور ورجل یہاں سے جلدی

جلدی آگے چلے دیئے اور برفیلے علاقے میں پہنچ گئے جہاں ہر چیز منجمد تھی۔ یہ جھیل جمی ہوئی تھی اور شیطان اس میں دھنسا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ نمرود بھی برف میں دھنسا ہوا کھڑا تھا اور وہ تمام لوگ تھے جنہوں نے خدا کی مخلوق کو ورغلایا تھا اور خدا سے منحرف ہوئے تھے۔ وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے خدا کی مخلوق کو ورغلایا تھا اور خدا سے منحرف ہوئے تھے۔ وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنے محسنوں سے غداری اور بے وفائی کی تھی۔

دانتے جہنم کے یہ دل ہلا دینے والے نظارے دیکھ کر بہت گھبرا چکا تھا۔ مایوسی اور اداسی نے اس کے اعصاب کو منتشر کر دیا تھا۔ ورجل اسے تسلی دے کر اوپر لے گیا۔ اب وہ اس راستے پر آ گئے تھے جہاں ستارے چمک رہے تھے اور یہاں سے Puraatory کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ دانتے عیسائی اخلاقیات سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے عقیدے کے مطابق یہ وہ علاقہ ہے جہاں عیسائی روحیں فرشتوں کے ساتھ قدس گیت گنگناتی ہوئی آتی ہیں اور پھر یہ راستہ طے کر کے جنت کی طرف چلی جاتی ہیں۔ بہشت Paradise کے دروازے پر جب ورجل اور دانتے پہنچتے ہیں تو دانتے دیکھتا ہے کہ دروازے پر بیاترس کھڑی ہے۔ ورجل دانتے کو اس کے سپرد کرتا اور اسے حکم دیتا ہے کہ وہ دانتے کو بہشت کی سیر کرائے۔ بہشت کا سارا سفر دانتے بیاترس کے ساتھ کرتا ہے۔ اس سفر میں دانتے کا شعری معیار اپنے عروج پر ہے اور اس نے ہر لمحے کو نہایت ہنر مندی سے بیان کیا ہے۔ جب اسے نور خداوندی نظر آتا ہے اور وہ اسے دیکھتا ہے تو دانتے اپنی بے بسی کا اظہار کرتا اور کہتا ہے کہ باوجود کوشش کے میں اس لمحے کو بیان کرنے میں بے بس ہوں۔

ڈیوائن کامیڈی نے مغرب، یورپ اور دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب پر بہت گہرا اثر مرتب کیا۔ انگریزی شاعر چاسر اور خاص طور پر ملٹن اسکے بہت زیادہ زیر اثر رہے۔ ملٹن کی paradise lost پر ڈیوائن کامیڈی کے بہت گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ جہاں تک دانتے کی اس ڈیوائن کامیڈی کا تعلق ہے تو کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ دانتے نے نظم کو لکھنے سے پہلے خود بھی اثرات قبول کیے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نظم کی تشکیل اور فکری بنت میں عربی اور اسلامی نظریات کا بہت دخل ہے۔ 1919ء میں سپین کے ایک سکالر نے (جو کیتھولک پادری تھا) جس کا نام پروفیسر Asin palacios تھا۔ اس نے ڈیوائن کامیڈی میں اسلامی فلاسفی اور فکر کی نشان دہی کی ہے اور کہا ہے کہ دانتے نے جہنم کی تشکیل میں بہت سے واقعات اسریٰ اور معراج نبویؐ کی روایتوں سے لیے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دانتے عربی زبان سے واقف تھا؟

اس کا جواب اس نے یہ دیا ہے کہ کتاب المعراج کا لاطینی ترجمہ 1264 میں The book of mohammad,s Leader کے نام سے ہو چکا ہے۔ ممکن ہے اس کی کوئی کاپی دانتے کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ لیکن کچھ نقاد اس بات سے متفق نہیں ہیں۔

ڈیوائن کامیڈی کا عالمی ادب میں ایک اہم مقام ہے۔ اسے ایک لازوال شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ فلورنس میں پیدا ہونے والا دانتے Ravenna میں جلاوطنی کی حالت میں فوت ہوا۔ 1519ء میں اس کے جسد خاکی کو فلورنس لانے کیلئے سفیر راوینا گیا۔ قبر کھولی گئی لیکن وہاں چند ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پادری نے یہ کہہ کر قبر دوبارہ بند کر دی:

''دانتے نے زندہ حالت میں بدن اور روح کے ساتھ جہنم اعراف اور بہشت کی سیر کی تھی۔ ہوسکتا ہے مرنے کے بعد بھی اسکا جسم اور روح ایک ساتھ آسمان پر لے جائے گئے ہوں۔''

بوکیچو

(Giovanni Boccaccio)

چودھویں صدی عیسوی کا اطالوی شاعر، کہانی کار بوکیچو جس کی تخلیق ''ڈیکمرون'' سے چاسر اور شیکسپیئر نے فیض حاصل کیا۔ 100 کہانیوں کی اس کتاب سے دنیا کے ادب نے بڑا استفادہ کیا ہے۔

گیووانی بوکچیو

کہتے ہیں اگر گیووانی بوکچیو (Giovanni Boccaccio) نہ ہوتا تو دو بڑے آدمی آنے والی نسلوں سے پوری طرح متعارف نہ ہوتے۔ ایک اطالوی شاعر دانتے (Dante) اور دوسرا انگریزی زبان کا شاعر چاسر (Chaucer)۔

دانتے کی عظیم تخلیق ڈیوائن کامیڈی چھپی تو لوگ اس کی عظمت سے لاعلم رہے۔ اس کے اندر چھپی فنی اور فکری عظمتوں پر ان کی نظر نہ پہنچی۔ اس تخلیق سے ایک عرصہ تک لوگ لاعلم رہے، بغیر پڑھے اس کی عظمت سے بے خبر رہے، ایک بار فرانسیسی مصنف والٹیئر سے کسی نے پوچھا۔ ''دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے''

والٹیئر نے ہنس کر جواب دیا:

''ڈیوائن کامیڈی'' بڑی عظیم تخلیق ہے۔ میں نے اسے پڑھا نہیں لیکن میں اس کی عظمت کا قائل ہوں۔ میری طرح لاکھوں قارئین کا یہی خیال ہے اگر چہ انہوں نے بھی اسے نہیں پڑھا''۔

یہ تو والٹیئر کے زمانے کی بات ہے۔ بوکچیو کے زمانے (1313-1375) میں بھی لوگوں کی یہی رائے تھی بلکہ انہوں نے تو کھل کر اس کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ خاموش تھے اور کتاب گمنامی کے اندھیروں میں پڑی تھی۔ بوکچیو نے دانتے کی اس تخلیق کی طرف دھیان دیا۔ اس نظم کے اندر اترا، چھپی عظمتوں کا کھوج لگایا، فنی باریکیوں اور فکری وسعتوں کو پرکھا، دانتے پر یونیورسٹی اور ادبی محفلوں میں لیکچر دیئے۔ قارئین اور دانتے کے درمیان پھیلے فاصلوں کو ختم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دانتے گمنامی کے اندھیروں سے باہر آ گیا۔ اگر بوکچیو یہ سب کچھ نہ کرتا تو شاید دانتے اپنے پورے قد کاٹھ کے ساتھ ہم تک نہ پہنچتا۔

انگریزی شاعری کا باوا آدم چاسر (Chaucer) یوں تو دانتے اووڈ اور بوکچیو سے متاثر ہے لیکن جس شاعر کا ہاتھ پکڑ کر چاسر نے چلنا سیکھا جس کے کاندھے پر کھڑے ہو کر چاسر نے عظمت کے آسمان کو ہاتھ لگایا اس کا نام بوکچیو ہے۔

چاسر ایک عرصہ دربار سے منسلک رہا اور اپنی سفارتی ذمے داریوں کے سلسلے میں اس نے اٹلی اور فلورنس کے بے شمار دورے کیے۔ اسے دانتے اور بوکچیو کو پڑھنے کا موقع ملا لیکن اس نے بوکچیو سے اثر قبول کیا بلکہ اس نے اپنی شاعری میں کئی جگہ بوکچیو کی شاعری کا ترجمہ کر کے شامل کر لیا۔

چاسر کا پہلا مشہور رومانوی شعری کارنامہ جس سے وہ (Troilus and criseyde) ہے جو بوکچیو کی مشہور رومانوی نظم (il filostrato) سے پوری مشابہت رکھتی ہے۔ چاسر نے اس قصے کو انگریزی زبان میں لکھا اور لکھتے ہوئے بوکچیو کے رومانوی مناظر کو ترجمہ کر کے اپنی نظم میں شامل کر لیا ہے۔ بوکچیو کی یہ نظم Trojan war میں بچھڑنے والے دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔ چاسر نے جب اپنی مشہور عالم تخلیق کانٹربری ٹیلز (Canterbury tales) لکھنے کا منصوبہ بنایا تو اس کے سامنے بوکچیو کی تخلیق ''ڈیکمرون'' تھی۔ چاسر نے اپنی کہانیوں کا سارا فارمیٹ بوکچیو سے لیا۔ بوکچیو نے ''ڈیکمرون'' میں 100 کہانیاں لکھیں۔ چاسر نے 22 کہانیوں سے اپنی کتاب بنالی۔

اگر بوکچیو نہ ہوتا تو دانتے کی تفہیم مشکل ہو جاتی۔ اور چاسر کو کہانی لکھنے کا فن نہ آتا۔

....

''ڈیکمرون'' ایک کوری ڈور ہے جس میں بھانت بھانت کے انسان جمع ہیں اور اپنی روداد سنا رہے ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں۔ مزدور بھی۔ چرچ کے پادری بھی۔ چور، گھریلو عورتیں ان پڑھ، پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی، کرداروں کا ایک ہجوم ہے اور ان کی کہانیاں۔

(جولین پیٹرک)

....

بوکچیو، اووڈ (OVID) سے متاثر تھا۔ اووڈ نے سچ بولنے میں ڈنڈی نہیں ماری، بوکچیو نے بھی ہر بات کھول کر سامنے رکھ دی۔

گیووانی بوکیچو اٹلی کے شہر Ertaldo میں 1313ء میں پیدا ہوا۔اس کے مقام پیدائش کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ پیرس میں پیدا ہوا لیکن چند محققین کا خیال ہے کہ وہ (ertaldo) میں ہی پیدا ہوا۔ باپ تاجر تھا، ماں گمنام خاندان کی ایک خاتون تھی اور بوکیچو ان کا ناجائز بچہ تھا۔ بعد میں بوکیچو کے باپ نے اس کی ماں سے باقاعدہ شادی کرلی۔

بوکیچو کا ابتدائی زمانہ فلورنس میں گزرا اور اسے ابتدا میں ہی ایک ایسا عالم فاضل استاد مل گیا جس نے اسے علم وادب کی طرف راغب کردیا اس کا نام (Mazzuoli) تھا۔اس نے بوکیچو کا تعارف دانتے کی تحریروں سے کرایا۔ بوکیچو کے باپ نے اسے ایک بینک میں ملازم کرادیا لیکن بوکیچو نے یہاں کام کرنے سے انکار کردیا اور قانون کی تعلیم کی طرف دھیان دینا شروع کردیا۔ چھ سال اس نے قانون کی تعلیم جاری رکھی لیکن ادب سے اس کی دل چسپی جاری رہی۔ 1330 میں بوکیچو ایک جذباتی حملے سے دوچار ہوا اور شاید یہ اس کا پہلا محبت بھرا تجربہ تھا۔

بوکیچو کے باپ کی معرفت اس کی رسائی کنگ رابرٹ آف نیپلز (جسے رابرٹ The wise بھی کہا جاتا تھا) تک ہوئی۔اس کی شادی شدہ بیٹی سے بوکیچو کو عشق ہو گیا یہ عشق اتنا شدید ہوا کہ اس نے اس کے کردار کو اپنی نظموں کا کردار بنا کر لافانی بنادیا۔اس کی مشہور نظم filostrato il میں ابھرنے والا نسوانی کردار بوکیچو کی محبوبہ کا کردار ہے۔

بوکیچو کا دوسرا جذباتی تعلق فلپ آف ٹارنٹوون کی بیوہ سے ہوا۔ دونوں تعلقات سے اس نے شاعری کے لیے بہت سے موضوعات اکٹھے کیے اور اپنی شاعری کو مالا مال کیا۔اس دوران بوکیچو کا رجحان یونانی ادب کی طرف ہوا اس نے یونانی زبان سیکھی اور یونان کے ادب نے اس پر ایسا جادو کیا کہ اس نے ہومر (Homer) یوری پیڈیز کے ادبی اور فکری شاہکاروں کا ترجمہ کر ڈالا۔

بوکیچو کے پیٹرارک کے ساتھ بہت مراسم تھے۔ وہ پیٹرارک کو اپنا استاد کہتا ہے۔ اسی بڑے آدمی نے بوکیچو کو یونانی زبان اور یونانی ادب کی طرف راغب کیا۔ بوکیچو کی پیٹرارک سے 1351ء میں Padua کے مقام پر ملاقات ہوئی جہاں بوکیچو ایک سرکاری دورے پر تھا۔ بوکیچو نے پیٹرارک کو فلورنس یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے ایک نوکری کی پیشکش کی مگر کامیابی نہ ہوئی لیکن تامرگ اس سے ایک رشتہ قائم رہا۔اس سے مسلسل ملاقاتوں سے بوکیچو نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس کے گھر گیا اس کی لائبریری سے بہت استفادہ کیا۔ 1374ء میں جب اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو اس پر ایک طویل نظم لکھی۔

بوکیچو نے 1341ء میں نظم ونثر کا مجموعہ (Ameto) کے نام سے شائع کیا۔ پچاس کنٹوز کی ایک تمثیل جس کا نام Amorosa- vision تھا 1342ء میں آئی۔ 1374ء میں اس نے The fates of famous men لکھی اور 1362ء میں On Famous Women آئی یہ دونوں کتابیں بائیوگرافی کی صنف میں آتی ہیں۔

1349ء میں اس نے اپنی عالمی شہرت یافتہ کتاب ''ڈیکمرون'' (Decameron) پر کام شروع کیا اور 1353ء میں اس نے 100 کہانیوں کی یہ کتاب مکمل کرلی۔

''ڈیکمرون'' ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ''دس دن'' ہے۔ یہ سب کہانیاں دس دنوں میں کرداروں نے سنائیں اور ان کہانیوں کو بوکیچو نے چار سالوں میں لکھ کر کتاب بنالی۔ ان دس دنوں کا ایک پس منظر ہے جو کچھ یوں ہے۔

1348ء میں فلورنس شہر نے بہت سی تبدیلیاں دیکھیں تاجر طبقے کو تجارت میں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ شہر کا مال دار

طبقہ غربت کی دلدل میں دھنس گیا۔ امیر فقیر ہو گئے اور لوگ ایک وقت کی روٹی کو ترسنے لگے لیکن اب شہر پر جو سب سے بڑی آفت آئی وہ طاعون کی بیماری تھی۔ جس نے شہر کی چوتھائی آبادی کو قبرستان پہنچادیا۔ طاعون کی یہ آفت تاریخ میں (Black Death) کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

بوکیچو لکھتا ہے کہ شہر کی سات امیر ترین عورتوں نے اس بیماری سے بچنے کا ایک طریقہ سوچا۔ وہ اپنے ساتھ تین مردوں کو لیکر شہر سے دور ایک گاؤں میں چلی گئیں اور ایک حویلی میں قیام کرلیا۔ ہر کردار کے ذمے دس کہانیاں تھیں چنانچہ دس دنوں میں یہ سو کہانیاں مکمل ہو گئیں اور ڈیکمرون نامی ایک لافانی کتاب بن گئی جو انسانوں کی اچھائیاں اور برائیاں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں حماقتیں بھی ہیں، ذہانت بھی ہے، انسانی بہادری بھی ہے، بس یوں سمجھ لیں کہ ایک بہت بڑا کوری ڈور ہے جس میں انسانوں کا ایک ہجوم ہے جس میں بھانت بھانت کے انسان جمع ہیں اور اپنی اپنی روداد ہمیں سنا رہے ہیں۔ تاجر، مزدور، چرچ کے پادری، نن، چور، گھریلو عورتیں، کسان، ان پڑھ، پڑھے لکھے کرداروں کا ایک ہجوم ہے جنہیں دیکھ کر اور جن کی کہانیاں سن کر انسانی کردار کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ بقول گریٹ رائٹرز کے مصنف جولین پیٹرک (Patrick -julian)۔

In every story, The reader is confronted with the vices and virtues of humankind in a gallery of characters and situations exemplifying heroism self-denial foolishness, intelligence and modesty

بوکیچو احیائے علوم کے آغاز کا مصنف ہے۔ ان کہانیوں میں اسی عہد کے انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بوکیچو کی ان کہانیوں سے دنیا کی تمام زبانوں کے ادب نے فائدہ اٹھایا۔ خاص طور پر چاسر اور شیکسپیئر، اور پھر ان دونوں کے ذریعے بوکیچو کا لکھا ہوا ادب پوری دنیا میں پھیل گیا۔

''ڈیکمرون'' کی یہ کہانیاں عورت مرد کے تعلقات کے اردگرد گھومتی ہیں۔ یہ تعلقات جائز بھی ہیں اور ناجائز بھی۔ جنس کا جذبہ ہر عہد میں لوگوں کیلئے دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ ان کہانیوں میں یہ جذبہ بہت شدت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے اور اسی لیے ان کہانیوں کو بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ ان داستانوں یا کہانیوں پر کبھی کبھی فحاشی کا الزام بھی لگ جاتا ہے۔ یہ الزام بوکیچو کے زمانے میں بھی لگا۔ اس کے بعد بھی چند تنگ نظر نقادوں نے لگایا مگر ان کہانیوں کی مقبولیت میں فرق نہ آیا بلکہ ان الزامات کے بعد پڑھنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

انسانوں کے اس جنگل میں ہر قسم کا انسان پایا جاتا ہے۔ نیک، بد، برا، اچھا، اخلاقی درس دینے والا نصیحت کرنے والا، نیکی کی ترغیب دینے والا، برائی کی طرف راغب کرنے والا، انسانوں کی اس ''سرکاراما'' میں ہر قسم کا منتظر موجود ہے۔ بوکیچو نے اپنے عہد کے ہر قسم کے انسان کی کہانی لکھی ہے اور ایمانداری سے لکھی ہے وہ اپنے پیشرو اووڈ (Ovid) سے بہت متاثر تھا۔ جس طرح اووڈ نے سچ بولنے میں ڈنڈی نہیں ماری بوکیچو نے بھی ہر بات کھول کر سامنے رکھ دی ہے۔ چرچ میں رہنے والے پادریوں کے Nuns کے ساتھ تعلقات اور بظاہر نیک نظر آنے والے انسانوں کے اندر کی برائیاں، بوکیچو نے سب کچھ پردہ اٹھا کر ہمیں دکھا دیا ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ساری کی ساری کہانیاں ایسی ہیں۔ ان کہانیوں میں ایسی بھی کہانیاں موجود ہیں جو نیکی، خیر، ہمدردی اور انسان دوستی کا درس دیتی ہیں۔

بوکیچو عالمی داستانوں سے واقف تھا۔ اسے دنیا کے ادب سے گہری دلچسپی تھی وہ بہت دولت خرچ کرکے پرانے مسودے خریدتا تھا۔ ہومر کی ''اوڈیسی'' اور ایلیڈ'' کے مسودے اس نے بڑی رقم دے کر خریدے تھے۔ ہندوستان کا داستانی

ادب عالمی ادب میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ بوکیچو کی اس ادب تک بھی رسائی تھی ان کہانیوں میں سنسکرت ادب کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس داستان کا میں حوالہ دینے والا ہوں اس کا سارا پس منظر اور کہانی کا ماحول ہندوستانی داستان کے قریب تر دکھائی دیتا ہے اور یہ ایک سخی اور انسان دوست ناتھن کی کہانی ہے۔ بوکیچو کی کہانیوں میں پلاٹ، واقعات کی دلچسپی کے علاوہ اس کی نثر کی بنیادی صفت شگفتگی اور مزاح ہے۔ بوکیچو کی کہانیوں میں مکالمہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں مکالمے اتنے آسان اور برجستہ ہیں کہ قاری پڑھتے وقت اور پڑھنے کے بعد انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی نثر کی ایک ایسی صفت ہے جو اس کے ہمعصر لکھنے والوں میں نہ تھی۔

ڈیکمرون میں ناتھن نامی سخی آدمی کی کہانی ایک انسان دوست، ہمدرد شخص اور اس کے ایک جانی دشمن کی کہانی ہے جسے ناتھن اپنی شرافت اور محبت سے دشمنی فراموش کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کہانی کا عنوان فلورسسٹراٹو کی کہانی ہے۔ یہ کہانی حویلی میں قیام کے دسویں روز سنائی گئی تھی اور سنانے والے تیسرے آدمی کا نام فلورسسٹراٹو تھا۔ یہ کہانی کچھ یوں ہے۔

ناتھن نامی ایک سخی آدمی ملک ختا میں رہتا تھا۔ خاندان اونچا، حسب نسب قابل تکریم، دولت بے بہا، ہاتھ سخاوت میں بے مثال، دور دور اس کی سخاوت کے چرچے ناتھن کے دروازے ہر ضرورت مند کے لیے کھلے رہتے تھے جو آتا اپنے دل کی مراد پا کر واپس لوٹتا تھا۔ ہر گھڑی اس کے در پر ضرورت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کی داستانیں مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر کوئی اس سے خوش تھا، اس کے سب دوست تھے بس اس کا ایک ہی دشمن تھا اور وہ اسی کے ملک کا ایک رئیس اور معزز آدمی تھا جس کا نام میتھر ڈینز تھا۔ وہ خود بھی بہت دولت مند تھا اس کے محلات تھے، اس کے پاس دولت تھی، اسے بس ایک دکھ تھا، جب اس کے سامنے ناتھن کی سخاوت کی داستانیں پہنچتی تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہتا تھا کہ میرے پاس دولت ہے، محلات ہیں، ناتھن جیسی شان وشوکت ہے، پھر میرا نام کیوں مشہور نہیں۔ چنانچہ یہ حسد نفرت بن کر اس کے سینے میں زہر بن کر پھیلنے لگا اور اس نے ناتھن کو جان سے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک بار ایک بوڑھی عورت اس کے پاس خیرات لینے کے لیے آئی اور پھر بار بار اس کے پاس آتی رہی۔ میتھر ڈینز اس حرکت پر سیخ پا ہو گیا اور بڑھیا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، بڑھیا مسکرا کر کہنے لگی۔

''واہ بھئی واہ، میں تیرہویں بار خیرات لینے آئی تو تم ناراض ہو گئے۔ ناتھن کے پاس میں پچاس بار خیرات لینے گئی مگر اس کے ماتھے پر بل نہیں آیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سب سے بڑا سخی ناتھن ہی ہے۔

بڑھیا کی بات سن کر میتھر ڈینز آگ بگولا ہو گیا اور بھیس بدل کر ناتھن کو مارنے اس کے محل کی طرف چل دیا۔ کچھ خادم اس کے ساتھ تھے۔ تین دن کے سفر کے بعد وہ ناتھن کے محل کے قریب پہنچا محل دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اچانک اس کی ملاقات ایک شخص سے ہو گئی میتھر ڈینز نے ناتھن کو دیکھا نہیں تھا چنانچہ اس شخص سے کہنے لگا۔

''مجھے ناتھن کے محل کے اندر پہنچا دو، میں ناتھن کا امتحان لینا چاہتا ہوں، سنا ہے کہ وہ بہت سخی اور دیالو ہے۔

اتفاق سے جس شخص سے اس کی ملاقات ہوئی وہ ناتھن ہی تھا۔ ناتھن نے بھی میتھر ڈینز کو پرکھنے کے لیے کہا:

''تم فکر نہ کرو۔ میں موقع تلاش کر کے تمہیں اندر لے جاؤں گا۔ فی الحال تم ان درختوں میں ڈیرہ لگا لو۔''

میتھر ڈینز نے اس کی بات پر عمل کیا اور ناتھن خادم بن کر اس کی خدمت کرنے لگا اور ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ خود ہی ناتھن ہے.......... ناتھن نے میتھر ڈینز کی بے حد خدمت کی۔ میتھر ڈینز اب ناتھن سے بہت خوش ہوا اور اپنے دل کی

باتیں کرنے لگا اور ایک دن ناتھن سے کہنے لگا:

''میں بھی ناتھن کی طرح ایک رئیس زادہ ہوں۔ خیرات کرتا ہوں۔ میرے بھی محلات ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے وہ شہرت حاصل نہیں جو ناتھن کو حاصل ہے اب میں نے سوچا ہے کہ میں ناتھن کو موت کے گھاٹ اتار دوں تا کہ اس علاقے میں میرا نام ہی رہے۔ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔''

ناتھن نے مسکرا کر جواب دیا:

''میں یہی خدمت کر سکتا ہوں کہ کل رات ناتھن کو یہاں لے آؤں اور تم اسے ختم کر کے اپنی مراد پوری کر لینا۔'' یہ کہہ کر ناتھن چلا گیا۔ اور میتھر ڈینز بہت خوش ہوا کہ کل میرا دشمن ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلا جائے گا۔

دوسری شام مقام مقررہ پر میتھر ڈینز ناتھن کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وقت مقرر پر وہ خادم (ناتھن) اکیلا چلا آرہا ہے۔ میتھر ڈینز نے اسے دیکھ کر کہا:

''.....تم اکیلے ہی چلے آرہے ہو۔ ناتھن کو نہیں لائے۔ ناتھن کہاں ہے..........؟''

ناتھن نے مسکرا کر کہا:

''میں ہی ناتھن ہوں۔ میرا سینہ حاضر ہے۔ تلوار کا وار کرو۔ اور مجھے مار دو۔ میرے پاس جو بھی شخص ضرورت لے کر آیا۔ خالی ہاتھ نہیں گیا۔ مجھے مار کر تم بھی اپنی ضرورت پوری کر لو۔''

میتھر ڈینز یہ سن کر بت بن گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ ناتھن کے پیروں میں گر گیا اور رو رو کر کہنے لگا:

''تم واقعی بے مثال ہو ناتھن۔ یہ تلوار اٹھاؤ اور مجھ جیسے کمینے کا سر کاٹ کر اس دنیا کو پاک کر دو۔ تم دنیا کی شان ہو اور میں دنیا پر ایک بوجھ'' ''نہ میں تم سے انتقام لوں گا۔ نہ تمہارے منصوبے کو برا کہوں گا۔''

میتھر ڈینز نے کہا:

''زندگی بہت محترم اور قیمتی ہے۔ تم اسے میرے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔''

''مجھ سے جب بھی کوئی شخص کوئی چیز مانگتا ہے۔ میں اسے دے دیتا ہوں۔ تم نے زندگی مانگی میں آمادہ ہو گیا۔ دینا میری روایت ہے۔ میں اپنی روایت سے کیسے انحراف کرتا'' ناتھن کی باتیں سن کر میتھر ڈینز کے دل میں بیٹھا نفرت کا سانپ دم توڑ گیا۔ اس کا دل بدل گیا۔ اور اس نے ناتھن کے قدم چوم کر کہا:

''ناتھن کوئی تم جیسا نہیں ہو سکتا لیکن میں کوشش کروں گا کہ تم جیسا بن سکوں۔''

یہ کہہ کر میتھر ڈینز نے ناتھن کے پیروں کی مٹی اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور اپنے شہر کی طرف لوٹ گیا۔

بوکیچو کی اس قبیل کی کئی کہانیاں ہیں۔ جو انسانی دوستی، ہمدردی، پیار محبت اور اخلاقی اور روحانی اقدار کو اجاگر کرتی ہیں۔

''ڈیکمرون'' کو بوکیچو نے بڑے خوبصورت انداز میں ترتیب دیا ہے۔ ہوتا یوں تھا کہ جب کہانی کا آغاز ہوتا تھا تو سب سے پہلے عورتوں میں سے کسی ایک کو ''ملکہ'' بنا دیا جاتا تھا۔ وہ خود اس رات سنائی جانیوالی کہانی کا موضوع منتخب کرتی تھی اور پھر کہانی سنانے والا اسی موضوع پر کہانی سناتا تھا۔ بوکیچو نے......دس کرداروں کے نام بھی اس ذہانت سے رکھے تھے جو کہانی کے موضوع پر پورے اترتے تھے اور اس کردار کو ایسی ہی کہانی سنانے کیلئے کہا جاتا تھا جو اس کے نام سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان کہانیوں کے موضوعات انسانی زندگی میں ہر آدمی کو پیش آنے والے موضوعات ہیں۔ مثلاً

(1) مصیبت میں گھرے انسان کو اچانک خوشی مل جانا۔ (2) زندگی میں جس چیز کی خواہش کرنا، اس کا مل جانا۔

(3) گم شدہ چیز یا کھوئے ہوئے ساتھی کا دوبارہ مل جانا۔ (4) محبت کی کہانیاں جن کے انجام خوشی پر ہوں۔
(5) محبت کی کہانیاں جن کا انجام المیہ پر ہو۔ (6) خطرات سے ڈرنے والوں کی کہانیاں۔
(7) انسانیت کے ہمدرد لوگوں کی کہانیاں۔ (8) ایثار وقربانی کی کہانیاں۔
(9) مردوں اور عورتوں کی چالاکی کی کہانیاں۔ (10) بے وفا اور خاوندوں سے دھوکہ کرنیوالی عورتوں کی کہانیاں۔
(11) پادریوں اور NUNS کی جنسی سرگرمیوں کی کہانیاں۔ (12) لالچ اور ہوس کی کہانیاں۔

عورتوں کو DIONEO کی سنائی ہوئی کہانیاں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ جن میں مزاح بھی ہوتا تھا۔ جنسی جذبات بھی، طنز بھی اور عورتوں کی چالاکیاں بھی۔

بوکیچو کی ان کہانیوں میں ابھرنے والے اکثر کردار ماضی سے تعلق رکھتے ہیں جو بوکیچو نے لوک کہانیوں اور دنیا کے داستانی ورثے سے لئے ہیں۔ لیکن ان میں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو حقیقی ہیں اور بوکیچو کے زمانے میں بھی زندہ تھے۔ مثلاً دوسری اور پانچویں کہانی میں MADONA- FIOL RADALIS کا کردار حقیقی ہے۔ جو نیپلز (NAPLES) کے بازار حسن کی ایک طوائف MADOONA FLORA کے کردار کی افسانوی تشکیل ہے۔

ڈیکمرون کی کہانیوں کا ماخذ فرانس، اٹلی، ایران، سپین اور ہندوستان کی لوک کہانیاں ہیں۔ سنسکرت میں لکھی ''پنچ تنتر'' سے بوکیچو نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ نقادوں کا خیال ہے اس نے ''پنچ تنتر'' سنسکرت میں نہیں پڑھی ہوگی بلکہ ان کہانیوں سے اس کا تعارف فرانسیسی اور اطالوی تراجم سے ہوا۔ بہت سی کہانیاں بوکیچو نے لوگوں سے سنی اور پہلی بار انہیں تحریری شکل دی۔ اس نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''میں نے بہت سی کہانیاں بچپن میں سنی تھیں۔'' ہر کہانی کے شروع اور آخر میں بوکیچو خود شمولیت اختیار کرتا ہے اور کسی اطالوی لوک گیت کو شامل کر کے (جو کہانی کے مطابق ہوتا ہے) کہانی کے تاثر کو بڑھا دیتا ہے۔ اس میں بوکیچو کے اپنے کردار نے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اس کتاب کی کہانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں چاسر اور شیکسپیئر کے علاوہ (شیکسپیئر اپنے ڈرامے All is Well that Ends Well کا پلاٹ بوکیچو کی کہانی سے لیا ہے) بہت سے لکھنے والے شامل ہیں۔ شیلے، کیٹس (Keats) اور (Long Fellow) کی کچھ نظموں کے مرکزی خیال ان کہانیوں سے لئے گئے ہیں۔

بوکیچو کے آخری ایام بری صحت کی وجہ سے خستہ حالی میں گزرے۔ محبت میں ناکامی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ٹالسٹائی اور گوگول آخری عمر میں پادریوں کے چکر میں پڑ گئے تھے اور اپنی تمام تحریروں سے منحرف ہو گئے تھے۔ بوکیچو بھی ایک پادری کے چکر میں پھنس گیا۔ اس پادری نے اپنے ایک نمائندے کو اس کے پاس بھیجا اور بوکیچو پر زور دیا کہ وہ اپنی تحریروں کو ضائع کر دے اور ان سے لاتعلقی کا اظہار کر دے۔ بوکیچو نے شاید ایسا نہیں کیا مگر اس میں ایک تبدیلی ضرور آئی پہلے وہ عورتوں کی مدح سرائی کرتا تھا لیکن آخری عمر میں عورتوں کے بارے میں اس کا لہجہ تلخ اور ترش ہو گیا۔ وہ ساری عمر غیر شادی شدہ رہا، آخر میں ذہنی مریض بن گیا۔ ''ڈیکمرون'' جیسی لافانی کتاب دنیا میں اپنی یادگار چھوڑ کر 21 دسمبر 1375ء کو سیل فنا میں گم ہو گیا۔

مائیکل اینجلو

(Michael Angelo)

سولہویں صدی کا عظیم اطالوی مصور، مجسمہ ساز، شاعر، نشاۃ ثانیہ کا تابندہ، درخشندہ ستارہ، مصوری اور مجسمہ سازی میں نیچرل ازم کا بانی، لیونارڈو دا ونچی کا ہمعصر۔ درویش صوفی منش اور فلسفی۔

میں اپنی روح خدا کے ہاتھوں میں دیتا ہوں
اپنا جسم مٹی کے سپرد کرتا ہوں
میرا مال و اسباب میرے رشتے داروں کو دے دیا جائے۔

(آخری وصیت)

....

میری زندگی اب طوفانی سمندر کی زد میں ہے
اس جہاز کی طرح جو بندرگاہ پر آئے
مگر سارے راستے بند ہوں
اور وہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہو
یہ کتنا بڑا جرم ہے
کہ ہم انسان دنیاوی فن میں مصروف ہو جاتے ہیں
نہ چاہتے ہوئے بھی
ان خیالات کو اپناتے ہیں جن کا ملبوس فانی ہے
اب مصوری اور مجسمہ سازی مجھے لوری نہیں دے سکتی
اب میری روح اس کی محبت کی طرف راغب ہے۔

(VITTORIA کی موت پر)

مائیکل اینجلو

پادری دوست نے ایک بار اس سے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا:
''کاش تم نے شادی کی ہوتی، تمہارے بھی دو چار بچے ہوتے۔''
اس نے پوچھا:
''تو پھر کیا ہوتا''
''کم از کم آنے والی نسلوں تک تمہارا نام تو پہنچتا۔ تمہاری نسل تو پھلتی پھولتی''۔
''یہ دونوں چیزیں میرے فن میں موجود ہیں جو ہر پل مجھے سرگرم عمل رکھتی ہیں۔ میں جو فن چھوڑ کر جاؤں گا، یہی میرے بچے ہیں۔ اگرچہ یہ فن اس قابل نہیں لیکن میں اسی حوالے سے آنے والی نسلوں میں زندہ رہوں گا''۔
اس نے اپنے فن کے بارے میں کم اندازہ لگایا۔ وہ اپنے اس عظیم فنی ورثے کے حوالے سے آج بھی زندہ ہے اور جب تک فنی باریکیوں کو سمجھنے والے زندہ ہیں وہ زندہ رہے گا۔ صدیوں سے دلوں میں زندہ رہنے والا یہ شخص مائیکل اینجلو ہے جو 1475ء میں کیپریس (Caprese) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس قصبے کا مشیر تھا جسے پوڈیسٹا کہا جاتا تھا۔ مائیکل ابھی سات سال کا ہی تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی۔ مائیکل اینجلو کو ایک سنگ تراش اور اس کی بیوی کے ساتھ رہنا پڑا جہاں اس کے باپ کی پتھر کی فیکٹری تھی۔ اس کے والد نے 13 سال کی عمر میں اسے پڑھنے کے لئے فلورنس بھیجا مگر اسے پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے تحریر کے مقابلے میں ڈرائنگ، سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کو اہمیت دی اور مصوری سے اسے بہتر تصور کیا۔
مائیکل اینجلو کی نظر میں فطرت نے ایک ظلم یہ کیا ہے کہ بڑے بڑے اعلیٰ شاہکار پتھروں میں قید کر دیئے ہیں، اس کے نزدیک مجسمہ ساز کا یہ کام ہے کہ وہ انہیں تراش کے پتھروں کی قید سے رہائی دلائے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر پتھر میں ایک مجسمہ ہے۔ مجسمہ ساز غیر ضروری پتھر الگ کر کے نقش و نگار نمایاں کرتا ہے۔ سقراط نے برسوں پہلے یہی بات کہی تھی کہ پتھر میں ایک شکل موجود ہوتی ہے۔ مجسمہ ساز اسے پتھر سے باہر نکالتا ہے۔ مائیکل اینجلو نے اسی بات کی تائید کی ہے۔ اردو کا ایک نامعلوم شاعر اس بات کو اپنے شعر میں کچھ یوں لکھتا ہے۔

جب کسی سنگ سے ٹھوکر کھائی
نا تراشیدہ صنم یاد آئے

مائیکل اینجلو نے شروع ہی سے اپنے کام کی بنیاد نیچرلزم پر رکھی۔ اس نے ابتدا ہی سے چیزوں کو رنگوں کا ملبوس اس وقت تک نہیں پہنایا جب تک اس نے فطرت اور اصلیت سے اس کا موازنہ نہ کر لیا۔
مائیکل اینجلو کا شاگرد اور دوست Condivi اس کے بارے میں لکھتا ہے:
''مائیکل اینجلو کبھی کبھی مچھلی مارکیٹ چلا جاتا تھا۔ مچھلیوں کے مختلف اعضا اور اس کی جلد کو بغور دیکھتا۔ رنگوں پر توجہ

دیتا۔ تب جا کر کہیں وہ انہیں اپنی تصویروں میں (Paint) کرتا تھا''

بادشاہ میڈیچی نے اپنے عالی شان باغ میں پرانے مجسمے اور نوادرات جمع کر رکھے تھے۔ مائیکل اینجلو وہاں چلا گیا، مائیکل اینجلو کے شوق کو دیکھ کر مشہور استاد مجسمہ ساز لورنزو نے اسے اپنے گھر رکھ لیا اور اس سے اپنی اولاد جیسا سلوک کیا۔ اپنی نجی محفلوں میں اور ضیافتوں میں اسے شامل ہونے کا موقع دیا۔ انہی محفلوں میں مائیکل اینجلو نے ادب، فلسفہ اور سیاست پر پُرمغز باتیں سنیں اور روشن خیالی نے اس کے ذہن میں جڑیں پکڑیں۔ لورنزو کی اکیڈمی میں اس نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ ایک بار اس نے ایک بے کار پتھر سے ایک چہرہ بنایا۔ لورنزو نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا:

''تم نے بوڑھے آدمی کا چہرہ بنایا ہے۔ مگر اس کے دانت پورے کے پورے دکھا دیئے ہیں۔ اس عمر میں تو ایک یا دو دانت ہوتے ہیں۔''

مائیکل اینجلو نے فوراً ایک ہتھوڑی اٹھا کر دانتوں پر ماری اور اوپر والے سارے دانت توڑ دیئے۔ لورنزو کو اپنے شاگرد کی یہ ہوشیاری اچھی نہ لگی۔ مائیکل کے باپ کو بلایا اور مائیکل اینجلو کو اس کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ وہ استاد کی موت تک 1492ء تک اپنے گھر ہی رہا۔ وہ لورنزو (Lorenzo) سے متاثر تھا اور ان نئی باتوں سے اس نے اثر قبول کیا جو اس نے یونانی مجسمہ سازی میں شامل کی تھیں۔ اس عرصے میں وہ اپنے عہد کے مشہور شاعر اور دانشور پولیٹئین (Politian) سے بھی ملا جس نے مائیکل اینجلو میں شعری اور جمالیاتی ذوق کی آبیاری کی۔

لورنزو کی موت کے بعد مائیکل اینجلو نے اپنے عہد کے درویش صفت Savonarola سے بڑا اثر قبول کیا۔ مذہبی کتابیں پڑھیں۔ شاعری اور فلسفے کی باریکیوں کو سمجھنے میں شاعر دانتے نے اس کی بڑی راہنمائی کی۔ اس نے اس کی ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ کیا۔ جس نے اس پر بڑے دوررس اثرات مرتب کئے۔

اس کے بچپن کا دوست Torrigiano مائیکل اینجلو کے ابتدائی دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے اس نشان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مائیکل اینجلو کے رخسار پر مرتے دم تک رہا۔ مائیکل اینجلو اور وہ دونوں Carmine کے گرجا میں ڈرائنگ سیکھنے جایا کرتے تھے۔ آگے Torrigiano بیان کرتا ہے:

''مائیکل اینجلو کی عادت تھی کہ وہ خود تو ڈرائنگ نہیں کرتا تھا کسی اور کو کام میں مصروف دیکھتا تو بلاوجہ چھیڑتا اور کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بہت تنگ کیا۔ ساری ڈرائنگ خراب کر دی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کے جبڑے پر زوردار مکا مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ زمین پر جا گرا اور اس کے چہرے پر زخم بن گیا جس کا نشان مرتے دم تک اسے اس واقعہ کی یاد دلاتا رہا۔''

اس واقعہ کا اس کی زندگی پر بہت اثر پڑا اور اس کی فطرت بالکل بدل گئی لیکن 16 سال کی عمر میں اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی جذباتی تبدیلی آئی، جو اس کی فنی زندگی پر شدت سے اثر انداز ہوئی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی *Luigia de Medici* سے اس کی ملاقات تھی جسے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا، اس کی محبت میں بے شمار Sonnets لکھے۔ لیکن جس عورت سے اس کا مرتے دم تک رابطہ رہا وہ *Marouis Pescar* کی بیوہ تھی اس کا نام Vittoria تھا۔ اس سے عشق شروع ہوا تو مائیکل اینجلو کی شاعری نے مختلف پرتیں اختیار کیں۔ اس نے صوفیانہ نظمیں لکھیں۔ عشقیہ شاعری کی اور عیسائیت کی محبت میں اشعار لکھے۔

والٹر پیٹر نے مائیکل اینجلو کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اس عورت کے عشق نے اسکی شاعری میں ایک آگ بھر دی اور یہ آگ اس کی مجسمہ سازی اور مصوری میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ آگ کبھی پہاڑوں سے نکلتی نظر آتی ہے اور کبھی ایک پگھلتا ہوا لاوا ہے جو چاروں طرف بہہ رہا ہے۔ مائیکل اینجلو شاعری میں اپنی ذات کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی چیز اس کی مصوری اور پتھروں کے مجسموں میں نظر آتی ہے۔ (Vittoria Colona) خود بھی بہت اچھی شاعرہ تھی۔ مائیکل اینجلو کی پریشان، مصیبت زدہ اور جنونی زندگی میں یہ عورت اس کی واحد ہمدرد دوست تھی۔ اس کے لیے کہے ہوئے Sonnets لفظوں کے پتھروں سے بنے ہوئے خوبصورت مجسمے ہیں جن کا ہر ایک نقش شاعری کا اعلیٰ ترین مصرع ہے۔ مائیکل اینجلو کی یہ ہمدرد دوست 1547ء میں فوت ہو گئی۔ اس کی موت مائیکل اینجلو کے لئے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔

Condivi نے مائیکل اینجلو کی کیفیت کے بارے میں بڑی کربناک تفصیل دی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''مائیکل اینجلو اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اسے میں نے افسوس میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے اس بات کا بڑا پچھتاوا ہے کہ میں نزع کے وقت اس سے ملنے گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ماتھے یا رخسار پر بوسہ نہیں دے سکا۔''

Vittoria کی یاد میں اس نے بے حد غم زدہ نظمیں لکھیں۔ اسے اس کے بغیر ابھی بہت سے سال اندھیرے چرچ میں گزارنے تھے۔ 1554ء میں لکھی نظم میں وہ کہتا ہے:

میری زندگی اب طوفانی سمندر کی زد میں ہے
اس جہاز کی طرح جو بندرگاہ پر آئے
مگر سارے رستے بند ہوں
اور وہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہو
نیکی بدی سب ختم ہونے کو ہے
یہ کتنا بڑا جرم ہے
کہ ہم انسان دنیاوی فن میں مصروف ہو جاتے ہیں
نہ چاہتے ہوئے بھی
ان خیالات کو اپناتے ہیں جن کا ملبوس فانی ہے
میرے سامنے دو قسم کی اموات کھڑی ہیں
ایک کا مجھے یقین ہے
ایک آ چکی ہے
اب مصوری اور مجسمہ سازی مجھے لوری نہیں دے سکتی
اب میری روح اسکی محبت کی طرف راغب ہے
جس کی بانہیں ہمیں سمیٹنے کے لئے پھیلی ہیں

مائیکل اینجلو Vottoria کی موت کے دس سال بعد تک زندہ رہا۔ 1564ء میں اس کی زندگی کا جہاز موت کی بندرگاہ

پر ڈوب گیا۔

مائیکل اینجلو نے ساری زندگی اکیلے گزاری۔ بقول مائیکل اینجلو اس نے اپنے فن سے شادی کر لی تھی۔ مائیکل اینجلو واحد فنکار ہے جسے زندگی ہی میں دو سوانح نگار مل گئے تھے۔ ایک اس کا شاگرد Condivi اور دوسرا اس کا دوست واساری۔ واساری نے اس کی زندگی کی کہانی دو جلدوں میں لکھی۔ مائیکل اینجلو کو اس سے بعض باتوں پر اختلاف تھا چنانچہ اس نے اپنے شاگرد Condivi سے ان باتوں کو درست شکل میں لکھوایا۔ Vasari نے لکھا ہے کہ مائیکل اینجلو نے اپنی وصیت تین جملوں میں لکھوائی کچھ یوں تھی:

''میں اپنی روح خدا کے ہاتھوں میں دیتا ہوں

اپنا جسم زمین کے سپرد کرتا ہوں

میرا مال واسباب میرے رشتے داروں کو دے دیا جائے۔''

مائیکل اینجلو نے فقیری کی زندگی بسر کی۔ اسے سوائے اپنے کام کے کسی چیز کی پروانہ تھی۔ اس نے ایک غریب آدمی کی زندگی بسر کی۔ کام کرتے کرتے وہ پانی کے ساتھ روٹی کھا لیا کرتا تھا، تھک جاتا تو جوتوں سمیت بستر پر سو جاتا۔ فل بوٹ پہنتا تھا، جو ضروری تھے تا کہ پتھروں کے ذرات پیروں کو زخمی نہ کریں۔ یہ جوتے وہ بعض اوقات مہینوں تک نہ اتارتا۔ بقول Condivi کئی بار جب مہینوں کے بعد جوتے اتارتا تو پاؤں کی کھال بھی چمڑے کے ساتھ باہر آ جاتی تھی۔ شاید اس کی اس فقیری کی وجہ سے اسے احیائے علوم کی تحریک کا ایک پیغمبر کہتے ہیں۔

آخری عمر میں وہ اندھیرے میں کام کرنے کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ روشنی میں اسکی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ ایک بار ایک ملازم اس کے لئے بکری کی چربی کی موم بتیاں لے کر آیا۔ مائیکل اینجلو نے لینے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ انہیں باہر پھینک دو۔ اس وقت اسکی آنکھیں پڑھنے کے قابل نہ رہی تھیں اور وہ کتاب آنکھوں کے اوپر رکھ کر پڑھتا تھا۔ اسے روم کے لوگ ''چار روحوں والا انسان'' کہتے تھے۔ وہ آرکیٹکٹ تھا، مصور تھا، مجسمہ ساز اور شاعر تھا۔ ان چار روحوں نے مل کر اسے مائیکل اینجلو بنا دیا تھا۔

مائیکل اینجلو کی انگلیوں سے تراشے ہوئے پتھر کے مجسمے، اس کی مصوری، ڈرائنگ آج بھی صدیاں گزرنے کے بعد کل کی طرح بولتی اور دیکھنے والوں سے باتیں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

1496ء میں مائیکل اینجلو کارڈینل کی دعوت پر روم پہنچا اور اپنی مشہور زمانہ پینٹنگ *Pieta* بنائی۔ اس سے پہلے اس نے شراب کے رومی دیوتا Bacchus کا قد آدم مجسمہ بنایا جسے کارڈینل نے رد کر دیا۔ پھر 1497ء میں اس نے *Pieta* پر کام شروع کیا۔ اسے مجسمہ سازی کی تاریخ میں سب سے اہم شاہکار قرار دیا گیا۔ اس کے بارے میں اس کا سوانح نگار Vasari کہتا ہے۔

''*Pieta* کو دیکھ کر کسی معجزے کا گمان ہوتا ہے۔ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا کسی بیکار پڑے پتھر سے ایسا شاہکار تراشا جا سکتا ہے جو گوشت پوست سے قدرت نے بھی نہیں تراشا۔''

Pieta سینٹ پیٹر کے گرجا گھروں میں آج بھی لوگوں سے داد طلب ہے۔ مجسمے حضرت مریم اپنے مصلوب بیٹے کو گود میں لے کر بیٹھی ہے۔

حضرت عیسیٰ کا لاغر جسم، جسم کی ہڈیاں، پتھر کے لباس کی سلوٹیں سب کچھ مائیکل اینجلو کے کمال فن کا ثبوت ہے۔

1501ء میں مائیکل اینجلو کو پھر ایک مشکل کام سونپا گیا۔ فلورنس کے کیتھڈرل میں ایک تیرہ فٹ اونچا پتھر ایک سال سے کسی مجسمہ ساز کا منتظر تھا۔ مائیکل اینجلو کو یہ پتھر دیا گیا کہ وہ اس میں چھپی شکل کو باہر نکال سکے۔ مائیکل اینجلو نے اس پر اڑھائی سال محنت کی۔ اس نے بے کار پتھر کے ایک ایک انچ میں جان ڈال دی اور ڈیوڈ (The Statue of David) بنا دیا، جسے نشاۃ ثانیہ کا اہم ترین شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس مجسمے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جدید اور قدیم عہد کے لاطینی اور یونانی مجسموں میں اسے اولیت حاصل ہے۔

اسی سال مائیکل اینجلو Holy Family and St. John کو نقش کیا اور ''میڈونا اور بچہ'' کو تصویری شکل دی جو اب بھی لندن کی نیشنل گیلری میں موجود ہے۔

1505ء میں مائیکل اینجلو پوپ جولیس کے بلاوے پر روم پہنچا، اسے پوپ کے مقبرے کی آرائش کا کام سونپا گیا لیکن اس کے کام میں مسلسل مداخلت ہوتی رہی، اسے اس کام میں 40 سال مشقت کی آگ میں جھونکنے پڑے۔ اس کام کا مرکزی حصہ حضرت موسیٰ کا مجسمہ تھا جو مائیکل اینجلو اپنی مرضی کے مطابق مکمل نہ کر سکا۔ 1508ء میں اسے Sustine گرجا گھر کی چھت کی نقاشی سونپی گئی۔ مائیکل اینجلو کو شک تھا کہ اس کے ہمعصر رافیل نے پوپ سے مل کر یہ سازش کی ہے کہ گرجا گھر کی چھت کو مصوری کے فن سے سجانے کا کام مائیکل اینجلو کو سونپا جائے جبکہ رافیل اس کام میں ماہر تھا اور پوپ کو مائیکل اینجلو نے مشورہ بھی دیا لیکن یہ کام اسے کرنا پڑا جو بہت تکلیف دہ تھا۔ الٹالیٹ کر چھت کو پینٹ کرنا آنکھوں کی بینائی سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ اس کام میں چار سال صرف ہوئے۔

مائیکل اینجلو نے 300 تصویریں چھت پر بنائیں جس میں تخلیق کائنات، تخلیق آدم، زوال آدم، دوبارہ جنت حاصل کرنے کا وعدہ، حضرت نوح کا طوفان اور حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا۔ اس چھت کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ مائیکل اینجلو نے نئے اور پرانے عہد نامے کے ایک ایک لمحے کو چھت پر منقش کر دیا ہے۔ مائیکل اینجلو کا آخری شاہکار The Last Judgement ہے جس پر اس نے 34-1531 تک کام کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کو ظاہر کرتا ہے۔

مائیکل اینجلو نے مصوری، مجسمہ سازی اور آرکیٹکٹ میں بے شمار منفرد کام کئے جن کی جزوی تفصیل ممکن نہیں۔ اس نے کئی ایسے منصوبوں کی ڈرائنگ بنا کر چھوڑی جن پر بعد میں کام مکمل کیا گیا۔ اس کا ایک اہم کام 1530ء میں فلورنس کی ایک لائبریری کا ڈیزائن ہے۔ اسی لائبریری میں یونانی شاعر ہومر کی کتاب ایلیڈ رکھی ہے، جس کا ٹائٹل مائیکل اینجلو نے ڈیزائن کیا ہے۔

مائیکل اینجلو کو اپنی زندگی میں اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مائیکل اینجلو دراصل مردانہ جسمانی خوبصورتی کا بہت بڑا مداح تھا۔ چنانچہ مجسمہ سازی کرتے ہوئے اس نے مردانہ اعضا کو بہت خوبصورتی سے تراشا، اس پر اسے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مائیکل اینجلو افلاطونی عشق کے زیر اثر تھا۔ چنانچہ جب اس کی عمر 57 سال تھی تو اس کی ملاقات 23 سال کے ایک نوجوان (Tommaso-dei-cavalieri) سے ہوئی۔ مائیکل اینجلو کا اس سے وہی رشتہ استوار ہو گیا جو سقراط اور افلاطون کے درمیان تھا۔

مائیکل اینجلو بہت درویش صفت آدمی تھا۔ میر تقی میر کی طرح لوگوں کو اس سے یہ شکایت بھی تھی کہ وہ ''بد دماغ'' ہے۔ لیکن اس کا جواب بھی وہی تھا جو نقاد میر تقی میر کی بد دماغی کے دفاع میں دیتے ہیں۔ رشتے داروں کی سازشوں، گھریلو حالات اور ہم عصر فنکاروں کی سازشوں نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔

اس کا ایک ہم عصر مجسمہ ساز مائیکل اینجلو کے فن سے مسلسل فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس نے ایک بار (Sleeping Cupid) کا مجسمہ 30 ڈکیٹ (روپے) میں خریدا اور کسی کے ہاتھ 200 ڈکیٹ میں فروخت کر دیا۔ جب مائیکل اینجلو کو پتا چلا تو اس نے مسکرا کر کہا: ''میں بے شک امیر ہوں لیکن زندگی ایک غریب کی بسر کی ہے''۔ اسے کام کا جنون تھا۔ (Vittoria) کی موت کے بعد یہ جنون اور بھی بڑھ گیا۔ ایک بار اس نے جب حضرت موسیٰ کا مجسمہ مکمل کر لیا تو اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر غصے میں ہتھوڑی مجسمے کے گھٹنے پر ماری اور کہا:

''تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔''

حضرت موسیٰ کے مجسمے نے تو شاید اس سے بات نہیں کی لیکن اس کا ہر شاہکار اب تک دیکھنے والوں سے باتیں کرتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کا یہ عہد اس لحاظ سے بہت خوش قسمت زمانہ تھا کہ اس زمانے میں قدرت نے دو ایسے مصور، مجسمہ ساز اور نابغہ روزگار پیدا کئے جن کا نام اور کام صدیاں گزر جانے کے بعد بھی روز روشن کی طرح درخشاں اور تابندہ ہے۔ صدیاں گزر چکی ہیں مگر ان کے فن کو وقت دھندلا نہیں سکا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے سامنے بے رحم وقت بے بس ہو جائے۔ مائیکل اینجلو اور لیونارڈو داونچی ایسے ہی دو بڑے آدمی تھے۔

ان دونوں نابغہ روزگار فنکاروں کا اگر الگ الگ جائزہ لیا جائے اور ان کے تخلیقی کام کا تجزیہ کیا جائے تو دونوں بے مثال ہیں اور دونوں کا کوئی ثانی نہیں۔ دونوں ایک عہد میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہ چل سکے اور ایک دوسرے کے درپے رہے۔ دو بڑے دماغوں کے درمیان شاید یہ دوری فطری چیز ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ دو مہان لکھاری ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی بھی اسی دوری کا شکار رہے۔ اور ایک عرصہ میں سانس لیتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ملاقات نہ کر سکے۔ اگر کسی نے ملاقات کا وقت مقرر بھی کیا، جگہ کا تعین بھی ہوا تو دونوں میں سے کوئی نہ آیا۔ لیکن مائیکل اینجلو اور لیونارڈو داونچی آپس میں ملنے سے کبھی نہ کترائے اور گلی محلے میں تو تڑاخ سے بھی پرہیز نہ کیا اور لڑتے جھگڑتے رہے۔

مائیکل اینجلو فن کے نقادوں اور لوگوں کی باتیں سن کر بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ایک بہت خوبصورت کہانی فلورنس میں مشہور تھی۔ جب اس نے (The Statue of David) مکمل کیا تو ایک نقاد نے دیکھ کر کہا:

''تم نے بہت اچھا مجسمہ بنایا ہے لیکن اس کی ناک بہت بڑی بنا دی ہے......''

مائیکل اینجلو یہ سن کر بھاگا بھاگا اپنی ورکشاپ میں گیا۔ ایک ہتھوڑی اٹھا کر لایا اور مجسمے کی ناک توڑ دی اور نقاد سے کہا:

''اب تمہارا کیا خیال ہے''

نقاد نے مسکرا کر کہا: ''ہاں اب ٹھیک ہے کیونکہ مجسمے کا حسن اب اور بھی بڑھ گیا ہے......''

اس مجسمے کے بارے میں ایک بات اور بھی مشہور ہے۔ اس میں کردار لیونارڈو داونچی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ جب 13 فٹ کا بے کار پتھر مجسمہ بنانے کے لئے مائیکل اینجلو کو دیا گیا تھا اس سے پہلے پتھر کا یہ (Block) لیونارڈو داونچی کو بھی دیا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ کام نہ کر سکا اور چھوڑ کر چلا گیا۔ جب یہی کام مائیکل اینجلو کو سونپا گیا تو اس نے The Statue of David جیسا بے مثال شاہکار بنا دیا۔ یہ تو اس کہانی کا پس منظر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں ایک بار فلورنس کی ایک گلی میں ملے۔ باتوں باتوں میں مائیکل اینجلو کا مزاج بگڑ گیا اور اونچی آواز میں کہنے لگا:

''گھوڑوں کے ماڈل بنانے والے اس آدمی کو دیکھو جو پتھر سے مجسمہ نہ بنا سکا اور کام چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

لیونارڈو ونچی چپ چاپ سر جھکا کر چلا گیا۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ بھی دونوں کی زندگی میں آیا جب مائیکل اینجلو کو سر جھکا کر جانا پڑا۔ کارڈینل نے ایک بار دونوں کو چرچ کی دیواریں نقش و نگار بنانے کے لئے دیں۔ دونوں نے اپنا اپنا کام بڑی لگن اور محنت سے کیا لیکن جب لوگ انہیں دیکھنے کے لئے آئے تو لوگوں کا زیادہ ہجوم لیونارڈو داونچی کی دیوار کے سامنے تھا اور سب لوگ اسے دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ مائیکل اینجلو سے یہ منظر نہ دیکھا گیا اور وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ان کی فنی زندگی کا حسن ہیں۔ دونوں عظیم تھے دونوں مہان فنکار تھے۔ دونوں فصیل وقت پر چراغ بن کر روشن ہیں اور صدیوں تک روشن رہیں گے۔

ان دونوں میں نظریات کا اختلاف تھا لیونارڈو داونچی فطرت کے قرب کو اپنے فن کی عظمت سمجھتا تھا اور اسے فطرت سے پیار تھا جبکہ مائیکل اینجلو فطرت کو ظالم تصور کرتا تھا جس نے بہت ہی حسین اور خوبصورت چیزوں کو پتھروں میں قید کر دیا تھا اور اب اسے مجسمے بنا کر انہیں قید سے رہائی دینے کا کام سونپا تھا۔

انفرادیت کے باوجود دونوں میں ایک شے مشترک تھی۔ دونوں کو اس زمانے کے اخلاقی اصولوں نے اپنی گرفت میں لیا اور ان پر اعتراضات کیے۔ مائیکل اینجلو پر مجسموں میں عریانی اور جنس کے پہلو کو نمایاں کرنے کا الزام لگا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس نے ہسپتال میں باقاعدہ انسانی جسم کے بارے میں تعلیم حاصل کی ہے (اور تھا بھی کچھ ایسا ہی۔ 1492 میں اس نے Stospirito کے ہسپتال میں داخلہ لیا اور علم الاجسام (Anatomy) کا کورس کیا) اس لیے وہ جسم کے ہر حصے کو جزوی تفصیل کے ساتھ بناتا ہے۔ جہاں تک لیونارڈو داونچی کا تعلق ہے تو 24 سال کی عمر میں اسے فلورنس بلدیہ کے سامنے 3 ساتھیوں سمیت پیش کیا گیا اور بد اخلاقی کا مقدمہ چلا اور 7 جون 1478ء کو فرد جرم عائد کر دی گئی بعد میں کمیٹی نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دے کر لیونارڈو داونچی کو چھوڑ دیا!

دونوں بڑے ذہین لوگوں پر لگے یہ الزامات آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ آج ہم جب ان دونوں کے عظیم کاموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی ذات پر لگے یہ دو چھوٹے چھوٹے دھبے ہمیں نظر نہیں آتے اور ہم ان کے کام کی عظمت سے سرشار ہو کر انہیں داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں!

لیونارڈو دا ونچی

(Leonardo Da Vinci)

پندرہویں صدی کا عظیم اطالوی مصور، مجسمہ ساز، انجینئر، سائنس دان، ڈرافٹسمین، موجد، تحریر اور تقریر کا ماہر جسے قدرت کا معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

دنیا میں کوئی دوسرا دماغ لیونارڈو جیسا نہیں۔ ایک ایسا دماغ جو ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ جس کی سوچ اپنے عہد سے بہت آگے تھے۔

(VASARI)

....

میں نقادوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ان کے نیچے سے نکلی ہوا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

(لیونارڈو)

....

چاہے وہ کھوپڑی کا پوسٹ مارٹم ہو، پٹھوں کا مطالعہ، مصوری ہو یا ڈرائنگ کی باریک لائن، گھاس کی پتی ہو یا کسی ایجاد کا بنیادی منصوبہ، لیونارڈو نے اسے حیاتِ جاوداں سے مالا مال کر دیا۔

(برنارڈ برنس)

لیونارڈو داونچی

لڑکی معمولی کسان کی بیٹی تھی جبکہ اس کا عاشق رئیس آدمی اور مشہور اٹارنی۔ وہ لڑکی سے عشق تو کر سکتا تھا شادی نہیں، کیونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ لڑکی اس کی ہم مرتبہ ہو۔ دونوں نے اس سماجی پابندی کی پاسداری کی مگر زوردار عشق کیا۔ لڑکی اٹارنی کے بچے کی ماں بن گئی۔ اٹارنی نے ایک ہم مرتبہ خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی۔ اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور بچہ کسان عورت سے لے لیا۔ کسان عورت نے خوشی خوشی بچہ اٹارنی کے حوالے کر دیا اور خود ایک کسان سے شادی کر لی۔ اس کسان عورت کا نام کیٹرینا (Caterina) تھا۔ اٹارنی کا نام پیرو داونچی (Piero Da Vinci) تھا اور بچہ، جسے حقیقی ماں نے خوشی خوشی سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا، لیونارڈو داونچی تھا۔

لیونارڈو 15 اپریل 1452ء کو فلورنس کے گرد و نواح کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کی سوتیلی ماں نے اسے بے حد پیار اور باپ کا خاندانی نام دیا۔ وہ بھی دو چار سال بعد فوت ہو گئی۔ لیونارڈو نے ماں کی شفقت اور ممتا کے بغیر بچپن گزارا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ساری زندگی عورتوں سے دور رہا۔ اس نے عورتوں کی لافانی تصویریں تو بنائیں مگر اس کے دل کا کینوس کسی عورت کی تصویر سے خالی ہی رہا۔ عورت اگر اسکی زندگی میں آئی بھی تو صرف ماڈل بننے کی حد تک!

شیکسپیئر نے اپنے کسی ڈرامے میں ناجائز بچے کے بارے میں لکھا تھا کہ شادی کے بندھن سے آزاد، محبت کے لمحات میں جنم لینے والا بچہ صلاحیتوں اور ذہانت سے بھرپور ہوتا ہے، اس میں تخلیقی جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔ ونچی کے رہنے والے لیونارڈو نے یہ بات سچ کر دکھائی، وہ نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑی اور مسحور کن شخصیت بن کر اُبھرا اور آنے والی صدیوں پر اپنے کام اور نام کی مہر لگا دی۔

لیونارڈو داونچی کا بچپن اچھا گزرا۔ سوتیلی ماں اور باپ نے اسے بہت پیار دیا۔ بچپن ہی سے وہ ڈرائنگ، ریاضی اور موسیقی میں دلچسپی لینے لگا، بانسری بجانے میں بھی اس نے مہارت حاصل کی۔ سوتیلی ماں کی وفات کے بعد اس کا باپ اداس ہوتا تو بانسری پر کوئی دھن بجا کر باپ کا غم دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کاغذ پر تصویریں بنانے کا شوق پیدا ہوا تو اس نے تصویریں بنا کر کاغذوں کا ڈھیر لگا دیا۔ جوں جوں لیونارڈو بڑا ہوتا گیا یہ شوق اس کے دل میں جڑ پکڑتے گئے لیکن کاغذ پر نقش و نگار بنانے والے لیونارڈو داونچی کی باریک اور خوبصورت انگلیاں دیکھنے میں نرم اور نازک تھیں مگر مضبوط بھی تھیں۔ لیونارڈو خوبصورت ہی نہ تھا طاقتور اور شہ زور بھی تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے لڑکپن میں گھوڑے کی ایک نعل اٹھائی اور سخت لوہے کو اپنے ہاتھ سے مروڑ کے رکھ دیا۔ لوہے کے ساتھ یہ کھیل کھیل کر اسے ساری زندگی ایک سزا سے دوچار ہونا پڑا۔ سنا ہے کہ لکھنے، خاکے بنانے کے لیے اس نے اپنا بایاں ہاتھ استعمال کیا۔ گھوڑے کی نعل کو مروڑنے اور دہرا کرنے سے اس کا دایاں ہاتھ بے کار ہو گیا تھا۔

جب لیونارڈو پندرہ سولہ سال کا ہوا تو باپ مصوری اور ڈرائنگ میں اس کا شوق دیکھ کر اسے فلورنس لے گیا۔ فلورنس میں اپنے زمانے کے مشہور مصور اور سنگتراش ویروکیو (Verrocchio) نے آرٹ اکیڈمی کھول رکھی تھی۔ لیونارڈو کو سفارش

کے بعد اس اکیڈمی میں داخلہ مل گیا۔ جس نے جاتے ہی ویروکیو کی مصوری سے توبہ کرادی۔

کبھی کبھی ذہین شاگرد استاد کے لیے خطرناک ثابت ہوتے ہیں مثلاً، افلاطون کے لئے ارسطو، جو قدم قدم پر استاد کے نظریات کی مخالفت کرتا تھا، اس پر افلاطون ہنس ہنس کر برداشت کرتا اور کہتا:

''ارسطو میرا وہ بچھڑا ہے جو ماں کا سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے۔''

لیکن ویروکیو افلاطون کی طرح نہ تھا۔ لیونارڈو نے استاد کی ایک تصویر ''عیسیٰ کا بپتسمہ'' دیکھی اور تصویر کے ایک طرف ایک فرشتے کی تصویر بنادی۔ یہ تصویر اس قدر جاذب نظر تھی کہ ویروکیو دنگ رہ گیا۔ سارے فلورنس میں یہ کہانی پھیل گئی کہ ویروکیو نے مصوری چھوڑ کر مجسمہ سازی شروع کر دی ہے۔

لیونارڈو داونچی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا ذہن علم اور دانش کے لئے ہر طرف بھٹکتا پھرتا تھا۔ اس جستجو اور نئے پن کی تلاش نے اُس کی شخصیت کو حیران کن تخلیق کار بنا دیا۔ وہ مصور، مجسمہ ساز، انجینئر، سائنس دان، موجد، ماہر نباتات کے علاوہ علم الاجسام کا شناسا، ریاضی دان، موسیقار اور مصنف بھی تھا۔ اسے ہر عہد کا بڑا مصور سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جیسا دماغ شاید دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ اس کے فن اور علم کی سرحدیں بہت وسیع تھیں۔ ہیلن گارڈنر نے اسے اپنی کتاب میں Super Human کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس کا سوانح نگار انونیموگادیانو کہتا ہے:

''لیونارڈو کی تخلیقی قوتیں اسقدر بے مثال اور آفاقی تھیں کہ اسے قدرت کا ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے۔''

ایک دوسرے نقاد نے لیونارڈو کے بارے میں لکھا:

''دنیا میں کوئی دوسرا دماغ لیونارڈو جیسا نہیں۔ ایک ایسا دماغ جو ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ جس کی سوچ اپنے عہد سے بہت آگے تھی اور اس کے بعد آنے والی صدیاں اس کے زیر اثر رہیں۔''

لیونارڈو داونچی کے کام کا جائزہ لینے کے لئے کئی کتابیں درکار ہیں۔ اسے جس شعبے میں بھی دیکھیں اس کا کام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس نے جو منصوبے بنائے، جو تھیوری پیش کی، جو ڈرائنگ بنائی، ان پر آج تک کام ہو رہا ہے، اس کی میں صرف ایک مثال دوں گا اور یہ مثال مصوری یا مجسمہ سازی کی نہیں۔ انجینئرنگ کے شعبے سے ہے۔

1502ء میں لیونارڈو سلطان بایزید II کی دعوت پر ترکی گیا اور 720 فٹ لمبے پل کا نقشہ تیار کیا جس کا نام Golden Horn رکھا گیا۔ اس کی شکل سینگ کی طرح تھی۔ بایزید نے اس کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ ایسا پل بنانا ناممکن ہے۔ لیونارڈو واپس آ گیا اور نقشہ وہیں چھوڑ آیا۔ 2001ء میں بالکل لیونارڈو کے نقشے کے مطابق ناروے میں ایک پل بنایا گیا۔ 17 مئی 2006ء کو ترکی حکومت نے لیونارڈو کا بنایا ہوا نقشہ نکالا اور Golden Horn کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ ول ڈیورانٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ ترکی کے قیام کے دوران اس نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے واضح ثبوت نہیں ملتے۔

لیونارڈو کی وجہ شہرت عام قاری کے نزدیک مونالیزا کی تصویر ہے، لیکن جب لیونارڈو داونچی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اس کی کارکردگی پر رشک آتا ہے۔

ویروکیو کی اکیڈمی سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ لیونارڈو نے سانتا ماریہ نووا ہسپتال میں اناٹومی پڑھنے میں گزارا۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اسے فلورنس سے متنفر کر دیا۔

لیونارڈو اپنی 24ویں سالگرہ منانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے تین دوستوں اور اس پر بد اخلاقی کا مقدمہ درج

کر لیا گیا۔ الزام ہم جنس پرستی تھا۔ چاروں کو سزا سنا دی گئی۔ بعد میں لیونارڈو پر لگے الزامات جھوٹے ثابت ہونے پر اسے قید سے رہائی مل گئی لیکن وہ ساری زندگی فلورنس سے نفرت کرتا رہا۔

ویروکیو کی بنائی ہوئی تصویر Babtism of Christ میں بائیں طرف ایک فرشتے کی شبیہہ بنا کر لیونارڈو نے اسے مصوری چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اس سکول میں قیام کے دوران لیونارڈو نے Oil Paint کی نئی نئی پرتوں کو متعارف کرایا۔ میدانوں، ندیوں، پہاڑوں کو تصویروں میں استعمال کیا۔ اس قیام کے دوران دلچسپ بات یہ ہے کہ دو ایک بار تصویر بناتے وقت ویروکیو نے لیونارڈو کو بطور ماڈل بھی استعمال کیا۔

لیونارڈو نے پہلا انفرادی کام سینٹ برنارڈ کے گرجا گھر میں The Adration of the Magi بنا کر کیا۔ یہ ان تین دانشوروں کے بارے میں ہے جو حضرت عیسیٰ کو دیکھنے یروشلم آئے تھے۔

میلان کے قیام کے دوران اس نے Virgin of the Rocks اور اپنی مشہور تصویر The Last Supper یعنی ''آخری ضیافت'' بنائی جسے دنیا کا بہترین شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس قیام کے دوران اس نے جب انکم ٹیکس کے کاغذات جمع کرائے تو ایک عورت کو اپنا وارث نامزد کیا۔ اس عورت کا نام کیٹرینا تھا، وہی کیٹرینا جس نے خوشی خوشی لیونارڈو کو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا تھا۔

1495ء میں اسکی تدفین لیونارڈو نے اپنے ہاتھوں سے کی۔ میلان میں لیونارڈو نے گھوڑوں کے کئی مجسمے بنائے۔ میلان چرچ کا گنبد ڈیزائن کیا۔ دو بہت طویل قامت مجسمے بنائے جنہیں Grand Cavallo کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ 1499ء میں جب اٹلی کی دوسری جنگ شروع ہوئی اور فرانسیسی فوجی شہر میں داخل ہوئے تو وہ اس مجسمے کو نشانہ بازی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسیوں کے حملے کے بعد لیونارڈو اپنے شاگرد سالائی اور دوست کے ساتھ وینس بھاگ گیا۔ جہاں فوجیوں نے اسے تعمیرات کا کام سونپ دیا۔ کام یہ تھا کہ بحری حملے سے شہر کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ 1500ء میں وہ فلورنس واپس آ گیا اور The Virgin and Children بنائی جس کو بہت سراہا گیا۔ لوگ اسے جوق در جوق یوں دیکھنے آتے تھے جیسے کوئی میلہ لگا ہو۔ فلورنس ہی میں اس نے ڈیزائننگ اور تعمیراتی کام کیے The Battle of Anghirari اور مائیکل اینجلو نے The Battle of Calscina کے پینٹنگ Moral بنائے۔ کہتے ہیں کہ لیونارڈو کے حصے کی دیوار پر عورتوں مردوں کا رش تھا۔ لیکن مائیکل اینجلو کی تصویر کے سامنے ایک دو آدمی تھے۔ مائیکل اینجلو غصے میں آ کر چلا گیا تھا۔ اپنے فن سے لیونارڈو نے ایک پرانی بات کا بدلہ لیا تھا جو مائیکل اینجلو نے لیونارڈو سے کہی تھی۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ 13 فٹ کا ایک بے کار پتھر جب چرچ میں لیونارڈو کو پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے مجسمہ بنائے تو وہ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے کام بروقت شروع نہ کر سکا اور کام چھوڑ کر چلا گیا۔ جب یہی کام مائیکل اینجلو کو سونپا گیا تو اس نے The Statue of Divid جیسا عظیم الشان شاہکار بنا دیا۔ ایک دن لیونارڈو اور مائیکل اینجلو کی ایک گلی میں ملاقات ہوگئی تو مائیکل اینجلو نے بلند آواز سے کہا:

''دیکھو یہ جا رہا ہے گھوڑوں کے ماڈل بنانے والا۔ مجسمہ بنانے کے لئے کہا گیا تو کام چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

مصوری میں لیونارڈو کی Mona Liza ایک مثالی شاہکار ہے۔ جو صدیوں سے لوگوں کی نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کو جب بھی دیکھیں نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ لیونارڈو نے اس تصویر کو نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ اس کا پس منظر بھی بہت دلچسپ ہے۔ لیونارڈو نے یوں بہت سی عورتوں کی تصویریں بنائیں۔ میلا کے ڈیوک کی بیوی

،بیٹرائس، اپنی دو پسندیدہ عورتوں سیلیا اور لوکریزیا کو ماڈل بنا کر اپنے پورٹریٹ بنائے مگر وہ ان سے مطمئن نہ تھا۔ وہ کوئی شاہکار بنانا چاہتا تھا اور کسی خاص چہرے کی تلاش میں تھا۔ آخر وہ چہرہ اسے مل گیا۔

مونالیزا فرانسسکوڈیل جوکنڈو کی غالباً تیسری بیوی تھی۔ 1499ء میں مونالیزا کا بچہ فوت ہو گیا۔ وہ مسلسل تین سال اسے اپنے سٹوڈیو میں بلاتا رہا کبھی اس کے پس منظر میں روشنی اور سائے بناتا، کبھی دریا اور درخت کبھی صبح و شام کا منظر۔ کبھی اسے ریشمی کپڑے پہناتا کبھی کھدر کا سادہ لباس۔ اس کے چہرے پر ایک غم کی کیفیت بیان کرنے کے لئے اس نے سازندوں کا ایک گروپ بلایا اور انہیں ایسی دھنیں بجانے کے لئے کہا جو مونالیزا کے چہرے پر مامتا کا لطیف جذبہ جگا دے۔ منوں کا غذ اور سیروں رنگ خرچ ہو گئے مگر لیونارڈو کو چہرے پر وہ کیفیت نہ ملی جو وہ چاہتا تھا۔ آخر لیونارڈو نے یہ تصویر نامکمل چھوڑ دی۔ مونالیزا کے خاوند نے یہ تصویر لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ شاید نہیں چاہتا تھا تصویر آنے والے مہمان کو گھورتی اور مسکراتی رہے۔ چنانچہ لیونارڈو نے یہ تصویر اپنے پاس ہی رکھ لی۔ لیونارڈو کی وفات کے بعد یہ تصویر اس کے شاگردوں کے ہاتھ آ گئی اور مختلف محلوں سے ہوتی ہوئی اب یہ لوورے کے عالی شان Salon Carre میں سجی ہے، ہزاروں لوگ روزانہ اس کی مسکراہٹ کا بھید سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ کسے مسکرا کر دیکھ رہی ہے۔ لیونارڈو کو، اپنے خاوند کو، سازندوں کو یا ان لوگوں کو جو اسے دیکھنے آتے ہیں۔

لیونارڈو بہت وہمی اور سست تھا۔ وہ چیزوں کو ان کی اصل حقیقت میں بنانا چاہتا تھا، اسی لیے اسے دیر ہو جاتی تھی۔ اس کے فن کے بارے میں چھپنے والی ایک کتاب کا نام (On Art) ہے۔ اس میں وہ مصوروں سے مخاطب ہے، انہیں اپنے نظریات پر کاربند ہونے کا درس دیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے نقل کی نقل کرنے والے کبھی اچھے مصور نہیں بن سکتے۔ مصوروں کو چاہیے کہ کھلے میدان میں جا کر فطرت کا مشاہدہ کریں۔ اس کے بقول:

''مصورو! کھلے میدان اور کھیت میں جاؤ۔ ہر چیز کو بار بار اور غور سے دیکھو، جو چیز بہتر نظر آئے اسے گٹھڑی میں باندھ کر اپنے ساتھ لے آؤ''

نقادوں کے بارے میں اس کا رویہ بہت سخت تھا۔ وہ ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا تھا، وہ کہتا ہے:

''میں ان کے منہ سے نکلی ہوئی ہوا کو ان کے نیچے سے نکلی ہوئی ہوا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔''

لیونارڈو داونچی ایک آرٹسٹ کے لئے مظاہر جیسے فطرت روشنی، دھوپ، چھاؤں، بادل، غروب آفتاب اور طلوع آفتاب کے مطالعے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ لیونارڈو نے نئے مصوروں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''جب تم کوئی چہرہ بنانے لگو تو چھاتی کا رخ ادھر نہیں ہونا چاہیے جدھر چہرہ ہے۔''

اس کی ایک تصویر The Virgin and Child کو اگر غور سے دیکھیں تو لیونارڈو نے یہ تصویر بناتے وقت نوک دار پہاڑیوں اور چٹانوں کو پس منظر میں دکھایا ہے'' آخری ضیافت، مونالیزا اور سینٹ این'' لیونارڈو کی عظیم تصویریں مانی جاتی ہیں۔

جب لیونارڈو 'آخری ضیافت' بنا رہا تھا تو وہ تین دن پینٹنگ کرتا اور تین دن لکھتا تھا، شہر میں ایسے چہرے تلاش کرتا تھا، جن کے خدوخال ایسے ہوں جنہیں وہ حضرت عیسیٰ کے حواری دکھا سکے اور اس نے یہ چہرے ڈھونڈ نکالے تھے۔

لیونارڈو شاندار مصور ہی نہیں، بے مثال ڈرافٹسمین بھی تھا۔ اس کی ڈائریاں، ڈرائنگ اور سکیچوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس نے جتنی تصویریں بنائیں ان کے ابتدائی سکیچ مسودوں، ڈائریوں میں مل جاتے ہیں۔ بازار، شہر یا راستے پر جو

چہرہ بھی اس کی توجہ اپنی طرف کھینچتا لیونارڈو سارا سارا دن اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا، اس کی حرکات سکنات نوٹ کرتا رہتا اور اس کا سکیچ اپنی ڈائری میں بنا لیتا تھا۔ اس مشاہدے نے اسکی مصوری کو چار چاند لگا دیئے۔

لیونارڈو داونچی کی شخصیت، آرٹ اور سائنس کا مرکب تھی وہ بڑا سائنس دان بھی تھا۔ اس نے تقریباً 13000 صفحات لکھے جن میں اسکی ڈرائنگ، تعمیراتی نقشے اور سائنس کے مشاہدے اور تجربے درج ہیں۔ وہ روزانہ اپنے مشاہدوں اور روزمرہ کے حاصل شدہ علم کو لکھ کر محفوظ کر لیتا تھا۔

ان تحریروں میں ان ایجادات کے سکیچ بھی بنے ہوئے ہیں جن پر وہ کام کر رہا تھا مثلاً وہ جوتے جنہیں پہن کر آدمی پانی پر چل سکتا ہے یا ہوا میں اُڑنے کے لئے پرندوں کی ڈرائنگ۔ چہروں کا مطالعہ، بچوں، جانوروں اور پودوں کا مشاہدہ اور اخذ کیے گئے نتائج چٹانوں اور پہاڑوں کی بناوٹ اور خصوصیات، جنگی مشینوں کے سکیچ، ہیلی کاپٹر کی ڈرائنگ، جانوروں کے چہرے پر ابھرنے والے غصے اور پیار کے جذبات تک۔

لیونارڈو دراصل کائنات کو سمجھنا چاہتا تھا اور اس کے تفصیلی مشاہدے کے بعد لکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان سب چیزوں کے عنوانات قائم کر کے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں چھپوانا چاہتا تھا۔ اس کے ان کاغذات میں جن ایجادات کے نقشے ملتے ہیں، ان میں موسیقی کے ساز، پمپ، ایک ڈیزائن اڑنے والی مشین کا بھی ہے جو پیرس کے انسٹی ٹیوٹ میں رکھا ہوا ہے۔ اس نے پرندوں پر بھی ریسرچ کر کے گلائیڈر اور ہیلی کاپٹر بنانے کا ارادہ کیا۔ وہ ہیلی کاپٹر کے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا لیکن گلائیڈر کو جوڑ کر تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گیا

اناٹومی میں لیونارڈو نے بڑا کام کیا۔ اس نے ویروکیو کی ورکشاپ کے دوران ہی اس کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے سانتا ماریہ ہسپتال میں انسانی پٹھوں کا مشاہدہ کر کے انہیں ڈرائنگ کی شکل دی۔ ایک کامیاب آرٹسٹ ہونے کے حوالے سے اسے اجازت مل گئی تھی کہ وہ مُردوں کی چیر پھاڑ کر کے انسانی اعضا کا مشاہدہ کر سکے۔ اس نے ایک ڈاکٹر کے ساتھ مل کر 200 سکیچ بنائے جو انسانی جسم اور ہڈیوں پر مشتمل تھے۔ یہ کتاب لیونارڈو کی وفات کے 161 سال بعد 1680ء میں چھپی جس کا ٹائٹل تھا Treatise on Painting۔

لیونارڈو داونچی نے انسانی ڈھانچے اور انسانی اعضا کے بے شمار سکیچ بنائے۔ پٹھوں، رگوں اور دل کے سکیچ، عورت اور مرد کے جنسی اعضا کے سکیچ۔ اس نے انسانی بازوؤں کی ہڈیوں کا مطالعہ کیا اور اس کی ڈرائنگ بنائی۔ اس نے بہت باریکی سے اس چیز کا مشاہدہ کیا کہ بڑھتی ہوئی عمر انسانی مزاج پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات اور جذبات میں کیسے تبدیلی آتی ہے۔ خاص طور پر چڑچڑا پن اور غصہ اس عمر میں کیوں بڑھ جاتا ہے۔ بیماری کی حالت میں انسانی چہرہ کیسے بدلتا ہے اور طویل بیماری کا چہرے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ لیونارڈو نے انسانی چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کے بے شمار سکیچ بنائے۔

لیونارڈو نے آپریشن اور اجسام کے اندرونی مشاہدے کا مطالعہ صرف انسانوں تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے جانوروں کے آپریشن بھی کئے۔ اس نے گائے، بندر، ریچھ، مینڈک کے آپریشن کر کے ان کے اندرونی حصوں کا مشاہدہ بھی کیا اور ہڈیوں اور پٹھوں کی ڈرائنگ کی۔

لیونارڈو داونچی بحیثیت انجینئر اپنے عہد کا ایک نامور انجینئر تھا۔ اس نے (Ludovico Moro) کو ایک خط لکھا اور دعویٰ کیا کہ وہ ایسی مشینیں بنا سکتا ہے جو حملے کے وقت شہر کی حفاظت کر سکتی ہیں۔ جب وہ وینس بھاگ گیا تو فوج کی ملازمت میں اس نے ایک ایسا مکینیکل نظام تیار کیا جو شہر کو حملوں سے بچانے میں مددگار ثابت ہوا۔
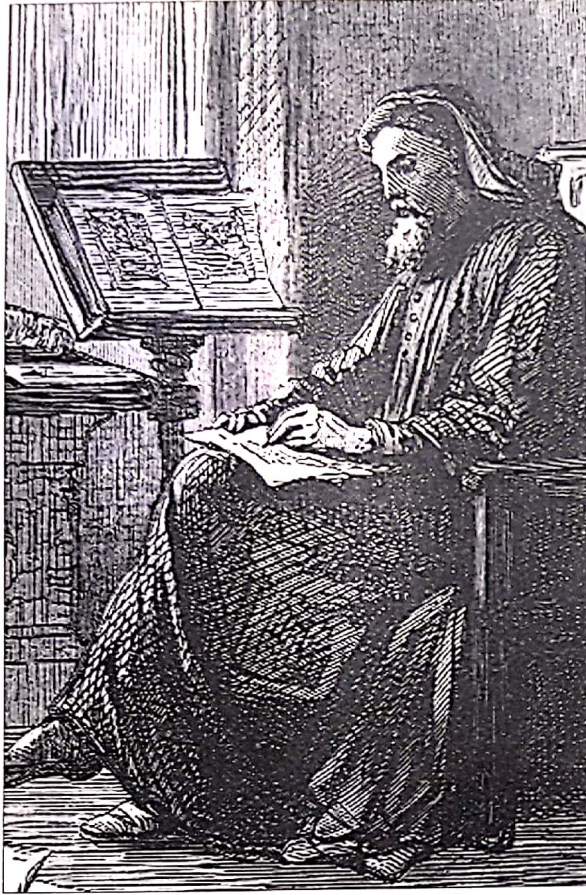
اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جس سے دریائے (Arno) کا رُخ بدلا جاسکتا تھا۔ بعد میں اسی منصوبے پر میکاولی نے کام کیا تھا۔ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ لیونارڈو کو ''پرواز'' اور ہوا میں اُڑنے کا بہت شوق تھا اس نے کئی منصوبے بنائے اور ان کے ڈیزائن تیار کئے، ان میں سے کچھ ممکن اور کچھ ناممکن تھے۔ ہیلی کاپٹر اور گلائیڈر کی ڈرائنگ بنائی اور گلائیڈر اُڑانے میں کامیاب ہوگیا۔

مجسمہ سازی، مصوری، ڈرائنگ، سائنس، اناٹومی، انجینئرنگ، ایجادات، تحریر، مشاہدہ، ریاضی۔ وہ کونسا شعبہ ہے جس میں لیونارڈو داونچی نے قدم رکھا اور کامیابی نے اس کا ہاتھ پھیلا کر استقبال نہیں کیا۔

فنونِ لطیفہ کا مشہور نقاد اور تاریخ نویس برنارڈ برنس کہتا ہے:

''لیونارڈو داونچی واحد ہے جس کے بارے میں بغیر کسی شک وشبہ کے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اسے لافانی حسن بخش دیا۔ چاہے وہ کھوپڑی کا پوسٹ مارٹم ہو، پٹھوں کا مطالعہ ہو، مصوری ہو، ڈرائنگ کی باریک لائن ہو، گھاس کی پتی ہو، یا کسی ایجاد کا بنیادی منصوبہ۔ لیونارڈو نے اسے حیات جاوداں سے مالا مال کردیا۔''

لیونارڈو کے زمانے میں وساری (Vasari) وہ سوانح نگار ہے، جس نے مائیکل اینجلو کی زندگی پر ایک بھرپور کتاب لکھی (گو مائیکل اینجلو کو بعض باتوں پر اس سے اختلاف تھا) اور اس نے اپنے عہد کے فنکاروں کے بارے میں قارئین کو باخبر کیا اس کی کتاب ''فنکاروں کی زندگی'' اس سلسلے کی بڑی اہم کتاب ہے۔ اس نے اس کتاب میں لیونارڈو کی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ وہ لیونارڈو داونچی کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''اس دنیا میں ذہین مرد اور عورتیں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن میں قدرت، حسن اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہے۔ یہ خزانہ ان میں اس قدر وافر ہوتا ہے کہ وہ باقی تمام انسانوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں، خدا ان سے کراتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ لیونارڈو داونچی کے بارے میں یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔''

لیونارڈو داونچی کی شہرت جب دور دور تک پھیلی تو ہر آدمی اسے اپنے قریب رکھنے کا طلب گار رہا۔ آخری دنوں میں فرانس کا بادشاہ اسے یوں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا جیسے لوگ خوشی خوشی کسی مقابلے میں جیتی ہوئی ٹرافی لے کر جاتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی بہت خدمت کی۔ اسے قلب وچشم میں جگہ دی اور لیونارڈو داونچی نے اس کے بازوؤں میں آخری سانس لی۔ یہ 2 مئی 1519ء کا واقعہ ہے جب نشاۃ ثانیہ کا سب سے اہم شخص دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اردو زبان میں ایک محاورہ بڑا مقبول ہے کہ جب کسی آدمی نے کوئی کام چٹکیوں میں سرانجام دینا ہو تو وہ یہی کہتا ہے۔ ''تم فکر نہ کرو یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔'' پتا نہیں وہ کام ہوتا بھی ہے یا نہیں لیکن لیونارڈو داونچی کے سارے کام بائیں ہاتھ سے ہوگئے۔ وہ بچپن میں لوہے کی نعل سے زور آزمائی کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بیکار کر بیٹھا اور سارے عظیم کارنامے بائیں ہاتھ سے سرانجام دیئے۔ 5 صدیاں گزر چکی ہیں، اس کے بائیں ہاتھ کے سارے کام آج بھی زندہ ہیں۔ جنہیں دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے ان عظیم الشان کارناموں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

چاسر
(Geoffrey Chaucer)

چودھویں صدی کا مقبول شاعر جسے انگریزی شاعری کا بادا آدم کہا جاتا ہے۔ اس کا اہم شعری کارنامہ ''کنٹربری ٹیلز'' ہے۔ اس نے شاعری میں ''بیانیہ اور (Realism) کا آغاز کیا۔ انگریزی زبان کو فرانسیسی اور لاطینی اثر سے آزادی دلائی۔

چاسر نے پہلی بار انگریزی ادب میں قارئین کے سامنے زندہ اور جیتے جاگتے کرداروں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

(ایل۔ جی سٹرانگ)

....

''600 سال گزر چکے ہیں۔ چاسر کی زبان بھی متروک ہو چکی ہے۔ لیکن اسے آج بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اگر قارئین پرانی انگریزی زبان، الفاظ کے Spellings اور زبان کی اجنبیت کو برداشت کر لیں۔ تو ان کہانیوں اور چاسر کے اسلوب سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔''

....

تاجر، پادری، نواب، طالب علم، کلرک، طوائفیں، نیک اور بد انسان، کسان، ملاح، راہب، راہبہ، پیدل، گھڑ سوار یہ سب ''کنٹربری ٹیلز'' کے کردار ہیں۔

جیوفری چاسر

دنیا کی کسی زبان کے ادب کی ابتدائی تاریخ پڑھ لیجئے۔ ہر زبان میں کوئی نہ کوئی شاعر باوا آدم کا روپ دھار کر آنے والی نسلوں کے لیے شاعری کی ایسی بنیاد رکھتا ہے، حرف و معانی اور اسلوب کی ایسی دیواریں اٹھاتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر شاعری کی خوبصورت عمارت تعمیر کرتی ہے۔ وہ فرسودہ روایات سے بغاوت بھی کرتا ہے۔ اظہار و بیان کے نئے انداز بھی اپناتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور پھر ادب کی دنیا میں دن طلوع ہو جاتا ہے۔ چاسر کو شاید اسی لئے

"The Dawn of English Poetry"

کہا جاتا ہے۔ اپنی اپنی زبانوں میں پشکن، سروانٹیز اور ولی دکنی کو بھی یہی مقام حاصل تھا۔

چودھویں صدی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس وقت انگلستان میں احیائے علوم کا آغاز ہو رہا تھا۔ زبان، علم اور شاعری نئے انداز اختیار کر رہی تھی۔ پرانا عہد مر رہا تھا۔ نیا عہد آنکھیں کھول رہا تھا۔

Chaucer is most representative of that age which was the sunset of the "Good old Time "

فتوحات کے جنون میں مبتلا سرداروں، پر جوش زائرین، گاؤں گاؤں گھوم پھر کر تفریح فراہم کرنے والے فنکاروں اور مقدس گیت گانے والوں کا زمانہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ رہا تھا.......... چاسر نے یہ سب کچھ دیکھا، سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا تھا۔

چاسر نے اپنے زمانے کے مسائل پر قلم نہیں اٹھایا مذہبی اختلافات، چرچ میں دنیاداری کا عنصر، کٹر مذہبی تعصبات کے خلاف احتجاج۔ اس نے ان میں سے کسی چیز کو اپنی شاعری کا موضوع نہ بنایا۔ اس نے اپنے سارے پلاٹ ماضی کی لوک کہانیوں سے لئے.......... وہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ دربار کے بارے میں اس کی معلومات بے بہا تھیں۔ جنگ اور فوجیوں کے بارے میں اس کا تجربہ اور مشاہدہ تھا کیونکہ وہ خود سپاہی تھا اور کئی جنگیں لڑ چکا تھا۔ بس یہ سب کچھ اس نے شاعری میں سمو دیا۔

جیوفری چاسر (Geoffrey Chaucer) 1340ء میں لندن پیدا ہوا۔ اس کا باپ سرائے کا مالک تھا لیکن وہ شراب کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ چنانچہ چاسر کو شروع ہی سے بھانت بھانت کے آدمیوں سے ملنے اور انہیں پرکھنے کا موقعہ ملا۔ جب سترہ سال کا ہوا تو دربار میں معمولی نوکری مل گئی، پھر وہ فوج میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ کے ساتھ Artois کی جنگ میں حصہ لیا۔ اسے دشمن کے سپاہیوں نے پکڑ لیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔ ایک عرصہ قید میں رہا پھر بادشاہ نے تاوان ادا کر کے رہائی دلائی۔ اب وہ بادشاہ کے قریبی حلقے میں شامل ہو گیا.......... ڈیوک آف لنکاسٹر نے اس کی سرپرستی کی۔ اس کا عہدہ بڑھایا۔ فرانس اور اٹلی میں سفارتکار بنا کر بھیجا.......... 20 پاؤنڈ پنشن مقرر کی، شراب کا ایک بیرل روزانہ گھر بھیجا جاتا تھا۔...... ڈیوک آف لنکاسٹر کو زوال ہوا تو چاسر بھی برے دنوں کی گرفت میں آ گیا۔ پنشن رک گئی، خوشحالی بدحالی میں

بدل گئی۔ ڈیوک جب دوبارہ برسرِاقتدار آیا تو اچھے دن پھر لوٹ آئے۔ چاسر کو اُون، شراب کے محکمے میں کلرکی مل گئی۔

چاسر نے ساری زندگی مصروفیت میں گزار دی۔ سپاہی بن کر جنگ لڑی، کلرکی کی، تاجروں اور دو کانداروں کی نفسیاتی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ سفارتکار بن کر فرانس اور اٹلی میں سیاسی لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ لندن کے عام آدمی، شرابی اور بدمعاشوں کی محفلوں میں بیٹھنے اُٹھنے کا موقع ملا۔ اسے انسانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے انسانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت غور سے دیکھا، پڑھا، مشاہدہ کیا اور پھر اپنی شاعری میں ان کے خدوخال بہت خوبصورتی سے پیش کر دیئے۔ عالمی ادب میں انسانوں کی زندگی کو جس طرح چاسر نے بیان کیا ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی...... کنٹر بری کی کہانیوں میں جس طرح انسانوں کے خارجی اور باطنی نقشے کھینچے گئے ہیں۔ اس سے یہی محسوس ہوتا ہے۔

کنٹر بری ٹیلز (The Canter Bury Tales) چاسر کا عظیم شعری کارنامہ ہے...... کنٹر بری ایک مقدس مقام ہے جہاں زائرین دُور دُور سے خانقاہوں اور مزاروں کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ چودھویں صدی میں لوگ قافلوں کی شکل میں اِس مقدس مقام کی طرف آتے تھے۔ قافلے میں زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی کرنے والے لوگ شامل ہوتے تھے۔ تاجر، پادری، نواب، طالب علم، کلرک، عورتیں، نیک اور بد انسان اور طوائفیں۔ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی سواری پر آتا تھا۔ کچھ لوگ پیدل ہوتے تھے۔ کچھ گھوڑوں پر اور کچھ چھکڑوں پر۔ سب دن بھر چلتے رہتے تھے اور رات کو کسی سرائے میں بسر کرتے تھے۔ وقت گزارنے کے لئے وہ آپس میں گفتگو کرتے۔ اپنا اپنا تعارف کراتے اور اپنی اپنی کہانیاں سناتے تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ کہانی آپ بیتی ہو، یہ جگ بیتی بھی ہو سکتی تھی...... چاسر کی یہ کہانیاں ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ ہوسکتا ہے چاسر نے کبھی زائرین کے اس قافلے میں شمولیت کی ہو۔ یہ کہانیاں سنی ہوں اور ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کر لی ہوں اور پھر انہیں شعری صورت دے دی ہو...... بہرحال چاسر کے قلم نے انہیں یادگار بنا دیا۔ 600 سال گزر چکے ہیں چاسر کی زبان بھی متروک ہو چکی ہے لیکن یہ کہانیاں اب بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اگر قارئین پرانی انگریزی زبان، الفاظ کے Spellings اور زبان کی اجنبیت کو برداشت کر لیں تو ان کہانیوں اور چاسر کے اسلوب سے لطف حاصل کر سکتے ہیں اور یقیناً صدیوں سے قارئین یہ لطف حاصل کر رہے ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کا آپس میں مل بیٹھ کر کہانیاں سنانا۔ سرائے اور مزاروں پر راتیں بسر کرنے والوں کا آپس میں ایک دوسرے کو متعارف کرانا۔ آپ بیتی، جگ بیتی سننے اور سنانے کی روایت بہت پرانی ہے۔ ان قصے کہانیوں سے دنیا کی مختلف زبانوں میں بڑا جاندار ادب تخلیق ہوا ہے۔ یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ ہماری اردو زبان میں اس کی بہترین مثال امن دہلوی کی کتاب قصہ چار درویش (جو فارسی زبان میں لکھی کہانی کا ترجمہ) ہے۔

چاسر نے اپنی کہانیاں لکھنے کے لئے 30 زائرین کا انتخاب کیا ہے جو مئی کی ایک صبح کو ٹابارڈ (Tabard) کی سرائے سے کنٹر بری کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ان زائرین میں 13 سال سے لیکر 80 سال کی عمر کے زائرین ہیں۔ ان میں غریب پادری، پروقار نواب، مداح، طالب علم، چرچ کی باعزت نن خواتین۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا کلرک۔ قانون دان، طبیب، کسان، چکی والا اور دوسرے عام زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ بقول

(L.A.G. STRONG)

"It is the first time in English Literature that we are brought face to face with

thirty living and breathing people"

ٹابارڈ کی سرائے سے چلنے سے پہلے یہ بات طے کی گئی تھی کہ ہر آدمی دو دو کہانیاں سنائے گا چنانچہ اس وعدے کو نبھایا گیا۔ جو کہانی جس جس آدمی نے سنائی وہ اس کے کردار، اُس کے تجربے کی عکاسی کرتی ہے...... اور پھر جب چاسر نے ان کہانیوں کو اپنے انداز میں لکھا تو چاسر کی قوت بیانیہ نے انہیں یادگار بنا دیا۔

نقادوں کا خیال ہے (اور یہ بات درست بھی ہے) کہ چاسر کے اس اسلوب اور کہانی کہنے کے فن پر دو آدمیوں کا گہرا اثر ہے۔ اور وہ دو آدمی ہیں دانتے (Dante) اور بوکیچو (Boccaccio)۔

چاسر نے اپنی سفارتی ذمے داریوں کو نبھانے کے لئے اٹلی کے کئی سفر کئے۔ اُسے دانتے اور بوکیچو کو پڑھنے کا موقعہ ملا لیکن اس نے جس مصنف سے زیادہ اثر قبول کیا وہ بوکیچو ہے۔

بوکیچو کی تصنیف ''ڈیکیمرون'' کا انداز بالکل کنٹر بری ٹیلز جیسا ہے۔ اس کتاب کا تحریری پس منظر یہ ہے کہ شہر فلورنس میں طاعون کی بیماری پھیلی تو شہر کی سات امیر عورتیں شہر سے بھاگ کر گاؤں کی ایک حویلی میں چلی گئیں اس کے ساتھ تین مرد بھی تھے اس حویلی میں دس روز تک وہاں رہیں اور ہر فرد روز دس کہانیاں سناتا تھا اِس طرح ''ڈیکیمرون'' لکھی گئی۔ ''ڈیکیمرون'' یونانی لفظ ہے جس کا مطلب دس دن ہے۔ بوکیچو کی ان کہانیوں پر ہندوستانی داستانوں کا بہت اثر ہے۔ بلکہ اس کی تصنیف ''ناتھن کی کہانی'' ہندوستان سے لی گئی کہانی ہے۔ چاسر نے بوکیچو سے متاثر ہو کر اپنی کہانیوں کا پلاٹ بنایا اور 22 دلچسپ کہانیاں تیار کر لیں۔ جن کا پس منظر، لب ولہجہ، ماحول اور کرداروں کی نفسیات اور زندگی کی ساری جھلک انگلستان کے لوگوں کی ہے۔

کنٹر بری ٹیلز انگریزی زبان میں بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ چاسر نے پہلی بار انگریزی ادب میں بیانیہ انداز کو شامل کیا۔ پہلی بار حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی اور دوسری اہمیت چاسر کے انگریزی زبان میں نئے تجربات ہیں۔ چاسر نے پہلی بار انگریزی زبان کو فرانسیسی اور لاطینی زبان کے اثر سے آزاد کرایا اور خالص لندن کی زبان شاعری میں شامل کی جسے (King's English) کہا جاتا تھا اور کم اہمیت کی زبان خیال کیا جاتا تھا۔ چاسر نے اسے چار چاند لگائے اور بعد میں آنے والے شاعروں کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ چاسر نے سات مصرعوں کا Stanza لکھ کر اِسے بیانیہ اسلوب کے قابل بنایا۔ (Kings's English) جسے مفلس زبان کہا جاتا تھا اُسے مالا مال کر دیا۔ بقول کیزامئین :۔

"He found it a thing of naugnt and left it so rich tha english poetry had but to add blank verse to it in order to be fully equipped"

چاسر نے اپنی شاعری کی ابتدا عشق ومحبت سے بھرپور جذبات سے کی ان نظموں میں وہ زبان پر اپنی بھرپور صلاحیت کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور پھر اس کی یہ صلاحیت ''بیانیہ'' کی طرف مڑ گئی۔ اس کا پہلا شعری کارنامہ BOKE OF BLAUNCHE THE BUCHESSE تھا جو اس نے اپنے محسن اور سرپرست ڈیوک آف لنکاسٹر کی پہلی بیوی کی وفات پر لکھا (PARLIAMENT OF FOULES)۔ ویلنٹائن ڈے پر قدرت ایک پارلیمنٹ کا اہتمام کرتی ہے اس میں شاہین، عقاب اور سب شکاری جانور موجود ہیں۔ گھاس پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔ یہ پارلیمنٹ اس لئے بلائی گئی ہے کہ اِس دن کے موقع پر پرندے جانور اور کیڑے مکوڑے اپنے ساتھی کا انتخاب کر لیں۔

(HOUSE OF FAME) چاسر کی ایک نامکمل نظم ہے۔ جس میں ایک سنہری عقاب چاسر کو اٹھا کر ستاروں کی

طرف لے کر اُڑ جاتا ہے تا کہ چاسر ستاروں کی کہکشاں کی شان میں شاعری کر سکے مگر جلد ہی شاعر اپنی عمر کا حوالہ دیتا ہے اور عقاب سے زمین پر لے جانے کی التجا کرتا ہے کہ اب بڑھاپا اس سے یہ کام نہیں لے سکتا۔ (LEGENDE OF GOOD WOMEN) چاسر کی بہت خوبصورت نظم ہے جس میں کیوپڈ اُسے سزا دیتا ہے کہ اُس نے محبت کرنے والوں کے خلاف اپنی نظم میں بہت طنزیہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایڈمٹیس کی بیوی ملکہ ایلکسٹ اُس کی سزا معاف کراتی ہے اور اُسے کہتی ہے کہ اب وہ ان عورتوں کے بارے میں نظم لکھے جنہوں نے محبت میں بہت کارنامے سرانجام دیئے ہیں چنانچہ اس نظم میں چاسر نے ایسی عورتوں کی تعریف میں شاعری کی ہے چنانچہ اس نے یونانی لیجنڈز میں سے کچھ عورتوں کی کہانیاں لکھیں۔ جن کا ذکر بہت پہلے اطالوی شاعر Ovio کر چکا ہے۔

چاسر کی مشہور رومانوی نظم TROILUS AND CRISEYDE بوکیچو کی مشہور نظم IL FILOSTRATO سے بہت مشابہت رکھتی ہے اس مشہور رومانوی قصے کو چاسر نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے مگر اس نے بوکیچو کے تمام رومانوی اور جذباتی مناظر کو ترجمہ کر کے اس میں شامل کر لیا ہے۔ یہ کہانی TROJAN WAR میں دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔

چاسر کی عالمی ادب میں اصل شہرت اس کے شاہکار کنٹربری ٹیلز (CANTERBURY TALES) کی وجہ ہے۔ جو تیس زائرین کی سنائی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کہانیوں سے پہلے چاسر نے پرولوگ لکھا ہے جو انگریزی شاعری میں ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں چاسر نے 29 زائرین کی تفصیل بیان کی ہے (تیسواں وہ خود تھا) ان زائرین میں مختلف مکتبہ ہائے زندگی کے لوگ شامل تھے۔

-1 THE KNIGHT -2 THE MONK -3 THE CLERK -4 THE MERCHANT
-5 THE COOK -6 THE SHIPMAN -7 THE DOCTOR -8 THE PLOUGHMAN
-9 THE MILLER -10 THE REEVE

اور اس کے علاوہ بہت سے کردار شامل ہیں اور ان سب میں اہم ترین THE WIFE OF BATH کا ہے۔

چاسر نے ان سب کا حلیہ اور ان کے کردار بیان کئے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے اس عہد کے تمام شعبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کرداروں سے ہمارا تعارف کرادیا ہے۔

جب یہ اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں تو دراصل یہ کہانی اُن کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ جس میں ان کی اچھائی، برائی، ان کی کمزوری اور چالاکی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ چاسر نے پرولوگ میں ان کے بارے میں جو تفصیل بتائی ہے وہ ان کرداروں کی شخصیت کا پورا احاطہ کرتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کہانی سنانے والے یہ کردار اب اپنی کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ چاسر ان کا پرولوگ میں کچھ یوں ہم سے تعارف کراتا ہے۔

راہبہ (NUN)

اس کا نام مادام الکنٹائن تھا
وہ حمدیہ گیت بہت دلکش اور موثر انداز میں گاتی تھی۔
فرانسیسی زبان فر فر بولتی تھی۔
کھانے کے آداب جانتی تھی۔
کھاتے وقت اُس کی انگلیاں

سالن میں آلودہ نہیں ہوتی تھیں
اپنے ہونٹوں کو اس طرح صاف کرتی تھی
کہ پانی پیتے وقت گلاس پر سالن کا دھبہ تک نہ آتا تھا۔
کسی چوہے کو تکلیف میں دیکھ کر
آنسو بہانے لگتی تھی
اِس کے ساتھ کچھ کتے بھی تھے
جنہیں وہ گوشت کھلاتی اور دودھ پلاتی تھی۔
ناک خوبصورت اور آنکھیں شفاف تھیں۔
اس کا دہانہ چھوٹا اور سرخ تھا۔

کلرک

آکسفورڈ کا کلرک منطق کا شوقین تھا۔
اس کا گھوڑا کمزور، مریل اور ٹیڑھا تھا۔
اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔
اس کے پاس 20 ارسطو کی کتابیں تھیں
جنہیں اپنے سرہانے رکھ کر سوتا تھا۔
وہ سب کچھ کتابوں پر خرچ کر دیتا تھا۔
ضرورت کے وقت بولتا تھا۔
ہر بات موقع محل کے مطابق
دوٹوک اور نپی تلی ہوتی۔

طبیب THE DOCTOR

بے مثال حکیم اور طبیب
ستاروں کے علم سے مریضوں کا علاج کرتے تھے۔
ستارے کا مقام دیکھ کر مریض کو دوائی دیتے تھے۔
نہ بقراط سے واقف
نہ ابن رشد اور ابن سینا سے تعارف
عمدہ لباس زیب تن۔
بہت کمایا۔ لیکن خرچ نہ کیا۔
کنجوس اور بخیل۔
سونے سے خاص محبت
کیونکہ کشتوں میں سونا استعمال ہوتا ہے

کسان THE PLOUGHMAN

سچا، محنت کش، ایماندار
خدا سے پیار کرنے والا۔
غم ہو یا خوشی ہر دم ذکرِ خدا
خدا کے بعد پڑوسی سے پیار کرنے والا
یسوع کے نام پر سب کی مدد کرنے والا
ہر کسی کے لئے، ہر وقت
بغیر معاوضہ خدمت کے لیے تیار

چکی والا۔THE MILLER

مضبوط ہڈیوں سے بنا آدمی
سینہ چوڑا، کاندھے چھوٹے۔
داڑھی سرخ بالکل لومڑی کی طرح
کھلا منہ بالکل بھٹی کی طرح
باتونی، داستان گو
اناج چوری کرنے والا
جنسی کہانیاں سنانے والا۔

THE WIFE OF BATH

باتھ (گاؤں) کے قریب رہنے والی
ایک گھریلو خاتون۔
کپڑا بننے کی ماہر۔
خوب صورت، رنگ گلابی۔
پانچ مردوں سے گرجے میں شادی کی۔
گرجے کے باہر کی شادیاں بے شمار
مردوں کی صحبت میں خوش۔
اونچا سنتی تھی۔
کیونکہ ایک بار پانچویں خاوند نے مارا تو
ساعت جاتی رہی۔
مقدس مقامات پر جانے کی شوقین
گپ شپ کی عادی۔
محبت کے قدیم فن سے آشنا

رقص سے پوری طرح آگاہ۔
کھل کر ہنسنے کی عادی۔

نواب

عادتیں نوابانہ۔
گھوڑوں کا شوقین
مصر، سپین اور افریقہ میں کئی جنگیں لڑیں۔
اس لئے نواب کہلاتا ہے۔

نواب کا بیٹا

عمر 20 سال، شرمیلا، بہادر
بہادری سے متاثر ہو کر ایک لڑکی عاشق ہوگئی۔
جس کا چہرہ گلاب۔
مئی کے دن کی طرح روشن۔

سوداگر THE MERCHANT

داڑھی گھنی، سر پر ہیٹ، گھوڑا مضبوط اور خوبصورت۔

چاسر نے اس طرح ان تمام زائرین کے حلیے بیان کئے ہیں۔ لیکن ان سب میں THE WIFE OF BATH کا کردار سب سے مقبول کردار ہے۔ یہ کردار عالمی شہرت رکھتا ہے اور اسے زندہ کرداروں میں تصور کیا جاتا ہے.........ان سب کرداروں کی سنائی ہوئی کہانیاں ان کرداروں کے بیان کئے گئے خدوخال کے عین مطابق ہیں۔ مثال کے طور پر MILLER جو کہانی سناتا ہے اُس میں اناج چرانے کا ذکر ہے لیکن اُس کے جرم کی سزا اسے یہ ملتی ہے کہ اُس کی بیوی کے ساتھ ایک کردار جنسی فعل سرزد کرتا ہے.........چاسر کی ان کہانیوں میں فحاشی کے عناصر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ جب بھی کہیں ادب میں فحاشی کی بحث چھڑتی ہے تو چاسر کی کہانیوں کا ذکر ضرور آتا ہے اور پھر چاسر کی اس خامی کو REALISM کا نام دے کر اچھائی میں بدل دیا جاتا ہے۔

''کنٹربری ٹیلز'' کی اہم ترین صفت کرداروں کا وہ لب ولہجہ ہے جو قرونِ وسطیٰ کے لوگوں کا لب ولہجہ تھا ہماری کہانیوں میں کامیڈی آف ایکشن کی فضا طاری رہتی ہے۔ راستے میں سفر کے دوران جس طرح وہ ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جو ان کی بات چیت ہے۔ وہی ان کہانیوں کی جان ہے۔ ہر کردار کے لئے جو کہانی چاسر نے منتخب کی ہے وہ اس کردار کی زندگی، ماحول اور رہن سہن کو ظاہر کرتی ہے۔ زائرین کا سفر جاری رہتا ہے۔ گھوڑے ہنہناتے رہتے ہیں۔ کاٹھیوں پر تلواروں کے دستے بجتے رہتے ہیں ہاؤ ہو کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ چاسر کے کردار کہانیاں کہتے رہتے ہیں۔ چاسر کی ان کہانیوں میں کچھ مذہبی کہانیاں ہیں کچھ جنسی۔ کچھ بہادری کی کہانیاں ہیں اور کچھ جذباتی۔ کچھ کہانیوں میں چرچ کی نیکی ہے کچھ میں بدی اور دنیاداری کی جھلک ہے۔ کچھ کہانیوں میں عورتوں کی شرم وحیا ہے کچھ میں عورتوں کے خفیہ راز ہیں۔ لیکن ان سب میں چاسر کا اسلوب، بیانیہ اور شعری حُسن (متروک زبان کے باوجود) انتہائی عروج پر ہے۔ اِس لئے 800 سال پہلے لکھی یہ کہانیاں آج بھی زندہ ہیں۔

بقول ڈاکٹر (L.K. PEARCE)

''چاسر کی فنکارانہ ہنرمندی، اس کا اسلوب بیان، کردار نگاری، شعری موسیقیت، انسانی نفسیات پر عبور، مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ طرزِ احساس۔ ان سب چیزوں نے اس کی کہانیوں کو منفرد اور بے مثال بنا دیا ہے۔ مزاح اور سنجیدگی کے ملاپ نے ان میں ایک حسن پیدا کر دیا ہے۔ زندگی کے بھرپور مشاہدے اور تجربے نے انہیں جاندار بنا دیا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر چاسر کو نہ صرف انگلستان بلکہ عالمی سطح پر ایک عظیم شاعر تصور کیا جاتا ہے۔
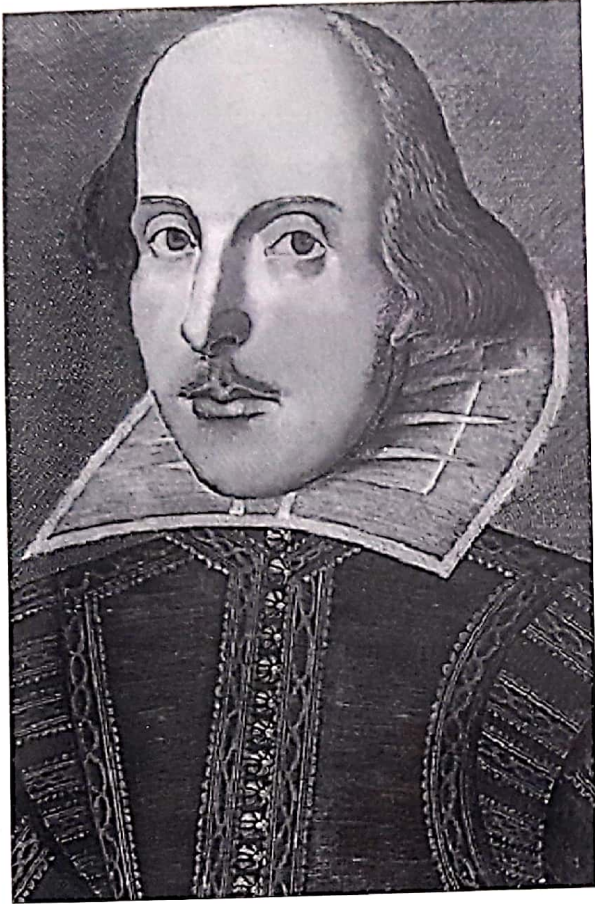
شیکسپیئر

(Shakespeare)

انگریزی زبان کا واحد شاعر، ڈرامہ نویس جسے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ سترہویں صدی میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے اب تک اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ اسے انگریزی زبان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

He was Not for Age, but for all Time.

(ڈاکٹر جانسن)

....

تھیٹر میں قلی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ پھر گھوڑوں کا سائس بنا، آہستہ آہستہ اداکاروں کا ناظم بن گیا۔ پھر قلم ہاتھ میں تھاما، ڈرامے لکھنے لگا۔ بہت عذاب جھیلے مگر ہمت نہ ہاری ڈرامہ نویسی جاری رکھی اور مشہور ڈرامہ نگار بن گیا۔

....

Lief is but a Walking Shadow ,
A Poor Player , It is a Tale
Told by an Idiot , Full o Sound and
Fury Signigeying nothing.

(ڈرامہ میکبتھ سے)

ولیم شیکسپیئر

ولیم شیکسپیئر شاید انگریزی زبان کا واحد شاعر ہے جسے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا گیا۔ جس کے ڈراموں کے سب سے زیادہ تراجم ہوئے، جس نے انسانوں کی نفسیات، محبت، ہمدردی، دشمنی، دکھ اور سکھ کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا جس کی عظمت کو دنیا کے سب ادیبوں اور شاعروں نے تسلیم کیا بس دو بڑے ادیب تھے جنہوں نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا۔ دونوں کا تعلق روس سے تھا۔ ایک ٹالسٹائی اور دوسرا دوستوئیفسکی۔

ٹالسٹائی کو تو شیکسپیئر نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ ٹالسٹائی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں نے شیکسپیئر کو 15 سال کی عمر میں پڑھا تو مجھے وہ بس یوں سا ادیب دکھائی دیا۔ 70 سال کی عمر میں جا کر میں نے سوچا کہ اسے دوبارہ پڑھا جائے تا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکوں۔ میں نے جب اسے دوبارہ پڑھا تو بھی اپنا فیصلہ نہ بدل سکا۔

دوستوئیفسکی کو شیکسپیئر پسند تو تھا مگر اسے وہ ایک ایسا شاعر کہتا تھا جس کے ہاں بہت غلطیاں تھیں اور یہ اس لئے تھیں کہ اس نے لکھتے ہوئے محنت نہیں کی۔ دوستوئیفسکی 31 مئی 1859ء کو لکھے اپنے بھائی کے نام خط میں کہتا ہے۔

"پشکن نے اپنی شاعری کی بہت کانٹ چھانٹ کی، بہت محنت کی لیکن شیکسپیئر اپنے لکھے کی کانٹ چھانٹ نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے اس کے ہاں بے شمار غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ کاش اس نے اپنے کام پر محنت کی ہوتی۔"

ٹالسٹائی اور دوستوئیفسکی کا ذکر میں نے شیکسپیئر کے سلسلے میں صرف مضمون کا ذائقہ بدلنے کے لیے کر دیا۔ یہ سورج اور چاند کی آپس کی لڑائی ہے۔ دونوں بے شک شیکسپیئر کے بارے میں جو بھی رائے رکھتے ہوں لیکن اسکی عظمت اور شاعرانہ وسعت کے یقیناً قائل ہونگے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کے دُکھ سُکھ کا جتنا احاطہ شیکسپیئر نے کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھنے والے کو اس کے ڈراموں میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ انسانوں کی ایک بڑی تعداد اس کے قارئین میں شمار ہوتی ہے۔ دنیا کی تمام لائبریریوں کا ایک خاص حصہ اس کے نام اور کام کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے ڈراموں پر بے شمار کتابیں لکھی گئی۔ بہت تنقیدی کام ہوا۔ اس کے ڈراموں پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد اس کے ڈراموں سے یقیناً ہزار گنا زیادہ ہوں گی۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ اس کی زندگی اور اس کے حالات پر دو ڈھائی صفحات سے زیادہ مواد دستیاب نہیں ہوتا۔

شیکسپیئر کی زندگی کے حالات کے بارے میں بہت سے ابہام ہیں۔ اس کے بارے میں لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا کہ وہ ایک زمیندار کا ہرن چراتا ہوا پکڑا گیا یا یہ کہ جب وہ لندن آیا تو پہلا کام اسے یہ ملا کہ اسے گھوڑوں کی دیکھ بھال کے لیے سائس بنا دیا گیا۔ یہ سب کچھ شاید اس لیے ہوا کہ ڈراما نگار کی حیثیت اس زمانے میں بس یہ تھی کہ وہ ڈراما لکھ کر دے دے۔ ریہرسل کے وقت موجود رہے اداکاروں کے تلفظ کی طرف دھیان دے۔ کوئی پبلشر اس کے ڈرامے کو چھاپنے پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوتا تھا جب تک کوئی امیر، رئیس یا پیسے والا اس ڈرامے کو سپانسر نہیں کرتا تھا۔

ڈراما نگار کی سوانح عمری چھاپنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ڈراما نگار کی زندگی کے حالات زیادہ تر اندھیرے ہی میں رہتے تھے۔ شیکسپیئر کو یہ دن بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا کہ اس کے ڈرامے اس کی زندگی میں چھپ سکیں۔ شیکسپیئر کی موت کے سات سال بعد اس کے دو اداکار دوستوں ہنری کونڈل اور جان ہیمنگ نے اس کے دو ڈرامے چھپوا کر مارکیٹ میں پیش کیے۔ اور ٹھیک سو سال بعد باقاعدہ سوانح عمری چھپ کر لوگوں تک پہنچی۔

ولیم شیکسپیئر 23 اپریل 1654ء کو جان شیکسپیئر کے گھر سٹیفورڈ میں پیدا ہوا۔ ماں کا نام میری آرڈن تھا۔ اس کی چار بہنیں اور تین بھائی اور بھی تھے۔ شیکسپیئر کو ڈرامے دیکھنے اور ڈراما لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اس کے گاؤں میں جب ڈراما دکھانے نوٹنکی آتی تھی تو وہ بہت شوق سے دیکھنے جاتا تھا اداکاروں کے بولے ہوئے مکالمے تنہائی میں دہراتا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ گھر چھوڑ کر نوٹنکی والوں کے ساتھ بھاگ جائے۔

اس کا باپ پیشے کے لحاظ سے قصاب تھا۔ سنا ہے کہ ایک بار اس نے ایک جانور کو ذبح کرنے کی کوشش کی۔ چھری چلانے سے پہلے ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دی۔ یہ وہ مکالمے تھے جو اس نے تھیٹر کے اداکاروں سے سنے تھے۔ جانوروں پر چھری چلانے کا شاید یہ اس کا آخری موقع تھا۔

شیکسپیئر کے لیے 13 کا ہندسہ منحوس ثابت ہوا کیونکہ 13 سال کی عمر ہی میں اسے سکول سے اٹھا لیا گیا۔ غربت اور مفلسی نے اس کی تعلیم کا راستہ روک لیا۔ 18 سال کی عمر میں اس نے جین ہیتھوے سے شادی کر لی۔ یہ شادی اگرچہ اس کی مرضی کے خلاف تھی لیکن اسے یہ شادی اس لئے کرنا پڑی کہ سسرال والوں نے اس کے مالی حالات بہتر کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ شادی کے بعد اس نے بیوی سے جوں توں گزارا کیا۔ ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ بنا اور پھر بھاگ کر لندن چلا گیا۔ تھیٹر کمپنیوں میں چھوٹے موٹے کئی کام کیے۔ اداکاری کا شوق تھا۔ چھوٹے موٹے کردار کر کے ایکٹروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ قلی سے کام شروع کیا تھا آہستہ آہستہ اداکاروں کے گروپ کا ناظم بن گیا۔ پھر قلم ہاتھ میں تھاما اور ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔ اس کام میں اس نے بہت عذاب دیکھے مگر ہمت نہ ہاری۔ 1603 میں اپنا نام ایکٹروں کی اس فہرست میں درج کرا ہی لیا جو بادشاہ وقت جیمز اول کے منظورِ نظر تھے۔ ڈرامانویسی جاری رکھی اور پھر وہ مشہور ڈراما نگار بن گیا۔

ولیم شیکسپیئر انگریزی زبان کا سب سے بڑا شاعر اور ڈراما نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری نے اس کے ڈراموں کو حسن بخشا۔ اسی شاعرانہ ڈرامے کی بدولت اسے ساری دنیا میں عظمت حاصل ہوئی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کا کہنا ہے:

For the Greates Drama is a Poetic Darama, and Damatic Defacts can be Compensated by Poetic Excellence.

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا خیال ہے کہ اپنی خوبصورت شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر شیکسپیئر جی۔ بی۔ شا اور ابسن سے بڑا ڈراما نولیس ہے۔ وہ ایک عہد کا ڈرامانولیس نہیں آنے والے تمام عہدوں کا ڈرامانولیس ہے۔

بقول ڈاکٹر جانسن " He was not of an age , but for all Time."

شیکسپیئر صرف انگلینڈ کے لوگوں کا شاعر یا ڈرامانولیس نہیں پوری انسانیت کا نمائندہ ڈرامانولیس ہے۔ وہ زندگی کا شاعر ہے۔ وہ زندگی کے حسن اور بدصورتی کا لکھاری ہے۔ وہ اپنے ڈرامے Hamlet میں ہیملٹ کی زبانی کہتا ہے:

What a Piece of Work is Man .

In From , in Moving , How express and Admirable in Acton , Now Like A God.

The Beauty of The World , The Paragon of Animals.

انسان کا رویہ بدل جاتا ہے۔ اقدار بدل جاتی ہیں۔ ادب کے معیار بدل جاتے ہیں۔ ہر عہد کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ شیکسپیئر ہر عہد، ہر مزاج اور ہر انسان کے مزاج پر پورا اترتا ہے۔ ہر عہد اسے اپنا عہد سمجھتا ہے۔ ہر ملک کا شہری اسے اپنا شاعر اور ہر آدمی اسے اپنے اندر کے دُکھ کا نمائندہ سمجھتا ہے۔

ایک بار آکسفورڈ میں ایک مطالعاتی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں ایک وفد چین سے بھی آیا۔ ایک چینی ادیب نے شیکسپیئر کا ڈراما ہیملٹ (Hamlet) دیکھا اور ڈراما دیکھ کر کہنے لگا:

''ہیملٹ کے تمام مسائل میرے مسائل ہیں۔ یقیناً ہیملٹ چین کا باشندہ ہوگا۔''

شیکسپیئر نے ساری حدیں پار کر لی ہیں۔ وہ اب صرف انگلستان کے لوگوں کا شاعر نہیں رہا بلکہ انسانوں کا شاعر بن گیا ہے۔

ولیم شیکسپیئر نے شاعری کی اور ڈرامے لکھے اس کے ڈرامے شاعری ہی کا دوسرا روپ ہیں۔ اس کے ڈرامے الزبتھ عہد کی روایات، جذبات اور انسانوں کے آئینہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ بات درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیئر تمام علاقائی سرحدیں عبور کر کے ساری دنیا کے انسانوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور بین الاقوامی سچائیوں کا نمائندہ ڈراما نگار بن گیا ہے۔

شیکسپیئر انسان کی زندگی، ان کے دکھ درد، ان کی خوشیاں، خوبیاں، کمزوریاں، سازشیں، نفرت، دوستی کو اپنے ڈراموں کا حصہ بناتا ہے۔ وہ ڈراما لکھتے ہوئے انسانوں پر اپنے فیصلے صادر نہیں کرتا۔ نہ وہ کسی اصلاحی تحریک کے تحت لکھتا ہے نہ وہ کوئی ٹیچر یا تبلیغ کرنے والا آدمی ہے۔ وہ تو انسانوں کو ہنستے، گاتے، روتے اور دکھ سہتے دکھاتا ہے۔ وہ ہمیشہ انسانوں سے محبت کے انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔ نہ ان کی حماقتوں پر ہنستا ہے نہ ان کے جرم کو اچھالتا ہے۔ وہ انسانوں کو باوجود ان کی کمینگیوں اور برائیوں کے محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ شیکسپیئر زندگی کا ڈراما نگار ہے۔ اس کے ڈراموں میں مرکزی حیثیت زندگی کو حاصل ہے۔ (ظاہر ہے یہ کرداروں کے حوالے سے ہے) اس کے کامیڈی ڈراموں کے کردار زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ صرف ٹریجڈی ڈراموں میں کچھ کردار زندگی سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ دکھ پچھتاوے اور کرب ان کی زندگی کے لیے عذاب بن چکے ہیں۔ مثلاً لیڈی میکبتھ کا کردار۔ زندگی کے بارے میں یوں ہمکلام ہوتا ہے:

"Out Out Brief Candle.

Life is But a Walking Shadow, A Poor Player. it is a Tale.

Tolo by an Idiot , Full of Sound and Fury Signifying Nothing."

شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں میں مندرجہ ذیل ڈرامے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں:

1۔ ہنری ہشتم (تین حصے)
2۔ مرچنٹ آف وینس
3۔ کنگ جان

4۔ ٹیمنگ آف شریو
5۔ ایز یولائیک اِٹ
6۔ ہیملٹ
7۔ کنگ لیئر
8۔ جولیس سیزر
9۔ میری وائیوز آف ونڈسٹر
10۔ اوتھیلو
11۔ رومیو اینڈ جیولٹ
12۔ میکبتھ
13۔ ٹویلوتھ نائٹ
14۔ دی ٹمپسٹ
15۔ ونٹرز ٹیل
16۔ انتھونی اینڈ قلوپطرہ
17۔ کامیڈی آف ایررز
18۔ مچ اوڈو اباؤٹ نتھنگ
19۔ لوز لیبر لاسٹ
20۔ اے مڈسمر نائٹ ڈریمز

شیکسپیئر کے ڈراموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (1) تاریخی ڈرامے۔ جن میں رچرڈ II اور رچرڈ III۔ ہنری ہشتم (تین حصے)، جولیس سیزر۔ انتھونی اور قلوپطرہ آتے ہیں۔ ٹریجڈی ڈرامے جس میں کنگ لیئر، ہیملٹ، اوتھیلو اور میکبتھ کے نام آتے ہیں۔ ڈراموں کا تیسرا حصہ شیکسپیئر کے کامیڈی ڈرامے ہیں۔ جن میں مرچنٹ آف وینس، رومیو اینڈ جیولٹ، ٹیمنگ آف دی شریو۔ میری انفرز آف ونڈسٹر، ٹویلوتھ نائٹ، ونٹرز ٹیل، کامیڈی آف ایررز، اے مڈسمر نائٹ ڈریمز، لوز لیبر لاسٹ کے نام آتے ہیں۔

اپنے المیہ ڈراموں میں شیکسپیئر نے یونانیوں کے تصور المیہ کے کسی اصول کو مدنظر نہیں رکھا اور نہ ہی اس نے المیہ کے بارے میں کوئی اپنے اصول بنائے ہیں۔ یونانیوں کے تھیٹر میں 30 ہزار مرد اور عورتیں ایک وقت میں ڈراما دیکھنے آتے تھے، موسیقی کے وہ فن پارے سننے آتے تھے جو ان کی روح کو اپنے قبضے میں لے کر اس مذہبی عقیدے کی گرفت میں رہنا چاہتے تھے جو انہیں اپنا اسیر بنالے۔ وہ ٹریجڈی میں رونما ہونے والے ایکشن کے منتظر رہتے تھے۔ جو ان کے دل اور روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ ایسے شاندار لباس اور آرائش جو ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دے۔ تھیٹریکل اثرات، مناظر کے علاوہ مذہب کا جذبہ بھی تھا جو انہیں بٹھائے رکھتا تھا۔ خوف، ڈر اور دہشت ان لوگوں کی تطہیر جذبات کا باعث بنتے تھے۔ یہ سب کچھ شیکسپیئر کے المیوں میں نہ تھا۔ یونانی المیہ میں پلاٹ کو بہت اہمیت حاصل تھی جبکہ شیکسپیئر کے المیہ میں سب سے زیادہ اہمیت کردار کی تھی۔ ہیملٹ، کنگ لیئر، اوتھیلو، میکبتھ، جولیس سیزر، قلوپطرہ، کنگ جان کے کردار اس بات کی

وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کا فرداً فرداً تجزیہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر ڈرامہ کسی نہ کسی انسانی جذبے کی ترجمانی کرتا ہے۔ کہیں دوستی کے جذبے کو سراہا گیا ہے کہیں انسان کے اندر زہر کی طرح پھیلتے لالچ کی عکاسی ہے۔ کہیں محبت میں شک کی دیمک دکھائی گئی ہے جو عاشق اور محبوب دونوں کی جان لے لیتی ہے۔ کہیں عمل اور بے عملی کے بھنور میں گھرے انسان کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جسے انتقام ہر پل پریشان رکھتا ہے لیکن جب انتقام لینے کا موقع آتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں اٹھتا۔ شیکسپیئر کا ہر ڈراما دنیا کے ہر انسان کے باطنی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی لئے شیکسپیئر کو عالمی شاعر اور ڈرامانگار کہا جاتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کی اکثر کہانیاں پہلے سے مشہور گویوں (Bards) کے ذریعے گلی گلی پھیل چکی تھیں لیکن اس عظیم ڈرامانگار نے جب انہیں اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا تو انہیں لافانی بنا دیا۔ مثال کے طور پر وہ کہانیاں جو تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں صرف تاریخ کا حصہ تھیں لیکن جب شیکسپیئر نے ان پر ڈرامے لکھے تو وہ گھر گھر پھیل گئیں۔

شیکسپیئر کا مشہور زمانہ ہیملٹ بھی اسی قسم کی کہانی ہے۔ بارہویں صدی کے ایک محقق نے اس کہانی کو ایک سچی کہانی قرار دیا ہے۔ اس واقعہ کو شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا اور یہ ڈراما لیجنڈ کی صورت اختیار کر گیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بالکل اس سے ملتا جلتا قصہ یونانی ڈراموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسکائی لیس کا ڈراما ''آگامم نان''، ''الیکٹرا'' اور ''اورسٹیز'' تینوں ڈراموں میں پھیلی ہوئی کہانی ایک ہو جائے تو شیکسپیئر کا ہیملٹ بن جاتا ہے۔ آگامم نان جب ٹرائے سے واپس آتا ہے تو اس کی بیوی کلائیٹم نسٹرا اپنے عاشق سے مل کر اسے قتل کر دیتی ہے۔ الیکٹرا اس کی بیٹی اور چھوٹا بیٹا اورسٹیز یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ اورسٹیز محل سے چلا جاتا ہے۔ جوان ہو کر واپس آتا ہے اور اپنے باپ کا انتقام اپنی ماں اور اس کے عاشق کو مار کر لیتا ہے۔ ہیملٹ میں بالکل یہی کہانی ہے۔ ہیملٹ جب اپنی ریاست میں واپس آتا ہے تو تخت پر اپنے باپ کو بیٹھا دیکھتا ہے۔ باپ کا بھوت ہیملٹ کو ساری کہانی سناتا ہے۔ وہ باپ کا انتقام لینا چاہتا ہے لیکن انتقام لینے میں ناکام رہتا ہے۔

شیکسپیئر کسی نہ کسی حوالے سے یونانی ڈرامے سے اثر قبول ضرور کرتا ہے۔ چاہے وہ کرداروں کی تشکیل کا سلسلہ ہو یا ماحول اور فضا کا۔ مثلاً اسکائی لیس کا ڈراما آگامم نان دیکھئے، آغاز میں ڈر، خوف کی ایک کیفیت ہے جو ہر طرف طاری نظر آتی ہے اور شروع ہی میں محسوس ہوتا ہے کہ محل میں کچھ ہونے والا ہے اور پھر محل میں کلائی ٹم نسٹرا اور اس کے عاشق کی منصوبہ بندی سے آگامم نان کا قتل ہو جاتا ہے۔ اب ذرا شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ پر نظر ڈالیں، ڈراما شروع ہوتا ہے تو چڑیلوں کی ملاقات ایک سازش اور منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میکبتھ کے محل میں موت کا سایہ اسی طرح گردش کرتا نظر آتا ہے۔ جس طرح اسکائی لیس کے ڈرامے آگامم نان میں موت دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح میکبتھ کی سازش بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

شیکسپیئر 1564ء میں پیدا ہوا، 30 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے سب سے بڑا ڈرامانویس بن گیا۔ 20 سال اس نے ڈرامے لکھے اور گھر واپس اپنے گاؤں سٹیفورڈ واپس آ گیا۔ لندن رہ کر بھی گاؤں کو نہ بھولا۔ 1606ء میں جب 52 سال کا ہوا تو فوت ہو گیا۔ شیکسپیئر لندن میں رہا تو طربیہ ڈرامے لکھتا رہا۔ وراثت اور جانشینی اور دوسرے ہلکے پھلکے موضوعات کو ڈرامے میں سموتا رہا۔ آخری سالوں میں شیکسپیئر نے ان ڈراموں کی طرف توجہ دی جو اس کے عظیم المیے بن کر دنیا کے

سامنے آئے جن میں زندگی مصیبت اور آفت سے نبرد آزما نظر آتی ہے جن میں ایک وقار بھی ہے اور شان و شوکت بھی، بلند خیال بھی ہے اور فکر کی عظمت اور گہرائی بھی۔ ان ڈراموں میں ہمیں کردار، خوف، آزمائش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان ڈراموں میں چار نام نظر آتے ہیں:

1۔ ہیملٹ
2۔ اوتھیلو
3۔ میکبتھ
4۔ کنگ لیئر

کنگ لیئر کا موضوع بوڑھے والدین اور نافرمان اولاد کے گرد گھومتا ہے۔ اس ڈرامے میں ان والدین کو موضوع بنایا گیا ہے جو اپنی اولاد کو پہچاننے میں ذرا سی غلطی کرتے ہیں اور پھر اس کی سزا بھگتتے ہیں اس اولاد کو عاق کر دیتے ہیں جو ان سے حقیقت میں محبت کرتی ہے۔ جبکہ اس اولاد پر محبت اور دولت نچھاور کر دیتے ہیں جو بناوٹی محبت کا اظہار کر کے والدین کی نوازشات سے جھولیاں بھر لیتے ہیں اور پھر والدین انہی کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

اس ڈرامے میں شیکسپیئر کے دو پلاٹ کے گرد کہانی گھومتی ہے لیکن مرکزی کردار کنگ لیئر ہی کا ہے۔ ڈرامے میں دو بوڑھے آدمی کنگ لیئر اور ڈیوک گلوسٹر اپنی اولاد کے ہاتھوں ذلت اور خواری سے دوچار ہوتے ہیں۔

کنگ لیئر برطانیہ کا بادشاہ ہے۔ گونرل، ریگن اور کارڈیلیا اس کی بیٹیاں ہیں۔ تینوں شادی شدہ ہیں، بادشاہ تینوں بیٹیوں سے پوچھتا ہے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ دو بیٹیاں (گوندل اور ریگن) بناوٹی اور جھوٹے الفاظ کا سہارا لے کر مبالغہ آرائی سے کام لیتی ہیں اور بادشاہ کو یہی انداز بھا جاتا ہے۔ تیسری بیٹی کارڈیلیا۔ جو اپنے باپ سے سچی محبت کرتی ہے حقیقی انداز اختیار کر کے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے جو بادشاہ کو پسند نہیں آتا چنانچہ وہ کارڈیلیا کو اپنی بادشاہت سے ملنے والی ہر رعایت سے عاق کر دیتا ہے۔ دوسری بیٹیوں کو اپنی بادشاہت میں سے کچھ علاقے دے دیتا ہے۔ بادشاہ نے جب بیٹیوں سے پوچھا تھا کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتی ہیں تو انہوں نے جو جواب دیئے وہ دیکھئے۔

گونرل:۔ مجھے آپ سے جتنی محبت ہے میں الفاظ میں اظہار نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے بادشاہت سے زیادہ آنکھوں کی روشنی سے زیادہ، کائنات سے زیادہ، تمام انمول اور کمیاب چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ میں جتنی محبت آپ سے کرتی ہوں۔ آج تک کسی بچے نے اپنی ماں اور باپ سے نہیں کی ہوگی۔

پھر دوسری بیٹی ریگن کہتی ہے۔

ریگن:۔ میرا بھی یہی خیال ہے جو میری بہن کا ہے۔ اس نے میری محبت اپنی زبان سے بیان کر دی ہے۔ بس میں ہر خوشی سے بے نیاز ہوں۔ میری اصل خوشی آپ ہیں۔

کنگ لیئر دونوں بیٹیوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ سرسبز گھنے جنگل شاداب علاقے جن میں دریا اور ندیاں بہتی ہیں۔ ان دونوں بیٹیوں کو دے دیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی تیسری بیٹی کارڈیلیا سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے۔

کارڈیلیا بے حد مختصر الفاظ میں کہتی ہے۔

کارڈیلیا:۔ ابا حضور میں اپنے بدبخت دل کی بات لبوں تک نہیں لا سکتی۔ میں جہاں پناہ کو اتنا چاہتی ہوں جتنا میرا فرض ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ کم۔

کنگ غصے میں اسے دوبارہ سوچنے پر اور اپنی زبان اور الفاظ بدلنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن کارڈیلیا ایسا نہیں کرتی۔

کارڈیلیا:۔ آپ نے مجھے پیدا کیا، پرورش کی، میرے ساتھ محبت کی میں ان عنایتوں کا حق ادا کرتی ہوں۔ آپ کی تعظیم کرتی ہوں۔ اگر میری بہنوں کی ساری محبت اور ساری خوشی آپ کے لئے ہے تو انہوں نے شادی کیوں کی۔ میں اگر شادی کروں گی تو میری آدھی محبت میرے خاوند کے لیے ہوگی۔

کنگ لیئر۔ کیا تم یہ دل سے کہہ رہی ہو۔

کارڈیلیا:۔ دل سے کہہ رہی ہوں۔

لیئر:۔ کیا تم اتنی بے درد ہو۔

کارڈیلیا:۔ سچائی یہی ہے جہاں پناہ

کنگ لیئر:۔ تو پھر یہی سچائی تمہارا جہیز ہے۔

اور پھر کنگ لیئر اسے عاق کر دیتا ہے اور دوسری بیٹیوں کو دولت، علاقے سے نوازتا ہے۔ حکومت، خزانہ، سارے امور سلطنت اور تاج دونوں بیٹیوں میں بانٹ دیتا ہے۔

اور پھر حالات بدلتے ہیں بہت سے نشیب و فراز کے بعد یہی کنگ لیئر اپنی دو چہیتی بیٹیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر اپنی ''عاق شدہ'' بیٹی کارڈیلیا کی محبت کی پناہ میں آتا ہے۔ جو اس پاگل، نڈھال اور مصیبت زدہ باپ کو (جو بے وفا بیٹیوں کے بُرے سلوک سے مرنے کے قریب ہے) اپنی محبت کی بانہوں میں لیتی ہے اور کہتی ہے۔

کارڈیلیا: اگر آپ ان کے باپ نہ ہوتے تو آپ کے یہ برف جیسے سفید بال میری بہنوں کی نگاہ میں رحم کے مستحق ہوتے کیا یہ نورانی چہرہ اس لائق تھا کہ غضب ناک ہواؤں کے تھپیڑے کھائے یا دل دہلا دینے والی گرج اور تیز لہرائی ہوئی بجلیوں کے صدموں کا مقابلہ کرے!

کنگ لیئر شرمندہ ہے اسے پچھتاوا ہے جب جنگ میں کارڈیلیا کو پھانسی دے دی جاتی ہے تو کنگ لیئر بھی اس کے پہلو میں دم توڑ دیتا ہے۔

کنگ لیئر:۔ میری بھولی بچی کو پھانسی دے دی گئی۔ اس میں بالکل جان باقی نہیں رہی۔ پھر کسی کتے، کسی گھوڑے، کسی چوہے میں جان کیوں باقی ہے۔'' کنگ لیئر بھی دم توڑ دیتا ہے۔ کنگ لیئر کے ساتھ دوسرا بوڑھا گلوسٹر ہے جس کا انجام کنگ لیئر سے بھی زیادہ عبرتناک ہے وہ ایڈگر اور ایڈمنڈ کا باپ ہے۔ ایڈمنڈ اس کا ناجائز بیٹا ہے۔ گلوسٹر کی آنکھیں نکال کر پیروں سے مسل دی جاتی ہیں اور وہ شیکسپیئر کے لافانی الفاظ بڑبڑاتا ہوا دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

''دیوتاؤں کے ہاتھوں انسان کی وہی حالت ہے جو شریر لڑکوں کے ہاتھوں مکھیوں کی ہوتی ہے۔ یہ دیوتا اپنی تفریح اور کھیل کے لیے ہمیں مٹا دیتے ہیں۔''

شیکسپیئر کے اس لافانی ڈرامے نے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ فرانسیسی ناول نگار بالزک نے اسی ڈرامے کے پلاٹ کو بنیاد بنا کر اپنا لافانی ناول ''بوڑھا گوریو'' لکھا۔

شیکسپیئر کے ہر ڈرامے کے تجزیے کے لیے ایک کتاب درکار ہے۔ کامیڈی ہو یا ٹریجڈی انسانی جذبات کی ایک روداد ہے۔ شیکسپیئر نے قارئین کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کی ہزاروں سطریں ضرب الامثال بن چکی ہیں۔ یونانی المیہ نگاروں کے بعد شیکسپیئر واحد ڈراما نگار ہے جس نے انسانوں کے دکھ درد، جذبات، سکھ چین، محبت اور خوشی کو اپنے

ڈراموں میں پیش کیا۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں شیکسپیئر کا بار بار ترجمہ نہ ہوا ہو اور شاید دنیا کا کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں جو اس کے نام سے واقف نہ ہو۔ شیکسپیئر واحد ڈراما نگار ہے جو گزرے کل کی طرح آج بھی زندہ ہے اور آنے والا کل بانہیں پھیلا کر اس کا سواگت کر رہا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ

"He was not of an Age. but for all Time."

ایس۔ٹی۔کولرج

(Samuel Taylor Coleridge)

18 ویں صدی کا مشہور انگریزی شاعر، نقاد، رومانوی تحریک کا اہم رکن تحیر، طلمسی ماحول، مافوق الفطرت عناصر، فطرت کا حسن، غنائیت، اس کی شاعری کے اہم عناصر ہیں۔ بہت کم لکھا، مگر بہت شہرت حاصل کی۔

''انگریزی شاعری کے جتنے بھی شاہکار نمونے ہیں ۔ ان میں کولرج کی ''قبلائی خان''، ''کرسٹابل'' اورThe Ancient Marinerc اعلیٰ ترین شاہکار ہیں۔''

(M.C.Bowra)

....

رات یخ بستہ ہے، جنگل میں کوئی پتا نہیں
کیا ہوا کی ہے یہ دردو کرب سے بوجھل صدا
یہ ہوا ساکت ہے اس میں اتنی بھی جنبش نہیں
کہ خم کاکل کو وہ ہلکی سی لرزش دے سکے
اس نے دیکھی ایک دوشیزہ پس شاہِ بلوط
دودھیا ریشم کا تھا ملبوس اس کے زیب تن
جھلملاہٹ چار سو پھیلی تھی جس کی رات میں
اس کی گردن سے جھلکتا تھا قبا پر زرد رنگ
مرمریں گردن، حسین بازو تھے عریاں اور وہ
پابرہنہ تھی، رگیں نیلی تھیں اس کے پاؤں کی

(کرسٹابل)

الیس۔ٹی۔کولرج

شوق بڑا ہو یا اچھا جنون بن جائے تو اچھے بھلے آدمی کو لے ڈوبتا ہے اور آدمی کہیں کا نہیں رہتا اور اگر شوق بچپن ہی سے جنون بن جائے تو پھر ڈوبنے کا عمل بچپن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ کولرج کے ساتھ یہی انہونی ہوئی۔ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اور کتابیں بھی الف لیلیٰ جیسی۔ باپ پادری تھا' ایسی کتابوں کے سخت خلاف تھا۔ چنانچہ وہ کولرج کو اصول وقواعد اور مذہبی خیالات کے دائرے میں رکھنا چاہتا تھا۔ وقت پر گھر آؤ' یہ کرو' وہ نہ کرو' یہ پڑھو' یہ نہ پڑھو اور اسی پر مار پیٹ ہوتی اور کولرج ہر پل خوف زدہ رہتا۔

ایک دن ''الف لیلیٰ'' کا ترجمہ اس کے ہاتھ آ گیا۔ وہ کتاب لے کر گھر سے باہر چلا گیا۔ کتاب پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی۔ اس پر باپ کی مار کا ڈر کپکپی بن کر طاری ہو گیا وہ گھر نہیں گیا۔ گھر سے باہر ایک باغ میں بیٹھا رہا۔ ساری رات برفباری ہوتی رہی اور وہ کتاب بغل میں دبائے ساری رات آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہا اور جوڑوں کا لاعلاج درد اس کی ہڈیوں میں رچ بس گیا اور ساری زندگی اس کے ساتھ ساتھ رہا۔

سیموئل ٹیلر' کولرج 1772ء میں انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں اوٹرے (Ottery) میں پیدا ہوا' جہاں اس کا باپ پادری تھا۔ دس سال کا تھا تو اس کا باپ مر گیا۔ کولرج کو ایک خیراتی طالب علم کی حیثیت سے کرائسٹ سکول لندن پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس زمانے کے ماسٹروں کی طرح تنگ نظر نہ تھا۔ اس نے کولرج کے اندر جھانک کر اس کے تخلیقی جوہر کو پہچانا اور شاعری اور فلسفے کے مطالعے میں اس کی رہنمائی کی۔ چارلس لیمب (جو بعد میں انگریزی زبان کا ایک نامور ادیب بن کر ابھرا) سے اس سکول میں اس کی ملاقات ہوئی۔

16 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس میں بڑی ادبی اور فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کی بہن مر گئی جس کی موت کا اس نے بڑا اثر قبول کیا۔ ایک خوبصورت لڑکی میری ایونز (Mary Evans) سے عشق ہو گیا مگر ناکامی ہوئی۔ انقلاب فرانس نے اس کے ذہن میں ایک ہلچل مچا دی۔ 1789ء میں کیمبرج پڑھنے گیا تو شاعر (Southey) سے دوستی ہوگئی۔ اس کی سالی سارا فریکر (Sarah Fricker) سے شدید محبت ہوئی۔ تعلقات مثبت ثابت ہوئے۔ کولرج نے 1795ء میں اس سے شادی کر لی......اور پھر ورڈز ورتھ سے دوستی ہوگئی جو ناقابل یقین تعلق میں بدل گئی۔ ورڈز ورتھ اسے اپنا ''روحانی بھائی'' کہتا تھا۔ لوگوں میں وہ ''دو بدن اور ایک روح'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔

کولرج کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ورڈز ورتھ سے ملاقات کے بعد ہوا۔ دونوں نے شاعری اور ادب پر بحث مباحثے کے بعد شاعری کے بارے میں نئے نظریات تشکیل دیئے اور پھر ان نظریات کے تحت موضوعات کا انتخاب کیا اور نظمیں لکھیں اور دونوں نے مل کر کتاب چھاپی جو انگریزی شاعری میں ایک اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے اور شاعری کا ایک نیا رخ متعین کرتی ہے۔ اس کتاب کا نام (Lyrical Ballads) ہے...... یہ زمانہ کولرج کی زندگی کا خوشگوار زمانہ تھا۔ یہ زمانہ اس نے Lake District میں گزارا۔ لیکن اس خوشگوار زمانے کی حیثیت میں افیون شیطان بن کر داخل ہوئی

اور کولرج کی جسمانی جنت کو جہنم بنا دیا۔ چھ سال کی عمر میں گھر سے باہر گزری رات اور برف باری نے اسے جوڑوں کا جو درد بخشا تھا اس نے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے اور کولرج نے جوڑوں کے درد سے بچنے کے لیے افیون کھانا شروع کر دی اور ساری زندگی اس سے جان نہ چھڑا سکا۔ اس بیماری کے دوران اس نے جرمنی کا دورہ کیا۔ واپس آ کر شیکسپیئر پر خطبات دیئے۔ ورڈز ورتھ کے ساتھ مل کر ایک رسالہ (Friends) نکالا' جب بیماری بڑھی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے ڈاکٹر (Gillman) پر چھوڑ دیا۔ ورڈز ورتھ سے تعلقات خراب ہو گئے۔ روحانی بھائی نے آنکھیں پھیر لیں۔ مالی مسائل بڑھ گئے۔ افیون نے مزاج پر اثر ڈالا وہ کاہل اور چڑچڑا ہو گیا۔ بیوی چھوڑ کر چلی گئی' پھر طلاق لے لی' یہ کولرج کے تابوت میں آخری کیل تھا۔ شاید اس کی زندگی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ انگریزی زبان کا یہ شاعر' نقاد' خوبصورت گفتگو کرنے والا' رومانوی تحریک کا اہم رکن 1834ء میں فوت ہو گیا۔

کولرج کی ساری زندگی حالات کی ستم ظریفی کی نذر ہو گئی۔

اس کی ساری جوانی افیون کی اُنگلی پکڑ کر گزری......اور یہی اسے لے ڈوبی کولرج کی زندگی کے تین بڑے المیے تھے۔ کمزور قوتِ ارادی' بُری صحت اور افیون کی عادت' ڈسٹرکٹ (Lake) کے بُرے موسم نے اس کی بیماری میں اضافہ کیا تو اس نے افیون کی مقدار بڑھا دی (اور یہ اس نے ورڈز ورتھ کے قریب رہنے کے لیے کیا) اور موت کے منہ میں چلا گیا......کولرج کی زندگی کے صرف دو سال تخلیقی زندگی کے سال تھے اور اسی عرصے میں اس نے شہرہ آفاق شاعری کی جس سے اسے آفاقی شہرت حاصل ہوئی۔

1) The Ancient Mariner

2) Kublai Khan

3) Christabl

یہ اس زمانے کی لکھی ہوئی نظمیں ہیں جو اس نے (Nether Stowey) میں اپنی بیوی سارا فریکر کے ساتھ گزارا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسے بیوی کا پیار بھی ملا۔ دوستوں کی محبت بھی ملی۔ ان چیزوں نے اس کی شاعرانہ اور تنقیدی قوتوں کو دو چند کر دیا اور جب یہ دونوں چیزیں اس کی زندگی سے غائب ہو گئیں تو وہ افیون کی کالی رات میں بھٹکتا رہا اور موت اسے دبوچ کر لے گئی۔

کولرج نے بہت کم شاعری کی اس کی ساری شاعری صرف 100 صفحات کی شاعری ہے۔ لیکن وہ ان سو صفحات کی شاعری کی بنا پر دنیا کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ کولرج نے نہ شیکسپیئر کا اسلوب اپنایا۔ نہ ملٹن کے نقشِ قدم پر چلا نا ورڈز ورتھ کی نقالی کی۔ اس نے اپنے اندر کی بات مانی۔ اس نے وہی لکھا جو اس کا اپنا تھا اور جس پر اس کی انفرادیت کی چھاپ تھی...... یہ اسلوب اس وقت بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا جب اس نے اپنی نظمیں مل کر ورڈز ورتھ کے ساتھ چھاپیں۔

ورڈز ورتھ اور کولرج نے Lyrical Ballads چھاپنے سے پہلے کچھ مسائل پہلے سے طے کر لیے تھے اور کچھ موضوعات کا انتخاب کر لیا تھا۔

ورڈز ورتھ نے روزمرہ زندگی میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات اور کرداروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان نظموں کی ایک سیریز یا لڑی بنالی۔ دیہاتوں میں رہنے والے کسان' بچے اور معصوم کرداروں کو اپنی نظموں میں پیش

کیا۔ مثلاً اس کی نظم (We are Seven) جس میں ایک بچی موت کے مفہوم سے بالکل لاعلم ہے۔ بچی جس کے دو بھائی مر چکے ہیں لیکن وہ ان کو بھی زندہ شمار کرتی ہے۔

پیارے جم (Jim) اس طفل سادہ کودک معصوم کو
کھینچتا ہو جو بدن میں سانس...... بے فکری کے ساتھ
جو رگ و پے میں کرے محسوس جینے کی......لگن
اس کو کیا معلوم کیا ہے موت کیا ہے...... زندگی
ترجمہ: احمد عقیل روبی

ورڈز ورتھ اس بچی کو گنتی گن کر بتلاتا ہے کہ دو بھائی مر چکے ہیں اور جنت میں ہیں اور تم کہتی ہو کہ ہم کل سات ہیں۔ لیکن بچی انہیں بھی زندہ تصور کرتی ہے اور کہتی ہے۔

''دونوں وہ جنت میں ہیں'' اب تم کہو میں نے کہا:
کتنے بھائی اور بہن تم لوگ باقی ہو......یہاں
سن کے بچی نے کہا برجستہ ''ہم سب سات ہیں''
''مر چکے ہیں دونوں وہ'' روحیں ہیں ان کی خلا میں
میرے یہ الفاظ سب بے کار تھے بے سود تھے
کیونکہ وہ قائم تھی' اپنی بات پر اس نے کہا
''یہ غلط' یہ جھوٹ ہے' ہم لوگ تو کل سات ہیں''
ترجمہ: احمد عقیل روبی

ورڈز ورتھ کی تمام نظمیں ایسے ہی معصوم کرداروں کے گرد گھومتی ہیں۔

کولرج نے اپنی شاعری کے لیے جو فضا جو ماحول منتخب کیا وہ حیرت' خوف اور تحیر سے بھرا جہان تھا۔ ایک جادو' ایک طلسم اس کی شاعری پر طاری ہے۔ مافوق الفطرت عناصر ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس فضا میں وہ رومانوی کرداروں کو تشکیل دیتا ہے اور حیرت کے در کھولتا نظر آتا ہے۔ چڑیلیں' بدروحیں' حیرت اور تحیر سے بھرے جنگلات اور اس فضا میں وہ جادو کا ایک جال بُن کر قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ وہ فضا ہے جس میں زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں...... ہماری اردو شاعری میں اس کی مثال منیر نیازی ہیں۔ جو حیرت زدہ ہوتا ہے اور حیرت زدہ کرتا ہے......خاموشی' تحیر' حیرت زدہ ماحول' ایک کے بعد طلسمی دروازہ' اُداس منظر میں ہنستی چڑیلیں' خوفزدہ کرنے والی دنیا۔ یہ سب کولرج کا جہان ہے۔ منیر نیازی کی شاعری اسی جہان کا ایک حصہ ہے......کولرج اپنی نظموں میں تحیر اور اسرار بھری دنیا دکھاتا ہے اپنے ہدف کی تفصیل نہیں دیتا۔ وہ خالص رومانوی اور حیران کن انداز میں خواب دیکھتا ہے اور قارئین کو خواب دکھاتا ہے۔ اس غیر معمولی اور رومانوی انداز نے اس کی ان نظموں کو انگریزی شاعری کا اعلیٰ شاہکار بنا دیا ہے......انگریزی زبان کا ایک مستند نقاد (C.M. Bowra) کہتا ہے:

''انگریزی شاعری کے جتنے بھی شاہکار نمونے ہیں ان میں کولرج کی قبلائی خان' کرسٹابل اور The Ancient Mariner اعلیٰ ترین رومانوی شاہکار ہیں۔''

کرسٹابل (Christabl) ایک ایسی بدروح' چڑیل کے بارے میں ہے جس کا نام جیرلڈین (Geraldine) ہے اور وہ لیولائن نواب کی بیٹی کرسٹابل کو رات کے 2 بجے جنگل میں ملتی ہے...... یہ ایک مافوق الفطرت عناصر میں لپٹی نظم

ہے۔لیکن کولرج نے ان تمام عناصر کو ایسے رومانوی انداز میں پیش کیا ہے کہ طلسمی اور جادوئی فضا میں رومانوی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔.....کرسٹابل رات کے پچھلے پہر اپنے عاشق کے لیے دُعا مانگنے جنگل میں جاتی ہے۔کولرج جنگل کی چپ، ساکت فضا کو اس طرح بیان کرتا ہے:

رات یخ بستہ ہے، جنگل میں کوئی پتا نہیں
کیا ہوا کی ہے یہ درد و کرب سے بوجھل صدا
پر ہوا ساکت ہے اس میں اتنی بھی جنبش نہیں
کہ خم کاکل کو وہ ہلکی سی لرزش دے سکے
وہ خم کا کل جو ہے مادام کے رُخسار پر   ترجمہ: احمد عقیل روبی

اور پھر کرسٹابل کو شاہِ بلوط کے پیچھے وہ بدروح چڑیل نظر آتی ہے۔جس کا نقشہ کولرج نے کچھ یوں کھینچا ہے۔

اس نے دیکھی ایک دوشیزہ پسِ شاہ بلوط
دودھیا ریشم کا تھا ملبوس اس کے زیب تن
جھلملاہٹ چار سو پھیلی تھی جس کی رات میں
اس کی گردن سے جھلکتا تھا قبا پر زرد رنگ
مرمریں گردن، حسین بازو تھے عریاں اور وہ
پا برہنہ تھی، رگیں نیلی تھیں اس کے پاؤں کی
اس کی بے ترتیب زلفوں میں سجے موتی گہر
جھلملاتے تھے، چمکتے تھے ستاروں کی طرح
ایک ماہ وش، خوبرو، خلعت تھی جس کی فاخرہ
اس کا یوں ملنا کسی خوف اور ڈر سے کم نہ تھا   ترجمہ: احمد عقیل روبی

اور پھر یہاں سے ایک جادو اور طلسم سے بھری کہانی شروع ہوتی ہے۔جیرالڈین اپنی داستانِ غم سناتی ہے کہ کس طرح پانچ شہسوار اسے اٹھا کر لائے اور یہاں پھینک کر چلے گئے۔کرسٹابل اسے باپ کا حوالہ دے کر کہتی ہے تم فکر نہ کرو میرے نواب باپ کے نوکر بڑے احترام سے تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آئیں گے۔تم میرے محل میں چلو.....کرسٹابل اس تھکی دوشیزہ کو محل میں لے آتی ہے۔قدم قدم پر تحیر سے بھرے عناصر رستہ روکتے ہیں۔چڑیل کو دیکھ کر اس کی پالتو کتیا چلاتی ہے۔حضرت عیسیٰ کا مجسمہ دیکھ کر چڑیل گھبراتی ہے۔کرسٹابل کی ماں کی روح اس چڑیل کا راستہ روکتی ہے۔چڑیل گرتی ہے،لڑکھڑاتی ہے مگر کرسٹابل اسے سہارا دیتی ہے اور اسے اپنے بیڈروم میں لے جاتی ہے۔

کرسٹابل اسے جنگلی پھولوں سے بنی شراب پلاتی ہے اور آرام کرنے کے لیے کہتی ہے۔جیرلڈین اسے کہتی ہے:''تم بھی میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔''

اپنے کپڑے تم اُتارو
لیٹ جاؤ میرے ساتھ
تا کہ میں مانوں دعا

جیرلڈین نے خود بھی کپڑے اُتارے اور پورے ماحول کو دیکھا۔

اپنی آنکھوں کو گھمایا اردگرد
سانس کھینچی زور سے
اپنی چھاتی کے جو نیچے تھی وہ پٹی کھولی دی
کرسٹابل کے سامنے عریاں کھڑی تھی جیرلڈین
اس نے کرسٹابل پہ ڈالی اک اُداسی کی نظر
اور سرگوشی میں اس سے یہ کہا
میرے سینے میں چھپا ہے ایک جادو کا اثر
کرسٹابل جو تیری گویائی پہ غالب آئے گا
کل بھی جانو گی اسے تم آج کی شب کی طرح
میری بدنامی کا دھبہ
ہوں گی ساری کوششیں بے سود اور ناکام، تم
دنیا والوں کو فقط اتنا ہی بتلا پاؤ گی
تم نے جنگل کے اندھیرے میں سنی تھی ایک آہ
اور ملی تھی تم کو اک دوشیزہ بے حد خوبرو
پیار اور اخلاص سے تم جس کو لے آئیں تھی گھر
ٹھنڈی جنگل کی ہواؤں سے بچانے کے لیے

یہ طویل نظم اپنی داستانی فضا حیرت اور خوف سمیٹے ہوئے ہے۔یہ ایک خوف اور حیرت سے شروع ہوتی ہے اور خوف حیرت پر ہی اس کا اختتام ہوتا ہے۔

کولرج کی دوسری نظم ''قبلائی خان'' Kublai Khan خوبصورت Images اور مضبوط اور مافوق الفطرت تخلیقات کی ایک انوکھی نظم ہے۔چنگیز خان اور ہلاکو خان کے جانشین قبلائی خان نے ایک خیالی جنت تعمیر کرنے کا نقشہ تیار کیا تھا کولرج نے ایک مضبوط شعری طاقت سے اسے نظم کی شکل دی ہے.....یہ نظم نامکمل نظم ہے۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ کولرج نے افیون کھا کر افیون کے سرور میں اس نظم کو شروع کیا اور لکھتا رہا جب نظم اپنے انجام تک پہنچنے والی تھی تو ایک ہندوستانی تاجر جو قالین بیچتا تھا اس کے پاس آگیا اور کولرج کو اس کیفیت سے باہر نکال دیا اور کولرج آخری دو مصرعے لکھ سکا۔

جن کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔ پہلے انگریزی کی دو لائنیں سن لیں:

Under The Waining Moon
The Devil's Lover Weeps

جن کا مطلب کچھ یوں ہے:

جیسے گھٹتے چاند کے نیچے زنِ فرقت زدہ
عاشقِ بدروح کی خاطر کرے آہ و فغاں

اس کے بعد کولرج نے بہت کوشش کی مگر وہ اس نظم کو آگے نہ بڑھا سکا یہ نظم نامکمل ہی رہی اس کے باوجود یہ دنیا کی چند بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

کولرج کی تیسری اہم ترین نظم

"The Rime of Ancient Mariner"

ہے۔ یہ ایک مصرع کی کہانی ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سمندری سفر پر جاتا ہے۔ مختلف ساحلوں اور جزیروں میں گھومتا پھرتا ہے اور اس سفر میں اس کی ملاقات ایک عجیب وغریب پرندے سے ہوتی ہے جو بولتا ہے۔ باتیں کرتا ہے اور کہانیاں اور لطیفے سنا کر ملاحوں کا دل بہلاتا ہے اور ملاحوں کے سفر کو خوشگوار بناتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ان کا جہاز ایک ایسے سمندر میں آجاتا ہے جہاں زندگی نام کو نہیں' ہر طرف برف ہی برف ہے۔

The ice was here
The ice was there
It cracked and howled
Like noice in sound

وہ راستہ بھول کر بھوکے پیاسے سفر کرتے رہے۔ ملاح مرتے رہے کیونکہ پانی کی ایک بوند بھی زندگی بچانے کے لیے میسر نہ تھی:

Water water every where
But not a drop to drink

لیکن پرندہ ان تمام باتوں سے لاتعلق اپنے موڈ میں خوش تھا۔ ملاح بھوک سے مر رہے تھے مگر وہ اپنے گیتوں اور کہانیوں میں مست تھا۔ وہ ہنس ہنس کر انہیں لطیفے سنا رہا تھا۔ چنانچہ نظم کے ہیرو ملاّح نے ایک دن غصے میں آکر اسے مار دیا اور خود ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو گیا جو مرتے دم تک اس پر طاری رہا...... اس کے دل میں درد کی اچانک ایک ایسی لہر اٹھتی تھی کہ وہ تڑپنے لگتا تھا اور درد اسی صورت میں ختم ہوتا تھا جب وہ کسی دوسرے آدمی کو اپنے جرم کے بارے میں بتلا نہیں دیتا تھا کہ اس نے ایک معصوم پرندے کو قتل کیا ہے۔

یہ نظم اپنی خوبصورت امیجری' تحیّر' خوف اور جنوبی سمندروں کے خوفناک جلال کی ایک زندہ' جاگتی اور بولتی تقدیر ہے اور اس میں کولرج کی شعری موسیقیت اپنے کمال پر ہے...... کولرج کا مطالعہ اس نظم کی تشکیل میں بہت کام آیا۔ اس نے سمندری سفر کے بارے میں بہت کتابیں پڑھی تھیں۔ بے شمار کہانیاں اسے ازبر تھیں اس نے یہ سب کچھ اس نظم میں سمو دیا...... نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ ورڈز ورتھ نے اپنے لیے زندگی سے مشاہدات اور تجربات اکٹھے کیے جبکہ کولرج نے کتابوں سے سب کچھ حاصل کیا۔ اپنی نظموں میں کولرج نے لفظوں سے تصویریں بنائیں اور موسیقی کی فضا پیدا کی۔ یہی اسے اپنے ہمعصروں میں انفرادی حیثیت دلاتی ہے۔ شاعری میں موسیقیت کی بات کرتے ہوئے ایک نقاد نے شیلے' بائرن اور کولرج کا موازنہ کرتے ہوئے کہا ہے:

''...... جہاں تک لفظوں سے موسیقیت پیدا کرنے کا سوال ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے' یہ موسیقیت کچھ کچھ شیلے میں موجود تھی۔ کولرج میں بدرجہ اُتم موجود تھی اور بائرن میں بالکل نہ تھی......''۔

اس بات کی تائید میں کولرج کی چار لائنیں دوں گا۔ ترجمہ نہیں کروں گا تا کہ آپ الفاظ کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی

موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں۔

The fair breeze blew, the white foam flew
The furrow followed free
We were the first that ever brust
into that silent sea.

ان تین نظموں کے علاوہ کولرج کی ایک نظم (Youth and Age) بھی بہت اہم نظم ہے۔ جس میں جوانی کے جانے بعد بڑھاپے کی آمد کا ذکر ہے اور ایک بوڑھے آدمی کی نفسیاتی کیفیت کس طرح اس کے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں کوئی خوف کوئی تحیّر اور مافوق الفطرت عنصر نہیں۔ یہ نظم انسانی نفسیات کے اُلجھاؤ کی بہترین مثال ہے۔

Youth and Age

شاعری پھولوں میں چلتی ایک آوارہ ہوا
تھی جہاں اُمید میری پرورش کے واسطے
بن کے مکھی شہد کی چمٹی تھی میری ذات سے
شاعری اُمید دونوں ہی میسر تھیں مجھے
شاعری' اُمید' فطرت کے سہارے زندگی
ہنستے گاتے کٹ رہی تھی میں جواں تھا جن دنوں
میں جواں تھا جن دنوں!

ترجمہ: احمد عقیل روبی

اور جب جوانی گزر جاتی ہے جسم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ طوفانوں سے کھیلنے والا جسم طوفانوں میں گھر جاتا ہے۔ جوانی ایک گزرا خواب بن جاتی ہے تو پھر آدمی کیا سوچتا ہے۔

یہ خمیدہ چال یہ بدلا ہوا ڈھانچہ میرا
دھوپ چاندنی سی نظر آتی ہے بالوں میں مجھے
پھر بھی ہے تیرے لبوں پر موسم گل کی خبر
اور تیری آنکھوں سے میرے اَشک لیتے ہیں چمک
زندگی اِک سوچ ہے اور سوچتا جاؤں گا میں
کیا؟ یہی کہ اب بھی ہیں میں اور جوانی ساتھ ساتھ
چھوٹے چھوٹے قطرے شبنم کے ہیں موتی صبح کے
شام کے یہ ماتمی آنسو ہیں کیا، کچھ بھی نہیں
زندگی تنبیہ ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں
غمزدہ وہ کرتی ہے اور دکھ درد دیتی ہے ہمیں
ہوتے ہیں جب بوڑھے ہم!

ترجمہ: احمد عقیل روبی

سو صفحات پر عظیم شاعری لکھ کر کولرج نے اعلان کر دیا:

''میرے اندر کا شاعر مر گیا ہے۔ کل میں تخیل کے گھوڑے پر سواری کرتا تھا۔ آج میں پیدل ہو گیا ہوں''

اس اعلان کے بعد اس نے شیکسپیئر پر لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ تنقید کی طرف دھیان دیا اور اہم ترین تنقیدی کتاب لکھ ڈالی جس کا نام بائیوگرافیا لٹریریا (Biographia Literaria) ہے اور تنقیدی نظریات پر ایک سند کا درجہ رکھتی ہے......

اس نے اس کتاب میں ورڈز ورتھ سے بہت سی باتوں میں اختلاف کیا اور یہی اختلاف ان کی دوستی میں دراڑ ڈال گیا۔

ورڈز ورتھ شاعری کے لیے عام اور سادہ زبان کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ ہمیں اپنی شاعری میں دیہات میں بولے جانے والی زبان کو فروغ دینا چاہیے لیکن کولرج نے شاعری میں شہری اور شرفا کی زبان کو استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ کولرج نے اولین متخیلہ اور ثانوی متخیلہ میں فرق واضح کیا۔

ورڈز ورتھ واہمہ (Fancey) اور تخیل (Imagination) کو ایک ہی چیز قرار دیتا ہے لیکن کولرج نے ان میں فرق واضح کیا۔ دوسری اہم بات یہ کہ کولرج نثر اور شاعری کی زبان میں فرق کی وضاحت کرتا ہے لیکن ورڈز ورتھ دونوں اصناف کے لیے ایک ہی زبان کو استعمال میں لانے کا مشورہ دیتا ہے۔ کولرج کہتا ہے کہ گفتگو کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہو سکتی......اس کے علاوہ بے شمار ادب کے نظریات ہیں جن پر کولرج نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ خیالات تنقید کے نظام میں آج بھی رائج ہیں۔ کولرج کو بحیثیت شاعر اور تنقید نگار ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ صدیاں گزر چکی ہیں، یہ حیثیت قائم و دائم ہے۔

کولرج گفتگو بہت خوبصورت کرتا تھا (اس کی تحیّر آمیز گفتگو کے بارے میں پڑھ کر منیر نیازی اور ناصر کاظمی کا خیال آ جاتا ہے کولرج کی طرح یہ دونوں بھی جس محفل میں محوِ کلام ہوتے تھے۔ اردگرد تحیّر اور اسرار بھری فضا طاری کر دیتے تھے۔ میں دونوں کی محفل میں بیٹھا ہوں۔ دونوں میں بس مجھے ایک فرق نظر آتا تھا۔ منیر نیازی فقرہ بنا کر بولتے تھے۔ ناصر کاظمی کے منہ سے بنا بنایا فقرہ نکلتا تھا)

انگریزی کا مشہور ادیب ہیزلٹ (Hazlitt) کولرج کے بارے میں اپنے مضمون میں لکھتا ہے۔

''کولرج ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کرتا تھا اور اس کی گفتگو اپنے اندر ایک دلچسپی رکھتی تھی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب وہ راستے پر بولتا ہوا چلتا تھا تو راستہ کان بن کر اس کی باتیں سنتا تھا اور ہارمر (Harmer) کا پہاڑ جھک کر اس کی گفتگو سنتا تھا......''

ورڈز ورتھ نے اس کے بارے میں کہا کہ میں نے زندگی میں ایسا خوش گفتار آدمی نہیں دیکھا۔ جب وہ بولتا تھا تو آدمی سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

کولرج کی باتیں سب نے غور سے سنیں۔ بس دو ہستیوں نے اس کی باتوں کی طرف توجہ نہ دی۔ ایک اس کی بیوی سارا فریکر نے۔ وہ اسے بیماری میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی اور دوسری افیون......رہی تو وہ کولرج کے ساتھ ساتھ مگر اس کی جان لے کر چھوڑی۔ جب افیون بھی اس کا کوئی علاج نہ کر سکی تو موت کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کر خود بھی اندھیروں میں کھو گئی۔

ورڈز ورتھ
(William Wordsworth)

18 ویں صدی کا رجحان ساز رومانوی شاعر انگریزی شاعری کے قدیم اسالیب میں فطرت اور دیہاتی زندگی کی معصومیت کو شامل کیا۔ فطرتی زبان، نیا نظام تنقید اور نئے موضوعات شاعری میں روشناس کرائے، بحیثیت شاعر اور نقاد ورڈز ورتھ کو اہم مقام حاصل ہے۔

CUKOO

اے بہاروں کے دل وجاں تیری آمد کو سلام

گرچہ میں تجھ کو سمجھتا نہیں طائر کوئی

میرے نزدیک ہے تو ایک صدائے اسرار

ایک موہوم سی شے، ایک رُخ نادیدہ

اب بھی میں تیری صدا، تیرے سریلے نغمے

لیٹ کر گھاس پر آرام سے سن لیتا ہوں

تیرے نغمات سے لوٹ آتا ہے عہد زریں

اپنے گزرے ہوئے ایام کو پالیتا ہوں

خوش گلو طائر خوش بخت تیرے آنے سے

یہ زمیں جس پہ قدم رکھتا ہوں میں بنی گئی ہے

ماورائی سا جہاں، غیر حقیقی دنیا

ہے مناسب یہ جہاں تیرے لیے رک جا یہاں

ولیم ورڈز ورتھ

انگریزی زبان کا شاعر ولیم ورڈز ورتھ دو حوالوں سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ فطرت سے محبت اور ایس۔ ٹی۔ کولرج سے دوستی۔ ورڈز ورتھ کولرج کو اپنا روحانی بھائی کہا کرتا تھا۔ دونوں نے اکٹھے شاعری شروع کی۔ دونوں ایک ہی فلسفے کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھے۔ منصوبہ بندی کے تحت نظمیں لکھیں۔ تنقیدی نظریات تشکیل دیئے ایک عرصہ اکٹھے رہے دونوں نے اکٹھے کتاب چھپوائی جس کا نام Lyrical Ballads تھا۔

جب اس کتاب کے لئے دونوں نے نظمیں لکھیں تو نظمیں لکھنے کے لیے اپنا اپنا دائرہ عمل مقرر کرلیا۔ ورڈز ورتھ نے حقیقی زندگی کا انتخاب کیا اور عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نظموں کا حصہ بنایا۔ کولرج نے مافوق الفطرت عناصر کی مدد لی۔ اور اپنی نظموں میں حیرت اور طلسمی فضا کو شامل کیا۔ مثلاً ورڈز ورتھ اپنی نظم Good Blacke and Harry Gill میں ایک عورت کی کہانی بیان کرتا ہے جو ایک کنجوس کسان کے کھیت سے چند چھڑیاں چرالیتی ہے۔ کسان اسے بُری طرح مارتا ہے اور عورت اسے بددعائیں دیتی ہے۔ کولرج کی مشہور نظم Ancient Mariner میں وہ Pacific سمندر کی طرف جانے والے ملاحوں کا ذکر کرتا ہے جو ایک پرندے Albatross کو مارتے ہیں اور پھر اس جرم کی پاداش میں مصیبتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ پرندے کو مارنے والا ملاح ایک ایسے درد میں مبتلا ہوتا ہے جو اس کے لئے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس درد میں کمی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے جرم کی کہانی سناتا ہے۔ کولرج کی یہ نظم بیان، اسلوب، موسیقیت اور خوبصورت تشبیہہ استعاروں سے مزین ہے۔ جبکہ ورڈز ورتھ اپنی نظم میں سادہ بیانی، علاقائی اور زمینی فضا قائم رکھتا ہے۔

کولرج اور ورڈز ورتھ کی مثالی دوستی ایک عرصہ قائم رہی اور پھر ایک ایسا موڑ آیا جب دونوں نے راستے بدل لئے اور ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ دونوں میں نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا۔ کچھ لکھنے والوں کے نزدیک اس دوری کا سبب کولرج کا ورڈز ورتھ کی بہن ڈروتھی میں دلچسپی ہے جسے ورڈز ورتھ بہت چاہتا تھا اور یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ اسے کوئی اور چاہے۔ ورڈز ورتھ نے کولرج سے تو ناتا توڑ لیا لیکن رومانویت، دیہاتی زندگی عام انسانوں کے قرب سے ناتا ہمیشہ قائم رہا۔ وہ دل کی آنکھ سے حقیقی زندگی کو دیکھتا رہا اور اسے اپنی شاعری میں بیان کرتا رہا۔

انگریزی شاعری میں ورڈز ورتھ کو ایک اہم ترین مقام حاصل ہے۔ ورڈز ورتھ رومانویت اور رومانوی تحریک کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے تنقیدی نظریات اور شعری رجحان سے انگریزی شاعری پر خاطر خواہ اثر چھوڑا اور پوری دنیا نے اس کی شاعری اور تنقیدی نظریات کو تسلیم کیا۔ اس نے انسان اور فطرت کو ایک نئے زاویے سے دیکھا اور دونوں کو ایک رشتے میں باندھنے کا فرض ادا کیا۔ اس نے اپنے مشاہدے اور تجربے پر اعتماد کیا۔ حقیقی زندگی اور اردگرد بکھرے فطرت کے نظاروں اور اشیا میں حقیقی مسرت اور خوشی کا کھوج لگایا۔ اس نے بتلایا کہ انسان ان چیزوں میں خوشی تلاش کر رہا ہے جہاں وہ موجود نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں حقیقی مسرت کی وضاحت کی۔

ورڈز ورتھ بچپن ہی سے فطرت کے قرب کا عادی رہا۔ اس نے بچپن ہی میں فطرت کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خوبصورتی، سچائی اور مسرت کے بے پناہ خزانے ڈھونڈ لیے تھے اور اب وہ اپنی شاعری سے لوگوں کو ان کا پتا بتلانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غم اور خوشی کا ذریعہ کیا ہے۔ وہ اپنے قارئین کو اس سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

ولیم ورڈز ورتھ 7 اپریل 1770ء کو ایک متوسط گھرانے میں Lake District کے ایک گاؤں Cock Mouth میں پیدا ہوا۔ ابتدائی چند سال ناز ونعم میں پرورش پائی پھر ماں باپ فوت ہو گئے اور چچا نے اس کی پرورش کی۔ اس کا ابتدائی سکول Hawk Shead میں تھا۔ سکول کے اردگرد فطرت کے خوبصورت نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ فطرت سے محبت کا آغاز اسی گاؤں سے ہوا۔ 1787ء میں وہ کیمبرج پڑھنے چلا گیا لیکن کالج کے نصاب سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے وہی پڑھا جو اسے پسند تھا۔ یہاں اس کی ملاقات Mary Hutchinson سے ہوئی۔ یہی وہ لڑکی ہے جس سے ورڈز ورتھ نے بعد میں شادی کی۔ تین سال بعد ورڈز ورتھ فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے سیر سپاٹے پر چلا گیا اور پھر اٹلی کا دورہ کر کے واپس آ گیا اور بڑی دلچسپی سے فرانسیسی زبان سیکھنے لگا۔ پیرس میں اسے دلچسپی کی ایک اور چیز مل گئی جس میں اس نے فرانسیسی زبان سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی اور وہ Annete Vellon تھی۔ ورڈز ورتھ نے اس میں اتنی دلچسپی ظاہر کی کہ اسے ایک بچی کی ماں بنا دیا۔ اس سے شادی نہیں کی، صرف تعلقات رکھے۔

ورڈز ورتھ پر انقلاب فرانس نے بہت اثر چھوڑا۔ وہ انقلاب سے بہت متاثر تھا۔ اس کے لندن کے دوستوں نے منع کیا کہ وہ انقلاب میں عملی طور پر حصہ نہ لے اور اس کے لندن سے آنے والے سارے فنڈز روک دیئے۔ ورڈز ورتھ کو انقلاب سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ اس میں اس کے نزدیک عام آدمی کی بھلائی تھی لیکن بعد میں وہ انقلاب سے مایوس ہو گیا۔ مایوسی کی وجہ یہ تھی کہ انقلاب کے نام پر ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور دوسری سب سے بڑی وجہ فرانس کا برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس اعلان سے ورڈز ورتھ کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ 1795ء میں وہ اپنی بہن کے ساتھ Racedown کے مقام پر رہنے لگا۔ 1802ء میں ورڈز ورتھ جرمنی کی سیر سے واپس آیا اور اپنی پرانی دوست اور کلاس فیلو Mary Hutchinson سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد کولرج سے اختلافات شروع ہو گئے۔ کولرج ورڈز ورتھ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ بچپن کے کچھ ابتدائی دنوں کو چھوڑ کر اسے تمام زندگی میں کسی معاشی مسئلے سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد اسے وراثت میں اچھی خاصی جائیداد مل گئی (Durham) یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے دی۔ ورڈز ورتھ نے ساری عمر شاعری کی۔ تنقیدی نظریات تشکیل دیئے، رومانوی تحریک کا امام کہلایا۔ عام انسانوں کی معصومیت اور زندگی کی اپنی شاعری میں عکاسی کی۔ قلم ہمیشہ چلتا رہا، بس جب اس کی بیٹی ڈورا (Dora) فوت ہوئی تو اس کا دل شاعری سے اچاٹ ہو گیا۔

ورڈز ورتھ کے شعری کارنامے قابل رشک ہیں۔ وہ اپنی شاعری اور تنقیدی نظریات کو وقت کے ساتھ ساتھ ترمیم واضافے کے ساتھ چھپواتا رہا۔ جب کولرج سے دوستی تھی تو بہت سے تنقیدی نظریات پر اس کا کولرج سے اتفاق تھا مگر جب دوستی ختم ہوئی تو اس سے ورڈز ورتھ کا نظریاتی اختلاف شروع ہو گیا۔ شعری زبان کے مسئلے پر ورڈز ورتھ عام انسانوں کی زبان کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ شاعری میں بول چال کی زبان استعمال کی جانی چاہیے۔ لیکن کولرج اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔

ورڈز ورتھ کی نظموں کے مجموعے مختلف عنوانات کے تحت چھپے Lyrical Ballads بہت اہم ہے۔

اس کتاب میں کولرج اس کے ساتھ شامل تھا۔ دونوں کی نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ دونوں نے شاعری کے لیے اپنے اپنے دائرہ فکر کا انتخاب کر لیا تھا۔ دوسری بار یہ مجموعہ ایک دیباچے کے ساتھ شائع ہوا اور اس میں چند مزید نظموں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس میں Lucy Gray سلسلے کی نظمیں شامل ہیں۔ 1807ء میں اس کی نظموں کے دو مجموعے چھپے۔ 1814ء میں The Excursion چھپی اور پھر The Prelude۔

ورڈز ورتھ کی انگریزی شاعری میں بہت اہمیت ہے۔ اس نے قدیم شاعری سے ہاتھ چھڑا کر رومانوی تحریک کو تقویت بخشی اور ساری دنیا اس تحریک کی لپیٹ میں آ گئی۔ بڑے شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاعری میں ایک نئے اور منفرد انداز اور اسلوب کی تشکیل کرتا ہے اور یہی صفت اس کی شہرت کا سبب بنتی ہے۔

ورڈز ورتھ نے قارئین کے شعری مزاج کی تربیت کی، اپنی شاعری کو نئے اسلوب اور موضوعات کو ان تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں ان کی رہنمائی کی اور انہیں نئے شعری راستوں پر چلنے پر اکسایا۔ جب کوئی بڑا شاعر پرانی شعری قدروں سے ہاتھ چھڑا کر نئے شعری افق تلاش کرنے نکلتا ہے تو اسے خطرہ ہوتا ہے کہ شاید قارئین اسے قبول نہ کریں۔ چنانچہ پھر وہ شاعری کے ساتھ ساتھ ایک نیا تنقیدی نظام بھی ساتھ لاتا ہے مثلاً اردو میں جب مولانا الطاف حسین حالی نے پرانی شاعری سے ہاتھ چھڑایا، جھوٹ، مبالغہ اور غیر حقیقی نظریات کی پیروی کو ترک کیا۔ فطری اور نیچرل اسلوب میں شاعری کی تو اپنے دیوان کے ساتھ ایک طویل دیباچہ بھی لکھ دیا۔ جو اردو تنقید میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ''مقدمہ شعر وشاعری'' کے نام سے مشہور ہے۔ ورڈز ورتھ کا Preface to Lyrical Ballads انگریزی تنقید کی تاریخ میں ایک سنگ میل یا Turning Point سمجھا جاتا ہے۔

ورڈز ورتھ نے اس طویل دیباچے میں شاعری کے موضوعات اور شاعری کی زبان پر بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمام علوم کا اول اور آخر شاعری ہے اور یہ آدمی کے دل کی آواز اور لافانی ہے۔ یہ دیباچہ رومانوی تحریک کا (Mani Festo) سمجھا جاتا ہے۔ جب ورڈز ورتھ نے اسے لکھنا شروع کیا تو کولرج کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی چنانچہ اس میں کولرج کی محبت بھی شامل ہے۔

دیباچے میں شامل تنقیدی نظریات اور اصول پوری دنیا کے تنقیدی نظام پر اثر انداز ہوئے۔ ورڈز ورتھ نے شاعری کے مقاصد شاعری کی زبان، شاعری اور سائنس کا رشتہ، شعری اور تخلیقی عمل، شاعر کے فرائض پر بات کی ہے۔

ورڈز ورتھ نے 18ویں صدی میں ہونے والی شاعری سے بغاوت کی شعری اسلوب کو اس کے Poetic Diction سے آزاد کرایا۔ شعری ابلاغ کے لیے سادہ اور عمومی زبان کو ذریعہ بنایا۔

ورڈز ورتھ کا کہنا تھا کہ شاعری کے لیے کسی خاص زبان کی ضرورت نہیں۔ شاعری کی زبان وہی ہونی چاہیے جو نثر کی زبان ہے جو بول چال کی زبان ہے۔ جو ہمارے اردگرد کے انسان بولتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ

The Poet is a Man Speaking to Man.

شاعرانہ مسرت اسی سادگی اور آسان زبان میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ انسانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا شاعر تھا۔ دیہاتی زندگی کے مسائل اور ان کی معصومیت کو شعری روپ دینے کا عادی تھا۔

اس کے نزدیک شاعری بے ساختہ جذبات کے بھرپور اظہار کا نام ہے یہ جذبات بہت طاقتور ہونے چاہیں۔ شاعر الگ تھلگ کسی جزیرے میں رہنے والا نہیں ہوتا۔ وہ انسانوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے انسانوں کی بات، ان کی

خوشیاں، ان کے دکھ درد، ان کی معصوم خواہشات کو آسان انسانی زبان میں بیان کرنا چاہیے۔ اسے چیزوں کے اندر اتر کر ان کا علم حاصل کرنا چاہیے۔ ورڈز ورتھ ارسطو کی طرح شاعری کو تمام علوم کا مجموعہ قرار دیتا ہے اور اسے روح کا فلسفہ کہتا ہے۔ ورڈز ورتھ کے نزدیک شاعری فطرت اور انسانوں کی عکاسی کرتی ہے۔

ورڈز ورتھ فطری سادہ اور دیہاتی زندگی کے سلسلے میں فرانسیسی فلاسفر روسو سے متاثر نظر آتا ہے۔ وہ دیہات کی زندگی اور دیہاتی لوگوں کی معصومیت کو شہری زندگی اور بناوٹی زبان کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے یہ بات اپنے دیباچے میں واضح طور پر لکھی ہے کہ سادہ، دیہاتی اور فطرتی زندگی اور فطرت کا حسن سنجیدہ اور بڑی شاعری کے اہم ترین موضوعات ہیں۔

ورڈز ورتھ کی ساری شاعری، دیہات، فطرت کے بکھرے ہوئے حسن، معصوم دیہاتیوں، کھلے آسمان میں اڑنے والے پرندوں، معصوم بچوں کے جذبات کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس کے معصوم کردار ہمیں متاثر کرتے ہیں اور ہم ان کی معصومیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً اس کی ایک نظم (We are Seven) ایک بچی کے بارے میں ہے جسے پتا نہیں کہ موت کیا ہے۔ وہ سات بہن بھائی ہیں ان میں سے دو مر چکے ہیں لیکن وہ انہیں مردہ نہیں سمجھتی اور ان کی قبروں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے۔ شاعر اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ تمہارے دو، بہن بھائی مر چکے اب تم کتنے بہن بھائی ہو تو وہ بولی:

سن کے میری بات اس نے پھر جواب ایسے دیا
''سات ہیں کل، دو ہیں نیچے پیڑ کے لیٹے ہوئے،
پیڑ ہے جو سامنے گرجا کے قبرستان میں''

....

''ان کی قبریں سبز ہیں'' اس نے کہا ''وہ دیکھئے''
اس جگہ اکثر جرابیں بیٹھ کر بنتی ہوں میں،
کاڑھتی ہوں اس جگہ میں بیٹھ کر اپنا رومال،
اور اکثر میں قریب ان کے زمین پر بیٹھ کر،
گیت بھی گاتی ہوں دونوں کو سنانے کے لیے'' ترجمہ: احمد عقیل روبی

ورڈز ورتھ نے بچی کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی کہ تمہارے دو بھائی مر چکے ہیں اور جنت میں ہیں مگر وہ بضد تھی۔

میرے یہ الفاظ سب بے کار تھے بے سود تھے
کیونکہ وہ قائم تھی اپنی بات پر اس نے کہا
یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے ہم لوگ تو کل سات ہیں

شاعر کے بارے میں ورڈز ورتھ کا خیال ہے کہ وہ معمولی نہیں ایک غیر معمولی شخصیت ہوتا ہے۔ ہر آدمی بیٹھ کر شاعری نہیں کر سکتا یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا کام ہے۔ جس کا احساس عام آدمی سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ بڑا شاعر بننے کے لیے جذبات، فکر، مشاہدے، فلسفے اور مضبوط فکری نظام کی ضرورت ہے۔ شاعری اس کے نزدیک اگرچہ عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور دکھ درد کی عکاسی ہے لیکن شاعر ان جذبات، احساسات کو اپنے اسلوب اور مشاہدے سے یادگار بنا دیتا ہے۔

ورڈز ورتھ کے ان نظریات پر اس کے عہد اور بعد میں آنے والے نقادوں نے جس بات پر سب سے زیادہ اعتراض کیا وہ شعری زبان کا مسئلہ ہے۔ اس کا کہنا ہے شاعری کی زبان عام لوگوں کی زبان ہونی چاہیے اور سج دھج اور تشبیہ استعارے والی زبان نہیں ہونی چاہیے۔

انگریزی تنقید میں ورڈز ورتھ کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس نے شاعری کے موضوعات اور زبان پر کھل کر بحث کی۔ فطرت اور انسانوں کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ شاعری میں تخیل کی اہمیت کو واضح کیا۔ اسے ایس۔ ٹی۔ کولرج کے مقابلے میں بڑا نقاد نہیں مانا جاتا لیکن اس کے باوجود اسے انگریزی تنقیدی تاریخ میں ایک اہم مرتبہ اور مقام حاصل ہے۔ بقول Rene Wellek

"Though Wordsworth Left only a Small Body of Criticism. It is Rich in Survivals, Suggestions, and Personal in Sight."

ورڈز ورتھ کی دوسری اہم کتاب Prelude ہے جو اس کی فکری تعمیر کی داستان بھی ہے اور اس کتاب کو ورڈز ورتھ کی روحانی سرگزشت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ورڈز ورتھ نے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی یادوں کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ فطرت سے اپنے قرب کو ظاہر کیا ہے۔ سکول کی ایک استانی اسے اکساتی تھی، ترغیب دیتی تھی کہ وہ فطرت کو اور اس کے حسن کو اپنے اندر رچا لے۔ اس سے لطف اندوز ہو، چنانچہ ورڈز ورتھ سکول سے بھاگ کر جنگل میں چلا جاتا، درختوں پر چڑھتا، پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے چراتا، کشتی پر بیٹھ کر دریا کی سیر پر نکل جاتا۔ یہ سب کچھ اس کی یادداشت کا حصہ بن گیا اور پھر اس کی شاعری میں آ گیا۔ وہ پرندے اور پرندوں کی آوازیں اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئیں اور بچپن میں سنی ان آوازوں کو بڑھاپے میں تلاش کرتا رہا اس کی ایک نظم "Cuckoo" اس کی بہترین مثال ہے یہ آواز اس نے بچپن میں سنی تھی۔ اب جب وہ ایسی آواز سنتا تو بچپن واپس لوٹ آتا۔ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان یہ آواز ایک رابطے اور پل کا کام کرتی ہے۔

"Cuckoo"

اے بہاروں کے دل و جاں تیری آمد کو سلام
گرچہ میں تجھ کو سمجھتا نہیں طائر کوئی
میرے نزدیک ہے تو ایک صدائے اسرار
ایک موہوم سی شے، ایک رُخ نادیدہ

....

اب بھی میں تیری صدا تیرے سریلے نغمے
لیٹ کر گھاس پہ آرام سے سن لیتا ہوں
تیرے نغمات سے لوٹ آتا ہے عہدِ زریں
اپنے گزرے ہوئے ایام کو پا لیتا ہوں

....

خوش گلو، طائر خوش بخت ترے آنے سے
یہ زمیں جس پہ قدم رکھتا ہوں میں ، بن گئی ہے
ماورائی سا جہاں ، غیر حقیقی دنیا
ہے مناسب یہ جہاں تیرے لئے ، رُک جا یہاں

ترجمہ:احمد عقیل روبی

1) The Solitary Reaper.

2) The Daffodills

3) The Green Linner.

4) Ode on Duty.

5) Milton.

6) The World is to Much with us.

7) Upon Westminister Bridge.

اس کی مشہور زمانہ نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں ایک نیا اسلوب لے کر انگریزی شاعری میں آئیں اور ان کا شمار انگریزی کی بہترین شاعری میں ہوتا ہے۔

ورڈز ورتھ کی حیثیت بطور شاعر اور نقاد منفرد ہے۔ اس کی دونوں حیثیتیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ بحیثیت نقاد اس نے اپنا نظام تنقید دیا اور اپنے آپ کو منوایا۔ بحیثیت شاعر اس نے شاعری کی نئی دکان کھولی اور ایک ہجوم اس کی طرف اُمڈ آیا۔

لارڈ بائرن

(Lord Byron)

انگریزی رومانوی تحریک کا مقبول ترین شاعر عشق کئے، بدنامی سمیٹی اور جاندار شاعری کی۔ اپنے ڈکشن اور اسلوب کی بنا پر وہ رومانوی شعرا میں سب سے منفرد ہے۔ وہ شیلے، کیٹس اور ورڈز ورتھ کا ہمعصر تھا۔

لارڈ بائرن لکھنے پر مجبور ہے اور ہم اسے پڑھنے پر مجبور ہیں۔

(میتھیو آرنلڈ)

....

میں رات کو سویا، صبح بیدار ہوا تو مقبول ترین شاعر بن چکا تھا۔

(بائرن)

....

اے انگلستان تو مجھے سب خامیوں کے باوجود پسند ہے۔
مجھے تیرا موسم پسند ہے اگر بارش نہ ہو
تیری پارلیمنٹ کی بحث پسند ہے اگر دیر سے شروع نہ ہو
تیرے ٹیکس پسند ہیں اگر وہ زیادہ نہ ہوں
اے انگلستان تو مجھے سب خامیو کے باوجود پسند ہے

(بائرن)

....

''بائرن ایک پاگل اور بُرا آدمی تھا۔ جس سے آشنائی خطرے سے خالی نہ تھی''۔

(لیڈی کیرولین لیمب)

لارڈ بائرن

مشہور نقاد ولیم ہنری ہڈسن نے شاعروں پر بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:

A great book owes to greatness in the first instance to the greatness of the personality which gave it life

میرے نزدیک یہ بات سو فیصد درست ہے۔ ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی، گوگول، چارلس ڈکنز کسی کو پڑھ لیجئے ان کی زندگی کے نشیب و فراز ان کی تخلیقات میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لارڈ بائرن بھی اسی زمرے میں آتا ہے، اس کی فنی زندگی اس کی نجی زندگی سے مستعار ہے اس کی ساری شہرت، ساری مقبولیت اس کی نجی زندگی سے ہوتی ہوئی فنی زندگی کا ہاتھ پکڑ کر قارئین کے سامنے آن کھڑی ہو جاتی ہے۔ لارڈ بائرن رومانوی عہد کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت بے پایاں تھی اور قارئین اختلاف کے باوجود اسے پڑھنے پر مجبور تھے۔ میتھیو آرنلڈ کا یہ جملہ سچائی پر مبنی ہے کہ میتھیو آرنلڈ نے بائرن کے بارے میں کہا تھا:

''لارڈ بائرن لکھنے پر مجبور ہے......اور ہم اسے پڑھنے پر مجبور ہیں۔''

ایک جملہ لیڈی کیرولین لیمب نے بھی اس کے بارے میں کہا ہے کیونکہ وہ یہ جملہ کہنے پر مجبور تھی۔ یہ اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

''بائرن ایک پاگل اور بُرا آدمی تھا جس سے آشنائی خطرے سے خالی نہ تھی۔''

بہرحال یہ ''پاگل اور برا آدمی'' 22 جنوری 1788ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام جیک بائرن تھا جسے لوگ پاگل جیک کہتے تھے۔ اس کا دادا بحریہ میں بڑا افسر تھا اور لوگ اسے Wicked Byron کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بائرن کا دادا بھی عجیب آدمی تھا۔ آخری دنوں میں بقول اس کی نوکرانی وہ شراب پی کر کمرے کے فرش پر لیٹ جاتا اور تمام گھر کی مکڑیوں، چوہوں اور چھپکلیوں کو آواز دے کر بلاتا۔ وہ آکر اس کے جسم پر رینگنے لگتے اور جب انہیں جانے کے لئے کہتا تو وہ سب کے سب چلے جاتے۔ جب وہ مرا تو یہ کہا جاتا ہے کہ سب رینگنے والے گھر سے رخصت ہو گئے۔

بائرن کی والدہ جھگڑالو عورت تھی، بائرن کا باپ مرا تو اس نے بائرن کی پرورش کی لیکن وہ اپنی گرم مزاجی کی وجہ سے بائرن کیلئے مصیبت بنی رہی۔ جب بائرن سکول میں پڑھتا تھا تو لڑکے اس سے پوچھتے تھے۔

''کیا تمہاری ماں پاگل ہے''

بائرن جواب میں کہتا ''ہاں! پاگل ہے۔''

بائرن کا ایک پاؤں پیدائشی طور پر ٹیڑھا تھا اور وہ ہلکا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ بچپن میں بائرن کی ماں اسے ایک اناڑی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس ڈاکٹر نے بائرن کا پیر شکنجے میں جکڑ دیا اور بائرن کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ پانی کا ایک بڑا بیرل اٹھا کر ایک گھنٹہ گراؤنڈ میں چلے اس سے بائرن کا پاؤں اور بگڑ گیا اور ساری زندگی وہ لنگڑا کر چلتا رہا۔ حیرت کی بات ہے

کہ لندن کی خواتین اس لنگڑے پن کو بھی اس کے حسن کا حصہ قرار دیتی تھیں۔

بائرن نے ابتدائی تعلیم گرائمر سکول سے حاصل کی پھر وہ ہارو سکول چلا گیا۔ وہاں اس نے یادگار کرکٹ میچ میں حصہ لیا جو 1805ء میں لارڈز کے میدان میں کھیلا گیا تھا۔ ان ہی دنوں میں اس نے اپنی نوکرانی مے گرے سے عشق و محبت کے طور طریقے سیکھے جو اس کی آنے والی زندگی میں بہت کام آئے۔ شائد بائرن اس سے اور فیض یاب ہوتا لیکن بائرن کی ماں نے مے گرے کو نوکری سے نکال دیا لیکن اس کی ماں اس کی محبت سے چھٹکارا نہ دلا سکی۔ محبت کے سلسلے میں بائرن مجنوں اور شیخو بابا (جہانگیر) کا شاگرد تھا۔ اس کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ بائرن نے جب پہلا عشق Duff سے کیا تو اس کی عمر 6 سال تھی...... بائرن کی والدہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''بائرن کیلئے محبت ہی سب کچھ ہے وہ Miss Chaworth پر بُری طرح عاشق ہو گیا ہے''۔

بائرن کو اپنے دادا کی طرف سے ڈھیر ساری دولت ملی جو اس نے عیاشیوں پر اڑا دی۔ اسے لارڈ شپ کا خطاب بھی ملا۔ وہ پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا جہاں جا کر اس نے دو تقریریں کیں جن میں خطابت کے ایسے جوہر دکھائے کہ پورا لندن اس کے خلاف ہو گیا۔ ان میں سے ایک تقریر تو لندن اور لندن میں رہنے والوں کی زندگی کے بارے میں تھی جس میں اس نے اشرافیہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ دوسری تقریر مزدوروں کے حق میں اور مشینوں کے خلاف تھی جن کی وجہ سے مزدور بیکار ہو گئے تھے۔ اس میں اس نے سزائے موت کے قانون کی مخالفت بھی کی۔ لارڈ بائرن نے اس بات پر زور دیا تھا کہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے مزدوروں پر بڑی زد پڑی ہے۔ ایک مشین کی وجہ سے 50 مزدور بے کار ہو جاتے ہیں۔ اسی تقریر میں بائرن نے مذہب کی بھی مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ ریاست اور مذہب میں فرق ہونا چاہیے۔ ہر مذہب کو آزادی ملنا چاہئے۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنی مرضی سے اپنی رسومات ادا کریں۔ صرف ایک مذہب کو سرکاری مذہب نامزد نہیں کیا جانا چاہیے۔ بائرن کے ان نظریات سے اس کے خلاف ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا اور اس کے عشق کا چرچا لندن کی ہر گلی اور ہر گھر میں ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مخالفت سے تنگ آ کر وہ اپنے چند دوستوں کو ساتھ لے کر دنیا کی سیر پر نکل کھڑا ہوا۔ لوگوں سے ملا۔ ان کی نفسیات کو سمجھا اور فطرت کے خوبصورت نظاروں کی سیر کی۔ واپس لندن آیا جو کچھ اس نے لکھا تھا اسے چھپوایا۔ رات کو سویا، دن کو جاگا تو اس کی کتاب چھپ چکی تھی اور وہ انگریزی زبان کا مشہور شاعر بن چکا تھا۔ لارڈ بائرن خود کہتا ہے۔

''میں رات کو سویا صبح بیدار ہوا تو میں مقبول ترین شاعر بن چکا تھا......''

لارڈ بائرن کی پہلی باقاعدہ شاعری کی کتاب جس میں اس کی پرانی اور نئی نظمیں شامل تھیں وہ Hours of Idleness تھی اس کی مشہور نظموں نے اپنے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ اس کی نظمیں:

She walks in beauty

when we two parted

مقبولیت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ دوسری نظم میں ذرا محبوب سے جدا ہوتے وقت شاعری کی جذباتی کیفیت دیکھئے:

خامشی سے جدا ہوئے ہم تم
ٹوٹے دل اور چشم نم لے کر
سالہا سال تک نہ ملنے کو

سرد اور زرد تھے تیرے رخسار
اور یخ بستہ تھا تیرا ماتھا
سچ ہے اس لمحہ جدائی نے
کی تھی پیش گوئی اس غم کی
آج ہوں مبتلا میں جس غم میں
صبح کی اوس سے میرا ماتھا
سرد تھا اور ایسے لگتا تھا
جیسے اس غم کا انتباہ تھا یہ
تو نے وعدے وفا کے توڑ دیئے
تیری شہرت بنی ہے بدنامی
جب تیرا نام لوگ لیتے ہیں
سن کے میں شرمسار ہوتا ہوں
جب تیرا ذکر روبرو میرے
لوگ کرتے ہیں میرے کانوں میں
شک کی گھنٹیاں سی بجتی ہیں
اور میں تھرتھرا سا جاتا ہوں
کیوں تو اتنی عزیز تھی مجھ کو
وہ نہیں جانتے کہ میں تجھ کو
جانتا ہوں، تیرا شناسا ہوں
سالہا سال بعد گر میں تجھے
مل بھی جاؤں تو تو بتا کیسے
میں کہوں گا خوش آمدید تجھے
خامشی اور چشمِ نم لے کر

لندن میں بائرن کی مخالفت بڑھی تو وہ کچھ عرصے کے لئے ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سفر پر روانگی بہت شاندار تھی۔ ایک ڈاکٹر اس کے ساتھ تھا۔ بائرن نے اس سفر میں بہت سے عشق کئے۔ ترکی کے ایک گورنر علی پاشا کا شاہی مہمان رہا۔ 1812ء میں واپس آ کر اپنی مشہور طویل نظم لکھی۔ وہ نظم Child Harold,s Pilgrimage تھی۔ اس نظم کے موضوعات نپولین، تاریخی حوالے، روسو اور والٹیئر تھے جن میں بائرن کے اپنے جذبات تھے جنہیں اس نے نہایت مہارت کے ساتھ، نغمگی میں ڈھال کر پیش کیا تھا۔

1812ء ہی میں بائرن کے ایک ایسے عشق کا آغاز ہوا جس نے پورے انگلستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ خاتون ایک شادی شدہ عورت تھی اور اس کا نام لیڈی کیرولین لیمب تھا۔ بائرن نے اس سے تعلقات ختم کرنا چاہے لیکن لیڈی کیرولین نے

سائے کی طرح بائرن کا پیچھا کیا۔ اس کے گھر آنے لگی اور کبھی کبھی تو وہ لڑکوں کا بھیس بدل کر آجاتی تھی اور بائرن کے لکھنے کی میز پر لکھ جاتی تھی کہ Remember me۔

لارڈ بائرن لیڈی کیرولین سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی کزن Annabella سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے اور اسے شادی کیلئے مجبور کیا۔ پہلے تو وہ مانی نہیں لیکن پھر ہاں کر دی۔ شادی ہوئی لیکن ناکام ہوگئی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی 1816ء کو وہ اپنی بیٹی Auguota ada کو لے کر بائرن سے الگ ہوگئی۔ اس علیحدگی کے بعد بائرن نے ہمیشہ کیلئے انگلستان کو خیرآباد کہہ دیا۔ جنیوا کی ایک جھیل کے کنارے رہنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ وہ سب لوگ اس کے پاس آکر رہنے لگے جو لندن سے بھاگے تھے یا جنہوں نے بائرن کی محبت میں لندن چھوڑا تھا۔ بائرن کی محبت میں لندن چھوڑنے والی میری شیلے کی سوتیلی بہن کلیر ماؤنٹ Clairmount بھی تھی جس کے بائرن کے ساتھ تعلقات تھے اور بائرن کی بیٹی الیگرا اس کی گود میں تھی۔ وہ شیلے اور میری شیلے کے ساتھ لندن سے بائرن کے پاس وینس پہنچی تھی۔

بائرن نے وینس میں اپنے ان ادبی دوستوں کے ساتھ بڑے اچھے دن گزارے اور بڑا تخلیقی کام کیا۔ اس کی عظیم نظم Don Juan کے پانچ کنٹوز Child Harold اس کے علاوہ Cain اور Manfred اس نے اسی قیام کے دوران مکمل کیں۔ رومانوی عہد کے دو بڑے شاعروں بائرن اور شیلے نے یہاں ایک ادبی سرکل Pisa Circle بنا کر ہم خیال ادیبوں کی تربیت کی۔ لارڈ بائرن نے وینس میں کئی عشق کئے اور ایک عشق نے تو اسے تگنی کا ناچ نچا دیا۔ اس خاتون کا نام کوگنی تھا۔ مارگریٹا کوگنی ایک شادی شدہ عورت تھی جو اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر بائرن کے گھر آگئی تھی۔ وہ ان پڑھ مگر بے حد خوبصورت تھی۔ تیز مزاج، غصیلی، سخت، لیکن بائرن سے محبت کرتی تھی۔

شیلے نے اس عشق کی بہت خوبصورت تفصیل لکھی ہے۔ بقول شیلے اس نے بائرن کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیا تھا۔ کسی کو بائرن سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ جب بائرن کی ڈاک آتی تو وہ لفافوں کو سونگھتی تھی اور سونگھ کر پتا چلا لیتی تھی کہ کون سا خط نسوانی ہے چنانچہ وہ خط پھاڑ دیتی تھی۔ شیلے لکھتا ہے کہ عورتوں کو اپنے انگوٹھے تلے رکھنے والا بائرن، کوگنی کے سامنے بالکل بے بس تھا، کبھی کبھی اس سے خوفزدہ ہوکر بائرن کو رات اپنی کشتی میں گزارنا پڑتی تھی۔ آخر لارڈ بائرن نے اسے گھر چھوڑنے کیلئے کہا۔ اس نے چیختے چلاتے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ گھر کی چیزیں توڑ پھوڑ دیں اور نہر میں چھلانگ لگادی اور تیر کر دوسرے کنارے پر چلی گئی جہاں اس کا خاوند اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اپنی نظم (Don Juan) میں اس نے مزاح، طنز اور ذہانت کو شامل کیا جو اس وقت کی شاعری سے غائب ہو چکی تھی۔ اس نے انسانی رویوں کا کھل کر مذاق اڑایا جو بناوٹی تھے، حیا، وفا، ہمدردی، انسانوں سے اٹھ گئی تھی۔

(Don Juan) کے دوسرے کنٹو میں جب جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو ہیرو کو ایک تختے پر ایک آدمی اور کتا نظر آتے ہیں۔ ہیرو انسان کو ڈوبنے دیتا ہے اور کتے کو بچا لیتا ہے اور دلیل یہ دیتا ہے کہ آج کل وفا انسان میں نہیں، کتے میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ انسان سے بہتر مخلوق ہے۔ لارڈ بائرن نے اپنے کتے کی وفات پر جو نظم لکھی ہے اس میں بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بقول برٹرینڈ رسل یورپ والوں نے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں، لندن والوں کو اس کی شاعری میں کچھ نظر نہ آیا۔ جب بائرن مرا تو پیرس کے کئی اخباروں نے یہ سرخی جلی حروف میں لگائی۔

''اس صدی کے دو بڑے آدمی نپولین اور بائرن دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

کارلائیل نے اسے یورپ کا ذہین ترین آدمی قرار دیا، بائرن کی موت پر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا بھائی دنیا سے

رخصت ہو گیا ہے۔

بائرن کی مشہور نظم Don Juan سترہ کنٹوز پر مشتمل ہے جسے اپنے وقت کی (EPIC) شاہکار کہا جاتا ہے۔ کچھ نقاد اس نظم کو ایک اعلیٰ تخلیق قرار دیتے ہیں جو ادبی روایت سے مالا مال ہے۔ اس نظم نے اس کے ہمعصر شعراء کو بیدار کر دیا تھا۔ 1819ء تک اس نظم کے کنٹوز ایک ایک کر کے چھپتے رہے لیکن پھر پبلشر نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا کیونکہ قارئین بائرن سے اختلاف کرنے لگے تھے۔ بائرن نے ورڈزورتھ اور کولرج پر سخت تنقید کی تھی جو قارئین کو پسند نہ تھی۔

بائرن نے 1821ء میں اپنے دوست (Hob House) کو خط میں لکھا:

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ میرے جیسے مزاج کے آدمی کو زیادہ دیر زندہ رہنا چاہئے۔''

بائرن اپنے دوستوں کا بہت وفادار تھا۔ چنانچہ (Hob House) نے جواب دیا:

''جس کے دوست اتنے وفادار ہوں وہ زیادہ دن زندہ رہتا بھی نہیں۔''

بائرن نے برطانیہ اور امریکا پر شاید اتنے اثرات نہ چھوڑے ہوں مگر یورپ پر اس نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ روس کا بڑا شاعر پشکن اسے عظیم شاعر مانتا تھا۔ پشکن نے بائرن کو اپنا آئیڈیل شاعر بنا کر اپنی شاعری کو آگے بڑھایا۔

بائرن نے ماں باپ کے گھریلو جھگڑوں سے بہت اثر قبول کیا۔ اپنے ٹیڑھے پاؤں کی وجہ سے وہ ہمیشہ فکرمند رہا۔ لندن کے لوگوں کی نفرت نے اسے ساری زندگی چین کی سانس نہ لینے دی۔ چنانچہ ان تمام وجوہات کی بنا پر وہ لندن اور لندن کے لوگوں سے باغی ہو گیا، یورپ میں پناہ لی اور بے شمار معاشقوں میں الجھا رہا جس میں اسے بدنامیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

بائرن کو جانوروں سے بڑا عشق تھا۔ اسے شاید انسانوں میں محبت اور وفا نہ ملی جسے وہ جانوروں میں ڈھونڈتا رہا۔ مختلف اوقات میں اس نے مختلف جانور پالے۔ لومڑی، بندر، طوطا، بلی، عقاب، کوا اور مور۔ لیکن سب سے زیادہ محبت اسے اپنے کتے سے تھی۔ جب اس کا کتا بیمار ہوا تو وہ اس کی تیمارداری میں اپنی شاعری تک کو بھول گیا اور جب یہ کتا مر گیا تو اسے خود دفنایا اور اس کی قبر پر ایک کتبہ لگایا جس پر بائرن کی نظم اب تک موجود ہے:

یہاں اس کی باقیات دفن ہیں
جو خوبصورت تھا مگر مغرور نہ تھا
جس میں طاقت تھی مگر تکبر نہ تھا
سوائے انسانوں کی برائیوں کے
اس میں ان کی ساری خوبیاں موجود تھیں
یہ سب خوبیاں اگر کسی انسان کے لئے لکھی جائیں
تو بے معنی تعریف ہوگی
یہ اس کتے کو خراج تحسین ہے
جس کا نام (Boats Woats) تھا
جو نیوفاؤنڈ لینڈ میں 1803ء کو پیدا ہوا
اور 1808ء نومبر میں نیوسڈ کے مقام پر مر گیا۔

بائرن نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ اسے Boats Woats کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

1823ء میں یونانیوں اور ترکوں کی جنگ شروع ہوئی اور ترک فوج نے لی پانٹو (Leapanto) نامی قلعے پر قبضہ کرلیا۔ بائرن یونان کا شیدائی تھا چنانچہ اس نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ اس نے یونانی جرنیل کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا کہ قلعے کو ترک فوج سے آزاد کرایا جائے۔ اس حملے میں بائرن زخمی ہوگیا۔ علاج شروع ہوا تو تیز بخار نے آلیا اور بیماری لاعلاج ہوگئی۔ بائرن 19 اپریل 1824ء کو فوت ہوگیا۔ فوج میں وہ بہت مقبول تھا اور یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اگر بائرن زندہ رہتا تو اسے یونان کا بادشاہ بنا دیا جاتا۔

بائرن کو لندن میں دفن کرنا تھا۔ یونانی اس بات پر بضد تھے کہ اسے یونان میں دفنایا جائے۔ چنانچہ بائرن کا دل (Messolonghi) میں دفنایا گیا۔ اس کا باقی جسد خاکی لندن روانہ کر دیا گیا لیکن لندن کے پادریوں نے اسے Westminister Abbey میں جگہ دینے سے انکار کر دیا اور اس کی میت دو دن کھلے عام پڑی رہی۔ دو دن کے بعد اسے سینٹ میری چرچ کے قبرستان میں دفنایا گیا اور اس کی ایک نظم کے مصرعے چاروں طرف گونجتے رہے:

اے انگلستان تو مجھے سب خامیوں کے باوجود پسند ہے
مجھے تیرا موسم پسند ہے اگر بارش نہ ہو
تیری پارلیمنٹ کی بحث پسند ہے اگر وہ دیر سے شروع نہ ہو
تیرے ٹیکس پسند ہیں اگر وہ زیادہ نہ ہوں
اے انگلستان
تو مجھے سب خامیوں کے باوجود پسند ہے۔

پی۔بی شیلے

(P.B.Shelley)

18 ویں صدی کا مقبول انگریزی شاعر اسے انقلاب فرانس کا روحانی بچہ قرار دیا جاتا ہے۔ شیلے کی شاعری، آزادی، حسن اور انصاف کے حصول کی جدوجہد ہے۔ اس کی شاعری آنے والے عہد کی بشارت دیتی ہے۔ شیلے، روسو اور نپولین سے متاثر تھا۔

پی۔بی شیلے

1809ء میں انگلستان کے سکول اور اساتذہ طلبا کی ذہانت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ یہ پڑھو، یہ نہ پڑھو، غلط اصول وضوابط کی پابندی، سینئر طلبا کے سامنے جونیئر طلبا کی جو حالت زار تھی وہ قابل دید تھی۔ وہ اپنے سینئرز کے جوتے پالش کرتے، کپڑے دھوتے۔ سکول کے لان میں لگے نلکوں سے ان کے لئے پانی بھر کر لاتے۔ ان احکامات کی نافرمانی سب سے بڑا جرم تھی جس پر انتظامیہ کڑی سزا دیتی تھی۔ جونیئر طلبا ان مظالم کی اپنے گھروں میں شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک طالب علم ایٹن سکول میں ایسا بھی آیا جس نے ان ظالمانہ احکامات کو للکارا اور اس طرح للکارا کہ اس کی آواز کی گونج سے سارا سکول لرز گیا۔ اور خاص طور پر ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر کیٹس (Dr. Keats) جس نے سکول میں یہ سخت نظام رائج کیا تھا ہل کر رہ گیا تھا۔ اس نظام کے خلاف احتجاج کرنے والا مسٹر ٹموتھی شیلے کا بیٹا پی۔ بی۔ شیلے تھا۔ لڑکیوں کی طرح نازک اندام، خوبصورت، چلتا تو خوبصورت سنہری بال شانوں پر لہراتے، کھلے گریبان کے پیچھے لمبی گردن دیکھ کر کسی دوشیزہ کا گمان ہوتا تھا۔ اسے سکول کے طلبا اور اساتذہ پاگل شیلے (Mad Shelley) کے نام سے پکارتے تھے۔ سکول کے ایک کونے سے جب ایک آواز ابھرتی ''شیلے'' تو ہاسٹل کے ہر کمرے سے ''شیلے شیلے'' کی آوازیں سارے سکول میں گونج جاتیں۔

وہ اپنی عادات، افکار اور باتوں سے سکول والوں کو واقعی پاگل لگتا تھا۔ لڑکے کھیلتے وہ کتابوں میں غرق ہو جاتا لیکن نصابی کتابوں میں نہیں ان کتابوں میں جو سکول میں ممنوع قرار دی گئی تھیں۔ فرانسیسی مصنفین کو شیلے نے سینے سے لگایا۔ والٹیئر، روسو اور دیدور کو پڑھا مشہور انگریزی مصنف گوڈون (Godwin) اور فطرت کے نظاروں میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔ ہری گھاس پر آنکھیں بند کر کے آسمان کا نظارا کیا اور بنی نوع انسان کے دکھوں کے تدارک کی فکر کی اور پھر آکسفورڈ کالج جانے سے پہلے عہد کیا۔

''میں عہد کرتا ہوں۔ ہمیشہ انصاف اور ذہانت کے راستے پر چلوں گا۔
میں عہد کرتا ہوں۔ مساوات اور آزادی کی خاطر جدوجہد کروں گا۔
میں عہد کرتا ہوں ہمیشہ حسن کی پرستش کروں گا۔''

پھر شیلے نے ساری زندگی انصاف، مساوات، آزادی اور حسن کیلئے جدوجہد کرتے گزار دی۔ وہ صرف 30 سال جیا لیکن صدیاں اس کے افکار کی بیساکھیاں لے کر آگے بڑھ رہی ہیں۔

شیلے کو انقلاب فرانس کا حقیقی بچہ قرار دیا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کی اصلی روح اس انگریزی شاعر کے اندر موجود تھی۔ شیلے ساری زندگی ایک نئی دنیا کے خواب دیکھتا رہا۔ ایسی دنیا جو ظلم وستم کے دبدبے اور ناانصافی سے پاک ہو، ایسی دنیا جو انتشار، بےیقینی اور خوف سے خالی ہو، انگریزی رومانوی عہد انقلابِ فرانس کی دین تھا۔ رومانوی شاعروں ورڈز ورتھ، کولرج، بائرن، کیٹس اور شیلے نے اسی سے جنم لیا لیکن شیلے اپنے نظریات اور فلاسفی کے لحاظ سے سب سے پیش پیش تھا۔

میں اپنی شاعری سے آزادی اور انصاف کی شمع روشن کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک نئے جہان کی تلاش ہے۔

جہاں سویرا اپنی سنہری کرنیں پھیلاتا ہے
ہمارے جذبات بھی وہاں چمکیں گے
اور بادشاہوں کے چہرے زرد ہو جائیں گے۔

(پی۔بی۔شیلے)

....

مغربی ہوا سے

لے جا اے وحشی ہوا
ساری چنگاریاں اس بجھتے ہوئے چولہے کی
ان کو انسانوں میں جا کر پھیلا
اے ہوا۔ دنیا کو جا کر یہ بشارت دے دے
موسم سرما اگر آ پہنچا
موسم گل بھی بہت دور ہیں

(پی۔بی۔شیلے)

اس نے ساری زندگی آزادی، مساوات اور انصاف کے خواب دیکھے۔ ایک ایسی دنیا کا خواب جو ان تینوں چیزوں سے آراستہ ہو۔ انقلاب فرانس کی بنیاد میں تین چیزیں اہم ترین محرکات ثابت ہوئیں۔ روسو، نپولین اور سیاسی صورتحال۔ یہی تین چیزیں انگریزی ادب میں رومانوی تحریک کا باعث بنیں۔

میں اس مضمون میں صرف شیلے پر بات کروں گا۔ شیلے پر انقلابِ فرانس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ شیلے کو وہ واحد شاعر کہا جاسکتا ہے جس نے آزادی اور انصاف کے گیت گائے اور ایک آنے والے عہد کی بشارت دی۔ شیلے واقعہ کی بجائے نظریات سے متاثر ہوا اور یہی اسے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔ وہ اپنے ڈرامے (Revolt of Islam) کے دیباچے میں کہتا ہے۔

''میں اپنے قارئین کے دلوں میں آزادی اور انصاف کی شمع روشن کرنا چاہتا ہوں۔ بنی نوع انسان کے دل سے تعصب اور تشدد کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور امید کو جنم دینا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنی نظم میں تین مصرعوں میں امید دلاتا ہے

جہاں سویرا اپنی سنہری کرنیں پھیلاتا ہے
ہمارے جذبات بھی وہاں چمکیں گے
اور بادشاہوں کے چہرے زرد ہو جائیں گے۔

شیلے کی فلاسفی اور نظریات کو جاننے کے لئے اسکی ایک طویل نظم بہت اہم ہے جس کا نام کوئین میب (Queen Mab) ہے، کوئین میب سے پہلے شیلے نے ایک پمفلٹ لکھا جس کا نام The Necessity of Atheism ہے۔ آکسفورڈ کی انتظامیہ نے نوٹس لیا اور شیلے کو کہا کہ وہ اس پمفلٹ سے انکاری ہو جائے لیکن شیلے نہ مانا اور اسے کالج سے نکال دیا گیا۔ باپ کے کہنے پر بھی اس نے اپنے نظریات بدلنے سے انکار کر دیا اور باپ سے بھی اس کے تعلقات خراب ہو گئے۔

پرسی بشی شیلے 4 اگست 1792ء کو پارلیمنٹ کے ممبر سرٹموتھی شیلے کے گھر پیدا ہوا۔ بے حد لاڈلا بچہ، ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر ایٹن سکول چلا گیا اور پھر آکسفورڈ کالج جہاں سے ایک انقلابی پمفلٹ لکھنے کی پاداش میں اسے نکال دیا گیا۔ شیلے روایات کے خلاف تھا۔ چاہے وہ سماجی ہوں یا ادبی۔ اس نے ہر طے شدہ اصول اور روایت کے خلاف بغاوت کی اور اس نظریے کو گوڈون کی کتاب پولیٹیکل جسٹس نے مضبوط سے مضبوط بنا دیا۔ شیلے اپنی کزن ہیریٹ (Harriet) سے شادی کی۔ گوڈون سے ملاقات کرنے پہنچا تو اسکی بیٹی میری گوڈون اسے پسند آگئی اور اس سے محبت کرنے لگا۔ گوڈون نے اپنی کتاب ''پولیٹیکل جسٹس'' میں شادی کے بندھن کی مخالفت کی تھی اور آزادی محبت کا پرچار کیا تھا۔ شیلے نے ان دونوں باتوں پر عمل کیا۔ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے اس نے میری سے میل ملاپ بڑھایا اور اسے بھگا کر پیرس چلا گیا۔ میری کو بھگا کر لے جانے کی اور ہیریٹ کے ساتھ بے وفائی کی داستان بھی عجیب داستان ہے۔ شیلے کی رومانوی زندگی کسی دل پھینک عاشق سے کم نہیں۔ فرانسیسی مصنف آندرے موراس (Andre. Maurois) نے اس کی زندگی پر ایک خوبصورت کتاب (Ariel) لکھی ہے جس میں شیلے کی داستان عشق کو بڑے خوبصورت انداز میں قلم بند کیا گیا۔ شیلے دوستوئیفسکی کی طرح زندگی بھر قرض کے بوجھ تلے دبا رہا اور عشق کرتا رہا۔ ہیریٹ سے شادی کی اسے چھوڑا، طلاق دے دی۔ ہیریٹ نے خودکشی کر لی۔ میری سے شادی کی۔ مرتے دم تک ساتھ

نبھایا لیکن خوبصورت چہرے کو دیکھ کر اس کا دل کبھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا تھا۔ اٹلی کے قیام کے دوران وہ ایک لڑکی ایمیلیا (Emilia) پر بُری طرح عاشق ہو گیا۔ میری کو اس عشق کے بارے میں پتا تھا اور شیلے نے اسے چھپایا بھی نہیں۔

میری اور شیلے دونوں افلاطون کی تحریروں کے شیدائی تھے میری جانتی تھی کہ یہ افلاطونی عشق ہے جو حسن کی صداقت کی داد دے رہا ہے۔ شیلے نے ایمیلیا پر ایک نظم شروع کی لیکن اس دوران ایمیلیا کی شادی ہو گئی۔ یہ عشق چھ ماہ تک چلا۔ میری اپنی ایک سہیلی کو لکھتی ہے۔

''ایمیلیا کی شادی ہو گئی ہے اور شیلے کا افلاطونی جو دراصل اطالوی طرز کا عشق تھا۔ اختتام پر پہنچ گیا ہے۔''

شیلے اپنے دوست کو لکھتا ہے:

''ہر آدمی کسی نہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے، یہ غلطی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں جس سے میں نے عشق کیا وہ بادل تھا۔''

شیلے نے یہ خبر سن کر کہ ایمیلیا شادی کر رہی ہے اپنی نظم کو مکمل کیا!

شیلے کی ساری زندگی آزادی، مساوات وعدل کے خواب دیکھتے اور عشق کرتے گزر گئی۔ وہ اپنے مطالعے میں اتنا الجھا رہتا تھا کہ اسے علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ عملی زندگی میں کیا قدم اٹھا رہا ہے۔ اس نے کبھی عقل سے نہیں سوچا ہمیشہ دل کی بات مانی۔ ہیریٹ اس کے ساتھ باوفا تھی لیکن اس نے اس کی وفا کو داد نہ دی اور میری کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بنالیا۔ یہ روداد بھی بڑی دلچسپ ہے۔

میری گوڈون (Mary Godwin) کے گھر کے باہر شیلے صبح کے 4 بجے تک انتظار کرتا رہا۔ پورے چار بجے وہ باہر نکلی اسے ساتھ لیا۔ میری کی سوتیلی بہن کلرے ماؤنٹ اور یہ دونوں ایک بگھی میں بیٹھ کر ڈوور (Dover) پہنچے اور وہاں سے کشتی پر بیٹھ کر پیرس پہنچے! پیرس میں چند دن گزار کر ان کا پروگرام سوئٹزرلینڈ جانے کا تھا مگر شیلے کی جیب خالی تھی۔ اس کے لندن کے ایک دوست نے پیرس میں کسی کے نام خط دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے کھانے پر بلایا لیکن وہ دولڑکیوں اور ایک آدمی کے اس سفر کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ شیلے کو اپنی گھڑی اور زنجیر (Chain) بیچنا پڑی جن کے بدلے اسے صرف آٹھ نپولین (فرانسیسی سکہ) ملے۔ ایک ہفتے بعد اس فرانسیسی کو ان پر رحم آیا اس نے 50 پاؤنڈز دے دیئے۔ شیلے نے پیرس چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور مویشیوں کی مارکیٹ میں جا کر ایک گدھا خرید لیا جس پر سامان لادا جا سکے۔

دوسری صبح تینوں بگھی پر سوار ہوئے گدھے کو بگھی کے پیچھے باندھا چند منزلیں طے کرنے کے بعد گدھا تھک گیا۔ ایک گاؤں میں اسے بیچ دیا اور ایک خچر خرید لیا اور آگے سفر جاری رکھا۔ چارکنٹون کی جھیل کنارے جا کر دو کمرے کرائے پر لئے اور شیلے نے رات کو اپنا ناول (The Assassins) پر کام شروع کر دیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی کمرے میں سٹوپ نے جلنے سے انکار کر دیا اور دُھواں پھیل گیا۔ تینوں جاگتے رہے اور لندن کے گھر، لندن کی آرام دہ زندگی اور لندن کے موسم کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر تینوں بیک زبان بولے ''لندن واپس چلا جائے۔''

شیلے کی جیب پھر خالی تھی۔ ایک جہاز کے کپتان نے ان پر رحم کیا اور لندن لے جانے کی حامی بھر لی اور تینوں جہاز پر سوار ہو گئے۔ شیلے ایک مسافر سے غلامی کے مکروہ قانون پر بحث کرتا رہا اور بحث کے خاتمے تک وہ لندن پہنچ گئے۔ شیلے کی جیب میں اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ بگھی کا کرایہ ادا کر سکے۔ بنک پہنچا تو بنک منیجر نے بتلایا کہ اس کی بیوی ہیریٹ (Harriet) نے سارے پیسے نکلوا لئے ہیں۔ شیلے سیدھا ہیریٹ کے گھر چلا گیا۔

ہیریٹ کو جب پتا چلا کہ شیلے واپس آ گیا ہے تو وہ خوش ہوئی کہ چلو صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا ہے لیکن جب ملی تو

معلوم ہوا کہ وہ بے وفائی کی تلافی کے لئے نہیں آیا۔ کچھ پیسے لینے آیا ہے تا کہ میری کو چند دن آرام سے رکھ سکے۔ اس نے شیلے کو کچھ پاؤنڈز دیئے تا کہ وہ کوئی گھر کرائے پر لے سکے۔ شیلے نے گوڈون سے ملنا چاہا لیکن اس نے ملنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنے دوست جان ٹیلر کو ایک شکایت بھرا خط لکھ کر شیلے کی غیر اخلاقی حرکت کی تفصیل بیان کی۔ اس نے لکھا:

''بڑی دردناک کہانی ہے۔ شیلے کا نام تو تم جانتے ہی ہو۔ میں تم سے بالکل نہیں چھپاؤں گا۔ شیلے ایک شادی شدہ آدمی ہے لیکن میری بیٹی میری کو بھگا کر لے گیا ہے۔ میری سکاٹ لینڈ سے آئی تو میں نے شیلے کو گھر کھانے پر بلایا۔ اس نے میری کو پہلی نظر میں پسند کیا اور پھر میری کے بارے میں اس نے مجھ سے بات کی کہ اسے میری سے عشق ہو گیا ہے۔ میں نے شیلے کی اس بات کی تائید نہ کی۔ 27 جولائی کی صبح میں سو کر اٹھا تو مجھے میری کے ایک کمرے سے ایک خط ملا جس سے پتا چلا کہ شیلے میری اور جین کلر ماؤنٹ کو لے کر فرار ہو گیا ہے''

لندن کے قیام کے دوران گوڈون نے اس سے ملاقات نہ کی۔ وہ ہیریٹ سے بھی نہ ملا۔ البتہ ایک صبح اس کی لینڈ لیڈی نے اسے بتلایا کہ ایک خط تمہارے نام آیا ہے۔ وہ خط گوڈون کی بیٹی فینری کا تھا جس میں شیلے کو خبردار کیا گیا تھا کہ جن سے تم نے قرض لیا ہے وہ اکٹھے ہو کر پولیس کے ذریعے تمہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے جتنی جلدی ہو سکے بھاگ جاؤ۔ چنانچہ شیلے میری کو لندن چھوڑ کر خود بائرن (Byron) کے پاس اٹلی چلا گیا۔ میری اور کلر ماؤنٹ بعد میں اس کے پاس پہنچیں۔

اٹلی میں بائرن کے ساتھ شیلے نے بڑا اچھا وقت گزارا۔ بائرن نے وہاں اپنے گرد لکھنے والوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا تھا۔ بائرن وہاں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ تمام لوگ جو لندن سے بھاگے تھے اس کے پاس وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں شیلے، میری شیلے، لی ہنٹ، کلر ماؤنٹ (کلر ماؤنٹ سے بائرن نے شادی کر لی تھی) اور شیلے اور بائرن کا دوست ٹری لانی شیلے کی موت تک یہ محفل جمتی رہی۔

شیلے نے کوئین میب کے بعد مسلسل لکھا اور یہ سلسلہ اس کی موت تک جاری رہا شیلے کی مشہور تصانیف جن سے اس کے نظریات اور شعری عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ کچھ یوں ہیں۔

1- Ozmandias
2- Ode to west wind
3- To A Skylark
4- Prometheus Unbound
5- Alastor
6- Adonais
7- The Revolt of Islam
8- The Triumph of Life
9- Zastrozzi (Novel)
10- St. Irvyne (Novel)
11- Mask of Anarchy

کارل مارکس، جارج برناڈ شا اور برٹرینڈ رسل نے شیلے کے شعری اور فکری نظام کو بہت سراہا ہے۔ احتجاج اور سیاسی

عمل میں عدم تشدد کے فلسفے پر عمل موہن داس کرم چند گاندھی نے شیلے ہی سے سیکھا ہے۔ گاندھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی گفتگو اور تقریروں میں Mask of Anarchy کا اکثر حوالہ دیا کرتا تھا۔ شیلے اپنی فکر اور نظریات کو پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکا۔ آنے والی نسلوں پر اس کے نظریات نے جو چھاپ چھوڑی وہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی زندہ ہیں۔

شیلے ساری زندگی بنی نوع انسان کی زندگی بدلنے کے خواب دیکھتا رہا۔ ایک ایسی نئی سوسائٹی ایک نئے سماج کے خواب جن میں انسانوں کے دکھ درد کا مداوا ہو سکے۔ وہ ہمیشہ معاشرے کے ان قوانین اور ان رکاوٹوں کے خلاف نبرد آزما رہا جو آزادی، انصاف اور سچائی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ انگلستان میں طویل عرصے سے بادشاہت اور آمریت کا تسلط تھا۔ شیلے اس کے خلاف تھا۔ اس عہد میں انسان کے بنیادی حقوق آمریت کے پیروں تلے روندے جا رہے تھے چنانچہ شیلے نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ انسان کے لئے ایک آزاد معاشرہ چاہتا تھا چنانچہ اس نے اس معاشرے کے خواب دیکھے اور یہ خواب وہ ساری دنیا کے انسانوں کو دکھانا چاہتا تھا اور ہوا کو وسیلہ بنا کر وہ اپنے خیالات کو پوری دنیا میں پھیلانا چاہتا تھا۔ شیلے کی ایک بڑی مشہور نظم اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ (Ode to the west wind) ان ہی تصورات، خیالات اور خوابوں کی عکاسی کرتی ہے۔ مغربی ہوا جو بہت طاقتور ہے، بہت وحشی ہے، بہت تیز رفتار ہے وہ اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

مغربی سمت سے آتی ہوئی اے وحشی ہوا
تیری موجوں، تیری لہروں کی سبک گامی سے
آسمانوں کی ترائی میں، خلل آیا ہے
برق و باراں کے فرشتے تیری ان موجوں میں
ایسے بکھرے ہیں کہ جیسے کوئی بے خود داسی
جذبہ جوشِ عبادت میں کرے رقص جنوں

....

اور پھر اپنا ذکر کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے:

ابر ہوں، موج ہوں، اک سوکھا ہوا پتا ہوں
دے سہارا مجھے اور بڑھ کے اٹھالے، مجھ کو
زیست کی کانٹوں بھری سیج پہ بکھرا ہوں میں
اور میرے جسم سے خوں بہتا ہے

ترجمہ: احمد عقیل روبی

شیلے مغرب کی وحشی ہوا سے کہتا ہے کہ تو ساری دنیا میں جاتی ہے۔ میرے خیالات اور افکار کو اپنے ساتھ لے جا۔ مجھے اپنا ساز بنا لے تا کہ میں دکھی انسانیت کو آزادی، انصاف اور ایک نئی دنیا کی بشارت دوں۔

جیسے جنگل سے گزرتی ہوئی تیری آواز
ساز بن جاتی ہے ...... وہ ساز بنا لے مجھ کو
روح بن جا تو میری آ......اے غضب ناک ہوا
میرے افکار پریشاں کو جہاں میں پھیلا

لے جا اے وحشی ہوا
ساری چنگاریاں اس بجھتے ہوئے چولہے کی
ان کو انسانوں میں جا کر پھیلا
اے ہوا دنیا کو جا کر یہ بشارت دے دے
موسم سرما اگر آ پہنچا
موسم گل بھی بہت دور نہیں

ترجمہ: احمد عقیل روبی

''موسم گل'' سے مراد شیلے کا وہ نئی دنیا کا خواب ہے جس میں مساوات، آزادی اور انصاف ہوگا۔

شیلے کی مشہور نظم کوئین میب کی اشاعت کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ انقلابی خیالات پر مبنی یہ نظم شیلے کے ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہے جن پر اس کے فکری اور شعری نظام کی بنیاد قائم ہے۔ شیلے پورے نظام کو بدلنا چاہتا تھا۔ معاشرے میں اصلاحی نظام لانا چاہتا تھا۔ جس میں عام انسان کو سہولت مل سکے۔ وہ فطری ماحول کو واپس لانا چاہتا تھا۔ وہ اس میں ایک جگہ کہتا ہے۔

''مجھے واپس اس دھرتی ماں کی طرف جانے دو، جہاں میں اپنے ہاتھوں سے کھیتوں اور جنگلوں سے اپنی خوراک حاصل کرسکوں۔''

شیلے نے اس کتاب کی اشاعت کا انتظام خود کیا۔ 120 کاپیاں پریس سے نکلوائیں۔ 50 جاننے والوں کو اس نے چوری چوری تقسیم کیں اور 70 پریس میں رکھوادیں اور سختی سے منع کردیا کہ یہ تقسیم نہ کی جائیں۔ جس دوست کے پاس یہ کاپیاں محفوظ تھیں اس کا نام ولیم کلارک تھا۔ 1821ء میں (شیلے کی وفات سے ایک سال پہلے) وہ یہ کتاب مارکیٹ میں لے آیا۔ بقول ایک نقاد، لوگ اس کتاب پر جھپٹ پڑے۔ شیلے نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خیالات کی وجہ سے لندن کے لوگوں میں اس کے خلاف مزید نفرت پھیلے۔ چنانچہ اس نے ولیم کلارک کے خلاف مقدمہ کیا۔ حکومت نے ولیم کلارک کو جیل بھیج دیا۔ کتاب ضبط کرلی۔ 1830ء میں اس کتاب کے 12 ایڈیشن چھپے۔ شیلے اپنے نظریات کی مقبولیت دیکھنے کیلئے زندہ نہ رہا۔ کہتے ہیں اتنا کچھ لکھنے کے باوجود شیلے کو اپنی شاعری سے ساری زندگی میں صرف 40 پاؤنڈ کا فائدہ ہوا۔ لیکن اسکے خیالات سے پوری دنیا مستفید ہوئی اور اسے یہاں تک مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کی شاعری اور اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ

"Shelley is as Sacred as the Bible"

(Jiddu. Krishnamurti)

شیلے کا ڈراما Prometheus un bound بڑی اہم تخلیق ہے۔ یونانی المیہ نگار اسکائی لیس کے مشہور ڈرامے Prometheus Bound کی یہ جدید شکل ہے شیلے نے اس میں اپنی فکر اور نظریات کو شامل کرکے اسے آزادی اور ظلم اور آمریت کے خلاف جدوجہد کا استعارہ بنادیا ہے۔ اسکائی لیس کے ڈرامے میں ہیرو Prometheus کو آسمان سے آگ چرا کر زمین کے انسان کو دینے کے جرم میں کاکیشیا کی چوٹی پر باندھ دیا گیا تھا جہاں عقاب دن بھر اس کو نوچتے رہتے تھے۔ شیلے نے اسے ایک ایسے انسان کا روپ دے دیا ہے جو ظلم اور آمریت کے خلاف سر نہیں جھکاتا۔ آمریت

کے خلاف جدوجہد جاری رکھتا ہے اور آخر فتح اس کی ہوتی ہے۔ اور وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ Rovolt of Islam اور To a Skylark میں قریب قریب انہی نظریات کا پرچار ہے۔

شیلے کے بارے میں نقادوں کا یہ خیال ہے کہ شیلے دراصل انسانوں کے اندر سوئے جذبوں کو جگانا چاہتا تھا۔ جو بات ٹالسٹائی نے بہت بعد میں کہی کہ انقلاب انسانوں کے اندر سے نمودار ہوتا ہے۔ شیلے اسی جذبے کو انسانوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ انسان خوشگوار زندگی صرف اس وقت گزار سکتا ہے جب وہ آزاد ہو اور اسی آزادی کے لئے شیلے انسانوں کو اکساتا ہے۔ شیلے کا نظریہ تھا کہ غلامی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ شیلے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پرندوں کو بھی پنجروں میں رکھنے کے خلاف تھا۔ پیرس سے جب وہ گدھے پر سامان رکھ کر لندن جا رہا تھا تو ایک گاؤں کے قریب اسے ایک چڑی مار ملا جو چڑیوں اور فاختاؤں کو پکڑ کر جا رہا تھا۔ شیلے نے اسے روکا اور سب پرندوں کی قیمت ادا کرکے پرندوں کو آزاد کردیا۔

شیلے رومانوی شعرا (ورڈز ورتھ، کولرج، بائرن اور کیٹس) میں سے واحد شاعر تھا جس میں غنائیت اور محسوس کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔ فطرت کی خوبصورتی اور حسن کا وہ زندگی بھر عاشق رہا۔ نقاد کہتے ہیں کہ ورڈز ورتھ آخری عمر میں نیچر سے کچھ دور ہو گیا تھا لیکن شیلے ساری عمر فطرت اور فطرت کی رعنائیوں میں ڈوبا رہا اور اسی سے اس نے انقلابی سوچ کو مضبوط تر بنایا۔ کزامیاں (Cazamian) اس کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

''شیلے کا تعلق انسانوں کے اس مخصوص گروہ سے تھا جنہوں نے جذبات اور ادراک کے مرکب سے انقلابی ذہن کو تیار کیا۔ بچپن سے جوانی تک یہ چنگاری اس کے اندر سلگتی رہی۔''

شیلے کو ساری زندگی مشکلات کا سامنا رہا جن کا شیلے نے بڑے صبر اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ یہ حوصلہ شیلے نے محبت سے حاصل کیا۔ اس کی محبت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی۔ اس کے حصار میں ہر جاندار مخلوق آتی تھی۔ جن میں جانور، پرندے، درخت، پھول، بادل، ہوا سب ہی شامل تھے۔ شیلے میں کائنات سے ہم کلام ہونے کا ہنر موجود تھا۔ وہ کبھی (To A Skaylark) سے مخاطب ہوتا ہے۔ کبھی West Wind سے اور کبھی بادل (Cloud) سے......!

اس کی نظم The Triumph of Life ہو یا کیٹس (Keats) پر لکھی گئی (Elegy) ڈراما The Cenci ہو یا نظم Cloud اس کی بے مثال غنائیت، تمثال اور جذبہ ہر سطر میں موجود ہوتا ہے۔

شیلے کے آخری ایام بائرن کے ساتھ اٹلی میں گزرے۔ جہاں اس کے ساتھ اس کے چند دوست بھی تھے جن میں مشہور شاعر لی ہنٹ اور ٹری لانی بھی تھا۔ سمندر اور سمندر کا پانی بچپن ہی سے شیلے کو بہت حیران کرتا تھا اور وہ کہتا تھا (Water is my Fate) اور یہ بات سچ ثابت ہوئی اور 8 جولائی 1822ء کو اپنی سالگرہ سے ایک ماہ تیس برس کی عمر میں پہلے شیلے ایک سمندر طوفان کی نذر ہو گیا۔ وہ بائرن کی کشتی (Don Juan) لے کر اپنے دو دوستوں کے ساتھ سمندری سفر پر جانے کے لئے تیار ہوا۔ کشتی کے ایک طرف اس نے (Ariel) کا نام لکھوایا۔ بائرن کو یہ بات پسند نہ آئی اور شیلے کو (Ariel) کے حروف مٹانے کے لئے کہا۔ شیلے نے یہ بات نہ مانی اور اپنے لئے دوسری کشتی حاصل کی۔ دوستوں کو ساتھ لیا اور سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ میری شیلے نے شیلے کی 1822ء میں لکھی نظموں پر دیباچہ لکھ کر ایک کتاب شائع کی تو اس کے دیباچے میں یہ بات لکھی کہ شیلے نے جس کشتی پر سفر شروع کیا وہ سفر کے قابل نہ تھی اسے لوگوں نے روکا مگر وہ سفر پر جانے کے لئے بضد تھا۔

شیلے کی موت کے بعد مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کسی نے کہا شیلے ان دنوں بہت ناامید تھا اور مرنا چاہتا تھا۔ کسی نے کہا اس کشتی کو بائرن کی کشتی سمجھ کر بحری قزاقوں نے لوٹنے کی غرض سے حملہ کیا۔ کسی نے اسکی موت کو سیاسی قتل قرار دیا۔ کیونکہ اس پر پہلے ایک حملہ ہو چکا تھا۔ بہر حال اس کی موت کے ایک دن بعد اخبار (The Courier) میں جلی حروف میں اس کی موت کی خبر چھپی۔

’’شیلے۔شاعر سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔اب اسے پتا چل گیا ہوگا کہ خدا ہے کہ نہیں۔‘‘

شیلے کو دفنایا نہیں جلایا گیا تھا۔ جب سمندر کے کنارے اس کی میت جل رہی تھی تو اس کے دوست ٹریلی وے نے شیلے کے جلتے جسم سے اس کا دل نکال لیا تھا۔ جو میری شیلے نے ایک شیشے کے برتن میں محفوظ کر لیا اور جب تک جیتی رہی اسے اپنے پاس رکھا۔میری کی موت کے بعد دل کو روم کے قدیمی چرچ کے قبرستان میں دفنا دیا گیا اور Heart of Hearts کی تختی لگا دی گئی۔

شیلے مر چکا ہے مگر مغرب کی وحشی ہوا میں اب بھی اس کا پیغام گونجتا ہے۔

روح بن جا تو میری آ۔اے غضب ناک ہوا
میرے افکار پریشاں کو جہاں میں۔ پھیلا
اے ہوا دنیا کو جا کر یہ بشارت دے دے
موسم سرما اگر آ پہنچا
موسم گل بھی بہت دور نہیں۔

جان کیٹس

(John Keats)

رومانوی تحریک کا سب سے کم عمر مگر صاحب اسلوب انگریزی شاعر، کیٹس جذبے، حسن اور تخیل کا شاعر ہے، شیلے بائرن اور کولرج کا ہمعصر، بہت کم لکھا مگر انگریزی شاعری پر دیرپا اثرات چھوڑے۔

مجھے صرف ایک چیز کا یقین ہے اور وہ ہے احساس اور جذبے کی سچائی۔ یہ دونوں چیزیں حقیقی حسن کو پا لیتی ہیں۔

(جان کیٹس)

....

حسن سچائی ہے اور سچائی حسن
سب کچھ یہی ہے
جو دنیا میں تمہیں جاننا چاہیے
اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں

(جان کیٹس)

....

کیٹس کہاں ہے؟
میں چاہتا ہوں وہ میرے پاس اٹلی آئے، تاکہ میں اس کی تیمارداری کروں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایسا کر کے ایک ایسے ہمعصر شاعر کی پرورش کروں گا جو فن اور شہرت میں مجھ سے آگے نکل جائے گا لیکن اس سے میری خوشی میں اضافہ ہوگا۔

(پی۔بی۔ شیلے)

جان کیٹس

محبت، شاعری اور زندگی گزارنے کے لیے قدرت نے کیٹس کو بہت کم وقت دیا۔ ویسے تو رومانوی شاعر بائرن (Byron) اور شیلے (Shelley) کی زندگی بھی بہت مختصر تھی مگر بہادر شاہ ظفر کا مصرع ''عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن'' کیٹس پر بڑا صادق آتا ہے۔ اس کی زندگی واقعی چار چھ دن ہی بنتی ہے۔ 19 سال کی عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کی۔ محبت کی شمع دل میں روشن کی اور 25 سال کی عمر میں موت اسے اٹھا کر لے گئی۔

بائرن اور شیلے نے زندگی گرچہ مختصر گزاری مگر زندگی کا ہاتھ پکڑ کر خوب دھما چوکڑی مچائی۔ عشق کیے، شاعری کی، لوگوں سے لڑائیاں لڑیں، گھومے پھرے مگر کیٹس بیماری کو سینے میں دبا کر میر تقی میر کی طرح غمزدہ رہا۔ اس کی تخلیقی زندگی چھ سال کا مختصر عرصہ ہے۔ اس مختصر عرصے میں اس نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو اس کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

جان کیٹس نے کسی کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ نہیں کھولی۔ کیٹس کا باپ لندن کے ایک شراب خانے میں (Barman) تھا۔ وہ اسے کسی اچھے سکول میں نہ پڑھا سکا۔ معاشی حالات نے راستہ روکا۔ (Enfield) کے ایک چھوٹے سے سستے سکول میں داخل کرایا گیا جہاں اتفاق سے ایک پڑھا لکھا ادبی ذوق رکھنے والا استاد John Clarke اسے مل گیا جس نے اس کی ادبی تربیت کی اور یونانی ادب کے تراجم سے متعارف کرا دیا۔ ایک دن باپ گھوڑے پر بیٹھ کر اسے ملنے کے لیے آیا۔ واپسی پر گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ کیٹس کا باپ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ باپ کی وفات کے چند ماہ بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرا خاوند اچھا آدمی ثابت نہ ہوا۔ ماں اس سے طلاق کے بعد کیٹس اور باقی بچوں کو لے کر اس کی دادی کے پاس چلی گئی۔ چند ماہ بعد ماں بھی مر گئی۔ اب کیٹس کی عمر 14 سال تھی۔ اسے سکول سے اٹھا لیا گیا اور خاندان کے ایک واقف سرجن ڈاکٹر کے پاس سرجری کی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ بقول کیٹس ''یہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ زمانہ تھا، جو اس نے ایک سزا سمجھ کر گزار دیا''۔

آج کے لندن کا ایک حصہ جو کیٹس کے زمانے میں (Guy) ہسپتال کہلاتا تھا۔ کیٹس کا قید خانہ تھا جس میں 1814ء سے 1816ء تک اس نے ادویات اور سرجری کی تعلیم حاصل کی۔ ہسپتال میں اسے چھوٹی موٹی نوکری بھی مل گئی۔ وہ اس ہسپتال میں تربیت حاصل کرتا رہا۔ دن کو پڑھتا، کلاس میں شریک ہوتا۔ رات کو سرجری روم میں سو جاتا اور شاعری کرتا۔ اس عرصے میں اسے ایک ہی خوف رہا کہ وہ شاعر نہ بن سکے گا۔ ادویات اور آلات سرجری کہیں اس سے شاعری کی تخلیقی طاقت نہ چھین لیں مگر ایسا نہ ہوا۔ یہاں آتے ہی اس نے اپنی پہلی نظم لکھی۔ 1816ء میں اسے ادویات سازی اور سرجری کی سند مل گئی۔ سند لے کر وہ اپنے گھر والوں اور پرورش کرنے والوں کے سامنے گیا۔ سند ان کے سامنے رکھی اور اعلان کر دیا کہ ''میں عطار نہیں شاعر ہوں اور شاعری کروں گا''۔

گھر والوں کے سمجھانے پر اس نے ہسپتال میں آنا جانا جاری رکھا لیکن زیادہ وقت شاعری اور ادب کو دیا۔ مشہور شاعر لی ہنٹ ان دنوں ایک رسالہ نکالتا تھا۔ جو نئے شاعروں کی نمائندگی کرتا تھا۔ کیٹس کے دوست (Cowden

(Clarke) نے کیٹس کا تعارف لی ہنٹ سے کرادیا جو مشہور شاعر شیلے کا بہت اچھا دوست تھا۔ لی ہنٹ نے کیٹس کی نظمیں اپنے رسالے The Examiner میں چھاپنا شروع کردیں۔ اسی کی وساطت سے کیٹس کی نظموں کا پہلا مجموعہ چھپ کر سامنے آیا۔ یہ زمانہ کیٹس کی زندگی میں ایک تبدیلی لے کر آیا اور انگریزی شاعری سے شناسائی رکھنے والے لوگوں میں اس کا نام گونجنے لگا لیکن ایک گروہ اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ ان نوجوان لکھنے والوں کے خلاف ایک تحریک چل نکلی۔ The Quarterly Review اور Black Woods میگزین خاص طور پر کیٹس کی شاعری کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے کیٹس کی شاعرانہ صلاحیت، زبان اور اسلوب پر کھل کر لکھا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ جا کر ادویات کی دکان کھولے۔ شاعری اس کے بس کا روگ نہیں۔

اگرچہ کیٹس کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی لیکن اس کی موت میں ان دو رسالوں کے تیکھے، بُرے تنقیدی مضامین کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ کیٹس کی موت پر شیلے نے درست کہا تھا کہ کیٹس کو (Black Wood) نے مار دیا۔

جان کیٹس 31 اکتوبر 1795ء میں پیدا ہوا۔ اس کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن سے اسے بہت محبت تھی۔

ادویات اور سرجری کی طرف (سند ہونے کے باوجود) کیٹس نے بالکل توجہ نہ دی اور اپنی مختصر زندگی کا سارا وقت شاعری کے کھاتے میں ڈال دیا۔ لی ہنٹ کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے لکھنے والوں سے متعارف ہو گیا اور لکھنے والے اس کی شاعری کو ایک ''نئے سکول'' کا نام دینے لگے۔

حسن اور تخیل کا اس نے اپنی شاعری میں ایک ایسا باغ لگایا کہ اس کے پھولوں کی مہک سے انگریزی شاعری کی دنیا بے خودی کی فضا میں لڑکھڑانے لگی۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

مجھے صرف ایک چیز کا یقینی طور پر احساس ہے اور وہ ہے جذبے کی سچائی، تخیل کی صداقت اور یہ دونوں چیزیں حقیقی حسن کو پالیتی ہیں''۔

اپنی مشہور زمانہ نظم Ode to a Grecian urn میں یہ لافانی سطور لکھ کر اس نے اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

حسن سچائی ہے اور سچائی حسن
سب کچھ یہی ہے
جو دنیا میں تمہیں جاننا چاہیے
اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں

کیٹس نے ایک ہمدرد اور ایک مخالف گروپ کے درمیان زندگی کے دن گزارے۔ ہمدرد گروپ میں بائرن، لی ہنٹ اور شیلے تھے جنہوں نے اس کی شاعری کی تعریف کی اور اچھے کلمات کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ مخالف گروپ میں یہی دو میگزین تھے۔ اس رسالے میں لکھنے والوں نے اس کی شاعری کو بُری طرح تنقید کا نشانہ بنایا اور اس کی شاعری کو The Cockeny School (لندن کی پرانی زبان) کا نام دیا لیکن کیٹس شاعری کرتا رہا۔ اسے بیماری کے باوجود زندہ رکھنے میں اس شدید محبت کا ہاتھ تھا جو اس نے Fanny Brawne سے کی۔ (Fanny Brawne) سے اس کا عشق خالص مشرقی روایتی انداز کا عشق تھا۔ ضبط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ محبوب کا دیکھنا، چپ رہنا، دیکھتے رہنا اور پھر تنہائی میں اس کی یادوں سے باتیں کرنا۔ عشق کی یہ گہرائی اور محبت کا یہ والہانہ پن باقی رومانوی شاعروں سے کیٹس کے ہاں مختلف انداز میں ملتا ہے۔ کیٹس نے بائرن اور شیلے کی طرح اپنی شاعری میں کسی انقلاب کی دعوت نہیں دی۔ بس اپنے محبوب سے

محبت کر کے تخیل اور حسن کی انتہائی بلندیوں کو چھوا ہے۔ (Fanny Brawne) اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ روز اس سے ملنے گھر آتی۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ کیٹس بیمار تھا لیکن اس کے آنے سے وہ اپنی بیماری کو بھول کر گھنٹوں اپنی شاعری کے بارے میں گفتگو کرتا رہتا۔ اپنی مشہور نظم (Bright Star) اس نے فینی کے ساتھ بیٹھ کر لکھی اور کانٹ چھانٹ کی۔ دونوں اپنی محبت کا اظہار چھوٹی چھوٹی کاغذ کی چٹوں پر کیا کرتے تھے۔ فینی نے کیٹس کو خطوط لکھے۔ کیٹس نے ان کا جواب لکھا۔ کیٹس کی موت کے بعد فینی کے تمام خطوط ضائع کر دیئے گئے لیکن کیٹس کے خطوط چھپوائے گئے۔ جن کا انگریزی ادب میں اہم مقام ہے۔

کیٹس کی زندگی میں فینی سے پہلے ایک خاتون اور بھی آئی اس کا نام ازابیلا جونز تھا، وہ شاعری کو تو اتنا نہیں سمجھتی تھی لیکن اسے تھیٹر سے بڑا لگاؤ تھا۔ کچھ عرصہ کیٹس کی زندگی میں وہ رہی اور کیٹس نے اس کے ساتھ زندگی کا کچھ عرصہ بہت رومانوی فضا میں گزارا، لیکن جب فینی کیٹس کی زندگی میں آئی تو اس کا نقشہ ہی بدل گیا اور وہ حسن اور سچائی کے مفہوم کو پا گیا۔ ازابیلا جونز کی محبت کیٹس کے نزدیک شاید جسمانی محبت تھی۔ فینی اس کے لیے روحانی بلندیوں کو چھونے کا سبب بنی۔

کیٹس کو اپنے بھائی ٹام کی تیمارداری میں ایک عرصہ گزارنا پڑا۔ ٹام ٹی۔ بی کا مریض تھا۔ چھوت چھات کی یہ بیماری کیٹس کو بھی لگ گئی۔ بھائی مر گیا۔ مگر وہ جاتے جاتے یہ موت کیٹس کی جھولی میں ڈال گیا۔ کیٹس دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا عادی تھا۔ 1818ء میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ گیا۔ کچھ عرصہ (Well Walk) کے علاقے میں ٹھہرا۔ پھرتے پھراتے سب دوست جولائی کے مہینے میں (Mull) کے جزیروں میں پہنچے۔ وہاں سے واپس آیا تو ٹی۔ بی کی بیماری اسے اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

فینی سے عشق کیا اور لازوال عشقیہ خطوط لکھے۔ لازوال شاعری کی۔ اس کی شاعری اس کی محبت ہے اور محبت اس کی شاعری۔ کائنات کی جس چیز پر بھی نظر ڈالی اس میں سچی محبت شامل کر کے اسے لازوال بنا دیا۔ اس کی لکھی ہوئی نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔ اس کا دوست (Brown) اس کی نظم Ode to a Nighting کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''1819ء میں میرے گھر کے قریب ایک کوئل نے درخت پر گھونسلا بنالیا تھا۔ کیٹس کو اس کی آواز میں ایک درد اور کشش نظر آئی۔ وہ صبح ناشتے کے بعد میز کرسی بچھا کر درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ جب کمرے میں واپس آتا تو کاغذوں پر اشعار کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ یہ نظم اسی عمل کے بعد مکمل ہوئی۔''

کیٹس کے خطوط کو انگریزی رومانوی نثر میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی رائے میں یہ اعلیٰ پائے کے رومانوی خطوط ہیں۔ کیٹس کے یہ خطوط اس کی ذاتی رومانی زندگی، شاعری کی اہمیت اور شاعری کے بارے میں اس کے خیالات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ کیٹس ایک بیمار آدمی تھا۔ ایک ایسا بیمار آدمی جسے بیماری آہستہ آہستہ ہاتھ پکڑ کر موت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ کیٹس اس سے آگاہ تھا اور وہ جاتے جاتے اپنی محبوبہ، رشتہ داروں اور دوستوں سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ ان خطوط میں کہنے کی کوشش کی ہے۔

کیٹس کی مختصر زندگی دُکھ درد، مصیبت آلام اور بیماری سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ 8 سال کی عمر میں باپ مرا، 14 سال کی عمر میں ماں مر گئی۔ پھر بھائی فوت ہو گیا۔ بیمار بھائی کی تیمارداری کے صلے میں بیماری ملی جو اس کے لیے جان

لیوا ثابت ہوئی۔ اور پھر فینی کے عشق کا عذاب۔ بس کیٹس میر تقی میرؔ کی طرح ساری زندگی دُکھ درد سمیٹتا رہا اور انہیں گیتوں کی شکل دیتا رہا۔ میر تقی میرؔ اور کیٹس کا دُکھ مشترک تھا۔ دونوں کا المیہ ایک، دونوں کے مصائب و آلام ملتے جلتے۔ میر تقی میرؔ ذرا ہمت والے تھے دُکھ درد ڈھوئے اور لمبی زندگی جی گئے مگر کیٹس جلدی ہمت ہار گئے، مگر دونوں کی شاعری کا مقصد ایک تھا۔ میر تقی میر نے کہا

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
کتنے دُکھ درد کیے جمع تو دیوان ہوا

کیٹس نے بھی یہی بات کہی:

"Our Sweetest Songs are those that Tell us Saddest Thoughts."

کیٹس کے زیادہ خطوط فینی کے نام ہیں۔ وہ اسے روز خط لکھتا تھا۔ خط لکھ کر اس کے ہاتھ میں دیتا۔ وہ گھر جا کر پڑھتی اور پھر جواب لکھ کر اسے کے تکیے کے نیچے رکھ دیتی۔ ان خطوط میں کیٹس کی بے تابی، بے چینی اور جذباتی والہانہ پن نظر آتا ہے۔ شاید کیٹس فینی کو خط لکھ کر موت سے چند لمحوں کے لیے دور ہو جانا چاہتا تھا۔

فینی اس کے پڑوس میں رہتی تھی، وہ اپنی بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلے وہ کیٹس سے اظہار محبت میں جھجھک محسوس کرتی رہی پھر اظہار محبت کر لیا۔ دونوں کے عشق کا انداز خالص مشرقی تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنا، کچھ کہتے کہتے رُک جانا، مل کر بچھڑنا اور پھر اداس ہونا۔ کیٹس جب اپنے آخری سفر پر روم کی طرف روانہ ہوا تو دونوں کی منگنی ہو چکی تھی شادی کی بات پکی ہو گئی مگر بات پوری نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر کیٹس آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے روم روانہ ہو گیا اور روم ہی میں فوت ہو گیا۔ اپنی محبوبہ کو لکھے چند خطوط میں کیٹس کی کیفیت دیکھیے۔

پیاری خوبصورت فینی

میں اپنا آج گزشتہ کل کی یادوں میں جی رہا ہوں۔ اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ وعدہ کرو اور لکھ کر وعدہ کرو کہ تم مجھ پر کبھی کل سے کم مہربان نہیں ہوگی۔ ہم دونوں اکیلے کب مکمل دن گزاریں گے۔ میری روح اور محبت نے ہزاروں بوسے تمہارے لئے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔

(11 اکتوبر 1819ء)

....

پیاری فینی

اس وقت میں اپنے لکھے ہوئے اشعار کو دوبارہ نقل کرنا چاہتا ہوں لیکن انہیں نقل کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں کیونکہ میرے دل و دماغ پر تمہارا قبضہ ہے۔

فینی تمہاری محبت نے مجھے خود غرض بنا دیا ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں ہر چیز فراموش کر چکا ہوں، بس میرے ذہن پر ایک ہی چیز کا جنون سوار ہے اور وہ ہے تم سے ملنا۔ تمہاری جدائی کا خوف مجھے پریشان رکھتا ہے۔ تم کبھی بھولے سے بھی بچھڑنے کی بات نہ کرنا۔ لوگ مذہب کے لیے جان دیتے ہیں اور شہید کہلاتے ہیں۔ میرا مذہب تمہاری محبت ہے، میں تمہارے لیے جان دے کر شہید محبت کہلانا چاہتا ہوں۔ فینی میں تمہارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔

(13 اکتوبر 1819ء)

....

پیاری فینی

میں تین دن بعد خواب سے بیدار ہوا ہوں اور پھر خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ رات میری حالت بہت بُری تھی۔ کہنے کو میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مسز (Dilke) تمہیں بتائیں گی کہ میں Hampstead میں رہنا چاہتا ہوں اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑنا چاہتا ہوں۔ میں بہت بے صبر ہو گیا ہوں۔ میرا دماغ کپکپا رہا ہے۔ پتا نہیں میں کیا کیا کہہ رہا ہوں۔

(19 اکتوبر 1819ء)

....

پیاری فینی

اگر بیماری سے تمہاری آنکھوں میں رضا مندی اور محبت کے اقرار کی کیفیت اس طرح جھلملا سکتی ہے تو کبھی کبھی بیمار ہونا ہی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ میں تمہارے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتا۔ کل رات جب مجھ پر شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ جب میرا سارا خون میرے پھیپھڑوں کی طرف دوڑ آیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اب شاید زندہ نہ رہوں تو اس وقت میں صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔

(فروری 1820ء)

....

مصیبت، بیماری اور دکھ کے ان آخری دنوں میں شیلے (Shellley) نے اس کا بڑا ساتھ دیا اسے اپنے پاس آنے کے لیے کہا تاکہ اس کی تیمارداری کر سکوں۔ اس نے لی۔ ہنٹ کی بیوی کو خط لکھا۔

کیٹس کہاں ہے؟

میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس اٹلی آئے تاکہ میں اسکی تیمارداری کر سکوں۔ توجہ دے سکوں، اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں روحانی اور جسمانی طور پر اس کا معالج بننا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایسا کر کے اپنے ایک ایسے ہمعصر شاعر کی پرورش کروں گا جو فن اور شہرت میں مجھ سے آگے نکل جائے گا۔ لیکن اس سے میری خوشی میں اضافہ ہوگا۔

(29 اکتوبر 1820)

....

کیٹس نے اس محبت بھری دعوت کا بہت عاجزی سے جواب دیا۔ اس نے شیلے کی دعوت کو قبول نہ کیا لیکن موت اس کا ہاتھ پکڑ کر روم لے گئی۔ 1820ء میں موت اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ بڑی مقدار میں خون جسم میں ختم ہو گیا۔ اس کا دوست جوزف سیورن (Severn) اسے لے کر اٹلی کی طرف روانہ ہوا۔ کیٹس اسے افیون کی بوتل خریدنے پر زور دیتا رہا مگر سیورن کو خوف تھا کہ بیماری کی شدت سے کیٹس افیون کھا کر خودکشی نہ کر لے۔ سیورن نے بوتل خرید لی لیکن کیٹس کو نہ دی۔ 23 فروری 1821ء کی صبح روم میں اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ صبح چار بجے کیٹس درد سے چلا کر پکارا۔

''سیورن مجھے اٹھاؤ میں مر رہا ہوں۔ فکر نہ کرو، میں بہت سکون سے مر جاؤں گا۔ شکر ہے آخر موت آ ہی گئی۔''

سیورن نے اسے اٹھا کر باہوں میں لیا۔ بلغم سے کیٹس کا منہ بھر گیا، سانس رُک گئی اور وہ فوت ہو گیا۔ دوستوں نے

اسے روم ہی میں دفن کر دیا۔ اس کی خواہش کے مطابق قبر پر ایک پتھر لگا دیا گیا۔ جس پر کیٹس کا کہا ہوا اپنا جملہ لکھ دیا گیا۔

"Here Lies one Whose Name was Writ in Water."
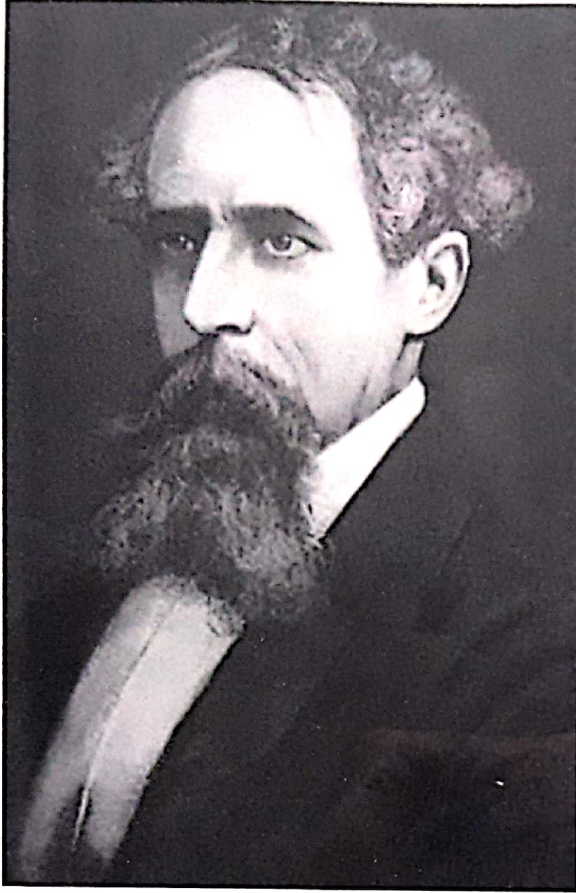
چارلس ڈکنز

(Charles Dickens)

انیسویں صدی کا مشہور انگریزی ناول نگار، اس کے ناول اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چارلس ڈکنز کا عہد اس کی کہانیوں میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ دکھی انسانیت کا لکھاری ،لاوارث بچوں، مچھیروں، چرچ کے فقیروں کی آواز ، سب کچھ اس کے ناولوں میں موجود ہے۔

’’وہ ہر بڑے اداکار سے بڑا اداکار تھا۔ ایک ایسا اداکار جو ایک ہیٹ کے نیچے پورا تھیٹر لے کر آتا تھا۔‘‘

(کارلائل)

....

ڈکنز کی شہرت اور فن نہ رکنے والا کارواں ہے۔ روسو، گوئٹے، ٹالسٹائی اور دوستوئیفسکی کا وہ پسندیدہ مصنف ہے۔ اس سے انہوں نے فیض حاصل کیا۔

....

’’وکٹوریہ ایک ملکہ تھی اس کی شہرت اس کے زمانے تک محدود ہے لیکن ڈکنز کی ’’پک وک پیپرز‘‘ ہر زمانے کے لئے ہے اور رہے گی۔‘‘

چارلس ڈکنز

میرے گرو انتظار حسین شاعروں کی محفل میں اکثر کہا کرتے ہیں کہ تم داد سمیٹنے میں ہم نثر نگاروں سے ہمیشہ بازی لے جاتے ہو۔ شعر سنایا اور واہ واہ کے پھول دامن میں بھر لئے۔ نثر نگار بے چارہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کب کوئی اس کی کتاب پڑھے، کب ملاقات ہو اور داد دے۔ نثر نگار کو داد تو ملتی ہے مگر ذرا دیر میں اور تم شاعر لوگ محفل ہو یا گلی کی نکڑ، شعر سنایا۔ داد لی اور چلتے بنے۔ انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے افسانہ، ناول تو آدمی آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے تو پڑھتا ہے۔ شاعر فوراً لین دین کر لیتا ہے لیکن انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنز نے سارے دھونے دھو دیئے۔ یوں داد سمیٹی کہ شاعر اس کا منہ دیکھتے رہے اور وہ لندن کے ہر چھوٹے بڑے کا محبوب بن گیا۔

چارلس ڈکنز کے اخبار میں قسط وار چھپنے والے ناول جب کتابی شکل میں چھپ کر مارکیٹ میں آئے اور اس کا نام گلی گلی گونجنے لگا تو اس نے محفل میں جا کر ناول پڑھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں سٹیج پر آتا اور ڈرامائی انداز میں ناول کے خاص حصے پڑھنا شروع کر دیتا۔ لوگ سانس روک کر اس کی طرف دیکھتے اور بت بن جاتے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ وہ کچھ نسوانی کرداروں کو بھی سٹیج پر لے آتا اور ناول کو باقاعدہ سٹیج پر (Perform) کرتا تھا۔ لوگ بے چینی سے اس تاریخ کا انتظار کرتے جب چارلس ڈکنز نے اپنا ناول پڑھ کر سنانا ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ہر قسم کے کردار کرنے پر بڑا عبور حاصل تھا۔ کارلائل (Carlyle) کا کہنا ہے:

’’وہ ہر بڑے اداکار سے بڑا اداکار تھا۔ ایک ایسا اداکار جو ایک ہیٹ کے نیچے پورا تھیٹر لے کر آتا تھا۔‘‘

اس نے یہ ’’ریڈنگ شوز‘‘ لندن کے علاوہ امریکا میں بھی کئے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف دو سال میں ان ’’شوز‘‘ سے ہونے والی آمدنی 54000 پاؤنڈز تھی۔

دو سال میں 54000 پاؤنڈز کمانے والے چارلس ڈکنز کا بچپن بہت ہی مفلسی میں گزرا۔ اس نے بہت دھکے کھائے، کپڑے دھوئے، برتن مانجھے، گھر میں جھاڑو دی اور گالیاں کھائیں۔ فرانسیسی فلاسفر روسو اور چارلس ڈکنز کا بچپن بہت ہی ملتا جلتا ہے۔ بس دونوں کے باپ عادات کے لحاظ سے ذرا مختلف تھے۔ روسو کا باپ بہت ایماندار اور محنتی تھا لیکن چارلس ڈکنز کا باپ بہت لالچی، بے ایمان اور فراڈیا آدمی تھا۔ روسو کا باپ جیل سے ڈر کر جنیوا سے بھاگ گیا۔ ڈکنز کے باپ کو پولیس نے قرض لے کر ادا نہ کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیا۔ روسو کو اس کے رشتے داروں نے محنت مزدوری کی بھٹی میں جھونکا۔ چارلس ڈکنز کو اس کے ماں باپ نے فیکٹری میں 6 شلنگ پر خود فیکٹری میں مزدوری کرنے بھیجا۔ روسو کو عشق کرنے کی بیماری بچپن ہی میں لاحق ہو گئی تھی۔ چارلس ڈکنز نے یہ مرض اس وقت پالا جب جیب میں چار پیسے آ گئے۔

چارلس ڈکنز 7 فروری 1812ء کو پورٹ ماؤتھ میں پیدا ہوا۔ جان ڈکنز کا یہ دوسرا بچہ تھا باقی چھ بچے اس کے بعد پیدا ہوئے۔ چارلس ڈکنز کا باپ نیوی کے لیے آفس میں کلرک تھا۔ روسو کی بدنصیبی تو ماں کے مرنے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی مگر چارلس ڈکنز پر سختیوں اور مصیبتوں کی بارش دس سال کی عمر میں شروع ہوئی۔ چارلس ڈکنز کا باپ بڑا فضول خرچ

آدمی تھا۔ اسے ہر وقت ایسے بے وقوف آدمی کی تلاش رہتی تھی جس سے وہ قرض لے سکے۔ قرض واپس کرنے کی عادت اسے بالکل نہ تھی۔ چنانچہ ڈکنز نے ابھی سکول جانا شروع ہی کیا تھا کہ اس کے باپ کو ایک عدالت نے نادہندہ قرار دے کر مارشل سی (Marshalsea) کے جیل خانے میں بھیج دیا۔ خاندان کے حالات پہلے ہی خراب تھے چنانچہ ڈکنز کی ماں مارشل سی جیل کے جیلر کے پاس چلی گئی اور اس سے اجازت حاصل کر لی کہ جب تک جان ڈکنز کی سزا ختم نہیں ہو جاتی اسے بچوں سمیت جیل خانے کے احاطے میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اس زمانے کے قوانین اس رعایت کی اجازت دیتے تھے۔ چنانچہ اسے اجازت مل گئی لیکن گھر کا خرچہ پورا کرنے کے لئے چارلس ڈکنز کو سکول چھوڑ کر مزدوری شروع کرنا پڑی۔ اس کی ماں کا ایک رشتے دار جیمز لیمرٹ ایک فیکٹری میں حصے دار تھا جس نے اس کو چھ شلنگ ہفتے پر فیکٹری میں ملازم رکھ لیا۔ یہاں کام بوتلوں کو دھونا اور ان پر لیبل چسپاں کرنا تھا۔ پھر جوتوں کی ایک فیکٹری میں وہ جوتے پیک کرنے کا کام کرتا رہا۔ اس دوران چارلس ڈکنز کی دادی فوت ہو گئی اور جان ڈکنز کو جیل سے رہائی مل گئی۔ ہوا یوں کہ بڑی بی جاتے جاتے اچھی خاصی رقم اپنے دو بیٹوں کے نام چھوڑ گئی۔ جان ڈکنز کو اپنا حصہ ملا تو وہ قرض ادا کر کے جیل سے باہر آ گیا۔ چارلس ڈکنز کو فیکٹری سے ہٹا کر سکول میں داخل کرا دیا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا وہ ایک بار پھر قرض لے کر جیل چلا گیا۔ چارلس ڈکنز کی ماں نے اپنے علاقے میں ایک پرائیویٹ سکول کھول لیا۔ چارلس ڈکنز کی ڈیوٹی تھی کہ وہ گھر گھر سکول کے اشتہارات تقسیم کرے اور بچوں کو سکول آنے کے لئے رضامند کرے۔ سکول زیادہ دیر نہ چلا اور قرضے بڑھتے چلے گئے۔ باپ جیل سے باہر آ گیا اور چارلس کو ایک وکیل کے دفتر ملازم کرا دیا۔ یہیں اس نے شارٹ ہینڈ سیکھی بعد ازاں اسے ہاؤس آف کامن (House of Commons) میں رپورٹر کی نوکری مل گئی۔ اس نوکری کے دوران کیوپڈ کا پہلا تیر چارلس ڈکنز کے دل پر لگا اور ماریہ بیڈنل (Maria Beadnell) سے عشق ہو گیا۔ ماریہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ تعلقات آگے بڑھے لیکن جب ماریہ کو پتا چلا کہ اس کا عاشق صرف باتیں کرتا ہے جیب میں پیسہ دھیلا نہیں تو وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ عرصہ دراز کے بعد ملی جب وہ لندن کی محبوب ترین شخصیت بن چکا تھا اور ماریہ کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے چارلس ڈکنز کے ڈراموں میں کردار کئے اور ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے کردار ڈورا (DORA) کا ماڈل بنی۔

وکیل کی ملازمت اور ہاؤس آف کامن کی رپورٹنگ سے چارلس ڈکنز نے بہت کچھ سیکھا۔ وکیل کے ساتھ وہ عدالت میں جاتا تھا مروجہ اچھے برے قوانین سے اس کی واقفیت ہوئی اور عدالت میں وکلا کی بحث سے بہت کچھ سیکھا اس مشاہدے اور تجربے سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ یہ اس کا چار سالہ تجربہ تھا۔ جو اس نے بلیک ہاؤس (Bleak House) میں استعمال کیا چارلس ڈکنز کی پہلی کہانی لندن کے ایک ماہنامے میں چھپی اس کا نام A Dinner at Popular Walk تھا۔ کہانی کی خاص بات یہ ہے کہ جس پریس میں یہ رسالہ چھپ رہا تھا چارلس ڈکنز ساری رات باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا رہا اور دوسرے دن چھپی ہوئی کہانی دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ ڈکنز نے اس کہانی کے بعد "کرانیکل مورننگ" کے لئے اسکیچ لکھنے شروع کر دیئے جس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کے الیکشن کی مہم پر گاؤں گاؤں جاتا تھا۔ اس کی رپورٹ بھی اخبار میں لکھتا تھا۔ چارلس ڈکنز کا نام لوگ جاننے لگے اور جب رسالے میں قسط وار اس کا پہلا ناول "پک وک پیپرز" چھپنا شروع ہوا تو لوگ متوجہ ہوئے اور جب ناول کتابی شکل میں چھپ کر باہر آیا تو چارلس ڈکنز مشہور ہو چکا تھا۔ ناول کے چھپنے سے پہلے اس نے "مارننگ کرانیکل" کے ایڈیٹر جارج ہوگرتھ (George Hograth) کی بڑی بیٹی کیٹ (Kate) سے شادی کر لی۔ اس کی سات بہنیں اور بھی تھیں جب اسے لے کر وہ نئے گھر

میں منتقل ہوا تو اس کی 16 سالہ سالی میری بھی رہنے کے لئے ساتھ ہی آ گئی۔ جن دنوں وہ "پک وک پیپرز" لکھ رہا تھا اسے اولیور ٹوسٹ (Oliver Twist) کی قسط بھی اخبار کو دینا پڑتی تھی۔ اس نے دونوں ناولوں [illegible] رکھے تھے۔ پندرہ دن "اولیور ٹوسٹ" کے لئے اور پندرہ دن "پک وک پیپرز" کے لئے۔

چارلس ڈکنز کے سب ناول اخبار میں قسط وار چھپے جس کے لئے لندن کے لوگ بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ اردو ادب میں بھی "فسانہ آزاد" مشہور اخبار "اودھ پنچ" میں قسط وار چھپا اور اسے ہم باوجود چند خامیوں کے کلاسیک کا درجہ دیتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار نے اسے اتنا طویل بنا دیا کہ وہ اگلی قسط لکھتے ہوئے پچھلی قسط کے کردار بھول جاتے تھے اور شاید اسی طوالت کی وجہ سے وہ پلاٹ کی چولیں نہ کس سکے لیکن چارلس ڈکنز کو قسط وار ناول لکھتے ہوئے بھی الجھن نہیں آئی۔ واقعات، کردار نگاری، اسلوب بیان، ڈکشن اور ماحول کی عکاسی ہر ایک چیز نپی تلی ہوتی ہے۔ کیٹ (KATE) نے چارلس ڈکنز کے دس بچوں کو جنم دیا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی توانا اور زرخیز نہ تھی اسے سوائے گھر اور بچوں کے ادب اور ڈکنز کے خیالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ یہ دلچسپی میری (Mary) نے لی اور ڈکنز کے قریب آ گئی۔ ڈکنز اس کی بہت تعریف کرتا تھا اور یہ تعریف آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی لیکن میری شاید کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکی۔ ایک رات تینوں تھیٹر دیکھنے گئے واپس آئے تو میری کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آئے اس نے ڈکنز کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔ اس کی موت کا ڈکنز کو ساری عمر دکھ رہا وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"میری چلی گئی ہے۔ میں اس کے لئے دعا گو ہوں اور ایک دن میں بھی مر کر اس سے جا ملوں گا۔"

اس نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ "اس کی قبر میری کی قبر کے ساتھ بنائی جائے۔"

چارلس ڈکنز بہت محنتی آدمی تھا۔ ایک کتاب ختم کر کے دوسری کتاب کا مسودہ تیار کرنا شروع کر دیتا۔ وہ لوگوں کی دلچسپی کیلئے لکھتا تھا اور اسکی نظر لوگوں کے ردِعمل پر رہتی تھی۔ وہ ماہانہ ہفت روزہ اور روزنامہ اخباروں کیلئے لکھتا تھا، چارلس ڈکنز نے بہت لکھا اور معیاری لکھا باوجود اس کے کہ وہ مسلسل لکھتا تھا۔ اس نے اپنی تحریروں کا معیار کم نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے اپنے ناولوں میں انسانوں کی زندگی کی عکاسی کی۔ اس کے سارے ناول اس کی اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدے پر مبنی ہیں۔ ہر دور کے قاری نے اس کی تحریروں میں اپنے آپ کو موجود پایا۔ اس کی کتاب "پک وک پیپرز" کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے:

"وکٹوریہ ایک مشہور ملکہ تھی اس کی شہرت اس کے زمانے تک محدود ہے لیکن ڈکنز کی "پک وک پیپرز" ہر زمانے کیلئے ہے اور رہے گی"

ڈکنز کی شہرت اور اس کا فن ایک نہ رکنے والا کارواں ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔ روسو، گوئٹے، ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کا وہ پسندیدہ مصنف تھا اور اس سے انہوں نے بہت فیض حاصل کیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبتے ابھرتے کرداروں کی تشکیل کی۔ ان کے مصائب، ان کی خوشیاں، چارلس ڈکنز کے تخیل اور اسلوب سے اس طرح ابھری ہیں کہ وہ جاوداں بھی ہو گئیں۔

پک وک پیپرز، اولیور ٹوسٹ، گریٹ ایکسپکٹیشن، اے ٹیل آف ٹو سٹیز اور ڈیوڈ کوپر فیلڈ اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ 11 ناول ہیں اور بے شمار کہانیاں، ڈرامے، مضامین اور خاکے ہیں۔ اس کے پسندیدہ موضوعات لندن، لندن کے لوگ، لندن کی زندگی۔ انسان اس کے دکھ درد، اس کی زندگی کے نشیب و فراز، خوشیاں، کمینگیاں، سازشیں اور وہ سب

کچھ جوانسان کر سکتا ہے۔ کردار نگاری چارلس ڈکنز کی سب سے بڑی صفت تھی۔ وہ کرداروں کی بنت اتنی ہنر مندی سے کرتا تھا کہ ان کے خارجی افعال اور داخلی نفسیات کھل کر سامنے آجاتی تھی۔ وہ دکھاتے تھے اس کی خوشبو، جس برے ماحول میں سانس لیتے تھے اس ماحول کی بدبو، قاری تک پہنچ جاتی تھی اور کردار پڑھنے والے کے سامنے آکر باتیں کرنے لگتا تھا۔

چارلس ڈکنز کے بائیوگرافر جان فاسٹر کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں خود کچھ نہیں بتلاتا وہ کرداروں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خود اپنے بارے میں قارئین کو بتلاتے ہیں۔ پہلی کتاب ''پک وک پیپرز'' سے لیکر آخری ناول تک اس کے بے شمار کردار مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کرداروں کے نام اور ان کی عادات انگریزی ادب کی جان سمجھی جاتی ہیں۔ ٹائنی ٹم، جیکب مارے، اولیور ٹوسٹ، پپ، مسس ہویشم، ڈیوڈ کوپر فیلڈ، سیموئیل پک وک، میکاؤبر، ڈورا، بیسٹی۔ سب کے سب مانے جانے کردار ہیں۔

چارلس ڈکنز کا اسلوب بہت سادہ اور شاعرانہ ہے۔ وہ انگریزی اشرافیہ کی بناوٹی زندگی پر طنز کرتا ہے۔ اس کی آنکھ لندن کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی ہے۔ سکول، ہوٹل، مسافر خانے، بندرگاہ، جہاز، جہازوں کے ملاح، مچھیرے، دریائے ٹیمز (Thames) کے کنارے بسنے والے مفلس، لندن کی گلیوں میں بیٹھی عورتیں، گرجا گھروں میں بھیک مانگنے والے لوگ، غریبوں کی بستیاں، امرا کا فرنیچر، مضافات کے لوگ، غرض اس کی تحریروں میں 18 ویں صدی کا انگلستان اور لندن سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔

چارلس ڈکنز نے ساری زندگی ایک جن کی طرح تخلیقی کام کیا۔ اس نے طویل ناول لکھے۔ رسالے نکالے، کچھ رسالوں کی ادارت کی، کچھ عرصہ ایک روزنامے کو بحثیت مدیر چلایا کچھ سہ ماہی رسالوں میں قسط وار مضامین لکھے۔ محفلوں میں تقاریر کیں۔ ادبی تقریبوں میں مقالے پڑھے۔ جلسوں میں اپنے ناولوں کے مناظر کی ڈرامائی تشکیل کی ان اجلاس کو Reading Shows کا نام دیا گیا تھا۔ یہ شوز کرنے اس نے دو بار امریکہ کا دورہ کیا جہاں اس کا ایک سربراہ مملکت کی طرح استقبال کیا گیا۔ 20 میل روزانہ گھڑ سواری کی، محفلوں میں ڈانس کیا، بچوں کو خوش کرنے کیلئے کرتب سیکھے اور پھر محفلوں میں یہ کرتب دکھائے، تھیٹر میں اداکاری کی، اسے تھیٹر میں کام کرنے کا بہت شوق تھا، اس نے اپنے ایک اداکار دوست سے باقاعدہ اداکاری سیکھی، اس اداکار کا نام ولکی کولنز Wilkis Collins تھا۔ لمبے لمبے سین زبانی یاد کئے۔ ولکی کولنز کے ساتھ مل کر اس نے ایک ڈرامہ (The Frozen Deep) لکھا اور پھر اسے اسٹیج کیا گیا جس میں چارلس ڈکنز نے اداکاری کی۔ اس ڈرامے کو ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے میں چارلس ڈکنز کی بیٹی نے بھی کام کیا تھا۔ جب اس ڈرامے کو دوبارہ دہرائے جانے کی نوبت آئی تو ایک نئی لڑکی کو ڈکنز کی بیٹی کی جگہ کاسٹ کیا گیا۔ اس کا نام ایلن ٹرنن (Ellen Ternan) تھا۔ 16 سال کی اس خوبصورت لڑکی کو جب چارلس ڈکنز نے دیکھا تو اس پر وہی قیامت ٹوٹی جو گوئٹے پر آخری عمر میں ٹوٹی تھی۔ چارلس ڈکنز ایلن پر عاشق ہو گیا۔ ڈرامے کی ریہرسل چارلس ڈکنز کے گھر ہوتی تھی۔ چارلس ڈکنز ایلن کے لئے ایک خوبصورت بریسلٹ لے کر آیا۔ جب ایلن کو دینے لگا تو اس کی بیوی کیٹ نے دیکھ لیا اور ایک طوفان کھڑا کر دیا اور پھر دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ میاں بیوی کے درمیان جو دوری پیدا ہوئی وہ چارلس ڈکنز کی موت تک کم نہ ہوئی۔

چارلس ڈکنز کے تخلیقی کام کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں یہاں اس کے عالمی شہرت یافتہ ناول ''ڈیوڈ کوپر فیلڈ'' کا

ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ چارلس ڈکنز نے بھی اسے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ اپنی تخلیق کے بارے میں مصنف کا فیصلہ اکثر درست نہیں ہوتا لیکن واقعی چارلس ڈکنز کا یہ بہترین ناول ہے۔

''ڈیوڈ کوپر فیلڈ'' ایک آٹو بائیوگرافیکل ناول ہے جس کا مواد ڈکنز نے اپنی زندگی سے لیا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے ناول کو بائیوگرافی نہیں بننے دیا۔ ڈکنز نے وہ تمام لوگ جو اس کی زندگی میں اسے ملے یا جن سے ان کا واسطہ رہا اس ناول میں کردار بن کر آگئے ہیں۔ کچھ کردار ڈکنز نے تشکیل دیئے جو اگر چہ حقیقی نہ تھے لیکن زندہ کردار بن گئے۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ 1850ء میں شائع ہوئی۔ یہ مسلسل ایک سال تک قسط وار چھپتا رہا۔ ڈیوڈ باپ کی وفات کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا جب یہ پیدا ہوا تو اس کی خالہ بیسٹی اس کی ماں کے پاس موجود تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ لڑکی پیدا ہو مگر ڈیوڈ کی پیدائش پر اسے دکھ ہوا۔ ڈیوڈ کی ماں کلارا بیمار عورت تھی۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد مرڈسٹون (Murd Ston) کے ساتھ شادی کر لی۔ ڈیوڈ کو آیا پیگوٹری کے ساتھ گاؤں بھیج دیا گیا جہاں اس کا مچھیرا بھائی رہتا تھا۔ گاؤں میں کچھ دن گزار کر ڈیوڈ گھر آیا تو اپنے سوتیلے باپ کو ماں کے ساتھ ظلم کرتا دیکھا۔ ڈیوڈ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک بار جب مرڈسٹون نے ڈیوڈ کو مارا تو ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ ڈیوڈ کو ایک سکول میں داخل کر دیا گیا جہاں اسے ماسٹر کا ظلم وستم برداشت کرنا پڑا۔ جب ڈیوڈ کی ماں مر گئی تو مرڈسٹون نے اسے لندن کی ایک فیکٹری میں ملازم کرا دیا۔ یہاں ڈیوڈ دس سال رہا۔ مصیبتیں برداشت کیں اگر کوئی اسے یہاں تسلی دیتا تھا تو وہ مکاؤبر تھا۔ جب وہ بھی لندن چھوڑ کر چلا گیا تو ڈیوڈ بھی وہاں سے بھاگ کر پیدل اپنی خالہ بیسٹی کے پاس ڈوور چلا گیا۔

خالہ نے بھی جب ظلم وستم شروع کر دیا تو ڈیوڈ مسٹر ویکفلیڈ کے پاس چلا گیا یہاں اس کی ملاقات ایک بن ماں کی بچی ایگنز سے ہوتی ہے جو ڈیوڈ کی پہلی محبت ثابت ہوتی ہے۔ ڈیوڈ اب سترہ سال کا ہو چکا ہے۔ وہ زندگی میں کچھ بننے کیلئے کسی ہنر کا متلاشی ہے اور وکالت پڑھنے کی کوشش میں مختلف پرانے دوستوں سے ملتا ہے۔ ان کی بے ایمانیوں اور منافقتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ ایگنز کی محبت کو سمجھ نہیں پاتا وہ جس قانونی فرم میں کام کرتا ہے اس کا مالک سپن لو ہے ڈیوڈ اس کی بیٹی ڈورا سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن ڈورا کا باپ مخالفت کرتا ہے۔ سپن لو کی وفات کے بعد اسے اس قانونی فرم سے نکال دیا جاتا ہے۔ ڈیوڈ لندن چلا جاتا ہے شارٹ ہینڈ سیکھ کر اخبار کی نوکری کرتا ہے۔ ڈورا سے شادی کر لیتا ہے اور خود کہانیاں لکھنا شروع کرتا ہے۔ مشہور مصنف بن جاتا ہے۔ ڈورا ایک گھریلو عورت ہے اسے اُس کی تخلیقی زندگی سے کوئی مطلب نہیں۔ گھریلو زندگی میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے اور ڈورا مر جاتی ہے۔ کئی رشتے دار فوت ہو چکے ہیں کئی المناک واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ اب لندن کا مشہور مصنف بن چکا ہے۔ اب اسے احساس ہوتا ہے کہ ایگنز ہی اس کی اصل محبت تھی۔ وہ ایگنز سے اس وقت جا کر ملتا ہے جب وہ شادی کرنے والی تھی ڈیوڈ اس سے حال دل کہتا ہے۔ ایگنز ڈیوڈ سے شادی کر لیتی ہے اور کئی بچوں کی ماں بن جاتی ہے...... اس کہانی کا راوی ڈیوڈ کوپر فیلڈ خود ہے......!

یہ ناول چارلس ڈکنز کے بچپن کی ناکامیوں اور محرومیوں کا آئینہ دار ہے۔ بچپن کی جتنی سچی حقیقی عکاسی اس ناول میں کی گئی ادب میں شاید اور کہیں نہیں کی گئی...... اس کی ساری کہانی چارلس ڈکنز کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ بچپن میں اس نے فیکٹری میں کام کیا۔ ڈیوڈ بھی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ چارلس ڈکنز نے وکیل کے ہاں نوکری کی شارٹ ہینڈ سیکھ کر اخبار میں نوکری کی، کہانیاں لکھیں اور مشہور مصنف بن گیا۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ نے بھی یہی کام کیے۔ ڈورا کا کردار چارلس ڈکنز کی بیوی کیٹ کا کردار ہے۔ ڈورا مر جاتی ہے۔ کیٹ کو ڈکنز نے زندہ رکھا۔ ایگنز کا کردار کیٹ کی بہن میری کا کردار ہے۔

جو چارلس ڈکنز کی بانہوں میں مرتی ہے۔ اس ناول میں چارلس ڈکنز نے اسے زندہ رکھا اور اس خواہش کو پورا کیا جو وہ حقیقی زندگی میں پورا نہ کر سکا۔ مسٹر مکاؤبر کا کردار سارے کا سارا ڈکنز کے باپ کا کردار ہے۔ یہ سب کردار ڈکنز کے قلم نے زندہ جاوید کردار بنا دیے ہیں۔ روسی ناول نگار دوستو یفسکی جو چارلس ڈکنز سے بے حد متاثر تھا اس نے بھی اپنے ناولوں میں یہی طریقہ استعمال کیا ہے۔ اپنے باپ کے کردار کو اس نے ہر جگہ استعمال کیا۔ یورپ کی سیر میں ایک تندخو ماڈل سے ملاقات ہوئی، محبت کا اظہار کیا اس نے اس اظہار کو جھٹک دیا، چلی گئی لیکن دوستو یفسکی نے اسے ''برادرز کرما ژوف'' کی ہیروئن میں ڈھال دیا۔

چارلس ڈکنز کے اس ناول کی بے شمار خوبیاں ہیں، اس ناول میں اس نے ابھرے پلاٹ پر کہانی بنی ہے اور دلچسپی میں کہیں فرق نہیں آیا۔ فیکٹری، دفاتر اور سکولوں میں کام کرنے والوں کو درپیش مسائل اور مشکلات کو بیان کیا ہے۔ یتیموں، کشتی پر کام کرنے والے بچوں کے حقوق کی بات کی اور Child Labour کی مذمت کی ہے۔ اشرافیہ کے بناوٹی انداز کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کے حقیقی اسلوب میں آ کر یہ سب چیزیں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس ناول کے کچھ حصوں کو سوشل اور سماجی ناانصافیوں پر ایک تنقید کہا جا سکتا ہے۔ وکٹورین عہد میں ظاہر ہونے والی غربت کو ڈکنز نے بے نقاب کیا ہے۔ لندن کے مضافات میں ہونے والے جرائم اور ناانصافیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ عدالت میں انصاف کے نام پر ہونے والی برائیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ (یہ سب کچھ اس کے ناول بلیک ہاؤس اور اولیور ٹوسٹ میں بھی موجود ہے)۔ اس ناول میں (بلکہ اس کے سارے ناولوں میں) لندن اور اس کے گردونواح کا سارا علاقہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ جب ڈکنز نے امریکہ کا دورہ کیا تو پریس والوں نے سرخیاں لگائیں کہ ''ڈکنز کا مطلب لندن اور لندن کا مطلب ڈکنز'' ہے۔

رچرڈ ڈبلیو لونگ نے ایک طویل مضمون ''انگلینڈ اور چارلس ڈکنز'' کے عنوان سے لکھا ہے ڈکنز کے ناولوں میں انگلینڈ اور لوگوں کے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''ڈکنز خود فیکٹری میں کام کرتا رہا، کلرکی کی، عدالت میں رپورٹر رہا، اخبار میں کام کیا، ہوٹلوں میں مزدوری کی، اسے چائلڈ لیبر اور بچوں کو درپیش مسائل اور زیادتیوں کا ذاتی تجربہ تھا چنانچہ اس نے اپنے ناولوں میں کھل کر اس کے خلاف آواز اٹھائی اور (Reform Laws) کے لئے راستہ ہموار کیا۔''

اس کے اسی پہلو کو دیکھ کر اس کے بائیوگرافر جان فاسٹر کا کہنا تھا کہ چارلس ڈکنز لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور ان کے دکھ اور سکھ سے پوری طرح واقف ہے۔ بنی نوع انسان کو درپیش مسائل سے آگاہ ہے اور اسکی کوشش ہے کہ ان مسائل کا ازالہ کیا جائے۔

چارلس ڈکنز کی مشہور کتابیں جن سے اسے زندگی ہی میں لازوال شہرت ملی وہ یہ ہیں:

1- SKETCHES BY BOZ

2- OLIVER TWIST

3- A CHRISMAS CORAL

4- A TALE OF TWO CITIES

5- DAVID COPPERFIELD

6- GREAT EXPECTATION

7- BLEAK HOUSE

8- HARD TIMES

9- OUR MUTUAL FRIEND

چارلس ڈکنز نے بالزاک، سروانٹیز، وکٹر ہیوگو اور شیکسپیئر سے فیض حاصل کیا۔ ان کی تحریروں سے متاثر ہوا اور دوستو یفسکی، تھامس ہارڈی، ایڈگرایلن پو، ٹالسٹائی اور جارج اورویل پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ ڈکنز نے چند دولت مند لوگوں کی مدد سے لاوارث عورتوں کے لئے گھر بنائے جہاں انہیں زندگی کی پوری سہولتیں دی جاتی تھیں۔ ڈکنز نے انگلینڈ میں گھوم پھر کر عورتوں کو تلاش کیا اور مستحق عورتوں کو پناہ گاہ فراہم کی۔

ٹالسٹائی کی طرح چارلس ڈکنز کا آخری عمر میں گھریلو ماحول کچھ اچھا نہ تھا۔ سونیا نے ٹالسٹائی کی زندگی کو عذاب بنائے رکھا لیکن چارلس ڈکنز نے یہ عذاب خود تیار کیا۔ میری کی وفات کے بعد اس کی دوسری سالی جارجی اس کے گھر چلی آئی۔ اس کی بیوی کیٹ بدذوق اور غیر ادبی شخصیت تھی میری کی جگہ جارجی نے لے لی اور وہ جذباتی طور پر جارجی میں دلچسپی لینے لگا لیکن جب ایلن اس کے ڈرامے میں کام کرنے آئی تو وہ سرتاپا ایلین کے عشق میں ڈوب گیا۔ سارا گھر ایلین کو ڈکنز کی محبوبہ کہنے لگا۔ جارجی نے عقل مندی سے کام لیا اور ایلین سے دوستی کر لی۔ بیوی اور اپنی ساس کے جھگڑوں سے تنگ آ کر اس نے (ریڈنگ شوز) کی تعداد بڑھا دی۔ اپنی بیوی کو گھر چھوڑ کر جانے کے لئے کہہ دیا اور وہ چلی گئی۔ ڈکنز کے ''ریڈنگ شوز'' کا دائرہ وسیع ہو گیا ڈکنز کو پبلسٹی سے محبت تھی۔ فلموں کی طرح اس کے ریڈنگ شوز کے پوسٹر چھپنے لگے شہرت اور دولت کا ڈھیر لگ گیا لیکن وہ صحت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دل کا دورہ پڑا لیکن وہ شوز میں جانے سے باز نہ آیا۔ جارجی اور ایلن اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ جارجی کو پتہ تھا کہ ڈکنز ایلن سے محبت کرتا ہے مگر اس نے برا نہ منایا بلکہ دونوں کی ملاقات کا اہتمام کرتی رہی اور پھر ایک دن آیا جب لندن میں ایک پوسٹر چھپا اور گلی گلی چسپاں کر دیا گیا کہ چارلس ڈکنز الوداعی شو میں اپنا ناول پڑھیں گے...... چارلس ڈکنز شو میں گیا۔ لوگ جوق در جوق آئے۔ چارلس ڈکنز نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔ تالیاں بجیں۔ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے لیکن یہ سب کچھ چارلس ڈکنز کو دل کے تیسرے اٹیک سے نہ بچا سکا، اسے اس کے گھر میں لایا گیا۔ اس نے اپنی بیٹی کیٹی (KATIE) کو بلوایا۔ کیٹی کو اس کی خالہ نے کہا کہ جا کر اس کی بیوی کو اطلاع دو کہ ڈکنز مر رہا ہے۔ وہ چلی گئی اور جا کر اپنی ماں کی بجائے ڈکنز کی محبوبہ ایلن کو لے آئی۔ ایک دن بعد یعنی 9 جون 1870ء کو چارلس ڈکنز اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دکھی انسانیت کا لکھاری، یتیم، لاوارث بچوں کی آواز، مچھیروں، چرچ کے فقیروں، گلی میں گھاس بیچنے والی اندھی بڑھیا کے دکھ کا رازداں۔ لندن کا آئینہ، بنی نوع انسان کی کیفیات کو سب سے زیادہ جاننے والا مصنف چارلس ڈکنز جو لندن کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لندن کی گہری دھند ہی میں کہیں گم ہو گیا لیکن لندن کے لوگوں نے اسے گم نہیں ہونے دیا۔ ڈکنز کی رہائش گاہ کو میوزیم بنا دیا۔ ڈکنز سنٹر قائم کئے۔ ہر سال ڈکنز کے نام پر فیسٹیول ہوتا ہے۔ کرسمس کے موقع پر اس کے نام سے کیک کاٹا جاتا ہے۔ جہاں جہاں ڈکنز رہا ان مقامات کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ 76.500 مربع گز پر ''ڈکنز دنیا'' ہے۔ جہاں ایک سینما، ہوٹل اور لائبریری بنائی گئی ہے۔ ڈکنز کے نام پر نوٹ چھپے ہیں جن پر اس کی تصویر اور ''پک

وک پیپرز'' کے کرداروں کے عکس بنائے گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر اس کی تقریباً سب ناولوں کے سیریل بن چکے ہیں اور فلمیں بنی ہیں۔ چارلس ڈکنز کو پبلسٹی اور شہرت سے بہت پیار تھا۔ وہ اسے مرنے کے بعد بھی مسلسل مل رہی ہے۔

جارج برنارڈ شا

(George Bernard Shaw)

بیسویں صدی کا آزاد خیال، عورتوں کے حقوق کا حامی، ڈرامے کا اہم ترین نام، ادب اور موسیقی کا نقاد، سوشل، مذہبی اور اخلاقی خامیوں سے باخبر، عصری تقاضوں سے آشنا، سوشلسٹ، مساوات کا قائل، یہ سب اس کے ڈراموں کے موضوعات ہیں۔

اسکا کوئی دشمن نہ تھا اور اس کا کوئی دوست اس سے خوش نہ تھا۔

(آسکر وائلڈ)

....

اس نے ڈراموں میں معاشرتی، سماجی اور مذہبی گتھیوں کو سلجھایا، برنارڈ شا لندن میں وہی کر رہا تھا جو ابسن ناروے میں کر رہا تھا۔

(A.C.Ward)

....

ڈاکٹروں نے کہا:

''اس آدمی نے 25 سال سے گوشت نہیں کھایا۔ یہ آدمی مر جائے گا۔''

برنارڈ نے جواب دیا:

" Animals are our Fellow Creature, not to be Killed for Human Food."

....

جارج برنارڈ شا

جارج برنارڈ شا بیسویں صدی کا ایک اہم ڈرامانویس، آزاد خیال مفکر، عورتوں کے حقوق کا زبردست حامی، تھیٹر کی تاریخ کا اہم ترین نام، موسیقی، ڈرامے اور ادب کا نامور نقاد تھا۔ جارج برنارڈ شا آئرلینڈ کے شہر ڈبلن میں پیدا ہوا۔ 15 سال کی عمر میں لندن آیا اور پھر لندن کا ہو کر رہ گیا۔

جارج برنارڈ شا کا باپ جارج (Carr. Shaw) بہت بڑا شرابی تھا جبکہ اس کی ماں اپنے خاوند سے 16 سال چھوٹی تھی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور وہ موسیقی میں مہارت رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو موسیقی سکھانا اور اوپیرا میں گیت گانا شروع کر دیئے۔ ماں نے برنارڈ شا کو بھی موسیقی کی طرف لانے کی کوشش کی۔ برنارڈ شا نے کچھ دلچسپی کا اظہار بھی کیا لیکن وہ لکھنے لکھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ برنارڈ شا کی یہ ''تھوڑی سی دلچسپی'' اس کی آئندہ زندگی میں بہت کام آئی اور اس کا ذریعہ روزگار بن گئی۔

ڈبلن میں جب برنارڈ شا کے خاندان کو تنگدستی نے گھیرا تو برنارڈ شا کی والدہ اپنے خاوند سے جھگڑ کر اپنی دو بیٹیوں کو ساتھ لے کر لندن چلی گئی اور لندن میں موسیقی سکھانے کا کام شروع کر دیا، برنارڈ شا شرابی باپ کے پاس رہ گیا، جس نے مختلف سکولوں میں اسے بھگا بھگا کر تعلیم سے متنفر کر دیا۔ جوں توں کر کے اس نے چھ سکولوں میں پڑھ کر اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر ایک دفتر میں جونیئر کلرک ہو گیا۔ یہ نوکری بھی جب اس کے مزاج کو نہ بھا سکی تو 1876ء میں وہ لندن اپنی ماں کے پاس چلا گیا اور 30 سال تک واپس آئرلینڈ نہ گیا، باپ کی موت پر بھی نہیں۔ اس کا باپ جب 1885ء میں فوت ہوا تو اس کے جنازے میں نہ اسکی ماں گئی، نہ بہنیں، نہ برنارڈ شا خود۔

اپنے عہد میں سکولوں کی حالت اور ٹیچروں کے کردار سے برنارڈ شا مطمئن نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سکول اور سکول ماسٹر دونوں بُرے ہیں۔ سکول ایسے جیل خانے ہیں جہاں طلبا کو قید کر کے رکھا جاتا ہے۔ سکولوں اور اساتذہ کے سلسلے میں اس کا اور لارڈ بائرن کا تجربہ ملتا جلتا تھا۔ اپنے سارے مشاہدے اور سکولوں میں ''سزا کاٹنے'' کے تجربات اس نے Treatise on Parents and Children میں کھل کر تحریر کیے ہیں۔

برنارڈ شا لندن میں آیا تو خالی جیب تھا۔ اس نے لائبریریوں اور میوزیم میں وقت بتانا شروع کر دیا، ذہن میں ایک لہر اٹھی کہ اسے ناول لکھنا چاہیے۔ بے کاری کے اس زمانے میں اس کی بہن لوسی اپنی موسیقی کی کمائی میں سے ایک پاؤنڈ ہفتہ وار دیا کرتی تھی۔ اس نے ناول لکھے لیکن ان ناولوں کا بُری طرح استقبال کیا گیا اور آخر رزق کمانے کا وسیلہ وہی موسیقی کا فن ٹھہرا جو اس نے چندروز اپنی ماں سے سیکھا تھا۔ اس نے ناول لکھنے سے توبہ کی اور کالم نگاری کی طرف دھیان دیا، اسے (Hornet) اخبار میں موسیقی پر کالم لکھنے کا کام مل گیا۔

برنارڈ شا 1892ء تک مختلف اخباروں میں تبصرہ نگار، نقاد اور مبصر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ وہ لندن کے مشہور اخبار (Pall Mall Gazetter) میں موسیقی پر لکھتا تھا۔ (The World) میں وہ ادبی فن پاروں کا تجزیہ کرتا تھا۔ (The

(Star میں بھی تنقیدی اور تجزیاتی کالم لکھتا تھا، یہ کام اس نے سالہا سال تک کیا اور بڑے تیکھے اور بھرپور تبصرے کئے۔ اس کے قلم اور فقرے کی کاٹ بہت تیز تھی۔ لوگ ناراض بھی ہو جاتے تھے مگر وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ مثلاً آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی تصویروں کے بارے میں اس کی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔ برنارڈ شا موٹے سول کے بڑے بڑے اور لمبے بوٹ پہنتا تھا۔ یہ بوٹ عام طور پر پہاڑوں پر چڑھنے والے مہم جو پہنتے تھے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ کیا وہ پہاڑوں پر جانے کا شوقین ہے، جو یہ جوتے پہنے ہوئے ہے برنارڈ شا نے جواب دیا:

"No These Boots are for London Art Galleries"

تنقیدی تبصروں، موسیقی کے تجزیوں اور آرٹ گیلریوں کی نمائشوں نے اس کے ذہن کو جب تھکا دیا تو اس نے ڈرامے لکھنے کی طرف دھیان دیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس کام نے اسے تقریباً ختم کر دیا تھا۔

برنارڈ شا نے 25 سال کی عمر میں گوشت کھانا بند کر دیا تھا۔ انگریزی شاعر شیلے، گوشت نہیں کھاتا تھا، وہ سبزی خور تھا اس نے گوشت کھانے کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ برنارڈ شا نے اس کی تحریروں سے بہت اثر قبول کیا۔ اس نے گوشت کو ہاتھ تک نہ لگایا وہ کہا کرتا تھا:

"Animals are our Fellow Creature not to be Slain for Human Food"

چنانچہ ڈاکٹروں نے اسے دیکھ کر کہا:

''اس آدمی نے 25 سال سے گوشت نہیں کھایا۔ یہ مر جائے گا'' مگر برنارڈ شا ثابت قدم رہا اور سبزیاں کھا کر 94 سال تک زندہ رہا۔ برنارڈ شا کو ماں کی محبت اتنی نہ ملی لیکن ماں سے ملی موسیقی کی تربیت نے اس کا روزگار سالہا سال تک چلائے رکھا۔ وہ لندن کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا رہا۔ اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے اس نے انسانوں کو دیکھا۔ پرکھا، سمجھا۔ یہ تجزیہ اس کے ڈراموں میں بہت کام آیا۔ لندن سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا تھا جس میں ڈراموں پر بھرپور تنقید چھپتی تھی۔ اس ہفت روزہ کا نام (Saturday Review) تھا۔ اس میں وہ ڈراموں پر تبصرہ کرنے لگا، ڈرامے دیکھتے دیکھتے ڈراما لکھنے کی خواہش اور بڑھی 1885ء میں جب اس نے ناول لکھنے سے توبہ کی تو ایک ڈراما شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکا۔ 1892ء میں اس نے اسے مکمل کیا۔ اس ڈرامے کا نام (Widowes Houses) تھا۔ یہ ڈراما لندن کے ان علاقوں کے گھروں کے بارے میں تھا جن میں متوسط طبقے کے غریب لوگ رہتے تھے اور یہ گھر ان امیر لوگوں کے تھے جو خود لندن کے (Posh) علاقوں میں رہتے تھے، گھر انہوں نے کرائے پر دے رکھے تھے، گھروں اور پس ماندہ علاقے کی گندگی اور برائیوں سے وہ بے خبر اور لاپروا تھے۔ اس ڈرامے میں برنارڈ شا نے غریب کرائے داروں کے مسائل کو پیش کیا۔

برنارڈ شا سے پہلے انگریزی تھیٹر کے لئے لکھنے والے سوشل مسائل، سیاسی اور مذہبی اونچ نیچ سے بالکل بے خبر تھے۔ کوئی ڈراما نگار ایسا نہ تھا جس نے عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان مسائل کو ڈراموں میں پیش کرنے کی جرأت کی ہو۔ برنارڈ شا نے پہلی بار یہ جرأت کی اس نے ان مسائل کی طرف دھیان دیا اور معاشرتی، سماجی اور ان مذہبی گتھیوں کو سلجھایا جنہوں نے لندن کے لوگوں کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اس کے ایک نقاد (A.C. Ward) کا کہنا ہے کہ برنارڈ شا لندن میں وہی کرنے جا رہا تھا جو (Ibsen) ناروے میں کر رہا تھا۔ برنارڈ شا جن دنوں Saturday Review میں لکھتا تھا اس نے بڑی جرأت اور بہادری سے انگلستان کے تھیٹر میں ہونے والے ڈراموں پر تنقید کی اور انسانی مسائل کو

ڈراموں میں پیش کرنے کا مشورہ دیا۔ جب اس نے ڈرامے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو کئی ڈھکے چھپے مسائل سے پردہ اٹھایا۔ اس میں اس کا ڈراما (Mrs. Warren's Profession) تھا جس میں اس نے طوائف کی زندگی پر کھل کر بات کی تھی۔ یہ ڈراما 1898ء میں پیش کیا گیا اور اسے لارڈ چیمبرلین کی سفارش پر (Ban) کر دیا گیا۔ جب برنارڈ شا کو 1925ء میں نوبل پرائز دیا گیا تو یہ ڈراما لندن کے تھیٹر میں پیش کیا گیا۔

برنارڈ شا نے تقریباً 63 ڈرامے لکھے۔ بے شمار تنقیدی مضامین لکھے۔ پمفلٹ لکھے۔ 5 ناول اور لاتعداد خطوط لکھے اور عوامی جلسوں میں بے شمار تقریریں کیں۔ بعض اوقات گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر عام لوگوں سے خطاب کیا۔

1884ء میں وہ لندن کے سٹی ہال میں ہنری جارج کا لیکچر سننے گیا (یہ وہی ہنری جارج ہے جس نے (Progress and Poverty) نامی مشہور کتاب لکھی ہے۔ ہنری جارج سوشلسٹ نظریات کا حامی تھا۔ برنارڈ شا اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے ایک تنظیم Fabian Society کی بنیاد رکھی۔ یہ تنظیم ایک انقلابی جماعت تھی جو سوشلسٹ نظریات کی پرچار کرتی تھی۔

برنارڈ شا عوام میں مساوات کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جو انسانوں کو مساوات کا سبق دیں اور غربت کا خاتمہ کریں۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل بہت ضروری ہے جب لوگ تہذیبی طور پر نیک اور اچھے بن جائیں گے تو وہ اچھے قانون بنائیں گے اور معاشرہ خوشحال اور نیک بن جائے گا۔

برنارڈ شا بچپن ہی میں عیسائی مذہب سے دور ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عیسائیت چرچ کے زیر اثر ہے اس لئے وہ کرائسٹ سے دور ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اعلیٰ مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ وہ خود کو عیسائی نہیں کہلواتا تھا لیکن وہ راہ راست پر چلنے والا آدمی تھا۔ شراب پیتا نہ تمبا کو نوشی کرتا اور نہ ہی گوشت خور تھا۔ بہت ہمدرد، لوگوں سے محبت کرنے والا اور فلاحی کاموں پر خرچ کرنے والا آدمی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ محبت ہمدردی اور بھائی چارے سے ہمیں دنیا کو خوشحال اور پُرسکون بنانا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ آئندہ آنے والی نسل کو ہم ایک ایسی دنیا دے کر جائیں جو رہنے کے قابل ہو اور روشنی سے جگ مگ کرتی ہو۔ برنارڈ شا کے تمام عقائد اور نظریات انسانی معاشرے کی فلاح اور خوشحالی کے لیے تھے۔ اس نے اس دنیا کو خوشحال بنانے کے لئے جتنا ہو سکا کیا۔ لوگوں سے فنڈز اکٹھے کر کے لندن میں لندن سکول آف اکنامکس کی بنیاد رکھی۔ روپے پیسے سے برنارڈ شا کو اتنی دلچسپی نہ تھی۔ 1925ء میں جب اسے نوبل پرائز دیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اعزازات سے کوئی دلچسپی نہیں، جب بیوی نے مجبور کیا تو مان گیا لیکن انعام کے ساتھ ملنے والی رقم لینے سے انکار کر دیا اور کہا مجھے یہ رقم نہ دی جائے بلکہ اس سے ایک سوسائٹی بنائی جائے جو سویڈن کے ادب کو انگریزی میں ترجمہ کرے۔

برنارڈ شا نے 1898ء میں ایک امیر آئرش عورت شارلٹ چین سے شادی کی، جس کی سیاسی جلسوں میں برنارڈ شا سے ملاقات ہوئی تھی۔ شادی کے بعد دونوں ہرٹ فورشائر کے قریب ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے اور وفات تک وہیں رہے۔ شارلٹ نے برنارڈ شا کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ برنارڈ شا کو اس سے بڑا لگاؤ تھا۔ مرنے کے بعد اس کی راکھ کو بیوی کی راکھ میں ملا کر گھر کے باغ کے صحن اور پگڈنڈیوں پر بکھیر دیا گیا تھا۔

برنارڈ شا کے ڈراموں کے موضوعات لندن کی زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے سیاسی، اخلاقی، سماجی، مذہبی خامیوں کو اپنے ڈراموں میں بے نقاب کیا۔ اس کا ہر ڈراما کسی نہ کسی تلخ حقیقت پر مبنی ہوتا تھا۔ ایسا کرنے سے اس پر کڑی

تنقید بھی ہوئی اور اسے تماشائی اکٹھے کرنے میں بہت وقت بھی لگا لیکن برنارڈ شانے ہمت نہ ہاری اور لندن کے تھیٹر کو نئے موضوعات ، نئے اسلوب اور نئے مزاج سے روشناس کرانے کی کوشش جاری رکھی اور آخروہ کامیاب ٹھہرا۔ مثلاً اس کا ڈراما (Widowes Houses) غریب کرائے داروں کے مسائل کو بے نقاب کرتا ہے ۔ مسز وارن پروفیشن میں اس نے طوائف کے موضوع کو پیش کیا ہے (Arms and The Man) جنگ کے خلاف اور ''انٹی رومانس'' ڈراما ہے۔ (The Devilos Disciple) مذہبی رواداری اور ضبط کے موضوع کو لئے ہوئے ہے۔ The Man of Destiny نپولین بونا پارٹ کی ایک عورت کے ساتھ لفظی جنگ اور گفتگو کا ڈراما ہے ۔ اپنے ڈرامے (Man and Superman) میں برنارڈ شا نے ایک ڈرائیور Henry Starker کا کردار تشکیل دے کر اسے جدید مشینری اور ٹیکنالوجی کا ماہر دکھایا ہے اور ترقی کا استعارہ قرار دیا ہے ۔ اسے ان روائتی ارسٹوکریٹ طبقے سے زیادہ اہم قرار دیا ہے جو برسوں سے عوام پر حکومت کر رہا ہے لیکن کچھ نہیں کر رہا ۔ پہلے پہل لندن کے لوگوں کو یہ موضوعات اجنبی لگے لیکن پھر وہ ڈراما دیکھنے جوق در جوق آنے لگے ۔ 1907ء میں اس کے ڈراموں کے 711 شوز ہوئے اور اس آئرش ڈراما نگار نے انگریزوں کو چند لمحوں کے لئے شیکسپیئر بھلا دیا ۔ جارج برنارڈ شا نے ناولوں کے علاوہ کہانیاں بھی لکھیں۔

The Black Girl in Search of God ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو دنیا کے مذاہب میں خدا کو تلاش کرتی ہے اور اسے مختلف عقائد کی کمزوریوں اور خامیوں سے الجھنا پڑتا ہے ۔ کہانی کا انجام خوشی پر ہوتا ہے جب وہ آئرش نوجوان سے شادی کر لیتی ہے جسے مذہب اور مذہبی عقائد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

اس کتاب کی دوسری کہانی The Miraculous Revenge ہے جو ایک شرابی سراغ رساں کے گرد گھومتی ہے جو ایک قبرستان میں ایک کیس کی تفتیش کرتا ہے اور اس کے سامنے ایک تازہ مجرم کی لاش ہے ۔

برنارڈ شا کے مشہور ڈرامے بے شمار ہیں لیکن جنہیں نمائندہ ڈرامے کہا جا سکتا ہے ان کے نام یہ ہیں ۔

1)- Mrs Warner's Profession

2)- Arms and the Man

3)- Candid.

4)- The Man of Destiny

5)- Caesar and Cleopatra

6)- Man and Superman

7)- Major Barbra

8)- Pagmallion

9)- Saint Joan

جارج برنارڈ شا کا ڈراما Pagmallion جب لندن میں کھیلا گیا تو موشن پکچرز کے پروڈیوسر ڈائریکٹر جبرئیل پاسکل نے بڑے مؤدب انداز میں برنارڈ شا سے کہا:

''میں اس ڈرامے پر فلم بنانا چاہتا ہوں مگر میرے پاس پیسے نہیں کہ میں آپ کو دے سکوں ۔''

جارج برنارڈ شا نے ایک پاؤنڈ نکال کر اسے دیا اور کہا جاؤ فلم بناؤ ۔ اس نے اس ڈرامے پر فلم بنائی لیکن فلم کی ریلیز

سے پہلے پاسکل فوت ہوگیا ۔ اس میوزیکل فلم پر برنارڈ شا کو 1938ء میں آسکر انعام دیا گیا تھا۔

برنارڈ شا اپنے عہد کا ایک عظیم ڈراما نویس تھا ۔ جسے آج بھی اتنا ہی بڑا ڈراما نگار مانا جاتا ہے ۔ اسے صرف وہی لوگ پسند نہیں کرتے تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ سوسائٹی میں تبدیلیاں لائی جائیں ۔ وہ آئرلینڈ میں آزاد حکومت کا خواہاں تھا ، عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کا خواہش مند تھا اور انکی تنخواہوں میں برابری چاہتا تھا ۔ عورتوں پر سماجی زندگی میں استحصال کے خلاف تھا ۔ ان تمام مسائل کو اس نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ۔ اس کے طنز کی کاٹ اپنی تھی جس کے لیے ادبی حلقوں نے (Shavian Wit) کی اصطلاح بنالی تھی ۔ برنارڈ شا ڈراموں میں ہنستے ہنستے وہ بات کر جاتا تھا جو طنز کا تیر بن کر دیکھنے والوں کے دل میں پیوست ہو جاتا تھا اور انہیں بعد میں پتا چلتا تھا کہ برنارڈ شا ہم سے ہاتھ کر گیا ہے ۔

1894ء میں جب اس کا ڈراما Arms and the Man پیش کیا جا رہا تھا تو لوگ ہنس ہنس کر پاگل ہو رہے تھے لیکن پھر اچانک لوگوں پر خاموشی چھا گئی اور انہیں محسوس ہوا کہ برنارڈ شا ان کا مذاق اڑا رہا ہے پھر برنارڈ شا کو سٹیج پر خیالات کا اظہار کرنے کے لئے بلایا گیا تو ہال میں سے دور سے ایک آواز آئی جسے برنارڈ شا نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا ۔

ڈراما دیکھنے والوں میں مشہور شاعر W.B Yeats بھی موجود تھا ۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا:

''میں ایک بُرا خواب دیکھ رہا تھا ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ایک سلائی مشین بجنے لگا رہی ہے لیکن پھر ایک ناقابل یقین واقع پیش آیا اور وہ یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ مشین مسلسل ہنس رہی ہے ۔ ہنس رہی ہے اور ہنسے چلے جا رہی ہے'' ۔

اور یہی برنارڈ شا کا فن تھا کہ وہ تماشائیوں کو ہنسا ہنسا کر ان کی خامیوں سے آگاہ کرتا تھا ۔

برنارڈ شا کا ڈراما Arms and the Man جنگ اور رومانس کے خلاف اور ''انٹی ہیرو'' ڈراما ہے ۔ اس ڈرامے میں جنگی ہیروز کی حماقتوں اور محبت میں قسمیں کھانے والوں اور ان کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے ۔

یہ ڈراما پہلی بار لندن میں 1894ء میں پیش کیا گیا اور اس کے مسلسل 50 شوز چلے ۔ اس ڈرامے کا آغاز میجر پٹکاف کے بلغاریہ کے گھر سے ہوتا ہے ۔

میجر پٹکاف کی بیٹی رینا پٹکاف اپنے بیڈ روم میں سونے کی تیاری کر رہی ہے گھر کے باہر فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں ۔ ماں اسے بتاتی ہے کہ ایک سرب سپاہی مفرور ہے اور فوجی اسے تلاش کر رہے ہیں ۔ رینا کو اچانک پتا چلتا ہے کہ وہ سپاہی کیپٹن بلنچلی اسی کے بیڈ روم میں ہے ۔ کیپٹن پستول دکھا کر اسے خاموش رہنے کے لئے مجبور کرتا ہے ۔ رینا تلاشی لینے والے فوجیوں اور ماں سے کہہ دیتی ہے کہ اس کے کمرے میں کوئی نہیں ۔ جب فوجی چلے جاتے ہیں تو رینا اور کیپٹن بلنچلی کی بات چیت شروع ہوتی ہے اور رینا اس کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کرتی ہے ۔ رینا کو بعد میں پتا چلتا ہے کہ کیپٹن کی پستول خالی تھی اور اس کے بیگ میں گولیوں کی بجائے چاکلیٹ بھرے ہوئے ہیں ۔ کیپٹن بتلاتا ہے کہ میں میدان جنگ میں گولی نہیں چلاتا اپنے مورچے میں بیٹھا چاکلیٹ کھاتا رہتا ہوں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ مرنے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں آخر جنگ میں صلح ہو ہی جاتی ہے ۔ بلنچلی پھر رینا کو بتلاتا ہے کہ جنگ کے دوران اس نے ایک بے وقوف میجر کو دیکھا جو بڑے احمقانہ انداز میں فوجی چوکی پر حملہ آور ہوا ۔ رینا کا محبوب سرجیئس بھی میجر کی حیثیت سے لڑنے گیا تھا ۔ چنانچہ وہ کیپٹن بلنچلی کی گفتگو میں دلچسپی لیتی ہے اور پوچھتی ہے کہ اس میجر کا حلیہ کیا تھا جب بلنچلی اپنی یادداشت پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے تو رینا اسے سرجیئس کی تصویر دکھلاتی ہے ۔ بلنچلی کہتا ہے ''ہاں یہی بے وقوف ہے'' ، بلنچلی

رینا کو بتلاتا ہے کہ وہ 48 گھنٹوں سے جاگ رہا ہے اور کہتا ہے کہیں مجھے یہاں نیند نہ آ جائے میں چلتا رہوں۔ لیکن وہ اونگھنے لگتا ہے اور وہیں ایک کونے میں خراٹے لینے لگتا ہے۔ رینا اسے بڑے پیار سے دیکھتی ہے۔ وہ اسے ''چاکلیٹ سولجر'' کے نام سے پکارتی ہے اور اسے کمبل اڑھا دیتی ہے اور خود بھی ایک طرف سو جاتی ہے۔

دوسری صبح اٹھ کر دیکھتی ہے تو ''چاکلیٹ سولجر'' غائب ہے۔ بلنچلی چلا جاتا ہے لیکن رینا کے دل میں اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔

دوسرے منظر میں میجر پٹکاف اور گھر کے دوسرے افراد کو دکھایا جاتا ہے جن میں گھر کے دو ملازم بھی ہیں۔ ایک نوکر ہے جس کا نام (Nicola) ہے اور ایک نوجوان نوکرانی ہے جس کا نام Louka ہے۔ نیکولا اور لوکا کی منگنی ہو چکی ہے لیکن ڈرامے میں برنارڈ شا ایسی صورتحال پیدا کرتا ہے کہ میجر سر جیئس نوکرانی لوکا سے عشق کرنے لگتا ہے۔ میجر پٹکاف اور اس کی بیوی کیتھرین کی گفتگو میں برنارڈ شا نے اس عہد کے لوگوں کی بناوٹی شخصیت کو بڑے اچھے انداز میں بے نقاب کیا ہے مثلاً کیتھرین میجر پٹکاف سے پوچھتی ہے کہ جب جنگ کے بعد صلح کا معاہدہ ہوا تو کیا تم نے مخالف افسر کو بتلایا تھا کہ ہمارے گھر میں ایک لائبریری بھی ہے۔ کیونکہ اس سے انہیں اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ ہم بہت سوشل اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس منظر میں کیتھرین نے کچھ دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لئے ڈرائنگ روم میں لٹکائے ہوئے ہیں۔ میجر پٹکاف ان کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ میں نے تو انہیں بتلا دیا تھا کہ ہمارے گھر ایک لائبریری موجود ہے لیکن مہذب لوگ کپڑے دھو کر سکھانے کے لئے ڈرائنگ روم میں نہیں پھیلاتے۔

ڈرامے کے آخری منظر میں رومانس کے سارے روائتی نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لوکا سے میجر سر جیئس شادی کا اعلان کر دیتا ہے لوکا اپنے منگیتر نیکولا کو چھوڑ کر سر جیئس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ کیپٹن بلنچلی اس منظر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ جاتے جاتے میجر پٹکاف کا کوٹ لے گیا تھا وہ واپس کرنے کے لئے آتا ہے وہ بھی رینا کو چاہتا ہے۔ چنانچہ رینا میجر سر جیئس کو لوکا کی طرف متوجہ دیکھ کر کیپٹن بلنچلی سے اقرار محبت کرتی ہے اور میجر سر جیئس سے سارے رشتے توڑ کر کیپٹن بلنچلی (جسے وہ ''چاکلیٹ کریم سولجر'' کہتی ہے) سے شادی کا اعلان کرتی ہے۔

اس ڈرامے میں برنارڈ شا نے جنگ کے خلاف اور روائتی رومانس کے خلاف کھل کر اپنے نظریات کا اعلان کیا ہے۔

جارج برنارڈ شا بیسویں صدی کا ایک اہم آدمی تھا اور اس صدی کے اہم لوگوں سے اس کے مراسم بہت گہرے تھے اس نے آئرلینڈ سے ہجرت کر کے ساری زندگی لندن میں گزاری۔ دنیا میں بہت کم ممالک کا سفر کیا صرف ایک بار ہندوستان اور روس کا دورہ کیا۔ 1930ء میں وہ روس گیا سٹالن سے ملاقات کی اور اس کے نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے ڈرامے On the Rocks کے دیباچے میں سٹالن کے نظریات کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ ''مانچسٹر گارڈین'' میں ایک خط لکھ کر روس میں مزدوروں پر ہونے والے مظالم کو جھوٹی کہانیاں قرار دیا اور اسے اخباری نمائندوں کی سازش کا نام دیا۔

ہندوستان کی آزادی کی حمایت کرنے والی خاتون مسز اینی بیسنٹ (Annie Besant) سے اس کے قریبی تعلقات تھے وہ برنارڈ شا کی بڑی مداح تھی۔ برنارڈ شا کے کہنے پر ہی اس نے Fabian Society میں شمولیت اختیار کی تھی۔ لارنس آف عربیا، ڈبلیو، بی ییٹس، جی۔ کے۔ چیسٹرٹن، ولیم موریس اور آسکر وائلڈ سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔

(کہا جاتا ہے کہ جب آسکر وائلڈ پر مقدمہ چلا تو برنارڈ شا آسکر وائلڈ کی حمایت میں گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش

ہوا تھا) اس زمانے کی مشہور اداکارہ Ellen Terry اور اس دور کا مشہور باکسر Gene Tunney اس کے دوست تھے اور مشہور مصنف H.G Wells اس کا بہت بڑا مداح تھا۔ وہ بلا رنگ و نسل سب سے پیار کرتا تھا۔ اس کے نزدیک قومیت اور مذہب کوئی معنی نہیں رکھتے تھے وہ انسانی رشتوں کا قائل تھا۔ اس نے سب سے پیار کیا اور سب کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا۔ وہ ایک پُر مزاح آدمی تھا اس کے تیز فقروں سے کوئی نہ بچا۔ آسکر وائلڈ نے اپنے ایک مضمون میں برنارڈ شا کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون کا ایک جملہ برنارڈ شا کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ آسکر وائلڈ (On Bernard Shaw) میں کہتا ہے۔

"He Has no Enemies and None of His Friends Like Him"

برنارڈ شا نے تھیٹر ڈرامے کی اصلاح اور ترتیب اور تشکیل میں بہت اہم کام کئے۔ کہتے ہیں موسیقی کے علم نے اسے مکالمے لکھنے میں بڑی مدد دی۔ وہ ایک موسیقار کے کانوں سے مکالموں میں الفاظ کی نشست و برخاست کو سنتا تھا۔ جو مکالمہ بولنے اور سننے میں اچھا نہ لگتا اسے کاغذ پر نہ لکھتا۔ چنانچہ اس کے ڈراموں میں مکالموں کا باقاعدہ ایک ''ردھم'' ہوتا تھا اور ''میوزیکل'' اہتمام ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ اداکاروں کو اس کے لمبے مکالمے بولنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ برنارڈ شا الفاظ کی آوازوں پر بڑا دھیان دیتا تھا۔ وہ اپنی کلرکی کے زمانے میں ''شارٹ ہینڈ'' میں لکھنے کا بہت ماہر تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ڈرامے بھی شارٹ ہینڈ میں لکھتا تھا بعد میں اس کا سیکرٹری انہیں فقرات کی شکل دیتا۔ اس سے یہ ہوا کہ ڈراموں میں کوئی غیر ضروری لفظ مکالمے میں اپنی جگہ نہ بنا سکتا تھا۔ ڈراما لکھنے سے چھپنے تک اور سٹیج ہونے تک برنارڈ شا ایک ایک لفظ پر توجہ دیتا تھا اور وہ خود ہر شعبے کی نگرانی کرتا تھا۔

غالبؔ نے کہا تھا کہ:

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پر انگشت

برنارڈ شا نے غالبؔ کے اسی شعر پر عمل کر کے اپنے ڈرامے لکھے اور کسی کو حرف پر انگلی نہ رکھنے دی۔

1950ء میں وہ اپنے گاؤں والے گھر میں سیڑھی لگا کر ایک درخت کی شاخیں درست کر رہا تھا کہ سیڑھی سے گر گیا اور یہ گرنا اس کی موت کا باعث بنا۔

سمرسٹ ماہم

(Somerset Maugham)

19ویں صدی کا مقبول انگریزی ناول نگار، ڈرامہ نگار، 100 ناول اور بے شمار ڈرامے لکھے۔
فلموں کی کہانیاں لکھیں، وہ اپنے عہد کا امیر ترین لکھاری سمجھا جاتا تھا۔

''میری تحریروں میں حقائق اور افسانوی رنگ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ میرے لئے جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ اصل کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے''۔

(سمرسٹ ماہم)

....

''میں دوسرے درجے کے لکھنے والوں میں صف اول کا لکھنے والا ہوں''۔

(سمرسٹ ماہم)

....

میری زندگی کا نچوڑ یہ ہے کہ میں نے غلطی کے بعد غلطی کی ہے۔ میں نے بے حد فضول زندگی گزاری اور زندگی برباد کر لی جو کچھ کیا بُرے انداز میں کیا۔

(سمرسٹ ماہم)

....

جدید عہد کا مصنف سمرسٹ ماہم واحد لکھنے والا ہے جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

(جارج آرویل)

سمرسٹ ماہم

کمزور صحت، زبان میں لکنت، نہ کھیل کود میں دلچسپی، نہ لوگوں سے ملنے جلنے کی عادت، پہلی ملاقات میں کبھی کسی کو پسند نہ کیا۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے کبھی کسی سے بات کرنے میں پہل نہ کی۔ تھا انگریز مگر پیدائش پیرس میں ہوئی۔ مادری زبان فرانسیسی تھی۔ انگریزی زبان ایک استاد سے سیکھی اور اس زوردار انداز میں سیکھی کہ 100 کے قریب ناول، کہانیاں اور ڈرامے لکھ دیئے۔

سمرسٹ ماہم (Somerset Maugham) نے 25 جنوری 1874ء کو پیرس میں انگریزی سفارت خانے میں آنکھ کھولی۔ باپ برطانوی حکومت کا سفارت کار تھا۔ شاہی خاندان سے قرابت داری تھی۔ کنگ ایڈورڈ I سے شجرہ نسب جا ملتا تھا۔ کئی نامور وکیل سمرسٹ ماہم کے خاندان میں موجود تھے۔ خاندان کے بیشتر افراد کا تعلق وکالت اور قانون سے تھا۔ سمرسٹ ماہم کی ماں Edith Mary بہت خوبصورت عورت تھی۔ پیرس کی مجلسی اور ثقافتی زندگی میں اس کا نام جانا پہچانا تھا۔ باپ بدصورت، متوازن آدمی تھا۔ شکل وصورت میں سمرسٹ ماہم نے باپ کی پیروی کی۔

فلابیئر کی طرح سمرسٹ ماہم نے بھی اپنی ماں سے شدید محبت کی۔ یہ شاید ان دونوں کا اثر تھا۔ اس کی ماں جب چھٹے بچے کی پیدائش کے دوران فوت ہوگئی تو سمرسٹ ماہم نے اس کا بہت اثر لیا۔ اس کی تصویر ہر وقت جیب میں رکھتا۔ 91 سال تک اس نے یہ محبت نبھائی جب فوت ہوا تو ماں کی تصویر اس کی جیب میں تھی۔

وہ کہتا ہے:

''محبت کرنے کے علاوہ عورتوں کو کچھ نہیں آتا۔ محبت ایک بیماری ہے۔ عورت کیونکہ بنیادی طور پر کمزور ہے وہ جب محبت کرتی ہے تو روح پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تاکہ طاقت ور بن سکے۔''

اس نے اپنی اس عادت کو لوگوں سے چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن چھپا نہ سکا۔ اس کے ان نظریات نے اس کی گھریلو زندگی برباد کر دی۔ اس نے شادی کی لیکن 1927ء میں اس کی بیوی (Syrie) نے اسے طلاق دے دی۔ سمرسٹ ماہم نے کسی دوست کی بیٹی لے کر اس کی پرورش کی اور دوبارہ شادی نہ کی۔

ماں کی وفات کے دو سال بعد سمرسٹ ماہم کا باپ بھی فوت ہو گیا۔ پیرس سے اسے انگلینڈ چچا کے پاس پرورش کے لیے بھیج دیا گیا۔ انگلینڈ میں جب اسے سکول میں داخل کیا گیا تو اس کے لیے یہ زمانہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے چھوٹے قد کا دوسرے لڑکوں نے مذاق اڑایا۔ اس کی انگریزی میں فرانسیسی لب ولہجہ کی چھاپ سنائی دیتی تھی جو ہنسی کا باعث بنی۔ زبان میں لکنت اسی زمانے میں شروع ہوئی جس نے ساری زندگی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ چنانچہ تیکھے جملے کہنے اور لوگوں کے ساتھ سخت لہجہ اپنانے کا آغاز اسی بات کا ردعمل تھا۔ 16 سال کی عمر میں سمرسٹ ماہم ادب اور فلسفہ پڑھنے جرمنی چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں رہا۔ اس کے چچا نے لندن میں اس کے لیے ایک دفتر میں اکاؤنٹنٹ کی ملازمت تلاش کی لیکن سمرسٹ ماہم کو یہ نوکری پسند نہ آئی۔ اب کیا کیا جائے۔ یہ سوال اس کے خاندان کے سامنے تھا۔ قانون اور وکالت کے

شعبے میں سمرسٹ ماہم زبان کی لکنت کی وجہ سے نہیں جا سکتا تھا۔ سول سروس میں بھی زبان کا مسئلہ رکاوٹ بن رہا تھا۔ سمرسٹ ماہم جو کرنا چاہتا تھا وہ کر نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی عمر 20 سال سے کم تھی اور وہ اپنے بزرگوں کے حکم اور نگرانی کا پابند تھا۔ چنانچہ 5 سال کے لیے اسے میڈیکل کے شعبے میں گزارنے پڑے جہاں اسے زندگی کا ایک وسیع تجربہ حاصل ہوا جو بقول سمرسٹ ماہم ایک مصنف کے لیے بے حد ضروری تھا۔

''میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے لندن کے مضافات اور غربت زدہ علاقے میں میرا مطلب ہے (Lambeth) کے علاقے میں کچھ عرصہ گزارنا پڑا۔ جہاں میں نے زندگی کو بھوک، بیماری اور موت سے لڑتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایسا مشاہدہ اور تجربہ ہے جو ایک مصنف کے لیے بہت ضروری ہے۔ اور یہ صرف میڈیکل پروفیشن سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔''

5 سال بعد 1897ء میں اسے میڈیکل کی سند مل گئی۔ صرف سند ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں وقت گزار کر اس نے پہلا ناول Liza of Lambeth بھی مکمل کر لیا جسے پڑھ کر قارئین خوش ہوئے اور اس کے رشتے داروں کو حیرانی ہوئی۔

اس ناول میں سمرسٹ ماہم ہماری ملاقات ان لوگوں سے کراتا ہے جو اس زمانے کی سوسائٹی میں کمتر کہلاتے تھے۔ سمرسٹ ماہم کے نزدیک وہ ان لوگوں سے صرف میڈیکل پروفیشن کے ذریعے ہی مل سکتا تھا۔

''میں نے لوگوں کو مرتے دیکھا۔ درد کی کیفیت سے گزرتے دیکھا، ان کی آنکھوں میں امید کی بجھتی روشنی دیکھی، خوف دیکھا اور اس سے نجات کی امید دیکھی۔''

کیٹس نے ادویات اور سرجری کی تربیت کے دوران Imitation of Spenser مکمل کی۔ ادویات کی ملی جلی خوشبو اس کے اندر سانس لیتے شاعر کو نہ مار سکی۔ سمرسٹ ماہم نے میڈیکل کے اس شعبے میں تربیت حاصل کرتے ہوئے ایک مصنف کو دریافت کر لیا۔ یہ ناول محنت، مشقت کرنے والے لوگوں، ان کے مسائل، جنسی ضرورتوں اور ان عورتوں کی کہانی ہے جو لندن کے مختلف گھروں میں ملازمت کرتی ہیں۔ نقادوں اور قارئین نے اس ناول کی بہت پذیرائی کی۔ پہلا ایڈیشن دیکھتے دیکھتے بک گیا اور پھر سمرسٹ ماہم ڈاکٹری کی سند بھول کر لکھنے کے میدان میں آ نکلا جہاں اس نے 65 سال اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

سمرسٹ ماہم نے اس ناول کے بعد دس ناول لکھے پھر اچانک اس نے ڈراموں کی طرف توجہ دی اور ایک ڈرامہ Lady Frederick لکھا۔ تھیٹر کے لیے لکھے اس ڈرامے کو لوگوں نے بہت سراہا۔ اس کے ڈراموں کے پلاٹ، مکالموں اور مزاح نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب لندن میں چار مختلف تھیٹروں میں بیک وقت اسی کے ڈرامے دکھائے جا رہے تھے۔ لندن کے اخبار میں ایک کارٹون شائع ہوا جس میں اس کی مقبولیت کو دیکھ کر شیکسپیئر حیرانی میں اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو سمرسٹ ماہم کے قلم نے رُک کر تھوڑا سانس لیا اور اسے ایمبولینس ڈرائیور بنا کر جنگ میں بھیج دیا گیا۔ وہ برطانیہ کی Red Cross تنظیم میں شامل ہو گیا۔ اس میں کئی اور مصنفین بھی شامل تھے جن میں (E.E Cummings) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس تنظیم کا نام ''لٹریری ایمبولینس ڈرائیورز'' رکھا گیا تھا۔ جنگ کی ان سرگرمیوں میں جسمانی طور پر وہ شامل رہا لیکن ذہنی طور پر وہ اپنے پہلے مقبول ناول (Of Human Bondage) پر کام کرتا رہا۔ اس ناول کی طرف ادبی حلقوں اور نقادوں نے توجہ دی۔ امریکہ اور برطانیہ میں اس ناول کے خلاف بڑے تبصرے ہوئے

۔ صرف ایک نامور نقاد اور ناول نگار تھیوڈر ڈریزر اس کی حمایت میں بولا اور اس ناول کو ایک شاہکار قرار دیا اور اسے بیتھوون کی سمفنی کا نام دیا۔

Of Human Bondage آپ بیتی طرز کا ناول ہے۔ سمرسٹ ماہم نے اپنے کردار کو تھوڑا سا تبدیل کر کے ہیرو بنا دیا ہے۔ جس طرح روسی ناول نگار دوستوئیفسکی نے اپنے ناولوں میں اپنے ہیرو کی عادات میں اپنی عادات کا تڑکا لگایا ہے۔ اپنے باپ کے کردار کو تھوڑا سا تبدیل کر کے کہیں نہ کہیں کسی ناول میں پیش کر دیا ہے۔ سمرسٹ ماہم نے بھی اپنے ہیرو میں اپنی لکنت کی بجائے اسے لنگڑا بنا دیا ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اپنے باپ، چچا اور رشتے داروں کے کردار شامل کر دیئے ہیں۔ اگرچہ سمرسٹ ماہم کو ساری زندگی عورتوں سے دلچسپی کم ہی رہی مگر جنگ کے زمانے میں اس نے شادی سے پہلے کئی عورتوں سے تعلقات قائم کئے۔ یہ عورتیں کردار بن کر اس کے ناول میں ظاہر ہوتی رہیں۔ اس کی ذاتی زندگی میں جھانک کر دیکھنے والے لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ ناول اس کی زندگی کی کہانی ہے۔ سمرسٹ ماہم کی تحریروں میں یہ عناصر اکثر غالب رہا اس نے خود پر گزرے حالات اور واقعات کو ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ خود کہتا ہے:

''میری تحریروں میں حقائق اور افسانوی رنگ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ میرے لیے جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ اصل کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔''

سمرسٹ ماہم جنگ کے دوران خفیہ ایجنسیوں کے لیے بہت کام کرتا رہا۔ اس کی بیوی (Syrie) نے لندن میں اس کا تعارف انٹیلی جنس کے ایک سربراہ سے کرایا جس کے لیے اس نے سوئٹزر لینڈ میں فرائض انجام دیئے۔ اپنے آپ کو مصنف ظاہر کیا لیکن اندر کام کوئی دوسرا تھا۔ وہ خاص مشن پر روس بھیجا گیا۔ یہ ناممکن کام اس نے بڑی کامیابی سے کیا۔ انٹیلی جنس کے شعبے میں وہ بہت خوش تھا یہ اس کی مرضی کا کام تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ کام کرنے کی یہ صلاحیت اس نے اپنے وکیل باپ سے ورثے میں پائی ہے۔ ان کاموں کے لیے اسے ''لامحدود پیسے'' دیئے گئے۔ ان کاموں کے دوران اسے بڑی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ ٹی۔ بی کی بیماری نے حملہ کیا۔ سکاٹ لینڈ کے سینی ٹوریم میں کچھ عرصہ گزارا۔ دو بار بخار کی شدت سے مرتے مرتے بچا۔ ایک بار ڈاکوؤں نے اسے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ ایک بار سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ یہ سارے مہماتی واقعات اس کے ذہن میں محفوظ رہے۔ جسے وہ اپنی تحریروں میں بروئے کار لایا۔ مختلف علاقوں کے انسانوں سے مل جل کر اس تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوا اور یہ سب کچھ اس نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں سمو دیا ہے۔ وہ انسانوں سے ہمدردی اور انسان دوستی میں نہیں ملتا تھا۔ تحریروں کو سجانے سنوارنے کے لیے ملتا تھا۔ جس کا اس نے بار بار اعتراف کیا ہے۔

سمرسٹ ماہم نے چل پھر کر آدھی دنیا دیکھی اور موضوعات اور مشاہدات کا ایک لامحدود خزانہ یادداشت میں محفوظ کیا اور ناولوں، ڈراموں اور کہانیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ 91 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے تقریباً 100 کے قریب ناول، ڈرامے اور کہانیاں لکھیں پہلے ناول اور کئی ڈراموں کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا۔

''میں نے لکھنے کی طرف سنجیدگی سے اس وقت تک توجہ نہ دی جب تک مجھے ڈرامائی عناصر پر گرفت کا تجربہ حاصل نہیں ہوا۔ مجھے اس تجربے نے یہ سکھایا کہ مجھے ہر اس چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے جو ڈرامائی فضا قائم کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔''

لکھنے کو تو سمرسٹ ماہم نے بے شمار لکھا، ناول، ڈراما، کہانیاں، فلموں کے سکرپٹ لکھے، بے شمار دولت کمائی، اس کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

" He was the Most Famous and Wealthiest writers in the English Speaking world."

سمرسٹ ماہم کے نمائندہ ناولوں میں

1) The Razor's Edge.

2) Cakes and Ale.

3) The Moon and Sixpence.

4) Letter (Play).

5) The Casuarina Tree

اور Of Human Bondage ہیں۔ سمرسٹ ماہم کے ناولوں اور کہانیوں میں اس کے کردار برائیوں اور جنسی آسودگیوں میں ملوث نظر آتے ہیں وہ کھل کر ان کی کسی برائی کی مذمت نہیں کرتا۔

''شاید یہ میری کمزوری ہو کہ میں کسی کردار کے بُرے پہلو سے حیران نہیں ہوتا اور یہ شاید اس لیے ہے کہ جب تک یہ برائی مجھ پر اثر مرتب نہ کرے میں کسی کی برائی کو بُرا نہیں سمجھتا۔''

سمرسٹ ماہم کی کہانیوں کی ایک بڑی تعداد سفر کے دوران سنے ہوئے قصے ہیں جنہیں اس نے کہانیوں کا روپ دیا ہے۔

سمرسٹ ماہم نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب تھامس مان، ورجینا وولف، ولیم فاکنر اور جیمز جوائس جیسے ناول نگار مقبولیت حاصل کر رہے تھے اور نقادوں سے داد وصول کر رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں اسے کم درجے کا مصنف کہا جاتا ہے۔ سمرسٹ ماہم خود کہا کرتا تھا:

''میں دوسرے درجے کے لکھنے والوں میں صف اول کا لکھنے والا ہوں۔''

سمرسٹ ماہم کی اپنی ایک منفرد حیثیت تھی، اپنا اسلوب اور انداز تھا۔ اس کا کسی کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا بھر میں اس کے ناولوں اور کہانیوں کے ترجمے ہوئے اردو میں سعادت حسن منٹو نے اس کی تحریروں کا ترجمہ کیا اور اثر قبول کیا۔ جارج آرویل نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے

"Somerset Maugham is the Only Modren Writer who has Influenced me the most."

سمرسٹ کا ناول Of Human Bondage ایک حساس معذور نوجوان کی بہت دردناک کہانی ہے جو مختلف جذباتی اُتار چڑھاؤ سے دوچار ہونے کے بعد سکون حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناول کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ کہانی تین عورتوں اور ایک مرد کے گرد گھومتی ہے۔ سمرسٹ ماہم نے اس کہانی میں قدم قدم پر دلچسپی کے مواقع فراہم کئے ہیں اور جنس کے حصول میں ایک عورت کو در در کی ٹھوکریں دکھایا گیا ہے۔

فلپ کیری بڑا احساس انگریز نوجوان ہے جو پیرس میں مصوری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ لنگڑا ہے۔ فلپ کا پروفیسر اسے مصوری کے لیے نااہل قرار دیتا ہے چنانچہ فلپ لندن واپس آکر میڈیکل میں داخلہ لے لیتا ہے لیکن خود اعتمادی کا فقدان اسے یہاں بھی اپنی گرفت میں جکڑے رہتا ہے۔ یہاں وہ ایک اَن پڑھ، اُجڈ لیکن خوبصورت ویٹرس ملڈرڈ

روجر کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ملڈرڈ روجر کو اگر چہ اس کے لنگڑے پن سے نفرت ہے لیکن وہ اسے ملتی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی فلپ کے رومانوی انداز کو جھٹک دیتی ہے۔ فلپ بُری طرح اس کے عشق میں مبتلا ہے اور میڈیکل کے امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔

فلپ جب ملڈرڈ روجر کو شادی کی دعوت دیتا ہے تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ ایک سیلز مین ایمل ملر (Emil Miller) سے شادی کر رہی ہے۔ فلپ اسے بھلانے کی کوشش کرتا ہے اور ایک مصنفہ (Norah) سے محبت کرنے لگتا ہے جو مردانہ نام سے کہانیاں لکھتی ہے۔ لیکن (Norah) بار بار اسے ملڈرڈ کی محبت کا طعنہ دیتی ہے۔ ملڈرڈ جلد ہی فلپ کے پاس واپس آجاتی ہے وہ بہت اداس ہے ملر اسے چھوڑ کر چلا گیا اور وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

فلپ ملڈرڈ کے لیے گھر کا انتظام کرتا ہے۔ معاشی طور پر اس کی مدد کرتا ہے اور (Norah) سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔

یہاں فلپ اس چیز کی وضاحت کرتا ہے کہ بندھن انسانوں کے درمیان کس طرح ٹوٹتے اور بنتے ہیں۔ فلپ منتظر ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ ملڈرڈ سے شادی کرے گا۔ لیکن ملڈرڈ بچے کی پیدائش کے بعد بچہ ایک نرس کو دے کر فلپ کے ایک دوست گریفتھ (Griffith) کے ساتھ پیرس بھاگ جاتی ہے۔ فلپ چیرٹی ہسپتال کے ایک مریض کی بہن Sally Athelnys کے ساتھ تعلق قائم کر لیتا ہے جو اسے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ چند دنوں بعد ملڈرڈ بچہ لے کر واپس آجاتی ہے۔ فلپ سے بے وفائی کی معافی مانگتی ہے۔ فلپ پھر اس کے چکر میں آجاتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ملڈرڈ کو پھر بے وفائی کا دورہ پڑتا ہے۔ وہ فلپ کے کمرے کو آگ لگا کر اس کا سب کچھ برباد کر کے چلی جاتی ہے۔

فلپ اب کالج چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن میڈیکل ہسپتال چھوڑنے سے پہلے اس کے پاؤں کا آپریشن کیا جاتا ہے جس سے اس کا لنگڑاپن دور ہو جاتا ہے اور وہ Sally Athelnys کے باپ کے ساتھ مل کر کھڑکیاں صاف کرنے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات ملڈرڈ سے ہوتی ہے جو اب ایک طوائف بن چکی ہے۔ وہ بری طرح بیمار ہے۔ اس کا بچہ مر چکا اور وہ ایک چیرٹی ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ فلپ کا دل دوبارہ موم ہوتا ہے اس سے پہلے کہ فلپ دوبارہ اسے ملتا۔ ملڈرڈ ہسپتال میں دم توڑ دیتی ہے۔ انجام کار فلپ ملڈرڈ کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اور Sally Athenlys سے شادی کر لیتا ہے۔

سمرسٹ ماہم کا یہ ناول اس کے نمائندہ ناولوں میں سے ایک ناول ہے۔ انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور انسانی کرداروں کی نفسیات کرتا ہوا یہ ناول قدم قدم پر سمرسٹ کی زندگی کی تصویر دکھاتا ہے اور اس کے بھرپور مشاہدے اور تجربے سے عکاسی کرتا ہے۔

سمرسٹ ماہم نے اپنے بارے میں کھل کر باتیں کی ہیں اپنی کسی برائی اور کمزوری پر پردہ نہیں ڈالا۔ وہ کہتا تھا:

''میں نے ہمیشہ اپنے بارے میں یہی اندازہ کیا کہ میں 25 فیصد ابنارمل ہوں اور 75 فیصد نارمل حالانکہ معاملہ الٹ تھا اپنے بارے میں یہ اندازہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔''

سمرسٹ ماہم بہت دولت مند لیکن بہت کنجوس تھا، پیسہ پیسہ گنتا تھا۔ حالانکہ رفاعی کاموں پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس کنگ سکول کی اس نے بہت مالی مدد کی جس میں اس نے اپنا بچپن بہت تکلیف دہ حالات میں گزارا تھا۔ زندگی کے آخری ایام اس نے بڑی شان سے اپنے پیرس کے Willa میں گزارے جس میں اس کے پاس چھ نوکر اور چار مالی تھے۔

اپنی وصیت میں بیٹی (Liza) کے لیے ایک پیسہ نہ چھوڑا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اپنی ماں کی طرف داری کرتی تھی۔ آخری عمر میں اسے اپنے کئے پر بہت افسوس تھا۔

''میری زندگی کا نچوڑ یہ ہے کہ میں نے غلطی کے بعد غلطی کی ہے۔ میں نے بے حد فضول زندگی گزاری اور زندگی برباد کرلی۔ جو کچھ کیا بُرے انداز میں کیا۔''

اس نے کئی بار سوچا کہ وہ اپنے بھائی ہیری کی طرح خودکشی کرلے مگر اس نے ایسا نہیں کیا Willa میں اس کا بھتیجا Robin روبن اس کے ساتھ رہتا تھا ایک دن اس سے کہا:

''اگر تم دعا پر یقین رکھتے ہو تو دعا مانگو کہ کوئی صبح بھی آئے کہ میں سو کر نہ اٹھوں اور ابدی نیند سو جاؤں''

16 دسمبر 1965ء کو اس کی دعا قبول ہوگئی اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ بقول فرانسیسی دانشور ول ڈیورنٹ ''اس نے ایک غمزدہ زندگی گزاری، وہ اس ادبی بلندی پر نہ پہنچا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا اگرچہ اس نے اپنے ناولوں، ڈراموں اور کہانیوں سے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ وہ محنتی تھا اور جینئس تھا۔ بس مزاح اور برداشت کی کمی تھی۔ دراصل قدرت نے اسے اس کی برائیوں کی پیشگی سزا دے دی تھی اور اسے موقع نہیں دیا کہ وہ سمجھ سکے کہ محبت اور معاف کر دینا تلخی اور انتقام سے کہیں بہتر ہے۔

ورجینا وولف

(Virginia Woolf)

بیسویں صدی کی اہم ناول نگار جس نے ناول کو سطحی، رومانویت سے چھٹکارا دلایا۔ ناول کو شعور کی عمیق گہرائیوں سے روشناس کرایا اور اپنے بعد آنے والے ناول نگاروں پر اثرات چھوڑے۔

مجھے یہودیوں کی آواز سے نفرت ہے اور نہ ہی ان کی ہنسی اچھی لگتی ہے۔

(ورجینیا وولف)

....

مرد کے ساتھ جنسی تعلقات کو میں پسند نہیں کرتی ۔ ہماری شادی اور احترام ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور سہارے کی بنیاد پر قائم رہے گا۔

(ورجینیا وولف)

....

''ٹو دی لائٹ ہاؤس'' کو جدید ناول کی تاریخ کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔اس ناول نے جدید ناول نگاری کی روایت کو پروست اور جیمز جوائس کی طرح آگے بڑھایا ہے۔

(لیونارڈ وولف)

ورجینیا وولف

عورت ازل سے مرد کی تابع رہی ہے۔ مردوں کی بنائی ہوئی دنیا نے اسے ہمیشہ اپنے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی۔ اپنی مرضی کی تنی رسی پر اسے چلنے کا حکم دیا۔ ہمیشہ اپنی منوائی اس کی نہ مانی۔ اسے چار دیواری میں رکھا تاکہ وہ اس کے لیے بچے پیدا کرے، ان کی دیکھ بھال کرے۔ بچے پیدا کرنے والی اس ''مشین'' نے جب جب اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اس آواز کو دبا دیا گیا لیکن عورتوں نے ہار نہ مانی اور اپنے حق کے لیے جنگ جاری رکھی اور سوسائٹی میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ جن عورتوں نے اپنی ذہانت اور اپنی تحریروں سے مظلوم عورتوں کو یہ جنگ جاری رکھنے کی ہمت دی اور منزل کی طرف پہنچنے کا راستہ دکھایا، ان میں ایک نام ورجینیا وولف کا بھی ہے۔

ورجینیا نے سوائے اپنے باپ Sir Leslie Stephe کے جو ایک مشہور مصنف اور نقاد تھا کسی دوسرے مرد کی حاکمیت کو قبول نہیں کیا۔ بس شادی کے بعد خاوند کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ شادی سے پہلے وہ ورجینا سٹیفن تھی۔ لیونارڈ وولف سے شادی کی تو وہ ورجینیا وولف بن گئی۔ شادی کے بعد اس نے جنسی تعلقات کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ لیونارڈ وولف کو اس نے شادی پر کہہ دیا تھا:

''مرد کے ساتھ جنسی تعلقات کو میں پسند نہیں کرتی ہماری شادی اور احترام ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور سہارے کی بنیاد پر قائم رہے گا۔''

لیونارڈ وولف نے اس پر عمل کیا۔ ہوگارتھ پریس بنایا۔ ورجینیا وولف کی کتابیں اسی پریس سے چھاپیں، دیگر مصنفین ای ایم فاسٹر، ٹی ایس ایلیٹ کی کتابیں بھی چھاپیں۔ لیونارڈ وولف نے ورجینیا کی ہر قدم پر مدد کی۔ اسے احترام دیا۔ بیماری میں تیمارداری کی۔ اس کی ہر مصیبت کو جھیلا اور اس کے لیے آسانیاں پیدا کیں اور یہ سلسلہ ورجینیا وولف کی موت تک جاری رہا۔

وہ بیسویں صدی کی اہم ناول نگار تھی جس نے ناول کو سطحی رومانویت سے چھٹکارا دلایا۔ ناول کو شعور کی عمیق گہرائیوں سے روشناس کرایا اور اپنے بعد آنے والے ناول نگاروں پر اثرات چھوڑے۔

ورجینیا وولف لندن میں لیزلی سٹیفن کے گھر پیدا ہوئی جو نقاد تھا۔ ماں جولیا ادب شناس اور ایک ادبی تنظیم کی صدر سیکرٹری اور میزبان تھی۔ اس عہد کے تمام ادیب اس کے گھر ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ ورجینیا کے باپ کی ایک بڑی لائبریری تھی۔ جہاں دنیا کی بہترین کتابوں کا خزانہ تھا۔ ورجینیا وولف کو اس ادبی ماحول اور لائبریری کی کتابوں نے مصنف بنادیا۔ اپنے باپ سے ورجینیا بہت متاثر تھی۔ بچپن ہی سے اس نے باپ کا اثر قبول کیا اور اپنے ذہن میں ایک ادبی ماحول کی پرورش کرتی رہی۔ ورجینیا اپنی ایک ڈائری میں لکھتی ہے:

''جب میرے والد کرسی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر کے بولتے تو ہمیں یوں لگتا جیسے وہ صرف ٹینی سن اور ورڈز ورتھ کے شعر ہی نہیں سنا رہے بلکہ اپنے محسوسات اور معلومات بھی ان میں شامل کر رہے ہیں۔ چنانچہ کئی عظیم انگریزی شاعروں

کی نظمیں مجھے اپنے باپ کی یاد دلاتی ہیں۔ میں ان میں اپنے باپ کی آواز سنتی ہوں......''

جب ورجینیا 13 سال کی ہوئی تو اس کی ماں مرگئی۔ باپ اعصابی مریض بن گیا۔ یہ بیماری ورجینیا کو بھی آ لپٹی اور ورجینیا ساری عمر اس سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔ یہی اعصابی بیماری اس کی خودکشی کا باعث بنی۔ باپ نے بیوی کی وفات کے بعد گھر کے انتظامات سنبھال لیے۔ ورجینیا نے اس کا ہاتھ بٹایا لیکن سٹیفن کا مرض بڑھتا گیا اور وہ 1904ء میں مرگیا۔ اب گھرداری ورجینیا کے سر آ پڑی۔ وہ گھر اور اعصابی دوروں کو ساتھ ساتھ چلاتی رہی۔ باپ کی موت کے بعد اس نے بھی خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر بچ گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور بہن بھائیوں کو لے کر نئے گھر بلومز بری (Blooms Bury) چلی گئی اور وہاں ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

ماں باپ کے ہاں اس پر وکٹورین عہد کے ادب کا اثر رہا لیکن بلومز بری میں آ کر اس نے آزاد خیال دانشوروں اور لکھنے والوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا جو ادب اور زندگی گزارنے کے سلسلے میں کلی طور پر آزاد تھے اور ہر پابندی کے خلاف تھے۔ ان میں کلائیو بیل، سیکسن سڈنی، لیونارڈ وولف، روجر فرائی، ڈنکن گرانٹ اور ٹرنر جیسے مشہور لکھنے والے تھے۔

ورجینیا وولف کی چھوٹی بہن نے کلائیو بیل سے شادی کر لی اور ورجینیا وولف نے لیونارڈ وولف سے یوں بلومز بری گروپ کی ادبی محفلیں زور وشور سے جاری رہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ورجینیا وولف نے لکھنا شروع کیا اور اس کی مقبولیت سارے ملک میں پھیلی۔

ورجینیا وولف نے لکھنا شروع کیا تو اونچی سوسائٹی اور اشرافیہ کے لوگوں نے اس پر تنقید شروع کر دی۔ ورجینیا وولف کے ہاں یہودی کرداروں کو بڑا غلیظ اور جسمانی طور پر کمزور دکھایا گیا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ یہودیوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:

''مجھے یہودیوں کی آواز سے نفرت ہے اور نہ ہی ان کی ہنسی اچھی لگتی ہے۔''

لیکن اس نے شادی ایک یہودی سے کی۔ اس کے بارے میں جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''میرا مذہب یہودی لوگوں سے زیادہ مذہبی ہے مگر اس کا ایک ایک بال انسانی محبت سے بھرپور ہے۔''

بلومز بری گروپ نے جنس کے حوالے کو رد کیا۔ اسی شرط پر ورجینیا نے لیونارڈ وولف سے شادی کی تھی مگر جب ورجینیا وولف ہیرلڈ کی بیوی ویٹا سے ملی تو اس سے دوستی کر لی اور ایک عرصہ تک دونوں کے درمیان جذباتی تعلق قائم رہا۔ جب ورجینیا کا ناول Orlando چھپا تو ویٹا کے بیٹے نے کہا۔

''یہ ادب کی دنیا میں چھپا سب سے طویل محبت نامہ ہے''

یہ ویٹا اور ورجینیا کی کہانی ہے۔ دونوں عورتیں مرتے دم تک دوستی کے رشتے میں بندھی رہیں۔

ورجینیا وولف نے بہت کام کیا۔ باوجود اعصابی بیماری کے جس نے اسے کئی بار خودکشی پر مجبور کیا۔ ورجینیا نے بہت کچھ لکھا اس کے ناولوں میں

1 The Voyage Out
2 Night and Day
3 Mrs Dolloway
4 To the Light House
5 Orlando

6 The Waves
7 The Years

اس کے مشہور ناول ہیں۔ اس نے عورتوں کے بارے میں بہت مضامین لکھے جو Nonfiction میں شمار ہوتے ہیں۔ مضامین کے کئی مجموعے چھپے۔ ان میں A room of his own بہت مشہور ہے۔ جس کی شہرت نے اسے Feminist icon بنا دیا۔

ورجینیا وولف نے مختصر کہانیاں بھی لکھیں جن کا ایک مجموعہ بھی چھپا جس کا نام The Complete Shorter ہے۔

ورجینیا وولف کی ساری زندگی اعصابی دوروں کا شکار رہی۔ پہلا دورہ اسے ماں کی موت پر پڑا، دوسرا دورہ باپ کی وفات پر اور پھر یہ مرض دائمی ہو گیا۔ ان دوروں سے بچنے کے لیے اس نے بلومز بری گروپ بنایا۔ ادیبوں کا ہجوم اپنے گرد رکھا۔ ویٹا سے جنسی تعلقات استوار کیے لیکن وہ ان اعصابی دوروں سے نہ بچ سکی۔ 1882ء میں پیدا ہوئی 1941ء تک بیماری کا شکار رہی۔ دو بار خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن بچالی گئی۔

اس کا آخری ناول Between the Acts ہے۔ اس نے اس کا مسودہ مکمل کیا اور پھر موت کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ 28 مارچ 1941ء کا واقعہ ہے۔ ورجینیا وولف رات کے پچھلے پہر اٹھی۔ اپنا اوورکوٹ پہنا اور دریا کے کنارے چلی گی۔ اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں بھاری بھاری پتھر کے ٹکڑے بھر لیے اور پھر چلتی ہوئی دریا میں داخل ہوگئی، چلتی رہی اور پھر پانی میں ڈوب گئی......اس کی لاش کو بہت تلاش کیا گیا۔ اس کے خاوند نے تلاش جاری رکھی پھر 18 اپریل کو لاش ملی اور اسے Monk House کے باغ میں دفنا دیا گیا۔ اپنے خاوند کے نام اس نے ایک خط چھوڑا جو کچھ یوں تھا:

''میرا خیال ہے میں پھر پاگل پن کا شکار ہو رہی ہوں۔ میرا خیال ہے اب ہم زیادہ دن اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ مجھے اب پھر یونانی پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ چنانچہ اب میں وہی کر رہی ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ تم نے مجھے زندگی کی ہر خوشی دی ہے۔ مجھ سے اب ہر چیز چھن گئی ہے بس تمہارا اچھا سلوک باقی ہے۔ اب میں مزید تمہاری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں سے زیادہ اچھی زندگی کسی نے نہیں گزاری۔''

''ٹو دی لائٹ ہاؤس'' کو جدید ناول کی تاریخ کا سنگِ میل سمجھا جاتا ہے......اس ناول نے جدید ناول نگاری کی روایت کو پروست Proust اور جیمز جوائس James Joyce کی طرح آگے بڑھایا ہے۔ اس ناول میں پلاٹ کی حیثیت ثانوی ہے اور فلسفیانہ اور نفسیاتی بہاؤ کو اولیت دی گئی ہے۔ بچپن کے جذبات اور جوانی کے تعلقات کو نمایاں کیا گیا ہے......''ٹائم میگزین'' نے اسے انگریزی زبان کے 100 بہترین ناولوں میں شمار کیا ہے......ناول تین حصوں میں تقسیم ہے۔

1. Window
2. Time Pass
3. To The Light House

ناول کا آغاز رمزے خاندان کے گھر سے ہوتا ہے جو ایک جزیرے میں واقع ہے اور سارا خاندان یہاں چھٹیاں منانے آیا ہوا ہے۔ مسز رمزے Ramsay کھڑکی میں بیٹھی سویٹر بُن رہی ہے۔ اس کا چھ سالہ بیٹا جیمز اس کے پاس بیٹھا رسالوں اور اخباروں سے تصویریں کاٹ رہا ہے۔ مسز رمزے اسے بتلاتی ہے کہ اگر دن آج کی طرح صاف اور اُجلا رہا تو کل وہ کشتی میں بیٹھ کر لائٹ ہاؤس دیکھنے جائیں گے۔ مسٹر رمزے اپنی بھرپور آواز میں کہتے ہیں شاید دن کل اتنا

صاف اور اجلا نہ ہو۔ اس گھر میں کچھ اور ملاقاتی اور مہمان بھی آجاتے ہیں۔ ان میں للّی Lilly بھی ہے جو ایک مصور ہے اور مسز رمزے اور جیمز کی تصویر بنانے کے لیے اپنا ایزل لگاتی ہے۔ مسٹر رمزے بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ کل کا دن اُجلا اور صاف نہیں ہوگا۔ جیمز کا دل بار بار اس بات سے ٹوٹتا ہے کیونکہ وہ لائٹ ہاؤس جانے کے لیے بیتاب ہے۔

مہمانوں میں ایک کردار بوڑھے آگسٹس کارمیکل کا بھی ہے جو شاعر ہے۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور بال سفید ہیں مگر اس نے بالوں پر مہندی لگا رکھی ہے اور وہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا ہے۔ یہ حصہ ڈنر پارٹی پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ جو Time Pass کے عنوان سے شروع ہوتا ہے اس میں ورجینیا وولف نے بتلایا ہے کہ ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہو کر ختم ہو چکی ہے۔ پرو بچہ جننے کے دوران مر گئی۔ اینڈریو Andrew جنگ میں مارا گیا۔

تیسرا حصہ ''لائٹ ہاؤس'' دس سال بعد کے واقعات بیان کرتا ہے۔ جوان کردار بوڑھے ہو چکے ہیں اور بچے اب جوان ہیں۔ چنانچہ اب وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ لائٹ ہاؤس دیکھنے کا وہ پروگرام جو اب تک تکمیل کو نہیں پہنچا اسے مکمل کیا جائے۔ چنانچہ وہ لائٹ ہاؤس دیکھنے کے لیے کشتی پر سوار ہو کر لائٹ ہاؤس کی طرف بڑھتے ہیں۔ جیمز جو اب سولہ سال کا ہو چکا ہے کشتی چلا رہا ہے...... انہوں نے للّی کو بھی لائٹ ہاؤس چلنے کے لیے کہا تھا مگر وہ نہ مانی کیونکہ اسے گزشتہ دس سالوں سے نامکمل تصویر کو مکمل کرنا تھا۔ للّی اب جب ناشتے کی میز پر جاتی ہے تو اسے دس سال پرانے تمام واقعات یاد آجاتے ہیں کہ کس طرح دس سال پہلے مسز رمزے ناشتے کی میز پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور کس طرح سارا گھر قہقہوں سے گونجتا تھا۔ اس ناول میں فلیش بیک کی تکنیک سے واقعات پیش کیے گئے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

للّی لوگوں کے ساتھ لائٹ ہاؤس نہیں جاتی اور اپنی تصویر مکمل کرتی رہتی ہے۔ اسے لائٹ ہاؤس نظر آرہا ہے اور وہ کشتی بھی نظر آرہی ہے جس میں بیٹھ کر لوگ لائٹ ہاؤس کی طرف جارہے ہیں۔

کشتی جب آدھے راستے میں پہنچی تو ہوا تیز ہوگئی۔ مسٹر رمزے نے کہا کہ کشتی واپس کی جائے کل لائٹ ہاؤس چلیں گے لیکن جیمز نے کہا کہ کشتی واپس نہیں ہوگی اگر اب ہم واپس چلے گئے تو دس سال کا وقفہ پڑ جائے گا۔ چنانچہ سفر جاری رہتا ہے اور آخر کار وہ لائٹ ہاؤس پہنچ جاتے ہیں۔ للّی دور سے دیکھتی ہے اور خوش ہوتی ہے کہ چلو آخر ایک منزل سر ہوگئی۔

یہ ناول جتنا مشہور ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے اور قاری قدم قدم پر ابلاغ کی رقت پسندی سے دوچار ہوتا ہے۔ سارے ناول میں قاری کی رہنمائی کرنے والا کوئی راہنما دکھائی نہیں دیتا۔ پہلے حصے میں واقعات اور کردار بالکل قاری کے سامنے رہتے ہیں۔ کرداروں کا آپس میں تعلق، ان کی کارکردگی، واقعات کا بہاؤ، جو دوسرے حصے یعنی Time Pass میں ناپید ہے۔

اس ناول کا سارا پلاٹ، اس کے سارے کردار دراصل ورجینیا وولف کے گرد گھومتے ہیں مسٹر رمزے اور مسز رمزے اس کے ماں باپ ہیں اور ان کے بچے اس کے بہن بھائی۔ ناول میں باقی ابھرنے والے کردار وہ آنے جانے والے لوگ ہیں جو ان کے گھر آکر ادبی محفلیں برپا کرتے تھے۔ ورجینیا وولف نے اپنی پرانی یادوں، اپنے بچپن اور پرانے گھر میں ہونے والے واقعات کو اس ناول کا حصہ بنا دیا ہے۔ لیکن اس نے ناول کا جو اسلوب رکھا ہے وہ بالکل جدید ہے جس میں جیمز جوائس نے بھی اپنے ناولوں کی فضا تیار کی۔

اس ناول کو نقاد آٹو بائیگرافی طرز کا ناول قرار دیتے ہیں کیونکہ واقعات، ماحول اور کرداروں کی مناسبت سے یہ ورجینیا

کے ذاتی اور نجی حالات کے بہت قریب ہے۔ یہ ناول چھپا تو ورجینیا وولف کی بہن نے کہا:

''مسز رمزے کا کردار دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری ماں دوبارہ زندہ ہوگئی ہے۔''

ورجینیا وولف اسے اپنا بہترین ناول کہتی ہیں۔ لیونارڈ وولف نے اس ناول کو ماسٹر پیس قرار دیا اور خوبصورت نفسیاتی نظم کا خطاب دیا۔ لوگوں میں (باوجود مشکل انداز بیاں کے) اس کی بڑی پذیرائی ہوئی 3000 کاپیاں چھاپی گئیں۔ ورجینیا وولف نے اسے ہوگارتھ پریس سے خود چھاپا۔ ناول بہت بکا اور میاں بیوی کو اتنے پیسے ملے کہ انہوں نے ایک کار خرید لی۔

فلم اور ٹی وی والوں نے اس پر فلم بھی بنائی اور اس ناول پر بہت سے ٹی وی سیریل بھی بنے۔ اور اب تک اس کا شمار دنیا کے سو بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔
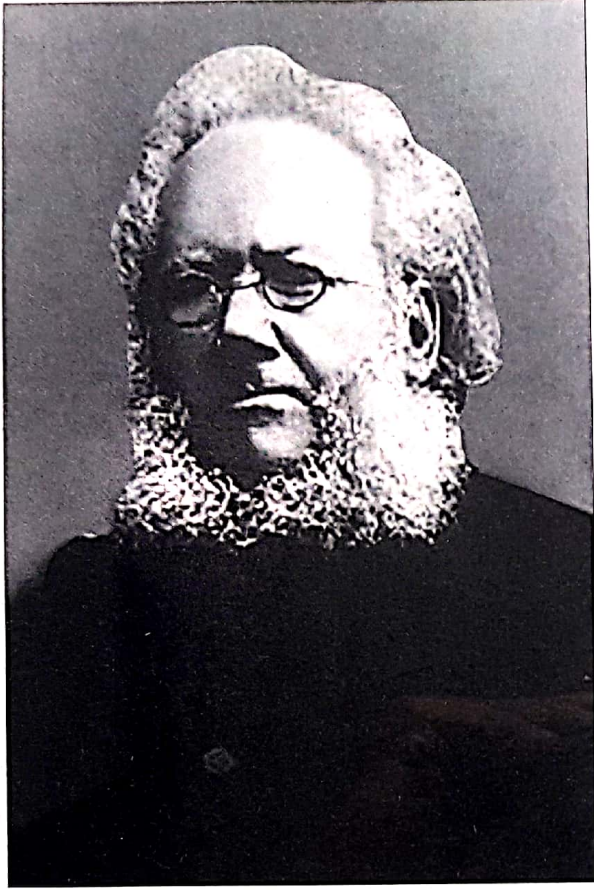
ہنرک ابسن

(Henrik Ibsen)

انیسویں صدی کا روایت شکن، باغی، نارویجن، ڈرامہ نگار، جدید ڈرامے کا امام، سوسائٹی کی فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کرنے والا ڈرامہ نگار، ڈرامے کا نیا نظام مرتب کیا۔ وکٹورین عہد کی اخلاقیات کے خلاف آواز اٹھائی۔ مذہب پر تنقید کی۔ جارج برنارڈ شا اور چیخوف نے اس سے اثر قبول کیا۔

ابسن جدید ڈرامے کا امام ہے۔اس نے جدید ڈرامے کے اصول وقواعد مرتب کئے اور مرتے دم تک نقادوں کی تنقید کا سامنا کرتا رہا اور انہیں اشتعال دلاتا رہا۔

(جولین پیٹرک)

....

ابسن کا ڈرامہ ''گڑیا گھر'' جدید ڈرامے کی طرف کھلنے والا پہلا دروازہ ہے۔

(جارج برنارڈ شا)

....

''گڑیا گھر'' پہلا Feminist Play سمجھا جاتا ہے۔اس ڈرامے کی اشاعت سے نیچرل مومنٹ کا آغاز ہوا۔حقیقی اور سچے واقعات نے ڈرامے میں جگہ بنائی اور روایتی رومانویت ڈرامے سے رخصت ہوگئی۔

ہنرک ابسن

اُردو کے شاعر یگانہ چنگیزی کی طرح انگریزی زبان کے مشہور ڈرامانویس جارج برناڈ شا نے بھی کبھی کسی دوسرے کو اپنے جیسا نہ سمجھا۔دونوں ادب کے جنگل میں اپنے سوا کسی دوسرے شیر کی حکمرانی کے قائل نہ تھے...... یگانہ نے غالبؔ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوگئے۔جارج برناڈ شا نے شیکسپیئر کی غلطیاں درست کرنا شروع کر دیں۔یگانہ نے تو آخر ہتھیار ڈال دیئے اور خود کو مشورہ دیا کہ

صلح کر لو یگانہ غالبؔ سے
وہ بھی اُستاد تم بھی اک اُستاد

مگر جارج برناڈ شا مرتے دم تک اپنے آپ کو شیکسپیئر سے بڑا ڈرامانویس سمجھتے رہے۔شیکسپیئر کے ڈراموں میں کیڑے نکالتے رہے۔اگر کسی ڈرامانویس کی عظمت کو تسلیم کیا جسے اس نے کھل کر داد دی تو وہ ناروے کے ہنرک ابسن Henrik Ibsen تھے۔اس پر کتاب بھی لکھی۔کھل کر اس کے ڈراموں کی تعریف کی اور سوسائٹی کی فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کرنے والا ڈرامانگار قرار دیا۔

تھیٹر کی روایتی زندگی میں اگر کسی کو جدید ڈرامے کا امام قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ ابسن ہے۔ناروے کے اس ڈرامانگار نے وکٹورین عہد کی روایات اور زندگی کے پیچھے چھپی فرسودگی کو بے نقاب کیا۔برسوں سے چلے آ رہے روایتی نظریات کو للکارا اور اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا۔ایسا کرتے ہوئے اسے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔چرچ اور روایات کے کرتا دھرتا اس کے خلاف ہوگئے'اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا' جلاوطنی اختیار کرنا پڑی مگر وہ آہستہ آہستہ جدید ڈرامے کا راستہ ہموار کرتا رہا اور آخر کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

ابسن 20 مارچ 1828ء کو ناروے کے شہر Skien میں پیدا ہوا۔Skien ایک چھوٹا سا گاؤں تھا' جو بندرگاہ کے قریب تھا۔ابسن کا خاندان ناروے کے چند معزز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔جس کا پیشہ تجارت تھا۔اپنے خاندان کے بارے میں ابسن نے نقاد (George Brandes) کو لکھے ایک خط میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔اس کی ماں مذہبی خیالات رکھتی تھی۔باپ ساری زندگی ذہنی دباؤ کا شکار رہا' ابسن کے ڈراموں میں ان دونوں کی کہیں کہیں جھلک دکھائی دیتی ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں ابسن نے گھر چھوڑ دیا اور ڈراموں کی طرف توجہ دی۔اٹھارہ سال کی عمر میں ایک نوکرانی سے تعلقات قائم کیے ایک ناجائز بچے کا باپ بنا جس سے وہ بعد میں انکاری ہوگیا۔حالانکہ 14 سال کی عمر تک اس بچے کو وہ باقاعدہ خرچہ دیتا رہا۔بچے سے وہ کبھی نہیں ملا اور وہ بچہ گمنامی میں فوت ہوگیا۔

ابسن نے ڈرامے لکھنے کی طرف توجہ دی۔بے شمار ڈرامے لکھے مگر کامیابی نہ ہوئی' کچھ پیسے شاید ملے ہوں مگر شہرت اور کامیابی نہ ملی۔تقریباً 145 ڈرامے بحیثیت مصنف' ہدایت کار اور پیش کار کی حیثیت سے اسٹیج کیے مگر وہ اسے حاصل نہ ہوا جو حاصل کرنا چاہتا تھا۔اٹلی' جرمنی میں وقت گزارا تھیٹر سے منسلک رہا اور تھیٹر کی زندگی کی باریکیوں کو سمجھتا رہا۔

یونانی المیہ نگار اسکائی لیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مصنف، ہدایت کار، پروڈیوسر، اسٹیج مینیجر، غرض چپڑاسی سے لے کر مصنف تک سب کام خود کرتا تھا۔ یہی حال ابسن کا تھا وہ ایک عرصہ ناروے جین تھیٹر (Bergen) میں ملازم رہا۔ اس عرصے میں اس نے تھیٹر کی ایک ایک باریکی کو سمجھا اور تجربہ حاصل کیا جو بعد میں اس کے تحریری کام میں بہت نکھر کر باہر آیا۔

1654ء میں اس نے Suzanhan Thoresen سے شادی کی۔ خرچہ زیادہ آمدنی کم۔ تنگ آ کر کرسٹانیا Christania چلا آیا اور پھر اگلے 27 سال اس نے وہیں گزارے۔

Brand اس کا پہلا کامیاب ڈراما ہے جو ایک پادری کے بارے میں ہے۔ جو اپنی تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار اور اصول اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے داؤ پر لگا دیتا ہے۔ جس کا انجام تنہائی اور خستہ مالی اور نفرت ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ ڈراما لوگوں نے پسند کیا۔ دوسرا ڈراما Peer Gynt تھا جو ایک خود غرض آدمی کی کہانی ہے۔

ابسن کو اصلی کامیابی، جس نے اسے ساری دنیا میں مشہور کر دیا اس کا ڈراما ''گڑیا گھر'' A Doll's House ہے۔ جس کا موضوع متنازع اور سخت اختلافی تھا۔ وکٹورین عہد کے تماشائیوں نے اس ڈرامے پر بڑی لے دے کی۔ یہ ایک متوسط طبقے کی کہانی ہے۔ پہلی بار ابسن نے شادی شدہ زندگی کی خامیوں کو بے نقاب کیا۔ نورا Nora اپنے خاوند کے لیے ایثار کا جذبہ رکھتی ہے، قربانی دیتی ہے لیکن اس کا خاوند اس کی قدر نہیں کرتا اسے کٹھ پتلی بنا کر گھر کی چار دیواری میں قید رکھنا چاہتا ہے لیکن نورا ایسا نہیں کرتی خاوند اور بچوں کی چھوڑ کر گھر سے چلی جاتی ہے۔ ''گڑیا گھر'' وکٹورین عہد میں رہنے والے شادی شدہ مرد اور عورت کی زندگی پر ایک جرأت مند تنقید تھی۔ ایک عورت پہلی بار جرأت کا ثبوت دیتی ہے اور مرد کے خود ساختہ دائرے سے باہر قدم رکھتی ہے۔ ایک عورت کی روایت کے خلاف بغاوت کا یہ پہلا قدم تھا۔

Ghosts وکٹورین اخلاقیات پر سخت تنقیدی ڈراما تھا۔ An Enemy of People نامی ڈرامے کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اکیلا آدمی درست راستے پر چل سکتا ہے اور وہ صحیح ہوتا ہے جبکہ لوگوں کا ہجوم گمراہ ہو سکتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ڈاکٹر لوگوں کو ایک بیماری سے بچانا چاہتا ہے۔ جو باتھ روم میں جانے والے اس پانی سے ہو سکتی ہے جو ایک ٹینسری سے ہو کر آتا ہے۔ لیکن لوگوں کا ہجوم اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جو ڈاکٹر ان کے سامنے لانا چاہتا ہے ایک آدمی کی درست بات کو لوگوں کا ہجوم رد کرتا ہے۔ اور سب اکٹھے ہو کر اس کے گھر پر پتھراؤ کرتے ہیں اور ڈاکٹر کو A Enemy of People قرار دے دیتے تھے۔

ابسن کے دوسرے اہم ڈراموں میں Hedda Gable اور The Master Builder ہیں۔ ابسن نے اپنے ڈراموں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کو پیش کیا۔ اس کے موضوعات علاقائی نہیں بلکہ آفاقی ماحول کو پیش کرتے تھے۔ مذہبی، سماجی برائیاں ہمیشہ اس کے حد نظر رہیں اور وہ ان کو اپنا موضوع بناتا رہا اور تمام عمر روایتی سوچ رکھنے والے لوگوں کی تنقید کا شکار بنتا رہا۔ جب جرمنی میں اس کا ڈراما ''گڑیا گھر'' پیش کیا گیا تو اسے ڈرامے کا انجام بدلنے کا مشورہ دیا گیا کیونکہ خیال تھا کہ نورا جب اپنے خاوند اور بچوں کو چھوڑ کر جائے گی تو شاید لوگ اس بات کو پسند نہ کریں اس لیے کہ مغرب اور یورپ عورت کی آزادی کے خلاف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ عورت اس نوعیت کی بغاوت کرے۔ چنانچہ یہ مشورہ دیا گیا کہ آخر میں نورا گھر نہ چھوڑے بلکہ اپنے خاوند اور بچوں کے سامنے بے ہوش ہو کر گر جائے اور پردہ کھینچ دیا جائے چنانچہ جرمنی میں اس ڈرامے کا انجام اسی طرح کیا گیا جس کے بارے میں ابسن نے یہ کہا کہ:

''اصلی ڈرامے کے ساتھ یہ سب سے بڑی بے ایمانی تھی''

ڈرامے کے انجام کو بدلنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ نورا کا مرکزی کردار کرنے والی اداکارہ نے اس انجام کے تحت کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جارج برنارڈ شا نے اصلی ڈرامے کے انجام پر ایک ایسا جملہ کہا جو اس ڈرامے کے ساتھ ساتھ اپنی شہرت رکھتا ہے۔ برنارڈ شا نے کہا تھا کہ جب نورا دروازہ بند کر کے خاوند کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو جدید ڈرامے کے طرف ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔

ابسن جب ناروے چھوڑ کر گیا تھا تو وہ ایک گمنام آدمی تھا، لیکن جب 1891ء میں وہ واپس کرسٹانیا (اوسلو) میں واپس آیا تو وہ دنیا کا اہم ترین ڈراما نویس بن چکا تھا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے اس کی پنشن مقرر کی گئی اور اوسلو کے سب سے بڑے تھیٹر کے سامنے اس کا ایک مجسمہ بنایا گیا یہ سب کچھ اس کی زندگی میں ہوا..... اوسلو آ کر وہ بیمار رہنے لگا۔ اوپر تلے دل پر کئی حملے ہوئے۔ 23 مئی 1906ء میں ہونے والا حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔

ابسن نے جدید تھیٹر کے لیے بہت کام کیا۔ پروڈکشن اسٹیج اور آرائش میں نئی نئی چیزیں شامل کیں۔ جدید ڈرامے کا بانی کہلایا اور اپنے بعد میں آنے والوں اور اپنے ہمعصر ڈراما نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس سے اثر قبول کرنے والوں میں روسی ڈراما نگار چیخوف اور جارج برنارڈ شا کا نام پیش پیش ہے۔ جارج برنارڈ شا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ڈراموں میں وہ کچھ کیا جو ابسن نے ناروے میں رہ کر کیا تھا۔

ابسن نے اپنے ڈرامے اور اس میں شامل موضوعات سے ساری زندگی لوگوں کو جھنجھوڑا اور ان میں اشتعال پیدا ہو گیا اور روایتی اداروں کی کڑی تنقید کا سامنا کیا۔ اس نے ڈرامے کے اصول و قواعد مرتب کیے اور نیچرل ڈرامے کو اسٹیج سے روشناس کرایا۔ متوسط طبقے کے مسائل اپنے ڈراموں میں پیش کیے۔ اپنے عہد کی اخلاقی اقدار کو للکارا۔

سوسائٹی میں مردوں کی خود ساختہ حکمرانی کو چیلنج کیا۔ عورتوں کو ان زنجیروں کو توڑنے کی جرأت عطا کی۔ مصلحت اور منافقت کو بے نقاب کیا اور اسٹیج ڈرامے کو روایتی حد بندی سے باہر نکالا۔ بقول Great Writers کے مصنف Julian Patrick

"Ibsen was Responsible for the Introduction of Modren Realistic Drama to the Stage, Rewrote the Rules of Drama Remaining Challenging and Provocative to the End."

گڑیا گھر A Doll's House

ابسن کے اس ڈرامے نے صرف یہ کہ ڈرامے کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ ابسن کو دنیا کا صفِ اول کا ڈراما نویس بنا دیا ہے جب یہ ڈراما چھپا تو اس پر بہت سے اعتراضات ہوئے لیکن پھر اس کے موضوع اور اس کی اہمیت کو سمجھا گیا اور کالجوں اور سکولوں کے نصاب میں شامل کر دیا گیا اور اسے پہلا حقیقی Feminist Play قرار دے دیا گیا۔ اس ڈرامے کی اشاعت سے نیچرل موومنٹ کا آغاز ہوا۔ حقیقی اور سچے واقعات نے ڈرامے میں جگہ بنائی اور روایتی رومانویت ڈرامے سے رخصت ہو گئی۔

ڈراما ''گڑیا گھر'' ایک شادی شدہ عورت نورا NORA کی کہانی ہے جسے اس کا خاوند ٹوروبلا Torvala ایک سست، ناکارہ اور کٹھ پتلی عورت سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچتی رہے اس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو۔ اپنے خاوند کے حکم پر چلتی پھرتی نظر آئے۔ ''گڑیا گھر'' میں انیسویں صدی کے مرد عورت کے تعلقات کو زیر بحث لایا گیا ہے

اس ڈرامے کو گھریلو زندگی کے خلاف ایک بغاوت سمجھا گیا کیونکہ اس عہد کے لوگ خاوند اور بیوی کے رشتے کو چرچ اور مذہب کی دی ہوئی ایک گانٹھ سمجھتے تھے جسے کھولنا دونوں اداروں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ زیادہ تر نقادوں کا اس ڈرامے کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ جارج برنارڈ شاہ نے اس ڈرامے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ابسن بغیر کسی تعصب کے بے حد ایمانداری کے ساتھ اس روایتی رشتے میں تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ جس میں بہت سی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اس ڈرامے میں نورا NORA مرکزی کردار ہے اور وہ اپنی ذات کو پہچان کر بغاوت کرتی ہے اس دائرے کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ جس میں اس کی ذات کی کوئی پہچان نہ تھی اور اسے ایک بے جان اور بے کار چیز سمجھ لیا گیا تھا۔ نورا کا کردار ایک باغی ماڈل عورت کا کردار بن کر سامنے آتا ہے وہ ایک ایسی عورت بن کر سامنے آتی ہے جو اپنے آپ کو پا چکی ہے اور اب پرانی دنیا سے ہاتھ چھڑا کر نئی منزل کی طرف گامزن ہے۔

نورا ایک نیک افسر ٹورویلا کی بیوی ہے اس کی سہیلی کو جب پتہ چلتا ہے تو ٹورویلا بینک کا بڑا افسر بن گیا ہے تو نورا کے پاس آتی ہے۔ کرسٹائن KRISTINE نورا سے کہتی ہے ''میں بیوہ ہو چکی ہوں، تم ٹورویلا سے سفارش کر کے مجھے بینک میں نوکری دلا دو۔'' نورا اس سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ ٹورویلا سے سفارش کرے گی۔ نورا کرسٹائن کو اعتماد میں لیتی ہے اور اپنے ایک راز میں اسے شریک کرتی ہے۔ اسے بتلاتی ہے کہ ایک وکیل Krogstad سے اس نے ایک بار قرض لیا تھا کیونکہ ٹورویلا بیمار تھا لیکن ٹورویلا کو اس نے بتایا نہیں تاکہ اس کی انا مجروح نہ ہو اب وہ دن رات محنت کر کے اپنے خاوند سے چوری چوری چھوٹے موٹے کام کر کے اس کا قرض اتارنے کی کوشش کر رہی ہے ڈرامے کا ایک کردار جو نورا کا فیملی فرینڈ ہے نورا سے عشق شروع کر دیتا ہے۔

وکیل اب نورا کو بلیک میل کرنا شروع کر دیتا ہے وہ نورا سے کہتا ہے کہ اپنے خاوند سے کہہ کر مجھے بنک میں نوکری دلاؤ ورنہ وہ نورا کے ایک جرم کا سارا قصہ ٹورویلا کے گوش گزار کر دے گا۔ نورا نے اپنے باپ کے جعلی دستخط ایک بانڈ پر کئے تھے اور وکیل اس کی اس حرکت سے واقف تھا...... وہ نورا کو بتلاتا ہے کہ اس نے یہ ساری کہانی لکھ کر MAIL BOX میں ڈال دی اس کا خاوند یہ بکس کھولے گا اور نورا کا راز فاش ہو جائے گا...... نورا مختلف حربوں سے اپنے خاوند کو ڈاک کا ڈبہ کھولنے سے روکتی ہے۔ جس میں کامیاب بھی ہوتی ہے۔ اس شرم ناک فعل کو اپنے خاوند سے چھپانے کے لئے وہ خودکشی کرنے کا ارادہ بھی کرتی ہے...... اس کی سہیلی کرسٹائن نورا کو بتلاتی ہے کہ وکیل شادی سے اس کی محبت میں مبتلا رہا ہے وہ اسے خط واپس لینے پر آمادہ کرے گی...... چنانچہ کرسٹائن وکیل Krogstad سے ملتی ہے اور اسے بتلاتی ہے کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ میں نے شادی صرف ماں باپ کے دباؤ میں آ کر کی تھی۔ میں اپنے خاوند کی وفات کے بعد دوبارہ تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ وکیل اس کی بات مان لیتا ہے۔ کرسٹائن اسے خط واپس لینے پر رضامند کر لیتی ہے۔ نورا بھی ایک فیصلہ کرتی ہے اور سوچتی ہے کہ شادی کے بندھن کو بچانے کے لیے اسے اپنے جرم سے ٹورویلا کو آگاہ کر دینا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ٹورویلا ڈاک چیک کرتا ہے نورا روکنا چاہتی ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتی۔ ٹورویلا وکیل کا خط پڑھ کر نورا سے کہتا ہے کہ میں اب Krogstad کی گرفت میں ہوں کیونکہ جعلی دستخطوں والا بانڈ میں نے بینک آفیسر کی حیثیت سے کیش کیا تھا۔ اب مجھے وکیل کی تمام شرائط پر عمل کرنا ہوگا۔ ٹورویلا نورا کی بہت بے عزتی کرتا ہے اسے ایک بداخلاق، بے ایمان بیوی کے خطابات سے پکارتا ہے جو اپنے بچوں اور خاوند کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ (اس بات سے قارئین آگاہ ہیں کہ یہ سب کچھ نورا نے اپنے خاوند کی جان بچانے کے لیے کیا تھا، جب وہ بیمار تھا۔ وکیل سے قرض لینے

کے لیے نورا نے کاغذات لکھ کر دیئے تھے اور بانڈ پر دستخط کیے تھے) وکیل تمام کاغذات نورا کو واپس کر دیتا ہے اور بلیک میل کرنے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ کاغذات نوکرانی ٹورویلا کو لا کر دیتی ہے۔ ٹورویلا بہت خوش ہے، کاغذات جلا دیتا ہے اور نورا کو معاف کر دیتا ہے اور کہتا ہے اب تم میری نظروں میں پہلے سے بھی زیادہ اہم ہو۔ لیکن اب نورا بدل چکی ہے وہ سوچتی ہے کہ پہلے اس کے باپ نے اسے کٹھ پتلی کی طرح استعمال کیا۔ اب اس کا خاوند اس سے کٹھ پتلی کا کھیل کھیل رہا ہے اس کا سارا وجود، ساری گزری زندگی جھوٹ تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا اس کی اپنی مرضی کیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرتی ہے، ٹورویلا اس سے ماں اور بیوی کی ذمے داریاں نبھانے کے لیے کہتا ہے لیکن نورا اسے کہتی ہے کہ میری اپنی بھی کچھ ذمے داریاں ہیں جو مجھے اپنی ذات سے نبھانی ہیں۔ نورا کی نظر میں اب ٹورویلا ایک اجنبی ہے۔ ٹورویلا اس سے کہتا ہے:

''کیا شادی کے اس بندھن کو کوئی چیز بچا سکتی ہے؟''

نورا جواب دیتی ہے:

''کوئی بہت بڑا معجزہ ہی بچا سکتا ہے جو شاید اب نہیں ہوگا''

نورا زور سے دروازہ کھولتی ہے اور گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔

''گڑیا گھر'' وکٹورین عہد کے ازدواجی ادارے میں یہ پہلی دراڑ ثابت ہوا۔ یورپ اور مغرب میں شادی کو مرد اور عورت کے رشتے کا مضبوط بندھن سمجھا جاتا تھا اس کو مذہب اور چرچ کی حمایت حاصل تھی۔ شادی شدہ زندگی میں مرد کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ عورت کی حیثیت مرد کے سامنے ثانوی تھی اور یہ معاشرہ اسے یہ حق نہیں دیتا تھا کہ وہ گھر کی حدود پار کر کے بغاوت پر آمادہ ہو۔ ''گڑیا گھر'' کے مرکزی کردار نورا نے یہ قدم پہلی بار اٹھایا اور اس کی اس بغاوت سے ہر طرف سے ایک ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ ردعمل رہا مگر آہستہ آہستہ اس ڈرامے کی پسندیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔

امریکا کے Broadway تھیٹر میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی 1889ء میں پہلی بار برطانیہ میں اسٹیج ہوا۔

فلم اور ٹی وی والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس ڈرامے پر کئی بار فلمیں بنیں۔ 1973ء میں دو فلمیں بنیں جین فونڈا نے نورا کا کردار نبھایا۔

ابسن کے ڈراموں کے ترجمے دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں اردو میں گڑیا گھر (A Dool House) کا ترجمہ قدسیہ زیدی نے کیا ہے۔ اس کے ڈرامے معمارِ اعظم (The Master Builder) کا ترجمہ بھرپور دیباچے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ آج کل دستیاب نہیں ہوتا۔ یہ ترجمہ عزیز احمد نے کیا ہے۔

ابسن کے ڈراموں سے ہر زبان کے ادیب نے فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر ''گڑیا گھر'' کی ''نورا'' مختلف ادیبوں کے ہاں مختلف ناموں کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے لیکن ذہین اور پڑھا لکھا قاری پہچان ہی لیتا ہے کہ یہ ابسن کی نورا Nora ہے۔

والٹیئر

(Voltaire)

18ویں صدی کا روشن خیال مصنف، روشن ضمیری کا مبلغ، انسانی حقوق کا پرچارک، دانشور، ڈرامہ نگار، طنز نگار، فلسفی، تاریخ دان اور ناول نگار۔ والٹیئر کی تحریروں نے انقلابِ فرانس میں اہم کردار ادا کیا۔

گہرائی، گیرائی، ذہانت، تخیئل، انفرادیت، فطانت، رفعت، جلال، جمال، وقار، شکوہ، سادگی، فلسفہ، طنز، ظرافت، بے ساختہ، پاکیزگی، یہ ہے والٹیئر !

(گوئٹے)

....

’’چلے جاؤ پادری، میں اپنے اور خدا کے درمیان کسی دلال اور ایجنٹ کو پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے۔ میں جانوں اور وہ جانے۔‘‘

(والٹیئر)

....

’’مجھے تمہارے نظریات سے سخت اختلاف ہے لیکن آزادی تحریر کے حصول کے لیے میں قبر تک تمہارا ساتھ دوں گا۔‘‘

(روسو سے والٹیئر کا مکالمہ)

....

’’افسوس مجھے روسو اور والٹیئر کی تحریریں لے ڈوبیں‘‘۔

(لوئی چہارم)

والٹیئر

21 نومبر 1694ء کا دن پیرس کے سب سے بڑے ہسپتال کے عملے کے لئے پریشان ترین دن تھا۔ ڈاکٹرز، نرسیں، مڈوائف، وارڈ بوائے سب بوکھلائے پھر رہے تھے، پہلے تو بچہ پیدا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا کمزور تھا کہ ہسپتال کے پالنے میں اسے ڈھونڈنے کے لئے آنکھوں پر زور دینا پڑ رہا تھا۔ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے بچے کے باپ سے کہا:

’’مہربانی فرما کر اسے جلدی سے کسی چرچ میں لے جا کر دعا کرا لیں، بچہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔‘‘

لیکن ڈاکٹر کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی بچہ آٹھ دن نکال گیا۔ پھر آٹھ سال گزر گئے، پھر 50 سال۔ آخر یہ بچہ 30 مئی 1778ء میں فوت ہوا جس دن وہ فوت ہوا ہسپتال کے عملے کا کوئی آدمی زندہ نہیں تھا۔ قوتِ ارادی کے بل پر زندہ رہنے والے اس بچے کا نام والٹیئر تھا۔ روشن ضمیری کا سب سے بڑا مبلغ۔ انسانی حقوق کا پرچارک، مصنف، دانشور، ڈراما نگار، طنز نگار اور فلسفی۔ 18 ویں صدی کو ناز ہے کہ والٹیئر اس صدی میں زندہ تھا اور 18 ویں صدی کی پہچان بنا۔

والٹیئر کی تخلیقی زندگی میں بڑا حسن تھا۔ 18 سال کی عمر میں وہ یونانی ڈراما نگار اسکائی لیس کے پائے کا ڈرامہ نگار تھا۔ 40 سال کی عمر میں ارسٹوفینز کی ٹکر کا طنز نگار۔ 70 سال کی عمر میں انگریزی طنز نگار سوئفٹ (Swift) کی شہرت اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

گوئٹے والٹیئر کا بہت بڑا مداح تھا، وہ اس کے بارے میں کہتا ہے ’’گہرائی، گیرائی، ذہانت، تخیئل، انفرادیت، فطانت، رفعت، جلال، جمال، وقار، شکوہ، سہولت، سادگی، فلسفہ، سلجھاؤ، طنز، ظرافت، آرٹ، حسن، مزاح، بے ساختہ پن، پاکیزگی، مشورہ اور شان کاملیت ...... یہ ہے والٹیئر‘‘

والٹیئر نے ڈرامے لکھے، ناول لکھے، نظمیں کہیں، فلسفہ لکھا، طنز و مزاح اور ظرافت کو کمال تک پہنچایا۔ ہر شعبہ فن میں اپنی ذہانت کی دھاک بٹھائی، سماجی اور اخلاقی کمزوریوں کی نشان دہی کی۔ منافقانہ سیاسی نظام، شاعروں کے بے عمل کردار اور غیر معیاری تخلیقات کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اپنے ہمعصر ادیبوں سے کھل کر جنگ لڑی۔ روسو سے اس کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ وہ روسو کے نظریات کیخلاف تھا لیکن آزادی تحریر کا حامی تھا۔ اس کی مشہور زمانہ کتاب سوشل کنٹرکٹ کو جب فرانس میں (Ban) کیا گیا اور سرکاری طور پر ضبط کیا گیا تو روسو کے حق میں جلوس لے کر سب سے پہلے والٹیئر سڑک پر آیا اور اس نے روسو سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے نظریات سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن آزادی تحریر کے حق میں ہوں۔ روسو اور والٹیئر ایک ہی عہد کے دو نامور لکھنے والے تھے جنہوں نے جرأت مندانہ انداز میں آزادی اور انسانی حقوق کے لئے لکھا۔ انقلابِ فرانس کے بعد جب بادشاہ کو جیل بھیجا گیا تو وہ بار بار ہاتھ مل کر ایک بات افسوس سے کہتا تھا۔

’’مجھے روسو اور والٹیئر کی تحریریں لے ڈوبیں‘‘

والٹیئر پیرس کے مشہور وکیل اور قانون دان کا پانچواں بیٹا تھا باپ اسے وکیل بنانا چاہتا تھا لیکن والٹیئر کو شاعری اور نثر

لکھنے کا جنون تھا۔ باپ نے اسے گھر سے نکال دیا اور سب جاننے والوں میں اعلان کر دیا کہ میرا پانچواں بیٹا مر گیا ہے کیونکہ وہ شاعر ہو گیا ہے۔ عجب بات ہے کہ باپ نے جس بیٹے کی موت کا اعلان کیا تھا وہ آج زندہ ہے ساری دنیا اسے جانتی ہے اور وکیل باپ کو کوئی نہیں جانتا۔

والٹیئر شاعری کرتا رہا، بادشاہ اور سماجی ناانصافیوں کے بارے میں نظمیں لکھتا رہا۔ 16 برس کی عمر میں اس نے اپنا پہلا ڈراما (OEDIPE) لکھا، ڈراما مقبول ہوا۔ شہرت کے ساتھ ساتھ اعتراضات کی بوچھاڑ بھی ہوئی ...... والٹیئر کا زمانہ عوامی مشکلات کا زمانہ تھا۔ بادشاہ کے اصطبل میں ہزاروں گھوڑے اچھی خوراک کھا رہے تھے لیکن عوام کو روٹی نہیں ملتی تھی۔ عوام روٹی نہ ملنے کا گلہ کرتے تو بادشاہ جواب دیتا ''ڈبل روٹی کھایا کرو''۔

ایک بار دربارِ عام میں درباری اور عام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ والٹیئر بھی موجود تھا۔ بادشاہ نے بڑے فخر سے اعلان کیا:

''میں اپنے اصطبل کا خرچہ کم کر رہا ہوں تا کہ یہ رقم عوام کی فلاح پر خرچ کی جا سکے۔ چنانچہ میں نے اپنے اصطبل سے ایک ہزار گھوڑے نکال دیئے ہیں۔''

والٹیئر یہ سن کر کھڑا ہوا اور درباریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''لیکن آپ کے دربار میں جو یہ سینکڑوں گدھے موجود ہیں انہیں کب دربار سے فارغ کریں گے۔'' والٹیئر کا یہ جملہ اس کی تباہی کا باعث بنا اور اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔

والٹیئر غضب کا جملے باز تھا۔ اس کا جملہ دو دھاری تلوار کی طرح دل میں اتر جاتا تھا۔ اپنے لہجے کی سچائی اور تیکھے پن نے ہی اسے ایک عرصہ جلاوطن رکھا ایک بار شاہی محل میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ دعوت بادشاہ کے چچا فریڈرک کی آمد پر کی گئی تھی پیرس کے شاعر اور ادیب بھی شامل تھے۔ والٹیئر بھی ایک لمبا چوغہ پہن کر وہاں موجود تھا جس کا ایک بازو بغل تک پھٹا ہوا تھا۔ والٹیئر ہاتھ اٹھا اٹھا کر باتیں کر رہا تھا۔ جب وہ ہاتھ اٹھاتا تو اس کی بغل صاف نظر آتی تھی۔ فریڈرک نے اسے باتیں کرتے سنا اور لوئی چہاردہم (بادشاہ) سے پوچھا:

''یہ نوجوان کون ہے جو تیز اور اونچی آواز میں بات کر رہا ہے''

اس سے پہلے کہ بادشاہ جواب دیتا۔ والٹیئر نے اونچی آواز میں جواب دیا ''میں والٹیئر ہوں جس نے اپنے ہاتھوں سے عظمت کمائی ہے تمہاری طرح ورثے میں نہیں پائی۔''

بادشاہ کو والٹیئر کی یہ بات پسند نہ آئی اور اسے جیل بھیج دیا، والٹیئر ان دنوں بے گھر تھا۔ نہ سونے کی جگہ تھی نہ کھانے پینے کا کوئی انتظام لیکن جیل جا کر اسے یہ دونوں چیزیں مل گئیں۔ والٹیئر نے جیل جا کر بادشاہ کو فرانسیسی میں خط لکھا جو ایک جملے پر مبنی تھا جس کا انگریزی ترجمہ یہ تھا:

"Thank you for Food and Shelter"

بادشاہ نے جب یہ خط پڑھا تو اس نے سوچا، میں نے تو والٹیئر کو دکھ دینے کے لئے جیل بھیجا تھا وہ تو وہاں آرام کر رہا ہے۔ چنانچہ درباریوں کے مشورے پر بادشاہ نے والٹیئر کو پیرس بدر کر دیا اور والٹیئر لندن چلا گیا جہاں وہ تین سال رہا۔ یہ تین سال اس کی تخلیقی اور ادبی زندگی کی تشکیل میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

لندن میں تین سال کے قیام کے دوران والٹیئر نے انگریزی زبان سیکھی، انگریزی ادب پڑھا، شیکسپیئر سے متاثر ہوا۔ سیاسی نظام سے اثر قبول کیا۔ نیوٹن کی تحریروں سے اثر قبول کیا۔ اپنی مشہور کتاب ''لندن سے خطوط'' لکھی جو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ پیرس واپس آیا۔ انگریزی نظام اور ادب کی تعریف کی۔ فرانسیسی افسران اور درباریوں کو ناراض کیا تو ایک

بار پھر والٹیئر کو پیرس سے نکلنے کے منصوبے بنے اور اسے پیرس بدر ہونا پڑا لیکن اس بار وہ پیرس سے اکیلا نہیں گیا، جاتے ہوئے ایک خوبصورت عورت (Madam-Duchatelet) میڈم داشاتلے کو ساتھ لیتا گیا۔ جو ایک بڑے جاگیردار کی بیوی تھی اور والٹیئر کی محبت کا شکار تھی۔ دونوں بھاگ کر (Cirey) چلے گئے، جہاں والٹیئر نے پندرہ سال گزارے۔ والٹیئر داشاتلے کو لے کر کشتی کرائے پر لے کر بھاگ رہا تھا تو ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ جب والٹیئر کشتی میں بیٹھا اور چپو چلانے لگا تو ایک بوری میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ یہ آدمی والٹیئر کا ایک پبلشر تھا جس سے والٹیئر نے 200 فرانک لے رکھے تھے لیکن اسے کتاب کا مسودہ نہیں دیا تھا۔ اس نے والٹیئر سے کہا:

''تم جا رہے ہو میں مسودہ کس سے لوں گا، مجھے میرے دو سو فرانک دے دو۔''

والٹیئر نے اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مارا اور کہا:

''اب تم مجھے دو سو فرانک اور دو۔ اس لئے کہ تم ایک گمنام آدمی ہو تمہیں کوئی نہیں جانتا لیکن آنے والے وقت میں میرا یہ تھپڑ تمہیں زندہ رکھے گا۔''

داشاتلے بہت خوبصورت اور ذہین عورت تھی، والٹیئر بدصورت اور واجبی شکل کا آدمی تھا داشاتلے نے والٹیئر کو بہت چاہا اور اسے لکھنے کی تحریک دلائی۔ والٹیئر کی تخلیقی زندگی میں داشاتلے کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ والٹیئر نے اپنی مشہور زمانہ ناول کندید (Candid) ایک ہفتے میں مکمل کی جب روسو کو یہ کتاب ملی تو وہ چل کر والٹیئر کے گھر گیا۔ والٹیئر گھر پر موجود نہیں تھا اس نے داشاتلے کو دیکھا اور پھر کہنے لگا:

''میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ آخر وہ کون سا سرچشمہ، کون سی تحریک ہے جو والٹیئر کے لئے ایسی لافانی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر میں نے اپنے سوال کا جواب پالیا ہے۔''

روسو یہ کہہ کر پیرس واپس لوٹ آیا۔ یہاں والٹیئر داشاتلے کی وفات تک رہا اور پھر جرمنی کے بادشاہ فریڈرک کے ذاتی دعوت نامے پر جرمنی چلا گیا۔ یہ وہی فریڈرک تھا جسے والٹیئر نے جواب دیا تھا کہ میں نے عظمت ہاتھوں سے کمائی ہے ورثے میں نہیں پائی۔ جرمنی میں والٹیئر کا کچھ عرصہ بہت اچھا اور خوشحال گزرا لیکن پھر والٹیئر نے محسوس کیا کہ فریڈرک اسے ایسے مالٹے کی طرح سمجھنے لگا ہے جس کا سارا جوس نچوڑ لیا گیا ہو۔ چنانچہ 1753ء میں والٹیئر جرمنی سے چلا آیا اور ایک ایسی ریاست میں ڈیرے ڈال دیئے جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر واقع تھی۔ یہاں رہ کر اس نے یورپ کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے قائم کئے انہیں بلوایا۔ مہمان نوازی کی۔ والٹیئر نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا اور تخلیقی کارنامے سرانجام دیئے۔ اگر والٹیئر کے تخلیقی کارناموں کو اکٹھا کیا جائے تو یہ تقریباً 30,000 صفحات بنتے ہیں۔ ان میں ناول، شاعری، ڈرامے، فلسفہ، گیت، سیاسی تحریریں، پمفلٹ، ذاتی خطوط اور سنجیدہ تاریخی کتابیں شامل ہیں۔

والٹیئر مذہبی آدمی تھا، مذہب پر یقین رکھتا تھا لیکن پادریوں اور جنونی مذہب پرستوں کے سخت خلاف تھا۔ جب وہ مر رہا تھا تو پادری اس کے پاس آیا تا کہ Confessions کی رسم ادا ہو سکے۔ والٹیئر نے اسے واپس بھیج دیا اور سخت الفاظ استعمال کر کے کہا:

''جاؤ میں اپنے اور خدا کے درمیان کسی ایجنٹ یا دلال کو پسند نہیں کرتا، تم جاؤ۔ یہ میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے میں جانوں اور وہ جانے۔''

83 برس کی عمر میں مختلف علاقوں کی خاک چھان کر اور تخلیقی کارنامے سرانجام دے کر والٹیئر واپس پیرس آیا تو لوگوں

نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑا استقبال کیا۔ سر آنکھوں پر بٹھایا اور اسے عظیم بوڑھے آدمی (Grand Old Man) کا خطاب دیا۔ والٹیئر 1778ء میں فوت ہوا۔ اس نے عیسائیت پر بے شمار اعتراضات کئے تھے۔ بڑے تیز مضامین لکھے تھے۔ چنانچہ پادریوں نے اسے مذہبی رسومات کے مطابق دفن نہیں ہونے دیا، لیکن 13 سال بعد جب انقلاب فرانس آیا تو انقلابیوں نے اسے مذہبی رسومات کے بعد دوبارہ دفن کیا۔

والٹیئر ایک خوش مزاج، خوشگوار اور روشن دماغ آدمی تھا۔ 18ویں صدی میں جو فکری سماجی، ادبی اور سیاسی نظریات تشکیل دیئے گئے اس میں والٹیئر کا بہت ہاتھ ہے۔ اس کی تحریریں انقلاب فرانس میں بڑی مددگار ثابت ہوئیں اور وہ 18ویں صدی کی پہچان بن گیا۔

والٹیئر نے اپنی سماجی زندگی، ادبی رویوں اور نظریات کی تعمیر نو میں بہت مدد دی۔ وہ ایک معاشرہ چاہتا تھا جو فکری اور سماجی طور پر مضبوط اور باعمل سوچ کا قائل ہو۔ چنانچہ وہ کہا کرتا تھا:

''میں جن چہروں پر سنجیدگی کی سلوٹیں دیکھتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ ظرافت اور مزاح کی استری پھیر کر یہ سلوٹیں دور کردوں۔''

والٹیئر نے اپنے ڈراموں میں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں پر بھرپور تنقید کی، جس طرح یونانی کامیڈی نگار ارسٹو فینز اپنے عہد کے شاعروں اور ڈرامہ نویسوں کے بارے میں بہت سخت جملے استعمال کرتا ہے۔ والٹیئر نے یہی کام اپنے عہد کے شاعروں اور دانشوروں کے لئے کیا۔ مثلاً اس کے ایک ڈرامے میں ایسے شاعروں کو دکھایا جاتا ہے جو سطحی اور تیسرے درجے کی شاعری کرتے ہیں اور بے مقصد ادب کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ جنگ جاری ہے اور فوج میں لوگوں کو بھرتی کیا جارہا ہے کہ سرحد پر بھیجا جائے۔ والٹیئر نے ایک کردار کے منہ سے کہلوایا کہ شاعروں کو بھی فوج میں بھرتی کیا جائے۔

''لیکن انہیں تو گولی چلانا نہیں آتی''

دوسرے کردار نے جواب دیا۔

پہلا کردار پھر کہتا ہے:

''کوئی بات نہیں۔ کم از کم یہ دشمن کی ایک گولی سینے پر روکیں گے تو سہی اور اس طرح آہستہ آہستہ بُرے شاعروں کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

ایک دوسرے ڈرامے میں وہ فلسفیوں اور دانش وروں کی ایک کھیپ کو دکھاتا ہے، جو بے عملی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی فکر کا نہ انہیں فائدہ ہے نہ معاشرے کو ان کا کام دن رات بے عملی کے گوشے میں بیٹھ کر بے مقصد وقت کو برباد کرنا ہے۔ والٹیئر نے ڈرامے میں یہ سین دکھایا ہے کہ فرشتے دنیا کو تباہ کرنے آئے ہیں اور انسانوں کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب ان فلسفیوں کو دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں ماردیں تو ایک فرشتہ کہتا ہے:

''انہیں مارنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سوچتے سوچتے ایک دن خود ہی مرجائیں گے۔''

والٹیئر سائنس دان نہیں تھا لیکن فرانسس بیکن اور جان لاک کے نظریات کا قائل تھا۔ والٹیئر تاریخی شعور رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں کی لڑائیوں کی تاریخ پڑھنے کی بجائے ہمیں سماجی، ثقافتی اور کلچرل تاریخ کو زیادہ اہم قرار دینا چاہیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں کی لڑائیوں کی تاریخ پڑھنے کی بجائے ہمیں سماجی، ثقافتی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ

دینی چاہیے۔ اس نے کتاب (ESSAY ON THE MANNERS AND SPRIT OF NATIONS.) اسی موضوع پر لکھی تھی۔

آزادی رائے والٹیئر کے نزدیک سب سے اہم حق تھا۔ وہ اسے انسان کا بنیادی حق قرار دیتا تھا۔ روسو سے اس کا اختلاف تھا۔ اس کے نظریات کا مذاق اڑاتا تھا لیکن جب روسو کی Social Contract پر پابندی لگی تو والٹیئر سب سے پہلے جھنڈا لے کر روسو کے حق میں جلوس لے کر نکلا اور کہا:

''مجھے تمہارے نظریات سے سخت اختلاف ہے لیکن آزادی تحریر کے حصول کے لئے میں قبر تک تمہارا ساتھ دوں گا۔''

والٹیئر جتنا بڑا لکھاری تھا اتنا ہی بڑا دنیادار اور سمجھدار بیوپاری تھا۔ اس نے ہمارے برصغیر کے ادیبوں اور شاعروں کی طرح کسمپرسی کی زندگی بسر نہیں کی۔ چند ابتدائی سال اس نے غربت میں گزارے باپ مرا تو اسے ورثے میں اچھی خاصی دولت ملی اور پھر دولت اس پر عاشق ہوگئی۔ ڈراموں، کتابوں اور کتابچوں سے اس نے پیسہ کمایا۔ جب وہ فریڈرک کے پاس جرمنی میں رہا تو اسے 20 ہزار فرانک سالانہ ملتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اسے 6 ہزار سالانہ فرانک ملتے تھے۔ بھائی کی وفات کے بعد 4 ہزار فرانک سالانہ آمدنی میں اضافہ ہوگیا۔ دماغ بیوپار کرنے کی طرف راغب ہوا تو اس نے سپلائی کرنے کے لئے فوج میں ٹھیکے لینے شروع کردیئے اور پھر ساری دولت 33 فی صد پر INVEST کردی۔ فوج کے ٹھیکے مزید بڑھے اور اس نے فوج کے ڈپوؤں میں وردیاں، اجناس فراہم کرنی شروع کردیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس نے دوستوں اور رشتے داروں کو رقم سود پر دینا شروع کردی۔

والٹیئر کی شخصیت ایک چٹان کی مانند تھی جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے مغرور اور ڈکٹیٹر پاش پاش ہوگئے اور والٹیئر کا سر نہ جھکا سکے۔ اس نے ساری زندگی بادشاہوں اور آمروں کے خلاف لکھا اور انسانی حقوق پامال کرنے پر لعن طعن کرتا رہا۔ اس نے مختلف ممالک کے بادشاہوں سے دوستیاں کیں اور ان سے مالی فائدہ اٹھایا۔ اس کے کردار کا یہ پہلو اگرچہ اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے لیکن اسکی تحریروں اور ڈراموں کی عظمت اس خامی کو چھپا لیتی ہے۔ اس کی شخصیت اپنی دلچسپ عادات کی بدولت بڑی کشش رکھتی تھی۔ مثلاً اس کے چھوٹے چھوٹے ہنرمندوں اور کاریگروں کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ ان فنکاروں اور ہنرمندوں کو رقم ایڈوانس دے کر ان سے مال اور دست کاری کی چیزیں بنواتا تھا۔ ان چیزوں میں ملبوسات، جرابیں، گھڑیاں، بسیں، بوسکی اور کپڑا شامل تھا۔ وہ ان سے یہ مال وصول کرکے مشہور شخصیات اور مال دار لوگوں کے پاس جاتا اور انہیں چار گنا قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ روس کی ملکہ کیتھرائن اور ترکی کا حکمران مصطفےٰ اس کے مستقل گاہک تھے۔ جس سے اس کی آمدنی دو سو بیس ہزار فرانک ہوگئی جب کہ اس کا خرچہ چالیس ہزار فرانک تھا۔ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، ڈراما نگار تھا اور اپنے عہد کے شاعروں میں سب سے زیادہ خوشحال انسان بھی تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اسے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے اور اس کا فن مصلحت کا شکار نہ ہو جائے۔ اگر وہ بادشاہ کا ملازم ہوتا تو وہ بادشاہ کو کھری کھری نہ سنا سکتا۔ والٹیئر نے اپنی ذہانت سے اس تصور کو ختم کردیا کہ شاعر اور ادیب غریب ہوتے ہیں اور تنگدستی ساری عمر ان کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ اس نے اپنی ذہانت سے ایسا Net Work بنایا کہ ساری زندگی تنگ دستی نے نہیں دولت اور خوشحالی نے اس کا پیچھا کیا۔

والٹیئر نے ساری زندگی خود اعتمادی سے گزاری، جب وہ پیدا ہوا تو ڈاکٹروں اور مڈوائف (دائی) نے اسے صرف 8 گھنٹے زندہ رہنے کی بشارت دی مگر وہ 84 سال زندہ رہا۔ باپ نے گھر سے نکال دیا لیکن اس نے اپنی دنیا

آپ بنائی اور ہزاروں فرانک اپنی بھیجتی ڈینس کے نام چھوڑ کر مرا۔ خود بدصورت تھا مگر پیرس کی نہایت حسین وجمیل عورت کے ساتھ شادی کی۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کی شان میں قصیدے نہیں لکھے ان کے طرزِ حکومت پر اعتراضات کئے۔ انسانی بنیادی حقوق کے حق میں لکھا اور فرانس کے انقلاب کی حمایت کی۔ مذہبی جنون پرستی کے خلاف لکھا۔ پادریوں کی من مانی کرنے والی فطرت کو بے نقاب کیا۔

جب روسو نے پرائیویٹ پراپرٹی کے خلاف ''سوشل کنڈکٹ'' لکھا تو والٹیئر نے اسے خط لکھا اور کہا:

میں نے تمہارا ''معاہدہ عمرانی'' پڑھا مجھے اچھا نہیں لگا کیونکہ میں بچہ بن کر اب گھٹنوں کے بل نہیں چلنا چاہتا تھا۔''

چنانچہ اس کے ردعمل میں اس نے کندید (Candid) ناول لکھا جس میں پنگلاس کا کردار لکھ کر روسو کے فلسفے کا مذاق اُڑایا۔ والٹیئر دنیا کے عظیم طنز نگار کی حیثیت میں جانا جاتا ہے اور 18 ویں صدی کو فرانس کے اس عظیم فلسفی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ تاریخ کے معتبر حوالے کے طور پر آج بھی زندہ ہے جبکہ اس کے مخالفین کو اس کی نسبت سے پہچانا اور جانا جاتا ہے۔
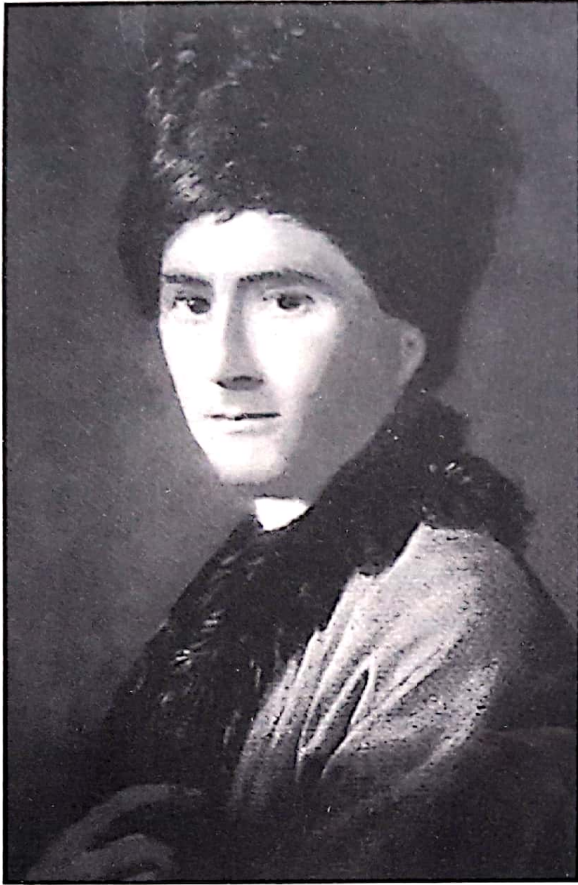
روسو

(Jean Jacques Rousseau)

18 ویں صدی کا نامور مصنف، فلسفی، فطری، اخلاقی، آزادی کا پرچارک، انسانی حقوق کا طالب، اس نے ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھا جہاں سب برابری سے زندگی گزاریں، جدید فلسفہ تعلیم کا موجود، افلاطون کی پیروی میں خیالی ریاست کا تصور پیش کیا۔

یہ حیران کن حقیقت ہے کہ روسو کے ہر کام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ سیاست ہو یا تھیٹر، تعلیم ہو یا مذہب یا ناول جو کتاب بھی آئی بھرپور مقبولیت حاصل کی۔

(Brazun)

....

تم آج روسو کی کتاب نذر آتش کر رہے ہو، کل اسی کتاب کی جلد تمہاری چمڑی سے بنائی جائے گی۔

(والٹیئر)

....

میری پیدائش میری سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ جس دن میں پیدا ہوا اسی دن میری ماں مرگئی۔

(روسو)

....

''اگر میں بہتر نہیں تو کیا ہوا کم از کم میں منفرد ضرور ہوں۔

(روسو)

روسو

روسو 1778ء میں فوت ہوا۔ انقلابِ فرانس کا آغاز اس کی موت کے 11 سال بعد ہوا۔ انقلاب فرانس کے لئے فضا تیار کرنے کا اگر کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے تو وہ روسو ہے۔ فرانس کے بادشاہ نے تو رو رو کر یہ بات کہی تھی کہ اس انقلاب کے ذمہ دار دو ہی آدمی ہیں والٹیئر اور دوسرا روسو!

یہ روسو کی تحریریں ہی تھیں۔ جنہوں نے غریب عوام کے لئے حقوق مانگے۔ ریاست کے ہر شہری کے لئے آزادی اور برابری کا درجہ طلب کیا جس نے جدید تعلیمی نظام کا تصور پیش کیا اور معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کی۔ اس کی تحریروں نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کی بھی راہنمائی کی۔ والٹیئر اگرچہ اس کے چند نظریات کے تحت خلاف تھا مگر روسو کی عظمت کا معترف تھا۔

روسو اپنے پاؤں میں گردشیں باندھ کر پیدا ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر موت تک اس نے کہیں مستقل قیام نہیں کیا۔ وہ جہاں بھی رہا در و دیوار سے ڈرتا رہا۔ لوگوں سے خائف رہا۔ دشمن تو دشمن اسے بعض اوقات اپنے دوستوں سے بھی خوف آتا تھا۔ انگریزی فلاسفر ڈیوڈ ہیوم (David Hume) نے اسے بڑے پیار سے لندن بلایا بلکہ اپنے ساتھ لے گیا۔ لندن کے لوگوں نے دل و جان سے روسو کا استقبال کیا۔ ہیوم کے ایک امیر دوست ڈیون پورٹ کے عالی شان مکان میں رہائش کا انتظام کیا گیا اس وقت کا بادشاہ جارج سوم محبت سے پیش آیا اور اس فرانسیسی فلسفی کا ایک ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کیا مگر روسو ان تمام مراعات اور محبت بھرے سلوک سے بیزار ہوگیا۔ اپنے دوست ڈیوڈ ہیوم سے ہی جھگڑا مول لے لیا۔ روسو سے نفسیاتی عدم توازن اور ذہنی دباؤ نے اسے وہاں نہ رہنے دیا۔ اسے ہر ملنے والے سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا ہر آدمی اس کا دشمن ہے اور اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ وہ ایک خط سیکرٹری آف سٹیٹ کو لکھ کر ایک کشتی میں اپنی بیوی کو لے کر لندن چھوڑ کر فرانس آ گیا۔ کہیں جانے اور پھر وہاں سے واپس آنے کا یہ ایک واقعہ ہے۔ یہ آنا جانا ساری زندگی لگا رہا اس کا ایک پس منظر ہے جو پیدائش سے شروع ہو کر اس کی موت تک پھیلا ہوا ہے۔

ژاں ژاک روسو جنیوا کے ایک گھڑی ساز کے گھر میں 28 جون 1712ء میں پیدا ہوا۔ ماں سوزین برنارڈ ایک پادری کی بیٹی تھی باپ آئزک روسو گھڑی سازوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ گھڑی سازی کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو رقص سکھا کر گھر چلاتا تھا۔ روسو اس کا دوسرا بیٹا تھا۔ روسو پیدا ہوا تو 9 دن بعد اسکی ماں مرگئی۔ روسو اپنی سوانح عمری ''اعترافات'' میں لکھتا ہے۔ "My Birth was my First Misfortune"

واقعی اس کی پیدائش اس کی پہلی بدنصیبی تھی اور پھر یہ بدنصیبیاں آہستہ آہستہ ڈھیروں کے حساب سے اسے ملتی رہیں۔

بچپن کے ابتدائی 9 دس سال اس نے باپ کے پہلو میں گزارے باپ گھڑیوں کی سوئیاں درست کرتا رہتا اور روسو اسے کتابیں پڑھ کر سناتا رہتا۔ آئزک اپنی بیوی کے غم کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا (جو مرتے دم تک وہ نہ بھلا سکا) اور بیٹا روسو مطالعے کی آبیاری کرتا رہا اور کتابوں سے اس کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہا۔ وہ اپنی سوانح عمری ''اعترافات''

میں ان لمحات کے بارے میں بڑا جذباتی ہو کر لکھتا ہے۔

''ہر رات کھانے کے بعد میں اور میرا والد وہ رومانوی کتابیں پڑھتے تھے جو میری ماں کے زیر مطالعہ تھیں۔ رات گزرتی رہتی ہم پڑھتے رہتے کبھی کبھار تو صبح چڑیوں کے چہچہانے پر میرے والد شرمندہ ہو کر کہتے'' چلو اب سو جائیں میں بھی تمہارے ساتھ بالکل بچہ بن گیا ہوں''

کبھی کبھی اس کا باپ روسو کا ہاتھ پکڑ کر کہتا:

''چلو تمہاری والدہ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں''

روسو معصومیت سے جواب دیتا'' جانتے ہیں کہ پھر ہم رو پڑیں گے اور پھر میرا والد رونے لگتا۔''

لیکن بیٹے اور باپ کا یہ جذباتی رشتہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ آئزک روسو کا ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا۔ آدمی زخمی ہو گیا اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی روسو کا باپ سزا سے ڈر کر جنیوا سے بھاگ گیا اور جاتے جاتے روسو کو اس کی خالہ اور ماموں کے سپرد کر گیا۔ ماموں نے اپنے بیٹے اور روسو کو لیمبر سائر کے پاس لاطینی زبان سیکھنے بھیج دیا جہاں اس کے علاوہ بقول روسو ''تعلیم کے نام پر فضول چیزیں پڑھائی گئیں''۔ روسو نے یہاں پانچ سال گزارے اس کے بعد اس کے ماموں نے اسے ایک کباڑیئے کے پاس ملازم رکھوا دیا۔ پھر ایک وکیل کے پاس بھیج دیا جو اسے غبی اور بے وقوف کہتا تھا۔ وکیل نے دھکے دے کر نکالا تو اسے ایک نقش و نگار بنانے والے کے پاس بھیج دیا۔ جہاں اُس نے کچھ عرصہ شوق سے کام کیا لیکن مالک نے جی بھر کر اس کی پٹائی کی اس کی مار نے روسو کا ذہن چوری، جھوٹ بولنا اور آرام طلبی کی طرف موڑ دیا۔ وہ چوری کو بُرا نہیں سمجھتا تھا اور اس نے چھوٹی چھوٹی چوریوں کو زندگی کا معمول بنا لیا۔ جب بھی وہ چوری کرنے کی سوچتا تو اس کے اندر سے آواز آتی ''اس کا انجام کیا ہوگا۔''

تو روسو زیر لب جواب دیتا۔

''زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ مار پڑے گی۔ تو کیا، میں تو پیدا ہی مار کھانے کے لئے ہوا ہوں۔'' اس کے باوجود وہ پیشہ ور چور نہ بن سکا۔ وہ یہ چوریاں صرف آزادی حاصل کرنے کے لئے کرتا تھا۔ اسکی عجیب منطق تھی اور وہ یہ کہ جب اس کی جیب خالی ہوتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آزادی چھن گئی ہے وہ خود کہتا ہے:

''اگر میرے پاس آزادی ہو تو مجھے یقین ہے میں لالچ کی طرف مائل نہیں ہوتا اور لالچ مجھے چوری کرنے پر مجبور کرتا ہے۔''

یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ سولہ سال کا ہو گیا (لیکن کتابوں سے اس کی دلچسپی کم نہ ہوئی) ایک دن وہ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کرنے شہر سے باہر چلا گیا۔ دیر میں واپس لوٹا تو جنیوا کے گیٹ بند تھے وہ قریب ہی ایک چرچ میں چلا گیا۔ (گھر اس لئے نہ گیا کہ مار پیٹ کا خوف تھا) پادری نے اس کی آؤ بھگت کی۔ یہ رومن کیتھولک چرچ تھا۔ ان کی تنظیم پروٹسٹ عقیدے کے لوگوں کو اپنی جماعت میں آنے کی تبلیغ کرتی تھی۔ روسو کے والدین پروٹسٹ تھے اور کیتھولک سے پروٹسٹ عقیدہ اختیار کرنے پر ہی اس خاندان کو فرانس چھوڑ کر جنیوا آنا پڑا تھا۔

روسو نے اپنے خاندان کا عقیدہ چھوڑ کر کیتھولک جماعت میں شمولیت اختیار کی اور پادری نے اسے میڈم ڈے وارین کی طرف خط دے کر بھیج دیا جو سارڈینیا کے بادشاہ سے وظیفہ لیتی تھی اور کام یہ کرتی تھی کہ کیتھولک جماعت میں داخل ہونے والے نوجوانوں کی خدمت کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ میڈم ڈے وارین 29 سالہ ایک خوبصورت طلاق

یافتہ عورت تھی۔ اچھے بُرے دونوں طرح کے خیالات اس کے دل میں پناہ گزین تھے۔ آزاد خیال۔ مارکیٹ میں سٹہ بازی کرتی تھی۔ روسو اس سے ملا تو اسے میڈم بہت پسند آئی۔

دونوں کے خیالات ملتے تھے روسو ساری زندگی میڈم سے رشتہ نہ توڑ سکا۔ اس سے دور بھی رہا تو لوٹ کے اسی کے پاس آیا۔

روسو کو میڈم ڈے وارین میں ماں، بیوی اور استاد تینوں مل گئے۔ روسو پر جب بھی کوئی مصیبت پڑی وہ دوڑا دوڑا میڈم کے پاس آیا اور اسے مصیبت سے چھٹکارا مل گیا۔ روسو کی زندگی میں سینکڑوں عورتیں آئیں مگر وہ میڈم ڈے وارین کو نہ بھلا سکا۔

روسو کی سوانح عمری ''اعترافات'' کا شمار دنیا کی بہترین اور مقبول سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ روسو کی فکر، حالات اور فرانس کے ماحول کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت اس نے کھل کر سچ بولا ہے۔ اس کتاب کے کچھ حصے اس نے پیرس میں نجی محفلوں میں پڑھ کر سنائے تو اس کے قریبی لوگ ڈرنے لگے کہ کہیں روسو کی سچائی کی زد میں وہ بھی نہ آ جائیں چنانچہ اسے بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا اور جاننے والوں اور دوستوں کی سازشوں کے ہاتھوں پیرس سے کئی بار جلاوطن بھی ہونا پڑا۔

''اعترافات'' پڑھے بغیر روسو کی زندگی بچپن، جوانی، عادات و خصائل، پیرس کا سماجی ماحول، بدلتی ہوئی اقدار ہمعصروں کی چشمک، سیاسی، سماجی، ادبی، تبدیلیوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ روسو کی بدلتی ہوئی فکر، اس کی تخلیقی زندگی کے نشیب و فراز، اس کے پس منظر مخالفین۔ ہمدرد دوستوں کی ہمدردیاں، اس کی اپنی نفسیات، دوستوں کے ساتھ اس کا بدلتا ہوا رویہ۔ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی سچائی ہے۔ واقعات کی درست پیش کش ہے۔ یہ کتاب لکھتے وقت روسو نے اپنے آباؤ اجداد کی مدح سرائی نہیں کی۔ (جوش صاحب کی طرح پدرم سلطان بود کی جلترنگ نہیں بجائی)۔ لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے خود کو بلندی اور سامنے والے کی تضحیک نہیں کی۔

جو کچھ وہ تھے اور جو کچھ روسو تھا لکھ دیا ہے۔ اپنے گناہوں کو قطار میں کھڑا کر کے قارئین کو دکھایا ہے کہ ''یہ میں ہوں'' کتاب کے دیباچے میں اس نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ قیامت کے روز میں یہ کتاب خدا کے حضور پیش کروں گا اور کہوں گا کہ اس کتاب میں میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے نیکی لکھتے وقت شاید میں نے ڈنڈی ماری ہو لیکن گناہوں اور غلط کاریوں پر پردہ نہیں ڈالا اور یہ سب کچھ اس لئے کہ یہ کتاب پڑھ کر لوگ یہی تاثر قائم کریں کہ

"If I am not better , at least I am different"

روسو کی زندگی کی یہ بھرپور روداد ''اعترافات'' حوالہ بن کر روسو پر کام کرنے والے نقادوں اور محققوں کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

روسو کی اس کتاب میں دو چیزوں کی بھرمار ہے۔ پہلی روسو کی بدنصیبیاں اور مصیبتیں۔ دوسری بے شمار خوبصورت عورتیں جن میں سے اکثر اس کی طرف متوجہ تھیں۔ اس کی ہمدرد تھیں۔ روسو کی زندگی میں انہوں نے بے شمار سہولتیں پیدا کیں اور اس کی مطبوعات کو چھپوانے اور لوگوں تک پہنچانے میں روسو کی بہت مدد کی۔ روسو جب موسیقی اور علم کا بے بہا خزانہ لے کر گلی گلی اور محفل محفل پھرتا تھا اور کوئی اس کی بات نہیں سنتا تھا تو پیرس کے ایک بوڑھے کیسل نے اسے زندگی کا ایک راز بتایا جو روسو نے ساری زندگی گرہ میں باندھ کر رکھا اور پھر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کیسل جسے کافی ہاؤس آنے

والے پاگل کہتے تھے اس نے روسو سے کہا:

''چونکہ کوئی موسیقار کوئی عالم تمہاری بات نہیں سنتا، تم اپنی حکمت عملی بدلو اور خواتین کو اپنی بات سناؤ۔ شاید ان کے ساتھ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ میں نے میڈم ڈی بیوزنرل، اس کی بیٹی میڈم ڈی بروگلی، میڈم ڈیوپن سے تمہارا ذکر کیا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں تم اپنا کام لے کر ان کے پاس جاؤ۔''

روسو ان سے جا کر ملا پھر مزید لوگوں سے ملا اور پھر عورتوں کی ہر محفل میں اس کے تذکرے ہونے لگے اور وہ سارے پیرس میں اپنے کام کے حوالے سے جانا جانے لگا۔

برسوں بعد جب روسو یورپ اور ساری دنیا میں مشہور ہو گیا تو کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا تھا۔

''میڈم ڈے رین، میڈم ڈی بروگلی، میڈم ڈیوپن، مسز گیلی، میڈم ڈی بریل، میڈم بسائل، میڈم ڈی لارنج اور میری دو خوبصورت شاگردیں۔ باوجود اس کے کہ میرے بالوں میں سفیدی آ چکی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تنہا نہیں ہوں اپنے حرم میں بیٹھا ہوں اور یہ سب میرے اِرد گرد بیٹھی ہیں۔''

روسو نے اگرچہ جم کر کہیں قیام نہیں کیا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ چند سال یہاں، چند سال وہاں پڑاؤ ڈالا لیکن اس کی تخلیقی زندگی کا عمل جاری رہا۔ اس نے بہت کام کیا اور اس کے کام نے کئی (Trend Set) کئے۔ اس نے سوانح عمری لکھی۔ اس کے علاوہ مندرجہ تخلیقات بھی مثالی ہیں:

1۔ معاہدہ عمرانی Social Contract

2۔ انسائیکلو پیڈیا پر کام کیا جس میں اس کے ساتھ دیدرو شامل تھے جسے وہ اپنا استاد بھی کہتا ہے۔

3۔ سائنس اور آرٹ کی مخالفت میں مقالہ

Discourse on the Arts and Sciences

4۔ انسانی اونچ نیچ کا منبع اور اس کے اسباب

On the origin and basis of inequality among men.

۵۔ ناول (ژولی)

6۔ ایمل (ناول)

7۔ (Letters on French Music)

8۔ اوپیرا (The Village Soothsayer)

روسو نے عملی زندگی کا آغاز موسیقی کے حوالے سے کیا۔ اسے بچپن میں اس کی خالہ پرانے گیت سنایا کرتی تھی۔ روسو انہیں بہت شوق سے سنتا' اس نے ان گیتوں میں ذرا سی ردو بدل کر کے میوزک پر کام شروع کر دیا۔ اسے اطالوی موسیقی سے بہت پیار تھا۔ جس میں خاص طور پر اوپیرا شامل تھا۔ اس نے اپنا میوزک ترتیب دے کر اکیڈمی کو پیش کیا جس سات سروں اور تال کو اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا لیکن اس کی اس کوشش کو اکیڈمی نے فضول قرار دے دیا۔

لیکن روسو نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل محنت کرتا رہا۔ انسائیکلو پیڈیا میں میوزک پر اس نے بہت کام کیا۔ آخر 1752ء میں اس کی محنت رنگ لائی اور اس کا اوپیرا لوئی xv کے دربار میں پیش کیا گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ روسو خود ہاتھ کے اشارے سے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر زندگی بھر کے لئے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جسے روسو

نے ٹھکرا دیا۔ صرف یہ سوچ کر کہ پیرس کے لوگ اس کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ یہی وہ آدمی ہے جس نے بادشاہ کے وظیفے کو ٹھکرا دیا ہے۔

روسو کا دوسرا اہم تحریری کام آرٹ اور سائنس کی مخالفت میں لکھا ہوا مقالہ ہے۔ جس کا پس منظر بہت دلچسپ ہے۔

روسو کے ساتھ دیدروٹ DIDEROT کو ایک مضمون لکھنے کے سلسلے میں حکومت نے جیل بھیج دیا تھا۔ روسو اسے جیل ملنے کے لئے جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا کہ اکیڈمی مقابلے کے لئے ایک مضامین کا مقابلہ کرانا چاہتی ہے جس کا عنوان تھا۔ ''کیا سائنس اور فنون لطیفہ نے اخلاق کو بگاڑا ہے؟۔'' روسو کہتا ہے کہ میں یہ اخبار لے کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا مجھے تھکاوٹ محسوس ہوئی میں سو گیا۔ خیالات نے مجھے گھیر لیا جب میری آنکھ کھلی تو میرے کوٹ کا بازو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اور سارا مضمون میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ اس نے جا کر دیدرو کو جا کر یہ ساری بات سنائی۔ اس نے بھی یہی بات دہرائی کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ بہر حال روسو نے مضمون لکھا جس میں اس نے ثابت کیا کہ علوم وفنون کی ترقی نے اخلاقیات کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے مصر' یونان اور روم کی مثالیں دے کر ثابت کیا کہ جب ان علوم اور فنون نے وہاں ترقی کی تو سب کے سب عیش وعشرت کے ہاتھوں فنا ہو گئے۔ اس کا کہنا ہے کہ فلسفے نے جب بھی انگڑائی لی۔ اخلاقیات زوال پذیر ہو گئی تعلیم کسی آدمی کو اچھا نہیں بناتی' چالاک بناتی ہے تاکہ وہ جرم کر سکے تہذیبی ترقی معاشرے کو زوال کی طرف دھکیل دیتی ہے اس کا یہ مقالہ اول انعام کا مستحق قرار پایا اور روسو کا نام چاروں طرف پھیل گیا۔ جیل میں قید اس کا دوست دیدرو بہت چلایا' دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ نقادوں نے بھی آواز بلند کی کہ مقالے میں شامل سارے خیالات دیدرو کے ہیں اور دیدرو خود بھی ہر محفل میں کہتا تھا:

''روسو جھوٹا ہے' شیطان ہے' احسان فراموش ہے' ظالم ہے' اس نے خیالات مجھ سے سمیٹے اور خود انہیں استعمال میں لے آیا۔''

روسو کی پہلی تحریری کامیابی پر تنقید کا یہ پہلا پتھر تھا۔

ویژن اکیڈمی کے لئے روسو نے جو دوسرا مقالہ لکھا اس کا نام ''انسانی اونچ نیچ کا منبع اور اسباب'' ہے روسو نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بے شک سائنس اور علوم وفنون نے اخلاقیات کو نقصان پہنچایا مگر اخلاقیات نے دم نہیں توڑا۔ روسو نے اس مقالے میں انسانوں کو واپس فطرت کی طرف لوٹنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسان نے جو عادات اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنائی ہیں اگر انہیں ترک کر دیا جائے تو انسان واپس فطرت کی طرف لوٹ سکتا ہے اور فطری انسان بن سکتا ہے۔ جو ہر عیب اور برائی سے پاک ہوگا۔ روسو کہتا ہے انسان کی فطرت میں دو عادات جبلی ہیں ایک جنس کی اور ایک مقابلے کی (جب وہ خطرہ محسوس کرے)۔ روسو کی زندگی میں پہلا انقلاب اس وقت آیا جب 1762ء میں اس کی شاہکار تصنیف معاہدہ عمرانی ایمسٹرڈیم سے شائع ہوئی۔ فرانس سے اس لئے نہیں چھپی کہ فرانس حکومت کا سنسر شپ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں روسو ایک ایسی جمہوریت کا خواہش مند ہے جس میں شہریوں کو آزادی' انصاف اور برابری کا درجہ حاصل ہو گا۔ یہی وہ تین نعرے تھے جو 11 سال بعد Battle -Cry of Revolution بن کر ابھرے اور فرانس میں انقلاب آ گیا۔

معاہدہ عمرانی اس تاریخی جملے سے شروع ہوتا ہے جو ضرب المثل بن کر دنیا میں چاروں طرف پھیل گیا اور غلامی کے اندھیروں میں آزادی کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ جملہ یہ تھا۔

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے' جدھر دیکھو وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے''۔

''اس معاہدہ کی رو سے ہر فرد اپنے تمام تر حقوق کل میں شامل کر دیتا ہے۔ وہ معاشرے کے مفاد میں متحد ہو کر یک جان ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس معاہدے میں شریک ہر فریق کی انفرادی شخصیت۔ اس اشتراک سے ایک اخلاقی اور اجتماعی تجسیم کو جنم دیتی ہے۔ ان کی شفاقت ایک ان کی زندگی اور ارادہ ایک ہوتا ہے۔ یہ عوامی فرد دوسرے افراد کے ساتھ متحد ہو کر مدنیت (شہر) کا نام پاتا ہے۔'' (ترجمہ معاہدہ عمرانی۔ ڈاکٹر محمود حسین)

روسو کہتا ہے کہ اس شہر یا Republic میں اخلاقی آزادی ہو گی اور یہی اخلاقی آزادی ہے جو ایک انسان کو انسان بناتی ہے۔ ''عمومی ارادہ اور مرضی ہمیشہ راہ راست کی طرف جاتا ہے۔ اس کا جھکاؤ عوامی مفاد کی طرف ہوتا ہے'' روسو کے مطابق: ''بادشاہ محض ایک روایت اور بنے بنائے ڈھانچے کی پیروی کرتا ہے جبکہ قانون ساز اسمبلی اس ڈھانچے اور روایت کو ختم کرتا ہے۔ قانون ساز ایک انجینئر ہے جو ایک مشین ایجاد کرتا ہے اور بادشاہ ایک مکینک ہے جو اس مشین کی مرمت کر کے اسے چلتے رہنے کے قابل بناتا ہے۔''

(''معاہدہ عمرانی..........ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین'')

روسو کے مطابق معاہدہ عمرانی کے ذریعے تمام افراد آپس میں مل کر اور اجتماعیت میں شامل ہو کر اپنی اور لوگوں کی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اپنے تمام اختیارات ایک فرد کو دے دینا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ سب کی آزادی کی حفاظت کرے گا۔ کیونکہ اس طرح جز وکل میں شریک ہو کر ایک ہو جائے گا۔

روسو افلاطون سے بہت متاثر تھا اس نے اس کے نقش قدم پر چل کر اس جیسی ایک مثالی ریاست بنانے کی کوشش کی۔ اخلاق، انسان کی فطری حیثیت اور آزادی کو بنیاد بنا کر ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔ ایک ایسا مذہب جو ایک عقیدہ رکھے۔ تعلیم جو وطن سے پیار سکھائے اور ایسے کھیل تماشے جو شہریوں کی جسمانی حالت کو درست رکھیں۔

روسو کا رومانوی ناول ''جولی'' ایک جذباتی کہانی ہے جو 25 لڑکیوں کی کہانی ہے (اس ناول میں روسو نے جذباتی حوالے سے ان واقعات کو بنیاد بنایا ہے۔ جو اس کے اور میڈم ڈی وارین کے درمیان وقوع پذیر ہوئے)۔ یہ ناول فطرت کی خوبصورتی اور سوئٹزرلینڈ کے خوبصورت مناظر سے بھرپور شاہکار ہے۔ روسو کو سیر سپاٹے کا بہت شوق تھا۔ اپنے کتے کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر دور تک نکل جاتا۔ اپنی بیوی ٹریز کے ساتھ میلوں پیدل چلتا رہتا اور فطرت کی خاموش آوازوں کو سنتا۔ اس نے ان تمام خوبصورتیوں کو اس ناول میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس ناول کا پیرس کے لوگ بہت انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ ناول چھپا تو محفل محفل اس کا چرچا ہونے لگا...... بقول روسو:

''خاص طور پر خواتین تو اس کتاب اور مصنف سے اس قدر متاثر تھیں کہ اگر میں کسی کے ساتھ تعلقات بڑھانا چاہتا تو ناکام نہ ہوتا......''

اپنی سوانح عمری میں روسو نے شہزادی کوتالمونٹ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''ایک اخبار فروش نے اوپیرا کی رات مجھے یہ خبر پہنچائی کہ کھانے کے بعد شہزادی یہ کتاب پڑھتی رہی۔ آدھی رات کو اس نے بگھی میں گھوڑے جتوائے اور کتاب پڑھتی رہی۔ ملازم نے آ کر کہا کہ سواری تیار ہے۔ رات کے دو بج گئے ہیں۔ آپ نے اوپیرا پر نہیں جانا۔ شہزادی نے کہا ''اگر یہ بات ہے تو اب رقص پر نہیں جایا جا سکتا۔'' شہزادی نے کپڑے بدلے اور پھر کتاب پڑھنے لگی۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ میں نے یہ اپنی کہانی لکھی ہے۔''

اصل قصہ یہ ہے کہ جب وہ پیرس کی دھواں دھار فضا چھوڑ کر اور روسو سے لڑ جھگڑ کر میڈم اپینے کے پاس گیا تو وہاں اس کی ملاقات میڈم کی رشتے دار صوفی سے ہوئی اور روسو اس سے عشق کرنے لگا۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ جب عشق نے شدت اختیار کی تو صوفی پیچھے ہٹ گئی اور روسو وہاں سے کہیں اور چلا گیا اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔

ناول کی کہانی ایک لڑکی ژولی کے سچے عشق کی کہانی ہے۔ اس وقت کے فرانس کے گھر کا قصہ ہے جہاں لڑکیوں کی شادی رضامندی کے خلاف کر دی جاتی ہے۔ لڑکیوں پر یہ ظلم ہوتا تھا لیکن جب وہ بیوی بن جاتی تھی تو اسے مکمل آزادی مل جاتی تھی۔ شادی کے بعد ژولی کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑکتی ہے اور اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ روسو نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ژولی چاہتی تھی کہ اس کی شادی اس سے ہو جس سے وہ محبت کرتی ہے لیکن ماں باپ نہیں چاہتے کہ ایک کم حیثیت رکھنے والے لڑکے سے اس کی شادی ہو۔ چنانچہ شادی کے بعد بھی وہ عشق کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ ناول کا انداز وہی خطوط کے ذریعے ہے: جو بہت سال بعد گوئٹے نے ''ورتھر کی داستان غم'' میں اپنائے.......

ژولی آخر میں جب جان دیتی ہے تو وہ اعلان کرتی ہے کہ وہ اپنے خاوند سے عشق نہیں کرتی اپنے محبوب کو چاہتی ہے......

گوئٹے نے اپنے ناول ''ورتھر کی داستان غم'' میں اس سے ملتا جلتا پلاٹ اپنایا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے ناول میں ورتھر جان دیتا ہے۔ ژولی میں ژولی محبت میں جان کی قربانی دیتی ہے۔ داستان غم کی ہیروئن اپنے خاوند سے وفا کرتی ہے۔ ژولی اپنے محبوب کا عشق نبھاتی ہے...... داستان غم کی طرح ژولی کو بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کتابوں کی اتنی مانگ تھی کہ پبلشر کتابیں لوگوں کو ان کی طلب کے مطابق فراہم نہ کر سکا۔ گوئٹے کو کوئی رائلٹی نہ ملی لیکن روسو کے سارے قرض اتر گئے۔

روسو کی جو دو کتابیں دنیا میں اہم ترین تصور کی جاتی ہیں ان میں ایک معاہدہ عمرانی ہے اور دوسری کتاب نظریہ تعلیم پر اس کا ناول EMILE On Education بچے کی تعلیم و تربیت پر یہ لکھی ہوئی کتاب روسو کے نظریات کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ روسو کا کہنا ہے کہ بچہ اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ مار پیٹ سے اس کی تربیت مکمل نہیں ہوتی۔ کتاب میں ظاہر ہونے والا بچہ ایمل دیہات میں تربیت حاصل کرتا ہے۔ روسو نے اسے شہر کی فضا سے دور رکھا ہے کیونکہ فطرت کی قربت میں اس کی تعلیم زیادہ بہتر ہو سکتی ہے روسو کو یقین ہے کہ اس کے استاد کے بتائے ہوئے اصول اور قواعد اس کی بہتر تربیت کر سکتے ہیں۔ روسو کا نظریہ ہے کہ بچہ اچھائی اور برائی اپنے تجربے سے حاصل کرتا ہے۔ اس نے بچپن کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ 12 سال کی عمر تک بچہ اپنے جذبات سے سیکھتا ہے۔ 12 سے 16 سال کی عمر تک دلائل اور ادراک کے ہتھیار اس کے پاس آ جاتے ہیں۔ 16 سال کے بعد اسے کسی ہنر میں مشق کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں وہ اپنی زندگی میں سہولتیں پیدا کر سکے اس عمر میں وہ اپنا شریکِ حیات بھی ڈھونڈ لے گا۔ صوفی جس سے ایمل شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک مثالی عورت ہے جس میں ایک کامیاب اور مثالی بیوی بننے کی تمام صفات موجود ہیں جبکہ ایمل مردوں کے اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جس میں مثالی شوہر بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ روسو کی اس کتاب کو بہت پذیرائی ملی.......... 1994ء میں جان ڈارلنگ اپنی تحریر میں کہتا ہے۔ ''تعلیم کے سلسلے میں روسو کے نظریات بڑے اہم اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید نظریہ تعلیم کی تمام تحریریں روسو کے مقابلے میں فٹ نوٹس (Foot Notes) کی حیثیت رکھتی ہیں۔''

ایمل لکھنا روسو کی دیرینہ خواہش تھی۔ اسے ساری زندگی یہ افسوس رہا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ

دے سکا اور انہیں یتیم خانے میں داخل کرا کے ان کی زندگی برباد کر دی۔ اس ندامت کا قرض اس نے ایمل لکھ کر چکایا تا کہ دنیا کے بچے برباد نہ ہو سکیں۔

روسو اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمیں بچے کی ذہنیت کو سمجھنا چاہئے۔ ان کا دیکھنے، سوچنے اور بولنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ذہنیت کو ان پر نہیں تھوپنا چاہئے۔ وہ اس عمل کو بڑوں کی بے وقوفی قرار دیتا ہے۔

جب یہ کتاب چھپی تو چرچ والوں نے اس کی سخت مخالفت کی کہ روسو نے مسیحیت اور خدا کا کہیں ذکر نہیں کیا بلکہ مذہبی خیالات کی نفی کی ہے جن کے بغیر انسان کی نجات نہیں ہو سکتی چنانچہ اسے جلا دینا چاہیے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے مصنف کو گرفتار کرنے اور کتاب کو جلانے کا حکم جاری کر دیا۔ دوستوں نے روسو کو خبر کر دی اور وہ اپنی بیوی کو اکیلا چھوڑ کر گھر سے بھاگ گیا...... لطف کی بات یہ ہے کہ چرچ والے کتاب میں ان باتوں کی نشان دہی نہ کر سکے جن کی وجہ سے کتاب جلانے اور مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم جاری ہوا تھا............ یہ وہی کتاب ہے برسوں بعد جس نے فلسفی کانٹ (KANT) کے معمول کو تتر بتر کر دیا تھا...... کانٹ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ وقت کا اتنا پابند تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کر لیتے تھے۔ کانٹ ایک وقت مقررہ پر سیر کیلئے نکلتا تھا۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر اس کے وقت میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں آتا تھا...... اچانک ایک بار لوگ حیران رہ گئے کہ وہ مقررہ وقت سے لیٹ ہو گیا ہے۔ لیٹ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ روسو کا ناول ایمل پڑھ رہا تھا۔ اسے وقت کا خیال ہی نہ رہا وہ کتاب ختم کر کے اٹھا...... یہ اس کی زندگی کا واحد واقعہ تھا کہ کسی آدمی نے اپنی تحریر سے اس کے معمولات میں خلل ڈالا ہو۔ روسو کے نظریات نے کانٹ پر کیا اثر کیا یہ دوسری بات ہے............!!

روسو بچپن میں استادوں اور رشتے داروں کی لعن طعن برداشت کرتا رہا۔ مار کھاتا رہا۔ دربدر بھٹکتا رہا مشکلات کا شکار رہا۔ فاقے کئے، چوریاں کیں، جنسی غلط کاریوں میں ملوث رہا...... جوان ہوا اور تخلیقی منازل کی طرف قدم بڑھائے تو نقادوں اور دشمنوں نے راستہ چلنا دشوار کر دیا مگر روسو نے ہمت نہ ہاری اگرچہ وہ وہی تھا جو ہر آدمی پر شک کرتا تھا۔ صحت بھی کمزور تھی۔ حالات سے جلد گھبرا جاتا تھا مگر اس نے سفر جاری رکھا۔

میں نے روسو کی زندگی میں آنے والی خواتین کا ذکر کیا ہے مگر ایک خاتون رہ گئی جو طویل عرصہ اس کے ساتھ رہی اس کے لئے پانچ بچے پیدا کئے۔ یہ عورت اس کی بیوی تریزے (TERESE) تھی۔ تریزے کے بارے میں روسو ہمیشہ بددل رہا۔ وہ ہمیشہ اسے بدصورت جاہل، پاگل ہونے کے خطاب دیتا رہا لیکن وہ عورت ایک عرصہ تک بغیر شادی روسو کے ساتھ رہی۔ تریزے کی ماں بھی ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ روسو جس سے بڑی نفرت کرتا تھا۔ روسو نے اس کے مشورے پر ہی اپنے بچے یتیم خانے میں داخل کئے تھے۔ وہ ''اعترافات'' میں کہتا ہے کہ میری ساس بہانے بنا کر مجھ سے پیسے نکلوا لیتی تھی اور یہ سلسلہ اُس کی موت تک جاری رہا...... روسو کے ساتھ تریزے کے بے شمار جھگڑے ہوئے لیکن وہ اسے خود سے الگ نہ کر سکا وہ جہاں بھی بھاگ کر گیا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ 20 مئی 1778ء کو جب روسو ارمنو ویل گیا جو پیرس سے چند میل کے فاصلے پر ہے تو تریزے اس کے ساتھ تھی۔ جب 2 جولائی 1778ء کو روسو اس دنیا سے رخصت ہوا تو تریزے اس کے ساتھ تھی۔ بیماری کے دنوں میں تریزے کے تعلقات روسو سے اچھے نہیں تھے......

روسو کی موت بھی ایک معمہ ہے۔ وہ سیر سے واپس آیا۔ سر میں درد ہوا۔ شریان پھٹی اور وہ مر گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس نے خودکشی کی کیونکہ آخری دنوں میں اس کے حالات اچھے نہیں تھے...... اُس کی وفات کے بعد

فرانس حکومت نے اس کی بیوی تریزے کو 12 سو فرانک کا وظیفہ دیا۔ روسو کا مجسمہ شہر میں لگایا...... سب نے اس کی عزت کرنا شروع کر دی مگر اس کی بیوی نے ایسا نہیں کیا...... اس نے آرمنو ویل کے ایک فضول سے ملازم سے شادی کر لی۔ اس لڑکے نے چند دن اس بیوہ کا مال کھایا اور پھر کہیں غائب ہو گیا۔ تریزے کو روسو سے بے وفائی کی کڑی سزا ملی۔ حالات بگڑے اور یہ دن بھی آئے کہ لوگوں نے اسے پیرس کے تھیٹر کے باہر بھیک مانگتے دیکھا اور بھیک مانگتے مانگتے وہ 1801ء میں فوت ہو گئی۔ روسو کے کام پر بڑی تنقید ہوئی اسے والٹیئر جیسا تیز، فقرے باز ہم عصر ملا جس نے روسو کے فلسفے اور مقالات کا مذاق اڑایا، اسے ڈیوکلب جانسن کا ''پاگل کتا'' تک کہا (لیکن جب روسو کی کتابیں جلائی گئیں تو اس نے روسو کے حق میں آزادی رائے کی حمایت میں جلوس نکالا) چند دشمنوں کی سازشوں اور والٹیئر کی تنقید کے باوجود روسو کی تحریروں نے یورپ اور مغرب اور پھر ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور خیالات میں ایک تبدیلی آ گئی...... وہ روشن ضمیری کی علامت بن گیا۔ شیلے، کیٹس، بائرن اور کولرج اس کی رومانویت سے متاثر ہوئے۔ گوئٹے نے اثر قبول کیا۔ وکٹر ہیوگو نے اس کی عظمت کو تسلیم کیا...... ہوبس (HOBBES) اور جان لوکی (JOHN LOCKE) نے اس کے نظریات کی حمایت کی۔ کسی کے نظریات پر تنقید اپنی جگہ۔ یہ انسان کا بنیادی حق ہے لیکن بقول (BARZUN)

"It was an amazing fact that .... every new work of Rousseau was a huge success, whether the subject was politics, the theater, education, religion or a novel about love...."

وکٹر ہیوگو

(Victor Hugo)

19ویں صدی کا مقبول ترین فرانسیسی ناول نگار، شاعر، مصور، ڈرامہ نویس، جمہوریت پسند، فلاحی کارکن، سیاسی شخصیت، رومانوی تحریک کا سرگرم رکن، وکٹر ہیوگو، فرانس کا سب سے بڑا شاعر اور ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔

اگر وکٹو ہیوگو ناول نگار بننے کی بجائے مصور بننا پسند کرتا تو اس صدی کے دوسرے مصور گمنام رہ جاتے۔

(Von Gogh)

....

روس کے نامور ادیب ٹالسٹائی نے وکٹر ہیوگو سے گہرا اثر قبول کیا۔ جب فرانس کا دورہ کیا تو وکٹر ہیوگو سے ملا اور فخر محسوس کیا اور کہا وکٹر ہیوگو کے خیالات جان کر مجھ میں بڑی تبدیلی آئی ہے میں نے اس سے بڑا کچھ سیکھا۔

(ٹالسٹائی کے خط سے اقتباس)

....

''لامزرابیلز'' ایک اہم ترین ناول ہے۔ جس میں نام نہاد اندھے قوانین، ناانصافی، اخلاقی گراوٹ غربت، بے روزگاری، عوام کی بے بسی اور محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

....

''لامزرابیلز'' ٹالسٹائی کے ''جنگ اور امن'' سے بڑا ناول ہے۔

(بالزاک)

وکٹر ہیوگو

پیرس کی تاریخ کا شاید یہ سب سے بڑا فیسٹیول تھا، جو کسی زندہ آدمی کے اعزاز میں منعقد کیا گیا۔ یہ 1881ء کا واقعہ ہے۔ تقریبات کا آغاز 25 فروری کو ہوا اور تین دن تک جاری رہا۔ کسی سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیت کا سوگ تو تین دن منایا ہی جاتا ہے لیکن کسی کی زندگی میں ایسا عقیدت بھرا جشن اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ 27 فروری کو فرانس کی تاریخ کی سب سے بڑی پریڈ کا اہتمام کیا گیا۔ شہر کے مختلف حصوں سے لوگ مارچ کرتے ہوئے پیرس کے مرکزی حصے میں جمع ہوئے اور پھر ایک بڑے ہجوم کی شکل میں ایک خاص ترتیب میں قدم ملاتے ہوئے اس کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

آج اس نامور، چہیتی، مقبول شخصیت کی 79 ویں سالگرہ تھی۔ لوگوں کا ہجوم اسکی کھڑکی کے سامنے سے 6 گھنٹے تک گزرتا رہا۔ پریڈ میں شامل لوگوں نے اپنے سینوں پر وہ پھول لگایا ہوا تھا جو اس کے ایک کردار Cosette کو بہت پسند تھا اور یہ پھول Corn Flower تھا۔ وہ چھ گھنٹے کھڑکی میں بیٹھا لوگوں کے عقیدت بھرے سلام کا جواب دیتا رہا۔ لوگ نعرے لگا کر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے...... 22 مئی 1885ء میں اچانک اس کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور وہ فوت ہو گیا۔ 20 لاکھ لوگوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی اسے Pantheon کے قبرستان میں الیگزینڈر ڈیوماس اور ایمل زولا کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ اس مقبول شخصیت کا نام وکٹر ہیوگو تھا۔

وکٹر ہیوگو فرانس کا سب سے بڑا شاعر، ناول نگار، ڈراما نویس، جمہوریت پسند، سیاسی شخصیت، فلاحی کا رکن اور رومانوی تحریک کا سرگرم رُکن بلکہ جان مانا جاتا ہے۔

وکٹر میری ہیوگو 26 فروری 1802ء میں Besancon شہر میں پیدا ہوا۔ اس کا والد نپولین کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ باپ کی نوکری کی وجہ سے اسے مختلف علاقوں میں وقت گزارنا پڑا، اس سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ وہ فرانس کے مختلف علاقوں کے مسائل سے آگاہ ہوتا گیا، جنہیں اس نے اپنے آنے والے ناولوں میں بڑے احسن طریقے سے پیش کیا...... اس کی ماں شوہر کی سفری نوکری سے بددل ہو کر پیرس میں قیام پذیر ہو گئی۔ وکٹر ہیوگو بھی اپنی تعلیم کے سلسلے میں اس کے پاس رہ گیا۔ ماں نے اسے کیتھولک چرچ میں تعلیم دلائی۔ ایک عمر تک تو وہ کیتھولک نظریات سے متفق رہا مگر پھر منحرف ہو گیا اور ساری عمر منحرف رہا۔ 1872ء میں ایک اخباری نمائندے نے اس سے پوچھا:

''کیا آپ کیتھولک ہیں؟''

اس نے جواب دیا:

''نہیں! بالکل نہیں۔ میں تو ایک آزاد سوچ رکھنے والا آدمی ہوں''

اس نے اپنی وصیت میں لکھا کہ مجھے ان مذہبی رسومات کے مطابق قبر میں نہ اُتارا جائے۔ اس کے باوجود وہ اپنے انداز میں ایک مذہبی آدمی تھا، جو دُعا، خدا اور طاقت پر یقین رکھتا تھا۔

وکٹر ہیوگو کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بیتھوون کی موسیقی کا دیوانہ تھا۔ اپنے عہد کے موسیقاروں سے اس کی بڑی

دوستی تھی۔ اپنے ڈراموں کی موسیقی مرتب کرنے میں اس کا بڑا عمل دخل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار میوزیکل کمپوزیشن اس کے مشورے سے مرتب کی گئیں۔ اس کی رومانوی نظمیں موسیقاروں کی توجہ کا خاص مرکز رہیں۔ ان کی کمپوزیشن میں وکٹر ہیوگو کا بہت ہاتھ رہا۔ ''نوٹرے ڈیم کا کبڑا'' اور Les Miserables پر بنے اوپیراز کی ترتیب اس کی نگرانی میں ہوئی۔

وکٹر ہیوگو ایک بہت اچھا مصور اور پینٹر بھی تھا، لیکن اس نے سرعام اس کی تشہیر نہیں کی۔ وہ اپنی مصوری کو خاص دوستوں تک محدود رکھتا تھا۔ سالگرہ اور کرسمس کارڈز جب وہ دوستوں کو بھیجتا تو ان کارڈز پر اس کی اپنی بنائی ہوئی تصویریں ہی ہوتی تھیں۔ اس کی تصویروں کی اس کے ہمعصر مصوروں نے بہت تعریف کی ہے۔ مشہور مصور وان گاف Won Gogh کی یہ بات اس کی مصوری کو بہت بڑا اخراج تحسین ہے:

"If Hugo had decided to become painter instead of a writer. He would have Thrown out the artists of his century...."

وکٹر ہیوگو رومانوی تحریک کے بانی Chateaubriand سے بہت متاثر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں بنوں گا تو Chateaubriand، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ 21 سال کی عمر میں جب اس کی شاعری کی پہلی کتاب Odeset Poesies Diverses چھپی تو اس نے دیباچے میں نوجوان شاعروں سے کہا کہ انہیں کلاسیکل طرزِ اسلوب سے بغاوت کرنا چاہیے اور رومانویت تحریک میں شامل ہونا چاہیے۔ اس کتاب نے اسے راتوں رات بڑا شاعر بنا دیا۔ گلی گلی اس کی نظموں کی دھوم مچ گئی۔ یہ بات شاہی دربار تک پہنچی اور Louis XVIII نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کتاب کے بعد وکٹر ہیوگو کی اوپر تلے چار کتابیں آئیں اور اسے فرانس کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لیا گیا۔

1829ء میں وکٹر ہیوگو کا اہم ترین نثری کارنامہ سامنے آیا اس ناول کا نام The Last days of Condemned Man تھا۔ (اس کا ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے اُردو میں ترجمہ بھی ہوا تھا جو سعادت حسن منٹو نے حسن عباس کے ساتھ مل کر کیا تھا) یہ بہت اہم کتاب تھی جس نے بعد میں آنے والے ناول نگاروں پر بہت اثر چھوڑا۔

وکٹر ہیوگو کا دوسرا اہم ترین ناول Notre Dame De Paris تھا جس نے ساری دنیا کے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔

اس ناول کا مرکزی کردار نوٹرے ڈیم چرچ کا کبڑا خدمت گزار Quasimodo ہے جو چرچ کے بڑے پادری Claude Frollo کا وفادار خدمت گزار ہے۔

یہ ناول 1482ء جنوری کے ایک فیسٹیول سے شروع ہوتا ہے، جس میں لوگ مل کر ''پیرس کے احمق ترین آدمی'' کے سر پر Pope of Fools کا تاج رکھتے ہیں۔ اس سال وہ یہ تاج نوٹرے ڈیم کے معصوم و بدصورت گھنٹہ بجانے والے Quasimodo کے سر پر رکھتے ہیں۔ اس ہجوم میں ایک خانہ بدوش خوبصورت لڑکی Esmeralda بھی ہے جس پر چرچ کا پادری Frollo عاشق ہو جاتا ہے...... پادری اپنے وفادار خادم کو یہ لڑکی اغوا کرنے کے لیے کہتا ہے۔ Quasimodo اسے اغوا کر کے چرچ میں لے آتا ہے اور خود بھی معصومیت میں اس کو دل دے بیٹھتا ہے۔ پادری کو جب پتا چلتا ہے تو اسے کوڑوں کی سزا دیتا ہے اور دھوپ میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اسے پیاس کی شدت ستاتی ہے تو

Esmeralda خود جا کر پانی پلاتی ہے Esmeralda پر ایک شخص Phoebus کے قتل کا الزام لگتا ہے...... خانہ بدوشوں کا ایک گروہ نوٹرے ڈیم سے Esmeralda کو رہائی دلانے کے لیے چرچ پر حملہ کرتا ہے۔ فوج انہیں روکتی ہے۔ پادری رقابت اور محبت میں ناکام ہو کر Esmeralda کو فوج کے حوالے کرتا ہے اور اسے پھانسی دے دی جاتی ہے۔ Quasimodo پادری کو چرچ کی بلندی سے گرا کر مار دیتا ہے اور خود پھانسی گھاٹ پر چلا جاتا ہے، جہاں لاشیں پڑی ہوتی ہیں اور جا کر Esmeralda کی لاش کے پاس لیٹ جاتا ہے اور ایک عرصہ بغیر کچھ کھائے پیئے گزار دیتا ہے۔ ایک سال کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ ہڈیوں کے دو ڈھانچے ایک دوسرے سے بغل گیر پڑے ہوئے ہیں۔

یہ سارا ناول چرچ کی فضا میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے نوٹرے ڈیم کا چرچ بھی ناول کا ایک کردار بن گیا ہے۔ اس ناول کے چھپنے کے بعد یہ چرچ دنیا کی نظروں کا مرکز بن گیا اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ وہ چرچ جو حکومت کی ناقدری کا شکار تھا، اسے حکام نے ازسرنو بنانا سنوارنا شروع کر دیا۔ اس ناول میں وکٹر ہیوگو نے نوٹرے ڈیم چرچ کی خوبصورت اور قابل دید تعمیر کے بارے میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

''نوٹرے ڈیم کا کبڑا'' بے حد پسند کیا گیا، قارئین کی ہمدردیاں کبڑے عاشق اور خانہ بدوش دوشیزہ کی طرف زیادہ تھیں، پادری Frollo کی منافق ذہنیت کو وکٹر ہیوگو نے بڑی جذباتی کش مکش کے نشیب و فراز کے انداز میں تشکیل دیا ہے۔

Esmeralda، پادری اور اس کے کبڑے خادم، دونوں کی محبت کا مرکز ہے مگر وہ خود کیپٹن Phoebus سے محبت کرتی ہے جسے پادری ایک سازش کے تحت قتل کرا دیتا ہے لیکن الزام Esmeralda کے سر تھوپ دیتا ہے۔

Quasimodo ایک معصوم آدمی ہے، پادری کا وفادار ہے، اس کے کہنے پر Esmeralda کو اغوا کرتا ہے لیکن خود اسے دل دے بیٹھتا ہے اور پھر وفا یوں نبھاتا ہے کہ اس کے بعد زندہ رہنا ایک توہین سمجھتا ہے اور جان دے دیتا ہے۔

اس ناول کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں کیا گیا۔ اس پر بہت سی فلمیں اور T.V سیریز بنائی گئیں۔

''نوٹرے ڈیم کا کبڑا'' کے بعد وکٹر ہیوگو کا اہم ترین کام جس پر اس نے پورے 17 سال کام کیا وہ اس کا لافانی ناول Les Miserables ہے جس کا انگریزی ٹائٹل The Miserable Ones ہے جو نپولین سوئم کے فرانس میں بسنے والے لوگوں کی اخلاقی، سیاسی، مذہبی، ذہنی زندگی کا آئینہ ہے۔ غربت، بھوک، دھتکارے ہوئے لوگوں کی داستان ہے۔ نپولین سوئم کے ظلم وستم، اندھے قوانین، جمہوریت پسند جیالوں کی جدوجہد کی کہانی ہے......

اس بڑے ناول کے بعد وکٹر ہیوگو کے تین ناول The Man who Loughs، Toilers of the Sea اور Ninety کے نام سے چھپے، جنہیں بہت پذیرائی ملی۔ وکٹر ہیوگو نے بے شمار پمفلٹ لکھے جو آزادی کے حق اور بادشاہت کی مخالفت میں تھے، جن کی وجہ سے اسے جلاوطن بھی ہونا پڑا۔ ڈرامے لکھے، اوپیراز لکھے جن سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

وکٹر ہیوگو کی سیاسی زندگی اتنی ہی بھرپور ہے، جتنی اس کی تخلیقی زندگی تھی۔ اس نے ملک کی سیاست اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ فرانس حکومت کے ظالمانہ، اندھے قوانین، چرچ کی بڑھتی ہوئی حاکمیت اور مذہب کے کٹرپن کے خلاف لکھا۔ وکٹر ہیوگو پہلا آدمی تھا جس نے پھانسی کی سزا کے خلاف احتجاج کیا۔ الیکشن میں جیت کر جب وہ قومی اسمبلی میں پہنچا تو سزائے موت کے قانون کے خلاف اس نے آواز بلند کی۔

وکٹر ہیوگو جمہوریت پسند انقلابی لیڈر تھا۔عوام دوستی اس کے رگ وپے میں رچی بسی تھی۔تین مسلسل ناکامیوں کے بعد وہ فرانس اکیڈمی کا ممبر بنا تو اس نے پریس کی آزادی کا نعرہ بلند کیا اور ادیبوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ پولینڈ کی خودمختاری کے حق میں تقریریں کیں۔ 1851ء میں نپولین سوئم جب سارے اختیارات کا مالک بن بیٹھا تو اس نے اسے ڈکٹیٹر قرار دیا، مخالفت کی اور جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔ 1870ء تک فرانس واپس نہ آیا، حالانکہ 1859ء میں نپولین سوئم نے اسے وطن آنے کی اجازت دے دی مگر وہ واپس نہ آیا۔ 1870ء میں فرانس واپس آیا تو لوگوں نے فوراً اسے اسمبلی کا ممبر منتخب کرلیا اور سینیٹ میں جگہ دلا دی۔

وکٹر ہیوگو نے ہمیشہ جمہوریت کی بات کی۔ جمہوریت پسند عوام کا ساتھ دیا۔ لامزرابیلز میں جا بجا جمہوریت پسند عوام کے مظاہرے اور جلوس اس کا ثبوت ہیں۔ اپنے عہد کی عدالتوں کا مذاق اُڑایا، ناانصافیوں کی طرف اشارہ کیا۔ بھوک پیاس کے ہاتھوں دم توڑتی عوام کا دکھ بیان کیا۔ اس کے ناولوں کے کردار اسی فرانس کی تقدیریں ہیں جو غربت اور افلاس کے بوجھ تلے دم توڑ رہا تھا۔

روس کے عظیم ادیب ٹالسٹائی نے وکٹر ہیوگو سے گہرا اثر قبول کیا، ٹالسٹائی نے جب فرانس کا دورہ کیا تو وکٹر ہیوگو سے مل کر اس نے بڑے فخر کا اظہار کیا۔ وکٹر ہیوگو کے خیالات جان کر مجھ میں بڑی تبدیلی آئی ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

وکٹر ہیوگو کو آخری عمر میں کچھ جذباتی صدمے ملے جن سے اس کے دل کو گہرا دکھ پہنچا، لیکن وہ مضبوط آدمی تھا، برداشت کر گیا۔ پہلے اس کے تین بیٹے فوت ہوئے، پھر بیوی فوت ہوئی۔ پھر اس کی دیکھ بھال کرنے والی مسٹریس دنیا چھوڑ گئی۔ یہ دکھ درد اسے شاید بہت عرصہ پہلے موت کے منہ میں دھکیل چکے ہوتے لیکن لوگوں کی محبت نے موت کا راستہ روکے رکھا۔ پیرس کے لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے گھر کا دن رات چکر لگاتے۔ 25 مئی 1881ء میں جو یادگار تاریخی فیسٹیول اس کے اعزاز میں منعقد ہوا وہ شاید کسی اور ادیب کی قسمت میں نہیں۔ وہ عوام کے دل میں رہتا تھا اور عوام اس کے سینے میں دل بن کر دھڑکتے تھے۔ اس کے ناول اس کی تحریریں، اس کے لکھے پمفلٹ اس محبت کا ثبوت ہیں۔

لامزرابیلز جیسا عظیم ناول اس کی عوام دوستی کی بڑی مثالی ہے۔ جس میں اس نے عوام ہی کے دکھ درد کی کتھا چھیڑی ہے۔

لامزرابیلز، وکٹر ہیوگو کا اہم ترین اور دنیا کا عظیم ترین ناول ہے۔ یہ ناول فرانس کی اس دور کی زندگی اور کرداروں کی بہترین عکاسی ہے جس دور میں فرانس کے لوگ واٹرلو کی جنگ کے بعد ایک نئے انقلاب کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ ناول فرانس کی سیاسی، تاریخی، اخلاقی، مذہبی زندگی کا نمائندہ ہے۔ یہ ناول ایک تاریخی افسانہ ہے، جس میں نپولین سوم کے خلاف ردِعمل، نام نہاد اندھے قوانین، ناانصافیوں، اخلاقی گراوٹ، سیاسی زندگی، غربت، بے روزگاری، عوام کی بے بسی اور محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

کہانی ایک سزا یافتہ ولجین (Valjean) کے گرد گھومتی ہے جو 19 سال جیل کاٹ کر جیل سے باہر نکلتا ہے۔ 5 سال کی سزا اسے اپنی بہن کے لیے روٹی چرانے کے جرم میں دی گئی۔ 14 سال کی سزا جیل سے بار بار بھاگنے کے جرم میں دی گئی۔ جیل سے رہائی پر قیدی کو ایک پیلا پرمٹ دیا جاتا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ یہ قیدی کی سزا کاٹ چکا ہے۔

لامزرابیلز 365 چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ہے۔ 1200 صفحات پر مشتمل ناول کو پانچ جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1. Fantine
2. Cosette
3. Marius
4. St. Denis
5. Jean Valjean

ان پانچوں جلدوں میں وکٹر ہیوگو نے مختلف کرداروں کے ذریعے فرانس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے لیکن کہانی کو مرکزی حیثیت ولجین کے کردار اسے ہی ملتی ہے۔

ولجین 19 سال کی قید اور پیلا پرمٹ لے کر جیل سے نکلتا ہے، لوگ اس سے صرف اس لیے آنکھ چراتے ہیں کہ اس کا ماضی اسے چور اور قیدی ثابت کرتا ہے۔ ولجین سڑکوں اور فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔ سرائے میں اسے پیلے پرمٹ کی وجہ سے جگہ نہیں دی جاتی۔ اسے کچھ راتیں جاگیردار کے کتوں کے اصطبل میں گزارنا پڑتی ہیں۔ ایک رات وہ فٹ پاتھ پر سویا ہوا ہے کہ بشپ Myriel اپنے گھر لے جاتا ہے۔ اسے کھانے کے لیے قسم قسم کے کھانے اور سونے کے لیے آرام دہ بستر دیا جاتا ہے۔ گھر کے قیمتی سامان کو دیکھ کر ولجین کی نیت میں خلل آجاتا ہے اور وہ رات کو قیمتی برتن چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ موقع پر بشپ آجاتا ہے ولجین میریل Myriel کو زخمی کرکے سامان لے کر بھاگ جاتا ہے...... ولجین دراصل اب اپنی مجرمانہ زندگی سے تنگ آچکا ہے وہ ان برتنوں کو بیچ کر کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ برتن بیچتے ہوئے پولیس اُسے پکڑ لیتی ہے اور پادری کے پاس لے جاتی ہے۔ پادری، ولجین کو پولیس کی حراست میں دیکھ کر کہتا ہے:

''آپ نے اسے کیوں پکڑا ہے۔ یہ برتن تو میں نے اسے خود دیئے ہیں۔ بلکہ یہ جاتے جاتے یہ سونے کے شمعدان تو بھول ہی گیا تھا۔''

ولجین کو بہت شرمندگی ہوتی ہے، پولیس اسے چھوڑ دیتی ہے۔ پادری یہ سارا سامان اُسے دے دیتا ہے اور وعدہ لیتا ہے کہ وہ آئندہ چوری نہیں کرے گا۔

ولجین وعدہ کرکے رُخصت ہوتا ہے لیکن عادت کے مطابق ایک بچے سے سونے کے سکے چھینتا ہے۔ پولیس میں پرچہ درج ہوتا ہے، ولجین کو پادری سے کیا ہوا وعدہ یاد آتا ہے، وہ شہر شہر پھرتا ہے تاکہ اس بچے کو سکے لوٹا سکے...... یہاں پولیس کا ایک انسپکٹر جیورٹ اُسے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ انسپکٹر جیورٹ جیل کے زمانے سے ولجین کو جانتا ہے۔ ایک بار جیل میں ایک قیدی پتھر کے نیچے دب گیا تھا۔ جیورٹ کو یاد ہے کہ ولجین نے بڑی بہادری سے اُسے بچایا تھا۔

ولجین اب اپنے ماضی کو چھپا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اس نے اب پیلے پرمٹ کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ وہ پولیس کو بچے سے سکے چھیننے کے کیس میں مطلوب ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو پولیس کی نظروں سے چھپانے کے لیے کاروبار شروع کرتا ہے اور پتھر توڑنے کی ایک فیکٹری کھول لیتا ہے۔ ولجین کی فیکٹری میں بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنے گھر کا خرچہ چلانے کے لیے مزدوری کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا دھندا بھی کرتی ہیں۔ ان میں ایک جوان عورت Fantine بھی ہے جو اپنی بچی کوزیٹ Cossette کی پرورش کے لیے محنت مزدوری کرتی ہے۔ 5 سالہ کوزیٹ دیہات میں ایک لالچی خاندان کے پاس رہ رہی ہے۔ Fantine انہیں کوزیٹ کی پرورش کا معاوضہ ادا کرتی ہے۔ یہ لالچی میاں بیوی کوزیٹ سے بہت کام کراتے ہیں۔ کوزیٹ جنگل سے پانی بھر کر لاتی ہے۔ برتن صاف کرتی ہے

اور گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ Fantine ایک بیمار عورت ہے۔ لالچی خاندان جب مزید خرچے کے لیے پیسے طلب کرتا ہے تو وہ ایک رات جسم فروشی کا دھندا کرنے چلی جاتی ہے۔ انسپکٹر جیورٹ اُسے تھانے لے جاتا ہے۔

ولجین کو ایک آدمی Fantine کے گرفتار ہونے اور اس پر تشدد کی خبر دیتا ہے، تو ولجین تھانے جا کر اسے گھر لے آتا ہے۔ ولجین پر انسپکٹر کو شک ہوتا ہے کہ یہ کہیں وہی پرانا قیدی نمبر 24601 تو نہیں...... ولجین بیمار Fantine کے قریب بیٹھا ہے۔ وہ مرنے کے قریب ہے۔ ولجین کو وہ Cossette کے بارے میں بتلاتی ہے۔ انسپکٹر جیورٹ ولجین کو پکڑنے کے لیے آتا ہے۔ Fantine مر چکی ہے۔ وہ اپنا لاکٹ ولجین کو دیتی ہے۔ ولجین انسپکٹر کو زخمی کر کے بینک سے ساری رقم نکال کر گاؤں میں کوزیٹ کے پاس چلا جاتا ہے۔ لالچی میاں بیوی کو ڈھیر ساری رقم دے کر کوزیٹ کو لے کر پیرس کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ انسپکٹر جیورٹ اسے پکڑنا چاہتا ہے لیکن ولجین کوزیٹ کو لے کر پیرس چلا جاتا ہے۔ 9 سال اور بیت جاتے ہیں، کوزیٹ اب 16 سال کی ہو چکی ہے اور ایک عالی شان محل میں رہتی ہے اور ولجین ایک دولت مند آدمی بن چکا ہے لیکن انسپکٹر جیورٹ کا خطرہ اب بھی موجود ہے

یہ نپولین سوئم کا زمانہ ہے۔ پیرس کی عوام میں انقلاب کی لہر دوڑ چکی ہے اور فرانس کو Republic بنانے اور جمہوریت بحال کرنے کی تحریک چل چکی ہے۔ نوجوان نسل مظاہرے کر رہی ہے۔ یتیموں اور عورتوں کو حقوق دلانے کے لیے گلی گلی جلسے ہو رہے ہیں۔ وکٹر ہیوگو نے ان اجلاس اور مظاہروں میں قدم قدم پر اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کوزیٹ کی ایک نوجوان Marius جو جلوسوں اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جلسوں میں پیش پیش ہے، سے ملاقات ہوتی ہے اور اس میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ولجین یتیم اور لاوارث بچوں کے لیے لنگر خانے کا آغاز کرتا ہے اور سینکڑوں بچے، بوڑھے اور عورتیں آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کوزیٹ اپنے محبوب کی اسی جگہ ولجین سے ملاقات کراتی ہے۔ انسپکٹر جیورٹ سب کچھ دور کھڑا دیکھ رہا ہے، وہ ٹھوس ثبوت تلاش کرنے کی فکر میں ہے تاکہ اپنے بھاگے ہوئے قیدی کو دوبارہ جیل میں ڈال سکے۔ ایک دن پُر یقین ہو کر وہ ولجین کے گھر جاتا ہے، ولجین جیورٹ کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے، خود چھپ جاتا ہے اور کوزیٹ کو اس سے بات کرنے کے لیے کہتا ہے۔ جیورٹ ایک خط دے کر چلا جاتا ہے، جس میں تحریر ہے کہ میں کسی بھی وقت تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔ کوزیٹ اکثر ولجین سے پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے؟ اس سے اس کا رشتہ کیا ہے......؟ اب جب پولیس والا خط دے کر جاتا ہے، کوزیٹ شک میں مبتلا ہوتی ہے، تو ولجین اسے اپنی ساری کہانی سناتا ہے۔ اسے اسکی ماں کا لاکٹ دیتا ہے اور خود عدالت چلا جاتا ہے۔ عدالت میں اس کا کیس سنا جا رہا ہے اور ایک آدمی کو ولجین بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تین قیدی بھی گواہی دیتے ہیں کہ ہاں یہ ولجین ہے جو دو سپاہیوں کو زخمی کر کے جیل سے بھاگا تھا۔ جب اس نقلی ولجین کو سزا ہونے لگتی ہے تو ولجین کھڑا ہو کر کہتا ہے:

''یہ ولجین نہیں ولجین میں ہوں، یہ گواہ جھوٹے ہیں۔''

اور پھر گواہوں کو پہچان کر ان کے جسم پر لگے کچھ نشانات بتلاتا ہے...... عدالت اسے شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیتی ہے، اور ولجین عدالت سے چلا جاتا ہے...... اسی دوران جمہوریت پسند نوجوانوں اور نپولین سوم کے درمیان باقاعدہ لڑائی ہوتی ہے۔ مشتعل نوجوان انسپکٹر جیورٹ کو پکڑ کر لے جاتے ہیں لیکن ولجین اس کی جان بچاتا ہے۔ اس ہنگامے میں کوزیٹ کا محبوب Marius زخمی ہوتا ہے، ولجین اسے اٹھا کر زیر زمین پائپ کے ذریعے بچا کر لے جاتا ہے۔ انسپکٹر جیورٹ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ جب ولجین گھر سے باہر نکلتا ہے تو انسپکٹر اسے اپنی حراست میں لے لیتا ہے۔ ولجین

کہتا ہے:

''...... ٹھیک ہے تم نے مجھے شناخت کر لیا ہے، میں گرفتاری دوں گا، مگر مجھے اتنی مہلت دے دو کہ میں اسے محفوظ مقام پر پہنچا دوں، جہاں اس کا علاج ہو سکے''۔

انسپکٹر جیورٹ اپنے اصولوں کو رد کرتے ہوئے اسے مہلت دے دیتا ہے۔

ولجین Marius کو لے کر اپنے گھر آتا ہے۔ کوزیٹ کے پاس اسے چھوڑتا ہے اور کوزیٹ کو سارے حالات بتا کر خود انسپکٹر جیورٹ کے پاس چلا جاتا ہے، جو دریا کے کنارے کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے...... جیورٹ ولجین سے پوچھتا ہے:

''جب میں انقلابیوں کی قید میں تھا، تو تم نے مجھے مارا کیوں نہیں......؟''

ولجین جواب دیتا ہے: ''اس لیے کہ مجھے تمہاری جان لینے کا کوئی حق نہیں......''

یہاں انسپکٹر جیورٹ کا کردار اچانک بدلتا ہے اور وہ ولجین کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول کر اپنے ہاتھوں میں لگاتا ہے اور دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتا ہے...... اور ولجین کے کانوں میں جیورٹ کی آواز گونجتی ہے کہ جس دن میں نے جذبے کو قانون پر فوقیت دی وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

انسپکٹر جیورٹ کا کردار ایک بھرپور کردار ہے جو نپولین سوم کے عہد کے اندھے قانون کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ جیل سے بھاگے ہوئے ولجین کو گرفتار کرنے پر تلا ہوا ہے اور سالہا سال تک اس کے پیچھے لگا رہتا ہے، جب ولجین اپنی پوری پہچان کے ساتھ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے احسان کے بدلے پہلی بار قانون کی ہتکڑی میں ڈنڈی مارنے کے جرم میں جان کا نذرانہ قانون کی دہلیز پر رکھ دیتا ہے۔ اس نے یہ وعدہ کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ''جان جائے پر وچن نہ جائے'' ہی میں انسانی کردار کی عظمت ہے۔ انسپکٹر جیورٹ اپنے عہد کی پتھر دل پولیس کا نمائندہ کردار ہے اور وکٹر ہیوگو کے لکھے نا قابلِ فراموش اور جاندار کرداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

لامزرا ایبلز دنیا کا اہم ترین ناول ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک یہ ٹالسٹائی کے ''جنگ اور امن'' سے بڑا ناول ہے۔ فرانسیسی ناول نگار بالزاک کی یہی رائے تھی۔ دنیا کی شاید کوئی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ اس ناول کے دو کردار ولجین اور انسپکٹر جیورٹ دونوں عظیم کردار سمجھے جاتے ہیں۔ انسپکٹر اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ قانون اس کے لیے سب کچھ ہے وہ پتھر دل ہے لیکن ہے انسان۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں انسان سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور جب وہ جاگتا ہے تو اندھے قانون سے ہاتھ چھڑا کر وہ انسان بن جاتا ہے لیکن اسے قانون سے انحراف بھی منظور نہیں چنانچہ وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ اس ناول میں وکٹر ہیوگو نے انسانوں کے اندر اُتر کر ان کے باطن میں گردش کرتے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ انسانوں کے سماجی نظام کے ان فرسودہ قوانین کو للکارا ہے جو خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے لوگوں کے اندر جھانک کر دیکھا ہے، یہ ناول انسانی معاشرے کی سب سے بڑی دستاویز ہے۔ یہ ناول نیکی اور بدی کی کہانی ہے۔ سماجی ناانصافیوں کا ایک رزمیہ ہے...... فرانس کے لوگوں کے ذہن میں رینگتے انقلاب کا ایک خواب ہے۔ ایک ایسی کہانی ہے جو کل کی طرح آج بھی زندہ جاوید ہے۔

1200 صفحات کا یہ ناول 1862ء میں چھپا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کی پہلی جلد چھپی جو دیکھتے ہی دیکھتے چند گھنٹوں میں بک گئی اور فرانس کی سماجی زندگی میں ایک طوفان آ گیا اور ہر گھر میں اس ناول کا ہونا ضروری سمجھا گیا۔ اس ہنگامے میں جب کہ ہر طرف اسی ناول کا ذکر چل رہا تھا، کچھ نقادوں اور لکھنے والوں نے اس میں کیڑے نکالنے شروع کیے مثلاً

Flaubert نے کہا:

''اس میں سچائی اور عظمت نام کی کوئی چیز نہیں''

Baudelair نے کہا:

''یہ کیا ہے، کچھ بھی نہیں''

دو ایک اخباری تبصرے ایسے بھی تھے جن میں کہا گیا:

''بدمزہ ہے''۔

لیکن وکٹر ہیوگو اس ناول کی عظمت سے واقف تھا، سب کچھ سن کر مسکراتا رہا۔ اس ناول نے اس کی شہرت کو ملک کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ وہ الیکشن میں کھڑا ہوا تو لوگوں نے اسے قومی اسمبلی کا ممبر منتخب کر لیا اور آج ایک عرصہ گزرنے کے بعد اس کے ناول کے 1200 صفحات کی ایک ایک سطر انسانوں کے مطالعے اور ان کے نفسیاتی مشاہدے کی سند سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ناول نوٹرے ڈیم کا کبڑا اور لامزرا ایبلز دو کنارے ہیں، جس کے درمیان انسانوں کی زندگی کا دریا بہہ رہا ہے اور اس وقت تک بہتا رہے گا جب تک پڑھنے والے موجود ہیں۔

''نوٹرے ڈیم کا کبڑا'' کی طرح ایبلز بھی فلم اور T.V کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ 1907ء سے 2000ء تک اس ناول پر 48 فلمیں بن چکی ہیں۔ ہر زبان میں (T.V) سیریل بنے ہیں اور بے شمار Animated فلمیں بن چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اتنی تعداد میں شاید ہی کسی ناول پر فلمیں اور سیریل بنے ہوں۔ 1200 صفحات کے اس ناول کی ایک ایک سطر سے پڑھنے والے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اُداس ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دکھ درد یوں بھی انسانوں کا پیچھا کرتے ہیں اور پھر فلابیر کی اس بات کو رد کرتے ہیں کہ ''نہ اس ناول میں سچائی ہے اور نہ عظمت''۔

ایملی زولا

(Emile Zola)

وکٹر ہیوگو کے بعد فرانس کا سب سے بڑا ناول نگار، صحافی، مضمون نگار، ظالم قوتوں کا مخالف، سچ اور انصاف کا حامی، مزدوروں کا ہمدرد، بھوک، مفلسی، طوائف، فحاشی، انسانی نفسیات کا عکاس، ناول میں ڈرامائی عناصر شامل کر کے ناول کو موثر شکل دی۔

میں نے ہمیشہ سچ اور انصاف کا ساتھ دیا ہے۔ میری صرف ایک ہی آرزو اور خواہش ہے کہ جو لوگ اندھیرے میں ہیں انہیں روشنی میں لایا جائے۔ جو دکھ میں سانس لے رہے ہیں انہیں خوشی دلائی جائے۔ یہ میری روح کی آواز ہے اگر یہ جرم ہے تو دن کی روشنی میں مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔

(ایملی زولا)

....

میری تحریریں اس رخصت ہونے والے دور کی آئینہ دار ہیں۔ جو شرمندگی اور پاگل پن کا زمانہ تھا۔

(ایملی زولا)

....

''تہذیب اور ثقافت اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگی اور عروج تک نہیں پہنچے گی جب تک آخری چرچ کا آخری پتھر آخری پادری کو ختم نہیں کر دے گا۔''

(ایملی زولا)

ایملی زولا

یہ بات تصدیق شدہ ہے اور تمام عالمی نقاد اس پر متفق بھی ہیں کہ فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو کے بعد فرانس میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول نگار ایملی زولا ہے، فرانسیسی سے دیگر زبانوں میں ترجمے کے بعد پڑھے جانے کا تناسب بھی یہی ہے۔

جب یورپ کا اقتدار اور کلچر اپنے عروج پر تھا تو فرانس کی تیسری جمہوریہ میں ایملی زولا ایک بڑے ناول نگار کی حیثیت سے ابھرا اور اپنے اسلوب بیان سے نام پیدا کیا۔

ایملی زولا نے اپنے عہد کو ایک صحافی کی نظر سے دیکھا مشاہدے اور تجربے سے مواد اکٹھا کیا۔ واقعات اور کرداروں کا ذخیرہ جمع کیا، انہیں ایک منصوبے کی لڑی میں پرویا اور لکھنا شروع کر دیا۔ برسوں تک لکھتا رہا اور پھر تجرباتی اور حقیقی ناولوں کا ڈھیر لگا دیا۔

بالزاک سے کوئی اور متاثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس کا سب سے زیادہ اثر زولا نے قبول کیا۔ زولا بھی بالزاک کی طرح ایک بڑا منصوبہ لے کر لکھنے کے میدان میں اترا۔ بالزاک ''ہیومن کامیڈی'' کا نعرہ لگاتا ہوا آیا۔ 137 ناولوں کا ہدف تھا۔ 91 ناول لکھ کر چلا گیا، ایملی زولا نے بھی اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس کے ذہن میں 20 ناولوں کا منصوبہ تھا جو The Rougon-Maequart کے تحت لکھے گئے۔

ناولوں کی یہ لڑی یا سیریز دراصل ایک خاندان کی سوشل نیچرل بائیوگرافیکل کہانی ہے جس کا آغاز فرانس کی دوسری جمہوریہ میں ہوتا ہے پہلا ناول اس خاندان اور اس کے افراد کا تعارف اور ان کی جذباتی اور رومانوی زندگی اور روزمرہ کی خوشیوں اور دکھوں پر مبنی ہے اور باقی 19 ناول اس خاندان کے افراد اور ان کی اولاد کی کہانیوں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ ایملی خود کہتا ہے:

''میں دراصل ایک خاندان اور انسانوں کے اس چھوٹے سے گروہ کو سوشل سسٹم میں چلتے پھرتے دکھانا چاہتا ہوں اور پھر اس گروہ سے جنم لینے والے بچوں کی زندگی کا احاطہ کرنا چاہتا ہوں اور دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ بڑے ہو کر ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں یا رشتوں کے دھاگے ٹوٹتے ہیں اور وہ بنے ہوئے معاشرتی نظام میں کیسے زندگی گزارتے ہیں میں یہ سب کچھ فکشن کے دائرے میں دکھانا چاہتا ہوں......''

ایملی زولا نے اپنے اس منصوبے پر عمل کیا اور 20 ناولوں کی سیریز مکمل کی جو بہت کامیاب رہی اور قارئین کو نانا، جرمینل، منی اور ہیومن بیسٹ جیسے ناقابل فراموش ناول دیئے۔ زولا کی اس سیریز کے ناول (1893-1871ء) کے درمیانی عرصے کی سیاسی، معاشرتی، سوشل، خاندانی اور جذباتی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔ زولا بہت منہ پھٹ، تلخ مزاج اور سچا لکھاری تھا۔ اس نے مصلحت سے کام لیا نہ اچھے برے حالات سے سمجھوتہ کیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا اس پر کھل کر تنقید کی۔ اس نے ایک بار خود کہا تھا:

''ایک رومانوی مصنف دنیا کو رنگین شیشے سے دیکھتا ہے جبکہ نیچرلسٹ شفاف شیشے سے''۔

زولا ایک نیچرلسٹ تھا چنانچہ اس نے نظری اور فکری طور پر دنیا اور دنیا کے مسائل کو رنگین کی بجائے شفاف شیشے سے دیکھا۔ وہ مذہب، پادری اور نپولین بوناپارٹ کے سخت خلاف تھا، چنانچہ اس نے اپنے ناولوں اور مضامین میں کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ ذرا نپولین کی عہد کے بارے میں اس کا تبصرہ دیکھیں۔

''میری تحریریں اس رخصت ہونے والے عہد کی آئینہ دار ہیں جو شرمندگی اور پاگل پن کا زمانہ تھا۔''

مذہبی لوگوں کے خلاف اپنے ایک مضمون میں وہ کہتا ہے:

''تہذیب اور ثقافت اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگی اور عروج پر نہیں پہنچے گی جب تک آخری چرچ کا آخری پتھر آخری پادری کو ختم نہیں کر دے گا۔''

ایملی زولا 2/اپریل 1840ء کو پیرس میں پیدا ہوا لیکن اس کا بچپن، لڑکپن جوانی کے کچھ سال ایکس۔ این کے صوبے میں گزرے جو اس کے ناولوں میں Plassans کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1858ء میں پیرس آیا۔ باپ اٹلی کا اور ماں فرانس کی تھی۔ 1862ء تک اس نے فرانس کی شہریت نہ لی تھی۔

زولا کا ابتدائی زمانہ بہت غربت میں گزرا۔ بہت سے محکموں میں کلرکی کی۔ آخر کار Therese Raquin نامی اخبار سے منسلک ہوگیا جس سے اسے پیسہ بھی ملا اور شہرت بھی۔ اسی عرصے میں اسے A.G Melley مل گئی جس سے اس نے 1870ء میں شادی کر لی۔ یہ شادی اچھی ثابت نہ ہوئی۔ زولا بچے کا خواہش مند تھا۔ 1888ء تک کوئی بچہ نہ ہوا۔ زولا کی بیوی نے ایک دوشیزہ ملازم رکھ لی، شکل وصورت اچھی تھی۔ زولا نے اسے محبوبہ بنالیا۔ اس پر زولا کے ساتھ اس کی بیوی نے معمولی سا جھگڑا کیا لیکن آخر کار روز روٹ کو زولا کی بیوی نے بچوں سمیت قبول کر لیا۔

زولا نے نیچرلسٹ تحریک کی سربراہی کی اور اپنی کہانیاں موپساں اور دوسرے دو لکھنے والوں کے ساتھ مل کر چھپوائیں اور مسلسل اس تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے کام کرتا رہا۔ زولا 1902ء میں فوت ہوا۔ اس کی موت ایک مستری کی نااہلیت کی وجہ سے ہوئی۔ مستری اس کے بیڈروم کی چمنی ٹھیک کرنے آیا۔ چمنی درست کی لیکن اس کے بند پائپ کو صاف کرنا بھول گیا۔ کوئلوں کی ساری گیس کمرے میں بھر گئی اور زولا صبح تک دم گھٹنے سے مر گیا۔

زولا کی زندگی کا ایک سنسنی خیز واقعہ 1898ء میں ہوا جو اس کی تخلیقی زندگی پر بہت اثر انداز ہوا۔ یہ فرانس کے صدر کے نام ایک کھلا خط تھا جو L.Aurore نامی اخبار کے پہلے صفحے پر چھپا۔ یہ فرانس کی فوجی انتظامیہ کی کرپشن کی نشاندہی تھی۔ اس خط نے فرانسیسیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، دنیا میں بدنامی الگ ہوئی۔ حکومت نے زولا کے اس خط کا سختی سے نوٹس لیا اور اس پر مقدمہ قائم کر دیا۔ عدالت نے زولا کو ایک سال کی سزا سنا دی۔ زولا انگلستان بھاگ گیا اور وہاں جا کر سیاسی پناہ لے لی یہ سارا ہنگامہ ایک یہودی کیپٹن Drey Fus کے بارے میں تھا جسے ایک سازشی جال میں پھنسایا گیا تھا اور زولا نے اس کی مدد کی تھی۔ سال کے بعد جب کیپٹن کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا گیا اور اسے پورے اعزازات سمیت بری کر دیا گیا تو زولا واپس پیرس آ گیا اور اپنی 20 ناولوں کی سیریز پوری کرنے لگا۔

20 ناولوں کی سیریز The Rougon Maequqrt کے سارے ناول تو میں نے نہیں دیکھے۔ چند ناول جو ہاتھ لگے یا میں نے پڑھے وہ ناول زولا کی تخلیقی طاقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں ابھرنے والے کردار ایک ہی خاندان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ناولوں میں کبھی کم اور کبھی دیر تک سامنے رہتے ہیں یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ

ایک ہی کردار کی زندگی کے واقعات ناول کا حصہ بنا لیے گئے ہیں۔ مثلاً چند ناول کچھ اس طرح ہیں:

1- Bram Shop

Gervaise جو ابھی 15 سال ہی کی ہے۔ دو بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ پیرس بھاگ جاتی ہے اور عاشق دو چار مہینوں کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اب اس کا کوئی سہارا نہیں۔ اس کے کچھ خواب ہیں جو وہ پورے کرنا چاہتی ہے اور خواب بہت سیدھے سادے ہیں۔ رہنے کے لئے گھر، بچوں کی خوشحال ماحول میں پرورش اور اپنے بستر پر پُرسکون موت۔ اسے ایک اچھا شریف آدمی Coupeall مل جاتا ہے جس کے ساتھ وہ شادی کر لیتی ہے اور لانڈری کی دکان کھول لیتی ہے، دن خوشحالی سے گزرنے لگتے ہیں لیکن زیادہ دن نہیں۔ ایک دن شراب کے نشے میں اس کا خاوند دکان پر ہی زخمی ہو جاتا ہے۔ زخم موت کا سبب بنتے ہیں اور وہ بچوں سمیت پھر اکیلی رہ جاتی ہے۔

2: Nana

یہ زولا کا بہت مشہور ناول ہے جس کے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ Dramshop کے کردار Gervaise کی بیٹی Nana اپنے گھر کے مفلس زدہ ماحول سے تنگ ہے جب پندرہ سال کی ہوتی ہے تو گھر سے بھاگ جاتی ہے اور طوائف بن جاتی ہے۔ ایک موسیقار سے ملاقات ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے فرانس کی اعلیٰ سوسائٹی اور شرفا کی شمع محفل بنا دیتا ہے۔ نانا بہت مال کماتی ہے لیکن دولت شہرت اسے خوشی نہیں دے سکتی چنانچہ وہ اپنی تباہی کا سبب خود ہی بنتی ہے۔ یہ ناول نانا کی حسین زندگی اور نفسیاتی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ زولا کا ایک شاہکار ناول ہے۔

3: The Land

Jean Macquart فوج سے ڈسچارج ہو کر فرانس کے ایک گاؤں میں جا کر سکونت اختیار کر لیتا ہے وہاں اسے ایک لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی لالچ، المناک صورتحال اور سفارش کی کہانی ہے۔ زولا نے دیہاتی زندگی کی بڑے خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

4: The Masterpiece

Claude Lantier کو بچپن میں مصور بننے کا شوق ہے۔ ایک آدمی اسے حوصلہ دیتا ہے اور وہ ایک ذہین مصور کی صورت میں جوانی میں قدم رکھتا ہے اور پیرس میں نام پیدا کرتا ہے لیکن ورثے میں ملی ہوئی ذہنی بیماری اور نفسیاتی الجھنوں کے سبب وہ محبت، گھریلو زندگی میں سکون سے نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اپنے ''ماسٹر پیس'' کی تکمیل کر سکتا ہے۔

5: The Dream

انجلیک ایک خوبصورت لڑکی ہے لیکن Sidonie کی ناجائز اولاد ہے۔ انجلیک گھر سے فرار ہو جاتی ہے اور عین کرسمس کے دن اس کی ملاقات چرچ کے دروازے پر ایک بے اولاد جوڑے سے ہوتی ہے جو امیروں کے اور چرچ کے لئے مقدس لباس سیتے ہیں۔ وہ انجلیک کو اپنی بیٹی بنا لیتے ہیں۔ انجلیک کپڑے سینے میں ماہر ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے لیکن لڑکے کا باپ شادی پر رضامند نہیں ہوتا۔ حالات میں تبدیلی آتی ہے۔ لڑکے کی ماں مر جاتی ہے اور لڑکے کا باپ پادری بن جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد انجلیک اور لڑکے کی شادی طے پاتی ہے۔ لڑکے کا باپ پادری شادی کی اجازت دے دیتا ہے۔ انجلیک شادی کے بعد اپنے خاوند کا ہاتھ چومتی ہے اور چرچ کی دہلیز پر دم توڑ دیتی

ہے۔ یہ ناول محبت کے راستے میں مذہبی مجبوریوں اور عقیدے کی رکاوٹوں کی کہانی ہے۔

6: The Human Beast

زولا کا یہ ناول بہت منفرد اور عجیب وغریب پلاٹ پر لکھا گیا ہے۔ یہ ایک ٹرین ڈرائیور اور ایکسپریس ٹرین کے انجن کی کہانی ہے۔ ٹرین کا ڈرائیور Jacques Lantier اپنے انجن سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ انجن کے بارے میں اس کے وہی جذبات ہیں جو ایک عاشق کے ایک عورت کے بارے میں ہوسکتے ہیں۔ اس عشق کے دوران ایک عورت Severine آجاتی ہے جو اسٹیشن ماسٹر کی بیوی ہے وہ اسے بہت تنگ کرتی ہے۔ انجن دراصل فرانس کی دوسری جمہوریت کا استعارہ ہے۔ ایک ایسا انجن جو شور وغل مچاتا ہے۔ آگ اگلتا ہے اور تیز رفتاری سے چل رہا ہے۔ اس استعارے کی زد میں آنے والے سب لوگ دیوانے ہیں۔ کوئی جنس زدہ ہے اور کوئی دولت کا دیوانہ ہے۔ اس ناول میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو اپنی بیوی کو بار بار زہر صرف اس لئے دیتا ہے کہ اس کی دولت حاصل کرسکے۔

کہ ان ناولوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ باقی ماندہ ناولوں میں بھی یہی کردار آتے ہیں لیکن واقعات اور کہانی مختلف ہے یا اس خاندان کے دیگر افراد ہیں۔ زولا نے یہ ناول لکھتے وقت، دوسری اور تیسری جمہوریہ کے عہد حکومت کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ان ہی کے پس منظر میں اپنے 20 ناولوں کی سیریز کو مکمل کیا ہے۔ آیئے زولا کے شہرت یافتہ اور سب سے مشہور ناول ''جرمینل'' پر ایک نظر ڈالیں۔

اس ناول میں رونما ہونے والے واقعات 1867ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار Lantier ہے جو Plassans سے پیرس آتا ہے۔ اپنی ماں Gervaise کے بُرے حالات دیکھ کر وہ ایک مکینک بن جاتا ہے۔ ناول کا آغاز ہوتا ہے تو اسے ریلوے کی ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے کیونکہ شراب کے نشے میں اس نے اپنے افسر کی پٹائی کر دی تھی مجبوری اس نے یہ ظاہر کی تھی کہ ''شراب کے دو گھونٹ پی کر جی چاہتا ہے کہ میں کسی سے جھگڑا کروں اس کے بعد میں دونوں کے لئے بیمار ہو جاتا ہوں''۔ نوکری سے فارغ ہو کر وہ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے آخر Montson کے مقام پر اسے کوئلے کی کان میں نوکری مل جاتی ہے۔ ناول 36 ابواب پر مشتمل ہے زولا نے پہلے گیارہ باب اس کان کے ماحول کی تفصیل پر لکھے ہیں جو صرف 24 گھنٹے کے وقت کو ظاہر کرتے ہیں اور ان واقعات کے پس منظر کو ظاہر کرتے ہیں جو آگے چل کر وقوع پذیر ہوں گے۔ زولا نے کوئلے کی کان اور اس میں کام کرنے والے دس ہزار مزدوروں کے بارے میں مکمل تفصیلات بیان کی ہیں جو کسی دوزخ کی تفصیل سے کم نہیں، جہاں انسانوں کے بدن سے ان کی روح کھینچ کر بے رحمی سے باہر نکالی جاتی ہے۔

یہ پورا علاقہ کوئلوں کی طرح سیاہ، بدصورت اور دھوئیں میں گھرا ہوا ہے۔ مزدوروں کے گھر نہایت بدوضع اور مزدوروں سے بھرے ہوئے ہیں کیونکہ Lantier نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے اس لئے اسے ان میں بکھرا عذاب زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے۔ سیلن زدہ گہری تاریک غار میں کام کرنے والے مزدوروں میں جنسی تعلقات کی وبا عام ہے جسے چھپانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

اس ماحول میں ہماری ملاقات Gregoires سے ہوتی ہے جو کان کا ایک حصے دار ہے اور دولت کی بے جا فضول خرچی نے اس کی بیٹی Cecile کو بگاڑ دیا ہے۔ تنخواہوں کا حساب کرنے والا منشی اور اس کا بھتیجا انجینئر Paul Negrel یہ سب اس وقت تک شریف ہیں جب تک ان کی جیب میں ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

کوئلے کی یہ کانیں Jean Bart کمپنی کی ملکیت ہیں جس کا ایک آدمی کرتا دھرتا ہے اس کا نام Deneulin ہے اچھا آدمی ہے اور مزدوروں سے دوسروں کے مقابلے میں اچھا سلوک کرتا ہے۔

''جرمینل'' میں مزدوروں کی ہڑتال اور اس ہڑتال سے رونما ہونے والی تباہی اہم واقعات ہیں ہڑتال Pluchart نامی آدمی کے نظریات سے شروع ہوتی ہے جو مارکسی ہے اور پہلی بین الاقوامی تحریک کا ممبر ہے۔ ناول کا مرکزی کردار Lantier بھی اس سیاسی ہنگامے میں شریک ہوتا ہے اور ایک شراب خانے میں اس کی ملاقات Rasseneur سے ہوتی ہے جسے سوشلسٹ نظریات کی بنا پر نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ Lantier چیزوں کو جاننے کا دعویدار ہے لیکن وہ جانتا نہیں، اس کے باوجود وہ مزدوروں کا بلا مقابلہ لیڈر بن جاتا ہے چنانچہ ہڑتال شروع ہوتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے پیدا ہونے والی تباہی اور تشدد کو کنٹرول نہیں کرسکتا یہ ہڑتال فرانس کی صنعت پر بڑے اثرات مرتب کرتی ہے۔

کان کی انتظامیہ کوئلے کی فروخت بند کر دیتی ہے اور کارکنوں کی مزدوری میں کمی شروع ہو جاتی ہے انہیں صرف اس کوئلے کی مقدار پر حصہ ملتا ہے جو وہ نکال کر کان سے لاتے ہیں لندن سے آنے والے فنڈز بند ہو جاتے ہیں مالکان بلغاریہ سے مزدور منگوانے کی تجویز پر غور کرتے ہیں نیز Jean Bart کے ایک پرائیویٹ شعبے سے مزدور لانے کی تجویز بھی سامنے آتی ہے اس شعبے کے مزدوروں نے ہڑتال نہیں کی اس مشکل صورت حال میں ایک Twist یہ آتا ہے کہ Lantier ایک مزدور Maheu کے چھوٹے سے گھر میں رہنا شروع کر دیتا ہے جہاں Maheu اپنی بیوی باپ اور سات بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔ Maheu کی 15 سالہ بیٹی کیتھرین کی Lantier سے دوستی ہو جاتی ہے لیکن اسے ایک ظالم اور کمینے آدمی Chawal کی داشتہ بننا پڑتا ہے۔ Chawal اسے مارتا ہے گالیاں دیتا ہے اور اس کی تذلیل کرتا ہے اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے چلی جاتی ہے Lantier کے سوشلسٹ نظریات Chawal کے دل میں اور نفرت پیدا کر دیتے ہیں۔

ہڑتال میں ایک دراڑ پیدا ہوتی ہے کچھ مزدور انتظامیہ سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہوتے ہیں مخالف گروپ ان کا راستہ روکتا ہے۔ فوج بلوائی جاتی ہے گولی چلتی ہے اور بہت سے مزدور مارے جاتے ہیں جن میں کیتھرین کا باپ اور بہن بھائی بھی شامل ہیں۔ Lantier کی مقبولیت کم ہوتی ہے اور اس پر پتھر برسائے جاتے ہیں وہ ایک مزدور کے گھر میں پناہ لیتا ہے۔

ہڑتال ناکام ہوتی ہے ایک انجینئر Souvarine جو ہڑتال میں شریک نہیں تھا ہڑتال کے خاتمے کے بعد وہ کان کے سارے سسٹم کو تباہ کرنے کا اور غار میں پانی چھوڑنے کا منصوبہ بناتا ہے تاکہ کان اور مزدور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں چنانچہ جب مزدور کان میں داخل ہو جاتے ہیں جن میں کیتھرین اس کا خاوند Chawal اور Lantier بھی شامل ہیں تو Souvarie انجینئر پانی کے دروازے کھول دیتا ہے اور غار میں کیتھرین اس کا خاوند اور Lantier پھنس جاتے ہیں Lantier اس صورتحال میں جب سب پانی میں ڈوب رہے ہیں کیتھرین کے خاوند کو مار دیتا ہے Lantier کیتھرین کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرتا ہے ایک گھنٹے کے بعد وہ بھی مرجاتی ہے۔ Lantier کو بچا لیا جاتا ہے وہ چھ ہفتے ہسپتال میں گزارتا ہے اور پھر وہیں واپس چلا جاتا ہے جہاں وہ نوکری سے نکالا گیا تھا، اور ناول اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ''جرمینل'' زولا کا سب سے مشہور ناول ہے اور غالباً ناولوں کی سیریز میں اسے بڑا ناول مانا گیا ہے۔ زولا نے سوشل، معاشی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں کرداروں کی جدوجہد دکھائی ہے۔ مزدوروں کی اس کشمکش میں زولا نے ایک المیہ محبت کی

داستان چھیڑی ہے جو حسد، کمینگی اور درندگی کے جذبات کے ہاتھوں اپنے انجام تک پہنچتی ہے۔ ایمل زولا نے اس ناول میں مزدوروں کی مشکلات اور ان مشکلات کے حل کی طرف اشارے بھی کیئے ہیں جن پر آنے والے وقت میں حکومت نے عمل بھی کیا۔ مزدور کلاس ایمل زولا کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ جب زولا کا جنازہ اٹھایا گیا تو مزدوروں کی ایک کثیر تعداد جنازے میں شامل تھی۔ جب تابوت قبر میں اتارا گیا تو سب مزدوروں نے سر سے ٹوپیاں اتار کر ''جرمینل، جرمنیل'' کے نعرے لگائے۔

یہ ناول لکھنے سے پہلے زولا ایک مدت تک کوئلے کی کانوں کا دورہ کرتا رہا اور کانوں کے اندر ہونے والے کاموں کو غور سے دیکھ کر نوٹس لیتا رہا، ہڑتال کو حقیقی رنگ دینے کے لئے وہ Anzin گیا جہاں ایک بڑی ہڑتال چند دنوں سے چل رہی تھی۔ اس نے اس کی تفصیل ذہن میں رکھی اور ناول میں شامل کی۔ پولیس کا تشدد ہجوم کی ہنگامہ آرائی۔ ان سب چیزوں کو اس نے ناول میں شامل کر کے ڈرامائی عناصر میں ملا کر مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

نقادوں کا کہنا ہے کہ اس ناول میں زولا نے کرداروں سے زیادہ Mass Action پر توجہ دی ہے اور ایسے مناظر پیش کیئے ہیں جن میں ہجوم میں شامل مشتعل افراد کو پیش کیا ہے۔ مثلاً اس بڑھیا کا ردعمل جب وہ دکاندار پر جھپٹتی ہے اور پھر گلی گلی بانس پر اس کے ''مردانہ پن'' کی تذلیل کرتی پھرتی ہے۔

اس ناول کا ایک منظر اور دو کردار بہت اہمیت کے حامل ہیں اور نقاد اس منظر کو زولا کے قلم کا شاہکار قرار دیتے ہیں ایک مزدور Maigrat پہلے کان میں کام کرتا تھا لیکن ایک افسر کی مدد سے وہ دکانداری شروع کر دیتا ہے مزدوروں کو ادھار دیتا ہے اور مزدوروں کی بیٹیوں اور بیویوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔ جب ہڑتال عروج پر آتی ہے تو ایک گروہ اس کی دکان کا گھیراؤ کر لیتا ہے اور پتھر مار مار کر اسے مار دیتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت مشتعل ہو کر آگے بڑھتی ہے اور اس کا نشان مردانگی کاٹ کر بانس پر ٹانک لیتی ہے اور گلیوں میں لے کر پھرتی اور گالیاں دیتی ہے۔ زولا دراصل یہ سب کچھ لکھتے وقت شاید انسان کی بے بسی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا اور انسان کی درندگی کی عکاسی کرنا چاہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود زولا کا طرز تحریر قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے دنیا میں بسنے والے لوگوں کو رنگین لینز سے نہیں دیکھا۔ شفاف لینز سے دیکھا ہے جس میں سے چیزیں بالکل ویسی نظر آتی ہیں، جیسی وہ ہیں۔

ایملی زولا کی اہم ترین ادبی صفت اس کے ناولوں کی فضا، پس منظر اور موضوع کا انتخاب ہے۔ زولا سے پہلے زولا کے عہد میں ناولوں کی فضا، ماحول اور پس منظر پیرس کے امرا تھے۔ زولا نے اس روایت کو توڑا اور اپنے موضوعات ورکنگ کلاس اور مزدوروں کی دنیا سے ڈھونڈے۔ تاریک کوٹھڑیوں اور ملوں کی دھواں دار فضا سے اپنے کردار تلاش کیے۔ اس کی سیریز کے بیشتر ناول انہی موضوعات کے پلاٹ پر مبنی ہیں۔ دکاندار، سٹور، فیکٹری کے مزدور، دفتر کے ماحول میں کام کرنے والے کلرک۔ زولا نے ان کرداروں اور ان کی زندگی کے مخفی پہلوؤں کو بقول ایک نقاد Clinical (description) قاری کے سامنے پیش کی۔ اس معاشی طور پر پسے ہوئے طبقے کے ناگفتہ بہ گھریلو حالات، بھوک، مفلسی اور شراب کی لت، جنس زدہ ذہنیت اور ان کی مشتعل فطرت۔ یہ سب کچھ زولا کے ناولوں میں ملتا ہے۔ ایسی زبان جو ان کی اندورنی فطرت کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ فرانس کے ماحول میں طوائف اور فحاشی کا بڑھتا ہوا رجحان جو صنعتی انقلاب کے بعد تیزی سے سوسائٹی میں اپنی جڑیں پکڑ رہا تھا۔ ان تمام چیزوں کی عکاسی زولا اپنا تخلیقی فرض سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

''اگر تم مجھ سے پوچھو کہ میں دنیا میں کیوں آیا ہوں؟ تو میں کہوں گا میں ایک فنکار ہوں اور میرا کام اونچی آواز میں بات کرنا ہے۔''

زولا نے ہمیشہ سچائی اور انصاف کے حق میں آواز اٹھائی اور مخالف قوتوں سے مقابلہ کیا۔

''میں نے ہمیشہ سچ اور انصاف کا ساتھ دیا ہے۔ میری صرف ایک ہی آرزو اور خواہش یہ ہے کہ جو لوگ اندھیرے میں جی رہے ہیں انہیں روشنی میں لایا جائے۔ جو دکھ میں سانس لے رہے ہیں انہیں خوشی دلائی جائے۔ یہ میری روح کی آواز ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو دن کی روشنی میں میرے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔''

فرانس کی حکومت کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس پر مقدمہ چلا لیکن جب سچائی سامنے آئی تو حکومت کو ہار ماننا پڑی۔ لیکن حکومت نے اندر ہی اندر زولا کو سزا دی۔ اس سزا کا انکشاف دس سال بعد ہوا۔ دس سال بعد زولا کے گھر کی چمنی ٹھیک کرنے والے مستری نے اس راز سے پردہ اٹھایا اور کہا کہ سیاسی وجوہات پر میں نے ہی زولا کے گھر کی چمنی کو بند کیا تھا۔ جس سے گیس زولا کے کمرے میں بھر گئی تھی اور زولا کی موت واقع ہوئی تھی۔

مستری، فرانس کی حکومت اور کمرے میں بھری ہوئی گیس، تینوں نے مل کر زولا کو مار دیا لیکن وہ اس سچائی کا گلہ نہ گھونٹ سکے جو صدیوں سے چل رہی ہے اور چلتی رہے گی زولا اس کے بارے میں خود کہہ گیا تھا:

" The Truth is on march and nothing will stop it "

ستاں دال

(Stendhal)

18 ویں صدی کا مقبول ناول نگار، جس نے کرداروں کے اندر اتر کر نفسیاتی الجھنیں سلجھائیں، اس کے ناول ناانصافیوں، انسانی نفسیات، احساسات اور گہرے مشاہدے کی بہترین مثال ہیں۔

میں نے اسے کبھی فارغ نہیں دیکھا، جب دیکھا کسی عورت کے عشق میں مبتلا دیکھا۔

(ستاں دال کے دوست کا بیان)

....

مجھے عام لوگوں سے پیار ہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا بہت تکلیف دہ ہے۔

(ستاں دال)

....

''جیل خانے کی کوٹھری کی بدبو نا قابل برداشت تھی لیکن پھانسی والے دن چمکتے سورج نے اس کا استقبال کیا۔ جولین بہت خوش اور حوصلہ مند تھا۔ کھلی فضا میں وہ یوں چل رہا تھا جیسے کوئی ملاح سمندر میں سفر کرنے کے بعد جزیرے کی کھلی فضا میں سیر کر رہا ہو۔ اس کا ذہن خوبصورت یادوں سے بھرا تھا۔ اس نے تن کر اپنے آپ سے کہا۔ ''میں اب بھی حوصلہ مند اور باہمت ہوں۔''

(سرخ وسیاہ سے)

....

''وہ دو مقصد لے کر پیدا ہوا تھا۔ بڑا ڈرامہ نویس بننا اور عورتوں سے عشق کرنا۔''

ستاں دال

فرانسیسی ادب کے نامور لکھنے والوں میں یوں تو سب کا مزاج شروع ہی سے عاشقانہ تھا مگر بالزاک اور ستاں دال نے میدانِ عشق میں کچھ زیادہ ہی ناموری کمائی۔ بالزاک کو اخراجات پورے کرنے کے لیے ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی تھی چنانچہ وہ کسی مال دار عورت سے عشق کرتا اور پھر اس سے قرض لیتا۔ اس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ عشق کیے اور بیک وقت دو دو عورتوں سے عشق کیے تاکہ ایک سے قرض لے کر دوسری کا قرض چکا سکے۔ ستاں دال نے قرض لینے کی مصیبت تو نہ پالی مگر عشق کرنے میں وہ بالزاک سے کسی صورت میں پیچھے نہیں تھا۔ بے شمار عورتوں سے عشق کیے بقول اس کے ایک دوست ''میں نے اسے کبھی فارغ نہیں دیکھا۔ جب ملا کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہی ملا۔''

ستاں دال دو مقاصد لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کا پہلا مقصد ایک بڑا ڈراما نویس بننا تھا۔ اس کے لیے اس نے پیرس آ کر بہت ڈرامے دیکھے۔ ہر تھیٹر میں گیا۔ بہت شوق سے ڈرامے دیکھے اور پڑھے مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور وہ بڑا ڈراما نگار نہ بن سکا۔ اس کا دوسرا مقصد محبت کرنا، عورتوں کو جذباتی جال میں پھنسانا تھا۔ اس کے لیے اس نے بڑی محنت کی، کبھی کامیاب ہوا، کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ محبت کے رموز و اسرار جاننے کے لیے اس نے بڑا (Home Work) کیا۔ دوستوں کو خط لکھ کر عورتوں کو رام کرنے کے طریقے دریافت کیے۔ ان سے مشورے لیے لیکن عمل اپنے ہی مشورے پر کیا اور وہ تھا ''حملہ آور ہونا'' (Attack, Attack) اس پر اس نے کئی بار عمل کیا، لیکن کبھی کبھی اسے منہ کی کھانا پڑی، اس کے سارے معاشقے شادی شدہ عورتوں سے تھے اور عورتیں بھی وہ جن کا پیرس کی سوسائٹی میں ایک مقام تھا اور جن کی سوشل حیثیت تھی اور مال و دولت رکھنے والی عورتیں تھیں، اس کے بائیوگرافر میتھیو جوزف سن (Mattew Josphson) نے اپنی کتاب Stendhal , or the Pursuit of Happiness میں ان دلچسپ معاشقوں کا ذکر بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔

ستاں دال 1783ء میں (Grendble) کے ایک خوشحال وکیل کے گھر پیدا ہوا۔ گھر والوں نے نام ہنری بائیل (Henri Beyle) رکھا مگر وہ ستاں دال کے قلمی نام سے لکھنے لگا۔ 7 سال کی عمر میں اس کی ماں مر گئی اور اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری اس کے باپ اور پھوپھی نے سنبھال لی۔ ستاں دال دونوں سے ناخوش تھا اور ساری زندگی ان کے بُرے سلوک کے گلے شکوے کرتا رہا۔ اسے اپنے پادری ٹیچر سے نفرت تھی۔ باپ سے گلہ تھا کہ وہ اسے وہ کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا جو اس کے باپ کی نظر میں بچوں کے پڑھنے کے لیے مفید نہ تھیں۔ دوسرے بچوں سے اسے کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی پھوپھی بہت سخت عورت تھی۔ بقول ستاں دال 'غصہ ہر وقت اس کے ناک پر بیٹھا رہتا تھا''۔

اس کا چچا نپولین بونا پارٹ کی فوج میں ملازم تھا۔ سارا خاندان شاہی خاندان کا حامی تھا لیکن بچپن ہی سے ستاں دال کے خیالات عوامی اور ری پبلکین تھے۔ وہ گیارہ سال کی عمر میں ہی گھر سے چوری چوری بھاگ کر ان کی خفیہ میٹنگوں میں چلا جاتا تھا۔ ستاں دال کا تعلق قدرے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن عوامی خیالات ہونے کے باوجود وہ عوام اور عام

لوگوں سے میل جول رکھنے میں کتراتا تھا۔ وہ خود کہتا تھا'' مجھے عام لوگوں سے پیار ہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا بہت تکلیف دہ ہے۔''

جب وہ 16 سال کا ہو گیا تو اس نے باپ سے اجازت مانگی کہ وہ پیرس جانا چاہتا ہے تا کہ فوج میں نوکری تلاش کر سکے۔ باپ نے اسے موسیو (Daru) کے نام خط دیا۔ جس کے دو بیٹے فوج میں تھے۔ چنانچہ بڑے بیٹے پیری (Pierre) کی وساطت سے اسے فوج میں کلرکی کا کام مل گیا۔ جب نپولین دوسری بار اٹلی پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔ پیری نے اسے فوج میں کمیشن دلوایا تو اس نے عملی طور پر میدان جنگ میں جانے سے پہلو تہی کی اور چھٹی لے کر گھر آیا اور پھر نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے تین مہینے گھر گزارے اور پھر پیرس چلا گیا اور اپنے دونوں مقاصد کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پیری کے چھوٹے بھائی کے ساتھ عشق کے میدان میں کسی غیر متوقع فتح کے لیے عورتوں کے حماموں کے چکر کاٹنے لگا۔ جہاں ''انقلاب پسند'' خاوندوں کی بیویاں آتی جاتی تھیں۔ یہاں اس کی ملاقات ایک تھیٹر کی اداکارہ میلینی گلبرٹ(Melanie Guilbert) سے ہوئی کچھ عرصہ سلسلہ چلا مگر پھر ستاں دال نے اس سے اس بنا پر کنارہ کشی کی کہ بقول ستاں دال وہ ذہنی اور روحانی طور پر اس کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اصل میں ستاں دال تھا تو ایک عوامی آدمی اور ری پبلک فکر سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کا مزاج رئیسانہ تھا۔ ایک بار پھر اسے مارشل (Daru) کی معرفت فوج میں نوکری مل گئی۔ معقول تنخواہ ملتی تھی۔ دو گھوڑوں کی بگھی تھی، دو نوکر ملے، عشق کرنے کے لیے اس نے اس بار کاؤنٹس (Daru) کا انتخاب کیا۔ ستاں دال شکل وصورت، جسمانی ساخت کے اعتبار سے بے حد بھدا اور معمولی آدمی تھا۔ بقول میتھیو جوزف سن......

He was Somewhat undersized , an ugly Plump young man with A Big Body and Short Legs. A Large Head and a Mass of Black Hair, his mouth was thin his nose thick and Prominent."

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک بڑے عاشق کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کاؤنٹس (Daru) سے اظہار عشق کا فیصلہ کر لیا۔ اسے کاؤنٹس کے دیہاتی محل میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ ٹھہرنے کا موقع ملا۔ کھانے کے بعد سب مہمان لان میں ٹہل رہے تھے۔ ستاں دال اور کاؤنٹس آگے آگے تھے۔ دوسرے مہمان کچھ فاصلے پر پیچھے۔ ستاں دال نے موقع غنیمت جانا اور کاؤنٹس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا اور کہا۔

''میں آپ سے شدید محبت کرتا ہوں، 18 ماہ سے یہ آگ میرے اندر جل رہی ہے۔ میں نے چھپانے کی بہت کوشش کی مگر آج ضبط کی تمام حدیں ٹوٹ گئی ہیں۔''

کاؤنٹس نے مسکرا کر بہت نرمی سے اس کا حال دل سنا اور کہا ''تم میرے دوست تو بن سکتے ہو مگر عاشق بالکل نہیں، میں اپنے خاوند سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔'' کاؤنٹس (Daru) نے ہاتھ جھٹکا تو ستاں دال چھٹی لے کر میلان چلا گیا۔ دس سال پہلے اس کی ملاقات یہاں ایک خوبصورت عورت جینا(Gina) سے ہوئی تھی وہ اس کے افسر کی داشتہ تھی۔ ستاں دال اس زمانے میں اس سے رسم وراہ نہ بڑھا سکا کیونکہ اس کا عہدہ بہت معمولی تھا لیکن اب اس کی حیثیت افسروں جیسی تھی اور جیب میں چار پیسے بھی تھے۔

جینا (Gina) ایک دکاندار کی بیٹی تھی۔ ایک کرک کی بیوی اگر چہ وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی اور بیٹے کی عمر 16 سال تھی لیکن ستاں دال کی نظر میں اب بھی وہ قیامت تھی۔

جینا(Gina) دس سال بعد ستاں دال سے ملی تو کہا ''میرا خاوند تم پر شک کرتا ہے۔ میلان میں ملنا جلنا ممکن نہیں۔ وینس چلتے ہیں۔'' چنانچہ جینا اپنی ماں، اپنے بیٹے اور ایک (Banker) کو ساتھ لے کر اس کے ساتھ وینس چلی گئی۔ اس قافلے کا سارا خرچہ ستاں دال کے ذمے تھا۔ وینس میں ستاں دال الگ ہوٹل میں ٹھہرا، جینا یہاں بھی اسے چوری چوری ملنے آتی تھی۔ 18 جون 1815ء کو نپولین کو واٹرلو(Water Loo) میں شکست ہوئی۔ وہ سارا دن ستاں دال نے جینا کے کمرے میں گزارا۔ ایک عرصے کے بعد ستاں دال نے اس سارے قصے کو بیان کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''دراصل مجھے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ جینا نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ وہ مجھے اور Banker کو بیک وقت خوش کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے اور Banker کو ساتھ والے کمرے میں خوشی کا اظہار کرتے دیکھ لیا تھا۔ بہر حال ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' اور میں نے جینا سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔''

جینا سے بھاگ کر ستاں دال نے 36 سال کی عمر میں ایک پولینڈ کے فوجی افسر کی بیوی سے عشق شروع کیا جو اپنے دو بچوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ خاوند کو چھوڑ دیا تھا۔ ستاں دال اس خلا کو پُر کرنا چاہتا تھا۔ 5 مہینے کی ملاقاتوں کے بعد ستاں دال نے اظہار عشق کیا تو اس نے ستاں دال کو گھر سے نکال دیا۔ لیکن ستاں دال نے ہمت نہ ہاری اور اسے خط لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیئے لیکن ستاں دال کی دال نہ گلی اور اس کی محبوبہ خط پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کرتی تمام بند لفافے ستاں دال کو واپس کر دیئے اور ساتھ ایک خط بھی لکھ دیا جس میں یہ تحریر تھی۔

''خبردار! اگر مجھے دوبارہ خط لکھا، اب تمہاری طرف سے مجھے کوئی خط نہیں آنا چاہیے۔''

یہ خط پڑھ کر وہ پیرس آ گیا اور 9 سال دوستوں سے گپیں ہانکتا رہا۔ عورتوں کے حماموں کے چکر کاٹتا رہا۔ آوارہ گردی کرتا رہا۔ ستاں دال باتیں بہت خوبصورت کرتا تھا۔ اس کا انداز بہت دلکش اور دلچسپ تھا۔ سننے والا اسکی حس مزاح سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ کلیمن ٹائن (کاؤنٹس ڈی کاریل) اسی سحر میں آ گئی۔ چند ملاقاتوں کے بعد کاؤنٹس سے اس نے اظہار عشق کر دیا۔ 2 سال اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان دو سالوں میں ستاں دال نے اسے 215 عشقیہ خطوط لکھے۔ اس کے خاوند کے خوف سے ستاں دال اسے ہمیشہ رات کے اندھیرے میں ملتا تھا۔ ایک رات اس سے ملنے گیا اچانک کاؤنٹس کا خاوند آ گیا۔ دونوں گھبرا گئے۔ کاؤنٹس نے ایک سیڑھی کے ذریعے ستاں دال کو تہہ خانے میں اتار دیا اور خود خاوند کی آؤ بھگت کرنے لگی، ستاں دال یہاں تین دن قید رہا، تین دن کی یہ قید ستاں دال کو بہت اچھی لگی۔ تین دن کے بعد کاؤنٹس کا خاوند گھر سے باہر گیا تو ستاں دال کو رہائی ملی۔ دس سال بعد جب اس نے کاؤنٹس سے دوبارہ رابطہ کرنا چاہا تو اس نے بڑی عقل مندی سے جواب دیا:

" One Cannot Light an Extinct Fire with Embers."

اسی دوران اسے دل کا دورہ پڑا لیکن وہ پیرس کی مصروف زندگی میں گھومتا پھرتا رہا۔ 1842ء میں وزارت خارجہ کے ایک کھانے سے رات کو واپس آ رہا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا۔ لوگوں نے اٹھا کر اسے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا۔ ایک دوست نے اچانک اسے پہچانا اور گھر پہنچا دیا۔ دوسرے دن ستاں دال فوت ہو گیا۔ کہتے ہیں اس کے جنازے کے ساتھ صرف 3 آدمی تھے۔

ہرمن میلول کی طرح ستاں دال وہ بدنصیب ناول نگار ہے جسے اپنی زندگی میں مقبولیت نصیب نہیں ہوئی نہ اس نے کبھی یہ سوچا کہ وہ ایک بڑے ناول نگار کی صورت میں پہچانا جائے۔ نہ ہی نقادوں نے اس کی تحریروں کو اہمیت دی اور نہ ہی قارئین نے اسے داد وتحسین سے نوازا۔اس کی ناقدری کا یہ عالم تھا کہ گیارہ سال کے طویل عرصے میں اس کے ناول (Armance) کی طرف سترہ کاپیاں فروخت ہوسکیں لیکن وہ اس سے آزردہ نہیں ہوا۔ اسے اپنی پہچان کرانے میں 1900ء تک انتظار کرنا پڑا۔

ستاں دال دراصل لکھنے کے لیے کوئی بڑا مقصد لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔اسے تو دراصل محبت کے کھیل کھیلنے کا جنون تھا اور بڑا ڈراما نگار بننے کی دھن اس کے سر پر سوار تھی۔ستاں دال نے بہت لکھا لیکن سب کچھ اپنے بارے میں لکھا۔سفر نامے لکھے، خط لکھے، 500 صفحات کی اپنی زندگی کی تفصیل لکھی اور اس میں سچ بولنے کی انتہا کردی۔

جب ستاں دال مرا تو پیرس کے صرف دو اخباروں نے چھوٹی سی خبر دی۔ تین آدمی جنازے کے ساتھ گئے۔ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ستاں دال کو فراموش کرنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ستاں دال کے ابتدائی کام پر مشہور نقاد سینٹ بیو(Sainte Beuve) نے دو ایک مضمون لکھے اس کے ناولوں کے بارے میں بات نہیں کی اگر کی تو یہی کہ ناول کے کردار کٹھ پتلیاں ہیں ان کی تشکیل میں لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے۔اس کے ناول The Charter House of Parma پر بالزاک،(Balzac) نے دو مضامین لکھے۔جن میں ستاں دال کی فنی صلاحیتوں کو بے حد سراہا گیا لیکن ان مضامین کی اہمیت کو بھی یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کی گئی کہ بالزاک نے ستاں دال سے تین ہزار فرانک ادھار لئے تھے چنانچہ اس احسان کے بدلے میں یہ مضامین لکھے گئے ہیں۔(ستاں دال کے مرنے کے بعد اس کے کاغذات سے ایک چٹ برآمد ہوئی تھی جس پر تحریر تھا کہ ستاں دال نے 3 ہزار فرانک ادھار دیئے ہیں)۔یہ ساری باتیں اپنی جگہ مگر ستاں دال کی اپنی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ستاں دال نے(Armance) کی پذیرائی نہ ہونے پر کہا تھا میری تحریروں کو سمجھنے کے لیے قارئین کو 1880ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔

1880-1900ء کے دوران ایک گمنام پروفیسر نے ستاں دال کے فن پر اپنے طالب علموں کو ایک بھرپور لیکچر دیا اور اس کے ناولوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ستاں دال فرانس کا عظیم ناول نگار ہے مگر افسوس اسے پڑھا نہیں گیا۔اس کے طالب علموں میں ایک طالب علم ایسا بھی تھا جس نے بعد میں ایک نقاد کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔اس کا نام ٹین تھا۔ٹین نے ستاں دال کے ناولوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور اسے انسانی نفسیات کا سب سے بڑا پارکھ قرار دیا۔اسے ایک ایسا ناول نگار قرار دیا جس نے انسانوں کے اندر اتر کر انسانوں کی الجھی نفسیات کے دھاگے سلجھائے اور نفسیاتی کشمکش کو نیچرل انداز میں بیان کیا۔ٹین کے بعد بے شمار نقادوں نے ستاں دال کی طرف توجہ دی اور ستاں دال عالمی شہرت اختیار کر گیا۔ٹین(Tain) نے ستاں دال کو فرانسیسی ادب کے تین بڑے ناول نگاروں میں سے ایک قرار دیا ہے اور بھی یہ بات درست ہے۔

ستاں دال کا پہلا ناول(Armance) تھا جس کی گیارہ سال کے عرصے میں صرف سترہ کاپیاں فروخت ہوئیں۔اس ناول کا پلاٹ اور مرکزی خیال ستاں دال نے اپنے زمانے کے ایک مصنف Henri de Latovche کے ناول سے لیا تھا۔پہلے ہیرو کا نام بھی وہی رکھا اپنی طرف سے ستاں دال نے نفسیاتی حقیقت پسندی کا عنصر شامل کر دیا۔اس کی دیگر تصانیف میں۔

1) Abbess of Castro

2) Memories of a Tourist

3) The Life of Henri Brulard

اور افسانوں کی ایک کتاب ہے۔اس کے مقبول ترین ناول دو ہیں۔

1) The Charter house of Parma

2) Scarlet and Black.

ستاں دال نے اٹلی کے قیام کے دوران مصوری پر کتاب لکھی اور موسیقی پر بھی ایک کتاب لکھی۔اس کی اہم ترین کتاب (On Love) محبت کے فلسفے پر لکھی ایک اہم دستاویز ہے۔جس میں محبت کی اقسام اور انسانی نفسیات کا بھرپور مشاہدہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔سائمن ڈی بوار(Saimon de Beauvoir) نے اپنی کتاب(The Second Sex) میں ستاں دال کی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ستاں دال کا ناول Scarlet and Black دنیا کے بڑے ناولوں میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔بالزاک اور زولا نے اسے اسلوب کی بنا پر نیچرلزم کا امام قرار دیا ہے اور نفسیاتی حقیقت نگاری کا سب سے بڑا ناول نگار کہا ہے۔

سرخ وسیاہ، معاشرتی ناانصافیوں، احساسات اور انسانی نفسیات کے گہرے مشاہدے اور پھر اس مشاہدے کی تصویر کشی کا بہترین نمونہ ہے۔''سرخ وسیاہ'' کا مرکزی خیال ستاں دال نے پولیس رپورٹوں اور ایک عدالت میں چلنے والے مقدمے سے اٹھایا جن دنوں ستاں دال ناول لکھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا ان دنوں عدالت میں ایک مقدمہ زیرسماعت تھا۔انتونی(Antoine Bewrthet) نامی ایک نوجوان پادری اتالیق بن کر(M.Michoud) کے گھر میں جاتا ہے اور اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جس کی پاداش میں اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔وہ دوبارہ دینی تعلیمات جاری رکھنا چاہتا ہے لیکن کوئی چرچ اسے اس کے غیر اخلاقی جرم کی بنا پر داخلہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔غصے میں آکر وہ میڈم(M.Michoud) پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے اور اس جرم میں پھانسی کی سزا دے دی جاتی ہے۔یہ پلاٹ تھا جس کو بنیاد بنا کر ستاں دال نے اپنے ناول کی خوبصورت عمارت تعمیر کی۔ستاں دال نے Antoine کے ردِعمل کو فطری انداز میں لیا۔نوجوان پادری کا جرم سوسائٹی کے خلاف شدید ردِعمل تھا۔ستاں دال ناول میں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ فرانسیسیوں میں اب اس اخلاقی اقدار کا فقدان ہے ضبط وصبر کا وہ جذبہ مفقود ہے جو کبھی ان کی فطرت میں موجود تھا۔کبھی لوگ محبت میں جان دے دیتے تھے۔لوگ غصے کی آگ میں جلتے رہتے تھے اور پھر انتقام لے کر اس آگ کو بجھاتے تھے۔یہی اصل رومانویت تھی۔اسی وجہ سے فرانس کی سرزمین کو(Love and Hate) کی سرزمین کہا جاتا تھا۔

ستاں دال نے اپنے ناول کا ہیرو جولین سوریل نچلی کلاس سے منتخب کیا ہے۔وہ ایک ترکھان کا بیٹا ہے۔گاؤں کا پادری جولین کی ذہانت سے بہت متاثر ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جولین سوسائٹی میں نام پیدا کرے۔ستاں دال نے متوسط طبقے کے اس کردار میں اعلیٰ سوسائٹی کی ساری ذہانت بھر دی ہے۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ستاں دال نے جولین میں اپنی ساری خصوصیات سمو دی ہیں۔

جولین سوریل 18,19 سال کا قابل قبول نقش ونگار رکھنے والا نوجوان تھا، سیاہ آنکھیں، کالے بال، وہ خوبصورت نہیں تھا مگر قبول صورت تھا۔حساس تھا، خوبصورت باتیں کرتا تھا۔حوصلہ مند تھا، بقول میتھیو جوزف سن

"He gave him his own astonishing sensitiveness calculating brain and vinity."

بڑے پادری کی سفارش پر جولین کو شہر کے میئر کے گھر بچوں کو پڑھانے کی نوکری مل جاتی ہے۔ میئر کی بیوی ''میڈم ڈی رینال'' جوان ہے میئر شکی مزاج آدمی ہے۔ وہ قدم قدم پر اسے نظر انداز کرتا ہے اور ذلت آمیز سلوک کرتا ہے۔ جولین چند دنوں میں جان لیتا ہے کہ میئر کے تعلقات بیوی سے اچھے نہیں۔ چنانچہ جولین میڈم ڈی رینال سے ہمدردی جتلانے لگتا ہے اور پھر اس سے شدید محبت کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میڈم ڈی رینال بھی اس محبت کا مثبت جواب دیتی ہے۔

میڈم ڈی رینال خوبصورت، ذہین عورت ہے، باوجود خوف اور ہچکچاہٹ وہ جولین سے شدید محبت کرتی ہے۔ ستاں دال نے ہنرمندی سے اس کردار کی تشکیل کی ہے۔ میڈم دو کشتیوں پر سوار ہے ایک طرف اس کا شوہر ہے، دوسری طرف جولین کی محبت۔ اس کی اس دوہری شخصیت اور نفسیاتی کشمکش کو ستاں دال نے بڑی ہنرمندی سے ناول میں پیش کیا ہے اور میڈم ڈی رینال کے کردار کو یادگار کردار بنا دیا ہے۔

کہانی میں اچانک ایک موڑ آتا ہے۔ میئر کو ایک گمنام خط ملتا ہے جس میں جولین اور میڈم ڈی رینال کے تعلقات کا انکشاف کیا گیا ہے۔ میئر بدنامی سے بچنے کے لیے جولین کو واپس پادری کے پاس بھیج دیتا ہے تاکہ وہ دینی تعلیمات کا امتحان دے سکے۔ میڈم ڈی رینال جس کے بارے میں میئر کو پتا چل چکا ہے کہ جولین سے اس کا ناجائز تعلق تھا۔ بہت پریشان ہے اور ہر طرح سے اپنے خاوند کے شکوک اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جولین سوریل مذہبی ادارے میں واپس جا کر پادری کی نظروں میں پھر سے اپنا اعتماد بحال کرتا ہے اور امتحان بڑے امتیازی نمبروں سے پاس کر لیتا ہے۔ اب جولین کے ذہن میں ایک خیال ہر پل گردش کرتا رہا ہے اور وہ یہ کہ وہ امیروں اور معاشرے کے بڑے حلقے سے کس طرح انتقام لے اور اس بناوٹی سوسائٹی میں مقام حاصل کرے۔ وہ جانتا ہے کہ چرچ ایک بااختیار ادارہ ہے۔ وہ اس ادارے کے ذریعے ہی سے یہ کام کر سکتا ہے اور پھر اسے یہ موقع مل جاتا ہے اور وہ درسگاہ کے سب سے بڑے پادری کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

درسگاہ کا مہتمم مارکیوس (Marquis de Lamole) جولین کی دانش مندی اور گفتگو سے بہت متاثر ہے چنانچہ وہ جب پیرس جاتا ہے تو اسے اپنا سیکرٹری بنا کر ساتھ لے جاتا ہے اور اس طرح اسے پیرس کی اعلیٰ سوسائٹی میں داخلے کا موقع مل جاتا ہے۔ جولین یہاں محبت کا ایک اور کھیل کھیلتا ہے۔ پادری مارکیوس کی بیٹی میتھلڈے (Mathilde) بہت خوبصورت ہے، کنواری ہے بہت شوخ ہے اور مغرور ہے۔ جولین کو وہ بہت بھاتی ہے چنانچہ وہ اس سے عشق کرنے کا منصوبہ بناتا ہے لیکن میتھلڈے پیروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی اور ہر قدم پر جولین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہے لیکن ذہانت سے جولین ہر بار بچ جاتا ہے۔ جولین میتھلڈے کو اپنے جال میں پھنسانے کا منصوبہ بناتا رہتا ہے۔ آخر میتھلڈے اس سے کہتی ہے کہ اگر تم مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو تو رات کو میرے کمرے میں آؤ۔ جولین اس کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میتھلڈے کچھ عرصے کے بعد حاملہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ خبر مارکیوس کو ملتی ہے تو وہ بے حد پریشان ہو جاتا ہے لیکن جولین بہت خوش ہے کیونکہ اس پر کامیابی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ مارکیوس بہت سوچ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ بدنامی سے بچ سکے۔ وہ میتھلڈے سے جولین کی شادی کرنا چاہتا ہے لیکن کشمکش میں مبتلا ہے۔ جولین اس سے کہتا ہے کہ وہ میئر کی بیوی میڈم ڈی رینال سے خط لکھ کر پوچھ لے کہ میں کیسا آدمی ہوں، جولین کو یقین تھا

کہ میڈم اس کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرے گی مگر ایسا نہیں ہوتا میڈم رینال مارکیوس کو خط لکھ کر بتلاتی ہے کہ جولین ایک بدکار آدمی ہے پہلے یہ کسی خاندان میں داخل ہوتا ہے پھر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ میری زندگی بھی اس کے ہاتھوں برباد ہوئی ہے۔ اس نے میری عزت لوٹ کر مجھے رسوا اور بدنام کیا ہے۔ مارکیوس خط پڑھ کر جولین سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس کی شادی میتھلڈے سے نہیں کر سکتا لیکن میتھلڈے پھر بھی جولین سے شادی پر رضامندی ہے۔ مارکیوس مجبور ہو کر جولین کو جائیداد میں سے حصہ دیتا ہے۔ اچھی نوکری دلاتا ہے۔ لیکن اچانک جولین ایک بہت بڑی حماقت اور بے وقوفی کرتا ہے۔ پستول لے کر میڈم ڈی رینال کے گھر جاتا ہے اس پر فائر کرتا ہے اور زخمی کر کے گھر لوٹ آتا ہے۔ پولیس جولین کو گرفتار کرتی ہے عدالت میں میڈم ڈی رینال بیان بدل لیتی ہے لیکن جولین عدالت میں ججوں اور معاشرے کے خلاف بولتا ہے۔ اور عدالت اسے پھانسی کی سزا سناتی ہے۔ وہ یہ سزا سن کر بالکل پریشان نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہے کہ اس نے جو سوچا تھا وہ حاصل کر لیا ہے۔ پھانسی کی کوٹھری میں اس کی کیفیت دیکھئے۔

''جیل خانے کی کوٹھری کی بدبو ناقابل برداشت تھی لیکن پھانسی والے دن چمکتے سورج نے اس کا استقبال کیا۔ جولین بہت خوش تھا اور حوصلہ مند تھا۔ کھلی فضا میں وہ یوں چل رہا تھا جیسے کوئی ملاح سمندر میں سفر کرنے کے بعد جزیرے کی کھلی فضا میں گھوم پھر رہا ہو۔ اس کا ذہن خوبصورت یادوں سے بھرا تھا۔ ہر چیز اچھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے تن کر اپنے آپ سے کہا: ''میں اب بھی باہمت اور حوصلہ مند ہوں۔''

اور پھر اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔

ستاں دال نے اپنے ہیرو میں اپنے سارے عادات و خصائل بھر دیئے سوائے اپنی بیماریوں کے.......... آخری عمر میں ایک جنسی بیماری سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس نے پوٹاشیم کی ڈبل خوراک لے لی جس کا Reaction ہو گیا۔ بغلوں میں پھوڑے نکل آئے۔ سر چکرانے لگا۔ کانوں میں دھماکے ہونے لگے۔ سانس رک رک کر چلنے لگی۔ پاؤں سوجھ گئے۔ ہاتھوں میں لرزش ہونے لگی۔ نہ قلم پکڑ سکتا تھا نہ چمچ۔ اُس کا ہیرو جولین سوریل خوشی کی تلاش میں پھانسی چڑھ گیا۔ ستاں دال خوشی کے تعاقب میں بے دم ہو کر سڑک پر گر گیا۔ لوگ اُٹھا کر گھر لے گئے۔ دو گھنٹے بعد مر گیا۔ وہ مر گیا لیکن اپنے ہیرو جولین سوریل کی طرح آخری سانس تک باہمت اور حوصلہ مند رہا!

بالزاک

(Honoré de Balzac)

18 ویں صدی کا نامور، مقبول ناول نگار، فرانسیسی زبان کے بڑے ناول نگاروں میں اسکا نام آتا ہے۔ فرانس کی سوشل زندگی کا آئینہ دار، اس کے ناول واقعات اور کرداروں کی بنا پر یادگار مانے جاتے ہیں۔ 97 ناول لکھے۔ ''بوڑھا گوریو'' یادگار ناول ہے۔

''بالزاک نے ''جنگ اور امن'' یا ''برادرز کرما ثوف'' جیسے شاہکار لکھ کر شہرت نہیں کمائی۔ اس کی شہرت اور مقبولیت اس کی تخلیقی طاقت میں ہے۔''

(میتھو آرنلڈ)

....

''ایک سو اوسٹر (Oysters) بارہ کٹلس، ایک روسٹ بطخ، سوپ، دلیے کا بڑا پیالہ اور چار میٹھے کی پلیٹیں اس کی خوراک میں شامل تھیں۔''

(بالزاک کا پبلشر)

....

دھیان رہے یہ میری چوکور ناک نہیں پوری دنیا ہے۔

(بالزاک)

....

فرانس کی سوشل دنیا ہوگی اور میں ہوں گا۔ میں برائیوں اور اچھائیوں کو مرتب کروں گا۔ میں حقیقی جذبات کی عکاسی کروں گا۔ شاید اس طرح میں آداب اور انسانی رویوں کی بھولی تاریخ لکھ سکوں جو تاریخ دانوں کی نظر سے اوجھل ہے۔''

(بالزاک)

بالزاک

گھر میں اس کی بہن کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تمام رشتے دار بڑے ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ اس نے الماری سے اپنا پہلا لکھا ہوا ڈراما نکالا اور ہال میں جا کر عزیزوں کو نوید سنائی کہ میں مصنف ہو گیا ہوں۔ سنو! سب لوگ متوجہ ہوئے اور اس نے اپنا ڈراما پڑھ کر سنا دیا۔ جب ڈراما ختم ہوا تو وہ چپ ہو گیا اور سب رشتے داروں نے یک زبان ہو کر کہا ''بالکل بکواس ہے''

یہ بالزاک کو اپنی تحریر پر ملنے والی پہلی داد تھی لیکن وہ نا امید نہیں ہوا۔ مسلسل لکھتا رہا اور ایک دن ایسا بھی آیا جب رشتے داروں اور پوری دنیا کو تسلیم کرنا پڑا کہ بالزاک فرانس کا عظیم ناول نگار ہے۔

بالزاک کے لکھے ہوئے تمام ناول اپنے کرداروں، واقعات اور بنت کے لحاظ سے یادگار ثابت ہوئے۔ بالزاک اپنے عہد اور زندگی کا سب سے بڑا شناسا تھا۔ انسانوں کے بارے میں اس کا علم اپنے ہمعصر لکھنے والوں میں سب سے زیادہ تھا۔ وکیل، پادری، کلرک، جرنلسٹ، دکاندار، دیہاتی، بُرے، اچھے انسان، عورتیں، بچے، بوڑھے، ہل مزدور، مالک، بینکر، تاجر، شہر، گاؤں اور گلیاں، بالزاک نے زندگی گزارنے والے کسی فرد کو مہلت نہیں دی کہ اس کی نظروں سے بچ کر چلا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ جانوروں اور مویشیوں کی طرح انسانوں کو بھی مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بقول میتھو آرنلڈ بالزاک کی شہرت کسی ایک ناول کی وجہ سے نہیں۔ اس نے ''جنگ اور امن'' یا ''برادرز کرما ثوف'' جیسے شاہکار لکھ کر شہرت نہیں کمائی بلکہ اس کی شہرت اور مقبولیت اس کی تخلیقی طاقت میں ہے جو اس کے مختلف ناولوں میں کارفرما نظر آتی ہے۔ بالزاک چیزوں کو اپنی ڈائریوں میں محفوظ کرنے کا عادی تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا اپنی نوٹ بک اور پنسل اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ بازاروں، گلیوں اور شہروں کی سڑکوں کی تفصیل نوٹ کر لیتا تھا تاکہ اپنے کرداروں کو ان سڑکوں سے گزار سکے۔ گراؤنڈ میں لگے درختوں اور پھولوں کی کیاریوں کی جائے وقوع لکھ لیتا تھا اور پھر ان کے درمیان یا گرد و نواح میں اپنے کرداروں کو گھومتے پھرتے دکھاتا تھا۔

بالزاک بہت زود نویس تھا بلکہ لکھنے میں فضول خرچ تھا۔ تیس سال وہ ایک فیکٹری کی طرح دن رات کام کرتا رہا۔ ایک ایسی فیکٹری کی طرح جس میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ ہر سال دو بڑے ضخیم ناول، درجن بھر ناولٹ، لاتعداد کہانیاں اور ڈرامے لکھنا اس کے پروگرام میں شامل تھا۔ وہ صبح سات بجے بیدار ہوتا تھا۔ بہترین لباس پہن کر لکھنے کی میز کی طرف چلا جاتا (اس کا کہنا تھا کہ لکھنے والے کا لباس صاف ستھرا ہونا چاہیے) موم بتی جلا کر میز پر رکھتا اور لکھنا شروع کر دیتا۔ لکھنے کے دوران بلیک کافی کے لاتعداد کپ پی جاتا۔ تقریباً 9 بجے اس کا پبلشر مسودہ لینے کے لیے آ جاتا۔ جب پبلشر چلا جاتا تو وہ 12 اُبلے ہوئے انڈے کھاتا اور دو چار کپ بلیک کافی کے لیتا اور پھر چھ بجے تک کام کرتا۔ پھر دوستوں سے گپ شپ کرتا اور سونے کے لیے چلا جاتا۔

بالزاک بسیار خور تھا۔ خوراک وحشیوں کی طرح کھاتا تھا۔ اس کا ایک پبلشر کہتا ہے:

''ایک سو اوسٹر (Oysters) بارہ کٹلس، ایک روسٹ بطخ، سوپ، دلیے کا بڑا پیالہ اور دو چار میٹھے کی پلیٹیں، اس کی خوراک میں شامل تھیں۔''

دستر خوان یا میز پر اس کی عادات اور آداب بڑے واہیات تھے وہ کھاتا بھی رہتا اور نیپکن کے ساتھ ناک بھی صاف کرتا رہتا تھا۔

بالزاک پستہ قد، مضبوط بدن، چوڑی پیشانی، بیل کی طرح مضبوط گردن اور مسکراتے ہونٹوں کے پیچھے چمکتے نہایت بے ترتیب اور بڑے دانت رکھتا تھا۔ اسکی ناک چوکور تھی اور نتھنے بہت کھلے تھے۔ وہ اکثر دوستوں سے مسکرا کر کہتا تھا

''دھیان رہے، یہ میری ناک نہیں پوری دنیا ہے۔''

بالزاک نے دن رات لکھا اور فضول خرچی کی عادت پوری کرنے کے لئے بہت پیسے کمائے مگر ساری زندگی مقروض ہی رہا۔ ہر جاننے والے سے قرضہ لینے کی عادت روسی ناول نگار دستوئیفسکی کو بھی تھی اور اگر کوئی جاننے والا اسے قرض نہ دیتا تو وہ اس کے خلاف ہو جاتا تھا (ایک بار ترگنیف نے اسے پیسے نہیں دیئے دستوئیفسکی نے ایک ناول میں اس کا کردار تشکیل دیا اور دل کا غبار نکال لیا) قرضہ لینے میں بالزاک دستوئیفسکی سے بھی چار قدم آگے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں سے قرضہ لینا بہت مشکل ہے۔ وہ اپنی گرہ کی بہت پکی ہوتی ہیں لیکن بالزاک نے اس مشکل کو بہت آسان بنالیا تھا۔ اس نے بے شمار عورتوں سے قرض لیا۔ وہ ہنس کر اسے مطلوبہ رقم دے دیا کرتی تھیں۔ قرض لے کر واپس کرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اسے بڑی بڑی دعوتیں کرنے، اپنے گھر کو خوبصورت فرنیچر سے سجانے، گھر کی زیبائش اور خوبصورت لباس پہننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ مسلسل وعدوں کے بعد جب بالزاک نے لوگوں کا قرض ادا نہ کیا تو وہ آئے، گھر کا فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان سب کچھ اٹھا کر لے گئے اور بالزاک کو دوبارہ کسی سے قرض لے کر دوسرا کرائے کا گھر لینا پڑا۔

بالزاک 1799ء میں پیرس کے قریب Tours میں پیدا ہوا۔ باپ 53 سال اور ماں کی عمر 21 سال تھی۔ (عمر کے اس فرق کا اس کی ماں پر بھی اثر ہوا اور ماں نے بالزاک پر اثرات مرتب کیے) بالزاک کا بچپن کچھ اتنا اچھا نہیں تھا۔ بالزاک کی ماں بالکل بائرن کی ماں جیسی تھی۔ جھگڑالو، جنونی اور منہ پھٹ۔ بائرن کی طرح بالزاک کی ماں نے بھی اسے ماں کا پیار نہ دیا۔ وہ سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ جب چھٹیاں ہو جاتیں بالزاک پھر بھی گھر نہیں جاتا تھا۔ 1813ء میں خاندان پیرس چلا آیا اور پھر بالزاک کے جنسی، مالی اور ادبی مسائل نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

بالزاک کے پڑوس میں ایک جرمن موسیقار کی بیٹی مادام برنی رہتی تھی۔ اس کے چھ بچے تھے۔ خاوند بیمار تھا۔ عمر 45 سال تھی۔ اس نے بالزاک سے تعلق قائم کرلیا۔ وہ چودہ برس تک بالزاک کی محبوبہ رہی اور ہر مشکل میں اس کے کام آئی۔ بالزاک اور برنی کا تعلق بھی عجیب تعلق تھا۔ بالزاک نے اپنی محبوبہ میں ماں کی محبت کو ڈھونڈ لیا تھا جب بالزاک کی ماں کو اس تعلق کا پتا چلا اور شہر میں رسوائی ہوئی تو ماں نے اس پر اعتراضات شروع کر دیئے لیکن بالزاک پر کوئی اثر نہ ہوا۔ برنی نے اسے کاروبار کے لئے 45 ہزار فرانک دیئے اور بالزاک نے پبلشنگ ادارہ کھول لیا۔ تین سال بعد ادارہ دیوالیہ ہوگیا۔ بالزاک کی ماں نے اسے 50 ہزار فرانک ادا کئے تا کہ وہ قرضے اتار سکے۔ بالزاک کے لکھنے لکھانے کا سلسلہ تو شروع ہو چکا تھا۔ اب اس نے اسی کو اپنا پیشہ بنانے کا ارادہ کیا اور باقاعدہ لکھنے میں جت گیا۔

بالزاک اور اس کے پبلشروں کے تعلقات ہمیشہ گڑبڑ کا شکار رہے۔ وہ ایک پبلشر سے ایڈوانس لے لیتا۔ پہلے پبلشر

کا کام چھوڑ کر دوسرے کا کام شروع کر دیتا اور پھر تیسرے چوتھے کے ساتھ یہی بات دہرائی جاتی اور بات جھگڑوں پر ختم ہوتی۔

لین دین کے سلسلے میں بالزاک بڑا ناقابل اعتماد آدمی تھا۔ اس کا بائیوگرافر آندرے بلی (Ander Billy) کہتا ہے کہ بالزاک شرمناک حد تک واہیات نادہندہ تھا۔ بہنوں، دوستوں، واقف کاروں، پبلشروں کے ساتھ اس نے کبھی کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا حتیٰ کہ اس نے اس سلسلے میں اپنی ماں تک کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ آندرے بلی نے بالزاک کے نام اس کی ماں کا ایک خط بالزاک کی بائیوگرافی میں دیا ہے۔ چند جملے دیکھئے۔

''تمہارا آخری خط مجھے نومبر 1834ء میں ملا تھا، جس میں تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپریل 1835ء سے مجھے ہر 3 ماہ کے بعد 2 سو فرانک خرچہ دیا کرو گے۔ اب اپریل 1837ء آ گیا ہے تم نے مجھے ایک فرانک تک نہیں بھیجا۔ بالزاک تم سوچ نہیں سکتے یہ وقت میں نے کیسے گزارا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر کہوں'' خدارا مجھے روٹی دو''۔ اب تک میں جو کچھ کھاتی رہی وہ میرے داماد نے مجھے دیا۔ یہ کب تک چلے گا۔ میرے بچے تم اپنی محبوباؤں پر، فرنیچر پر، لباس پر، جیولری پر اور عیاشی پر خرچہ کرتے ہو اپنی ماں کے بارے میں بھی سوچو۔''

بالزاک نے ماں کا خط پڑھ کر ماں کو اس خط کا جواب دیا جو ایک جملے پر مبنی تھا اور وہ جملہ یہ تھا۔

''میرا خیال ہے تم پیرس آ کر مجھ سے ایک گھنٹہ بات کرو''۔

بالزاک نے اپنی نجی اور ادبی زندگی میں بہت منصوبہ بندی سے کام لیا آگے چل کر میں بتانے والا ہوں کہ اس نے اپنی تخلیقی زندگی میں کس طرح ہیومن کامیڈی (La. Comedie Humaine) کا منصوبہ بنایا اور پھر اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے کس طرح موضوعات چنے کس طرح واقعات کو ترتیب دیا اور کس طرح کرداروں کو الگ الگ خانوں میں رکھا اور کس طرح پھر کرداروں کو چن چن کر طے شدہ ناولوں میں استعمال کیا۔

نجی زندگی میں اس نے جو جو عشق کئے ان میں بھی ایک منصوبہ بندی شامل تھی۔ بالزاک کو جب شہرت نے اعلیٰ مقام پر بٹھا دیا تو نئے دوست (خاص طور پر خواتین) اس کے اردگرد منڈلانے لگے۔ ان میں ایک شادی شدہ خاتون میڈم ہنسکا بھی تھی۔ خاوند کی عمر زیادہ تھی۔ وہ بیمار رہتا تھا۔ وہ پانچ بچوں کی ماں تھی لیکن 5 بچوں کی پیدائش نے بھی اس کا کچھ نہ بگاڑا۔ عمر تو اس کی 32 سال تھی مگر چہرہ مہرہ، چال ڈھال، ناز و ادا، سب کچھ 18 سالہ دوشیزہ کی طرح تھے۔ اس نے بالزاک کو ایک گمنام خط لکھا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہنسکا جنیوا میں اپنے خاوند کے ساتھ مقیم تھی۔ اس کا آبائی وطن یوکرائن تھا۔ بالزاک بن سنور کر جنیوا کے پارک میں ملاقات کے لئے چلا گیا کیونکہ ملاقات باغ ہی میں طے پائی تھی۔ بالزاک نے دیکھا ایک خوبصورت عورت ایک کونے میں بنچ پر بیٹھی ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ بالزاک قریب گیا تو دیکھا کہ جو ناول وہ پڑھ رہی تھی وہ بالزاک ہی کا ناول تھا اور عورت میڈم ہنسکا ہی تھی۔ بالزاک اسے دیکھ کر فوراً دل دے بیٹھا۔ وہ خوبصورت تھی اور دولت مند تھی۔ بالزاک چھ ہفتے جنیوا میں گزار کر پیرس واپس آیا۔ دونوں میں طے پایا کہ جوں ہی ہنسکا کا خاوند فوت ہو جائے گا وہ شادی کر لیں گے۔

جنیوا سے واپس آ کر بالزاک نے مزید قرضے لینے شروع کر دیئے اور وقتی طور پر ایک اور عشق کرلیا۔ دونوں کے عشق کے چرچے پیرس میں پھیل گئے۔ بات جنیوا میں ہنسکا تک پہنچی اس نے ایک سخت خط بالزاک کو لکھا اور کہا کہ وہ یوکرائن واپس جا رہی ہے۔ بالزاک 2 ہزار فرانک قرض لے کر اسے منانے ویانا چلا گیا۔ اسے منا کر پیرس آیا تو قرض دینے

والے پولیس کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ یہاں کاؤنٹس وسکونٹی کام آئی اور پیسے ادا کر کے اسے جیل جانے سے بچالیا۔

بالزاک کی نجی زندگی میں اتنا نشیب وفراز تھا۔ تحیر اور چونکا ہٹ تھی کہ پڑھنے والا اس کی زندگی کو ایک ناول کا پلاٹ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہ بات مستند ہے کہ اس نے ان واقعات کو جو اس کی نجی زندگی سے تعلق رکھتے تھے ناولوں کا حصہ بنا دیا۔ ہنسکا یوکرائن چلی گئی۔ کاؤنٹس اس کے بچے کی ماں بن گئی، کاؤنٹس کے خاوند پر عشق کا راز کھل گیا لیکن اس نے برا نہ منایا اور کہا:

''میری بیوی کو نسبتاً ایک سانولے بچے کی ضرورت تھی، وہ اسے مل گیا''

بالزاک ہنسکا کو عشقیہ خطوط لکھتا تھا اور وہ ان خطوط کو پڑھ کر کتابوں میں رکھتی رہی ایک دن یہ خط اس کے بیمار خاوند کے ہاتھ آ گئے اور وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ بالزاک کو پتا چلا تو اس نے ہنسکا کے خاوند کو خط لکھا:

''یہ خطوط مذاق مذاق میں لکھے گئے ہیں، ہنسکا کا کہنا تھا کہ میں صرف ناول لکھ سکتا ہوں۔ عشقیہ خط لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے یہ خط لکھ کر اسے بتایا ہے کہ میں یہ کام بھی کر سکتا ہوں۔''

ہنسکا کے خاوند نے بالزاک کی ان باتوں پر یقین کر لیا اور چند دن بعد فوت ہو گیا۔ بالزاک کا خواب پورا ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ اب ہنسکا سے شادی ہو جائے گی اور ہنسکا کے ساتھ آنے والی بے شمار دولت اس کے سارے قرض اتار دے گی لیکن ہنسکا نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور بالزاک کو صاف صاف لکھ دیا کہ تمہاری فضول خرچی، قرضے اور میری بیٹی کی شادی مجھے ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ بالزاک نے پرانی محبت کا یقین دلایا، وعدے یاد دلائے اور جذباتی انداز میں محبت کا دوبارہ اظہار کیا اور ہنسکا شادی کیلئے رضا مند ہو گئی۔ اس وقت تک بالزاک جسمانی طور پر زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پھیپھڑوں اور دل پر بیماریوں کا قبضہ ہونے لگا تھا اور شاید ہنسکا اس سے باخبر تھی۔ ہنسکا کے بھائی نے خط لکھ کر اسے شادی کرنے سے منع کیا اور بالزاک کے مقروض ہونے اور فضول خرچی کے حوالے دیئے لیکن ہنسکا اب بالزاک پر رحم کھانے لگی تھی اور اسے اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے بھائی کو جواب میں لکھا:

''میں بالزاک کو کچھ دینا چاہتی ہوں، اس نے بہت دن انتظار کیا ہے، وہ بیمار ہے اور اس کی زندگی کے اب چند دن باقی ہیں۔ وہ جلد ہی مر جائے گا۔ میں چاہتی ہوں، وہ میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر مرے اور جب وہ دنیا سے رخصت ہو تو میری تصویر اس کے دل میں ہو۔''

1850ء کی ابتدا میں ہنسکا نے بالزاک سے شادی کر لی لیکن یہ رشتہ کچھ اچھا ثابت نہ ہوا۔ بیماری نے بالزاک کو چڑچڑا بنا دیا۔ بات بات پر وہ مارنے پیٹنے کو دوڑتا اور پھر اس نے ہنسکا پر باقاعدہ حکم چلانا شروع کر دیا۔ ہنسکا کو گلہ تھا کہ اس نے بالزاک کی بڑی مدد کی لیکن وہ شکر گزار اور احسان مند نہیں تھا لیکن اصل بات یہ تھی کہ اس نے بالزاک کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس نے شادی قرضے ادا کرنے کیلئے نہیں کی۔ ہنسکا اپنے گھر میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی۔ فرانس کے نوکروں نے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ میاں بیوی کے جھگڑے پیرس کی ادبی محفلوں میں مشہور ہو چکے تھے۔

بالزاک جو دعوتوں، محفلوں اور ہنگاموں کا عادی تھا اپنے کمرے تک محدود ہو گیا اور آخر 17 اگست 1850ء کو فوت ہو گیا۔ ہنسکا نے بالزاک کے ساتھ 32 سال گزارے (اگرچہ شادی شدہ زندگی صرف 7 ماہ تھی) اس کے قرضے ادا کیے۔ بالزاک کی ماں کو (اس کی موت تک) تین ہزار فرانک سالانہ ادا کیے۔ بالزاک کی موت کے بعد اس نے اس کی تحریروں کو ترتیب دے کر چھپوانے کا اہتمام کیا۔ ٹالسٹائی کی بیوی کی طرح بالزاک کے غیر مطبوعہ ناولوں اور کہانیوں کو مرتب کیا۔

صاف ستھرا قیمتی اور بے داغ لباس پہن کر لکھنے والے بالزاک کی شخصیت پر کمزوریوں اور خامیوں کے بے شمار دھبے موجود ہیں۔ جو قارئین کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ دراصل پیرس کی مجلسی زندگی کا لازمی حصہ تھا۔ خاص طور پر مشہور لکھنے والوں کے اردگرد شادی شدہ خواتین کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا۔ شادی شدہ خواتین اور کبھی کبھی ان کے شوہر اس بات پر بہت فخر محسوس کرتے تھے کہ کسی مشہور مصنف کے ساتھ ان کے تعلقات ہیں اور جب ان کی اس محبت کا قصہ محفل محفل گھومتا تھا۔ بدنامی کوری ڈور میں بھاگی پھرتی تھی تو شادی شدہ عورتیں فخر سے محفلوں میں آتی جاتی تھیں۔ روسو کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا جو بالزاک کے ساتھ ہوا۔ جب بالزاک ہنسکا کے ساتھ عشق کر رہا تھا تو بیک وقت پانچ خواتین کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ ان کمزوریوں کے باوجود جب قاری بالزاک کی تخلیقی زندگی پر نظر ڈالتا ہے، تو یہ سب دھبے اور کمزوریاں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور صرف وہ بالزاک سامنے رہتا ہے جس نے بوڑھا گوریو جیسا ناقابل فراموش ناول لکھا اور ''کزن بیٹی'' جیسا شاہکار ناول ہمیں دیا۔

بالزاک کی تخلیقی زندگی دیومالائی بندر کی دم کی طرح بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اسکی تحریری دنیا میں نظر ڈالیں تو رنگا رنگ مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ جرنلسٹ کی حیثیت سے اس نے دو رسالے بھی نکالے اور ہر قسم کے موضوعات پر مضامین لکھے۔ اس کا پہلا باقاعدہ منصوبہ لارڈ بائرن کے (The Eorsair) پر لکھا ہوا کامیڈی اوپیرا تھا۔ 1820ء میں اس نے 5 ایکٹ پر مبنی ڈراما (Cromwell) لکھا۔ بالزاک کی ملاقات جب ایک دوست سے ہوئی اس نے کہا تم کہانیاں لکھا کرو میں پبلشر سے کہہ کر انہیں چھپوانے کا انتظام کر دونگا۔ اس نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں چنانچہ بالزاک نے بے شمار تحریریں کسی اور نام سے لکھیں (Saitslouny) کا کہنا ہے۔ ''یہ ناول کہانیاں دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن ہیں بہت بُری''

مشہور انگریزی ناول نگار (R.L.Stevenson) نے اپنے جاننے والوں کو بالزاک کی ابتدائی تحریریں نہ پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ سیموئل روجرز نے بڑی اچھی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ لکھ کر بالزاک نے اس بڑے ناول نگار کو ڈھونڈ لیا جو اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔

چارلس ڈکنز کی طرح بالزاک کے بیشتر ناول قسط وار اخباروں اور رسائل میں چھپے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ پیرس کے ایک گیراج میں رہتا تھا۔ اس کا پہلا مکمل ناول (Lecouans) 1829ء میں چھپا جو فرانس کے ان کسانوں کے بارے میں ہے جنہوں نے انقلابی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ دوسرا ناول (The Physiology of Marriage) لکھا جو عورتوں کے بارے میں تھا۔ اس نے یہ ناول لکھ کر عورتوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور خاص طور پر اس کا یہ جملہ بڑا مشہور ہوا:

''عورتوں کی اچھائیوں پر یقین کرنا دراصل ایک سماجی اور معاشرتی مذہب ہے اس پر ایمان قائم رکھنا چاہئے کیونکہ عورتیں دنیا کا سب سے خوبصورت زیور اور فرانس کی شان ہیں''

بالزاک کے دیگر مشہور ناولوں میں چند ایک یہ ہیں ساری فہرست دینے کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔

1- The Lilly in the Valley
2- The Hated Son
3- The Old Man

4- Lost Illsiohs

5- A Daughter of Eve

7- The Black Sheep

8- Cousion Bette

9- A man of Business

10- The Unwitting Actors

11- A Harlot High and Low

ان کے علاوہ بے شمار اور کئی ناول۔ یہ سب ایک عنوان کے تحت لکھے گئے اور وہ عنوان Humaine Comedy تھا جس کا ذکر میں آگے چل کر کرنے والا ہوں۔

بالزاک، جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ بے تکان لکھتا تھا۔ زیادہ کھانا اور زیادہ لکھنا اسکی عادت میں شامل تھا۔ وہ ایک بار لکھتا اور مسودہ پبلشر کو دے دیتا۔ جب پروف اس کے سامنے آتا تو پھر اس میں بے حساب اضافے کرتا اور چھپنے تک کرتا رہتا اور کبھی کبھی تو یوں ہوتا تھا کہ کتاب کی شکل بالکل ہی بدل جاتی اور پہلے مسودے اور چھپی کتاب میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ قسط وار چھپنے والی ناولوں میں بھی الجھاؤ ہوتا تھا اس کی کانٹ چھانٹ اور اضافے کی عادت کبھی کبھی ناول کو ہزار صفحات پر لے جاتی تھی اور کبھی کبھی اس کا ناول Tiger Eye کی طرح صرف 50 صفحات کا رہ جاتا تھا۔

بالزاک ادب کے میدان میں ایک بڑا منصوبہ لے کر اُترا۔ 1933ء میں اس نے اپنے تخلیقی کام کو ایک عنوان کے زیر تحت لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ عنوان ہیومن کامیڈی (LA. Comedy Humaine) تھا۔ جب یہ منصوبہ اس کے ذہن میں آیا تو اس نے بہت خوش ہو کر اپنی بہن کو لکھا۔

''فرانس کی سوشل دنیا ہوگی اور میں ہوں گا۔ میں برائیوں اور اچھائیوں کو مرتب کروں گا۔ میں حقیقی جذبات کی عکاسی کروں گا۔ اس سوشل دنیا سے کرداروں اور اہم واقعات کا انتخاب کرونگا۔ شاید اس طرح میں آداب اور انسانی رویوں کی وہ بھولی تاریخ لکھ سکوں جو تاریخ دانوں کی نظروں سے اوجھل رہی ہے..........''

بالزاک نے اپنے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے 137 ناولوں میں سے 91 ناول لکھے..........اس نے ان ناول میں ابھرنے والے کرداروں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا بالکل جس طرح (NATURAL HISTORY) لکھنے والے (BUFFON) نے جانوروں کو تقسیم کیا ہے۔ 1846ء میں بالزاک نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''......جس طرح ایک جانور خاص عادات وخصائل رکھتا ہے اس طرح ایک سپاہی ہوتا ہے اور ایک دستکار۔ دونوں کی الگ الگ قسمیں اور عادات ہیں۔ میں نے اس طرح کرداروں کو الگ الگ خانوں میں رکھا ہے......''

''خاندانی زندگی''، ''صوبائی زندگی''، ''فوجی زندگی''، ''سیاسی زندگی''، ''پیرس کی زندگی......'' اور ''پرائیویٹ زندگی''

ان چھ عنوانات کو سامنے رکھ کر بالزاک نے اپنے ناولوں کے پلاٹ، کردار اور واقعات کا انتخاب کیا اور ناول لکھے۔

بالزاک انگریزی مصنف والٹر سکاٹ کا بہت بڑا مداح تھا۔ بقول بالزاک اس نے انسانی فطرت کا کھوج اس کی تحریروں میں لگایا...... بالزاک کا خیال تھا کہ آدمی اچھا ہے نہ برا۔ سوسائٹی اسے اچھا برا بناتی ہے۔ اس میں اس کی ذات کو

بھی دخل ہے...... وہ دنیا کے دکھوں کا مخالف تھا، ذاتی طور پر اپنے ملک کو شہنشاہیت اور مذہب کی طرف لے جانا چاہتا تھا...... وہ ذاتی طور پر ایک ایسی روحانی دنیا کی تلاش میں تھا جہاں خدا اور انسان کے تعلقات فروغ پا سکیں۔

بالزاک ایسی روحانی دنیا تخلیق کرنے میں تو شاید کامیاب نہ ہوا لیکن ''سماج کے سیکرٹری'' کا رول نبھاتے ہوئے اس نے بہت کام کیا۔ بے مثال تحریریں لکھیں۔ بے مثال اور یادگار کردار تخلیق کر کے فرانس کی زندگی کے خوبصورت مناظر دکھائے جن میں دکھ سکھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

''ہیومن کامیڈی'' کی منصوبہ بندی کے زیر تحت اس نے بے شمار اچھے ناول لکھے ان سب کا ذکر شاید ناممکن ہوگا لیکن بوڑھا گوریو (Pere Goriot) اور ایک دوسرے ناول کزن بیٹی (Lacousine Bette) کا تذکرہ نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

بالزاک شاید دنیا کا واحد مصنف ہے جس نے لاتعداد کردار اپنے ناولوں میں روشناس کرائے۔ فرانس کے ایک نقاد نے ایک کتاب چھاپی ہے، جس میں صرف ان کرداروں کا ذکر ہے جو بالزاک کی تحریروں میں آئے ہیں۔ یہ کردار اپنی فطرت اور عادات کی بنا پر ساری دنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کزن بیٹی کا کردار، بوڑھے گوریو کا کردار، گوریو کی مطلبی بیٹیوں کے کردار، ''بوڑھا گوریو'' کے ہیرو یوجین کا کردار، اس کی بہنوں کے کردار جو دیہات میں رہتی ہیں اور بھائی کی کامیابی کیلئے دعا گو ہیں۔ اسی ناول کے حوالے سے پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی دعوتوں میں شریک شرفا اور بناوٹی زندگی بسر کرنے والوں کے کردار، بالزاک کے ناول اٹھاتے جایئے بھانت بھانت کے کرداروں سے آپ کی ملاقات ہوتی رہے گی۔

''ہیومن کامیڈی'' کے زیر عنوان لکھے گئے ناولوں میں بالزاک نے واقعی معاشرے کے ہر شعبے سے کردار، واقعات چن چن کر آداب، عادات، رسومات اور جذبات کی وہ تاریخ لکھ دی ہے جسے مؤرخین فراموش کر چکے تھے۔

کزن بیٹی میں اس نے مصیبت کی ماری بیٹی کا قصہ لکھ کر سوسائٹی کے ان تمام افراد کے چہرے دکھا دیئے ہیں جو اپنی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہیں اور بیٹی ان سب کے دکھ بانٹتی پھرتی ہے اور آخر میں جب ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو انتقام پر اتر آتی ہے۔ Man and Harlot میں اس نے تھیٹر کی زندگی دکھائی ہے۔ اخبار اور اخبار والوں کی سنسنی خیز زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ ایک ناول Ugene Drandet بھی ہے۔ جس کا کنجوس ترین کردار آپ قیامت تک فراموش نہیں کر سکتے۔ جو کاغذ بچانے کیلئے اخبار کی خالی جگہ پر اپنا حساب کتاب لکھتا ہے۔ بالزاک نے ایک بے حد جذباتی اور دکھ بھری صورتحال اس ناول میں پیدا کی ہے، جس اخبار پر وہ حساب کتاب لکھ رہا ہے اس میں اس کے بھائی کی خبر بھی چھپی ہے جو اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے اور آخر میں جب یہ کردار مرتا ہے اور پادری اس سے ''اعترافات'' لینے کے لیے آتا ہے تو پادری کے گلے میں سونے کی زنجیر دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آتا ہے۔ مرتے وقت بھی لالچ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

پھر اس کا ناول ''بوڑھا گوریو'' بھی ہے۔ بوڑھا گوریو جو اپنی بیٹیوں کے لئے جان تک قربان کرنے کیلئے تیار ہے ان کی عیاشی کے لئے اپنی ایک ایک چیز فروخت کر چکا۔ لیکن بیٹیوں کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ باپ ان کے لئے ہر پل شادمانی اور خوشیوں کا طلب گار ہے ان کے عاشقوں کے ناز اٹھاتا ہے۔ وہ خود بورڈنگ ہاؤس میں بے چارگی اور کسمپرسی کی حالت میں مرتا ہے لیکن اس کی بیٹیاں رقص میں مصروف رہتی ہیں اور جنازے پر خالی بگیاں بھیج دیتی ہیں۔ اس ناول کا

ہیرو جو گاؤں سے پیرس شہر کو فتح کرنے آیا ہے۔ بوڑھے گوریو کو بے بسی میں مرتا دیکھ کر سوچتا ہے کہ پیرس کے پتھر صفت شہر کو وفا، محبت اور ایمانداری سے فتح نہیں کیا جا سکتا اسے فتح کرنے کیلئے اسی کمینگی، مصلحت اور پتھر دل کی ضرورت ہے جو پیرس میں رہنے والوں کا شیوہ ہے اور وہ اس پر عمل کرتا اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔ بالزاک نے اس ناول کا پلاٹ اور کہانی شیکسپیئر کے ڈرامے کنگ لیئر (King Lear) سے لے کر ایک عظیم ناول تخلیق کیا ہے۔

بالزاک کو ادبی حقیقت نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے والٹر سکاٹ سے متاثر ہو کر کرداروں، واقعات اور چیزوں کے اندر جھانک کر انہیں گہری نظر سے دیکھا اور انہیں حقیقت کے قریب رہ کر بیان کیا۔ اس کی یہ عادت بہت مشہور تھی کہ وہ چیزوں اور کرداروں کو دیکھ کر ان کی ساری تفصیل اور چھوٹی چھوٹی عادات کاغذ پر نوٹ کر لیا کرتا تھا۔ وہ خود ایک کتاب کے دیباچے میں کہتا ہے۔

''میرا یہ پختہ نظریہ ہے کہ چیزوں کو حقیقی انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ہی کسی فن پارے میں عظمت اور فنی خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔''

چنانچہ اس نے فرانس کی سوسائٹی کو بڑی گہری نظر سے دیکھا اور حقیقت نگاری کا ٹھپہ لگا کر اپنے ناولوں میں پیش کر دیا۔ وہ فرانس کی سوسائٹی کو اپنے ناولوں کا مصنف کہتا ہے اور خود کو سوسائٹی کا سیکرٹری قرار دیتا ہے۔ ''ہیومن کامیڈی'' کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"French Society Would Be The Real Allthor. I Should Only Be The Secretary."

''ہیومن کامیڈی'' کے تحت لکھے جانے والے ناولوں کو بالزاک نے جن چھ شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان میں ڈاکٹر، تاجر، کلرک، افسر، عام آدمی، عورتیں، بوڑھے، جوان، صحافی، اداکار، ڈانسر، ہدایتکار، مصور، سٹور کیپر اور دکاندار سب کردار اپنی اپنی شناخت کرا کے اپنے اپنے شعبے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بالزاک تو یہاں تک کہتا تھا:

''پیرس کی گلیاں بھی انسانی صفات اور عادات رکھتی ہیں۔ وہ ہمارے دل و دماغ پر جو اثر چھوڑتی ہیں اسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔''

لگتا ہے بالزاک نے پیرس کی گلیوں کو میر تقی میرؔ کی آنکھ سے دیکھا تھا۔ جو بات میر تقی میر نے دلی کے بارے میں کہی ایسی ہی ملتی جلتی بات بالزاک نے پیرس کے بارے میں کہہ دی۔ میرؔ کے شعر کو پڑھ کر بالزاک کی بات سنیے دونوں ایک انداز میں بات کرتے نظر آتے ہیں۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

چارلس ڈکنز سو امریکی مسٹر لندن کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ اس کی کہانیوں میں لندن چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ نقادوں نے بالزاک کا چارلس ڈکنز سے موازنہ کیا اور اس کے ایک نقاد (W.H.Helum) نے اسے (The French Dickens) کہا ہے۔

بالزاک کی ''ہیومن کامیڈی'' کو عالمی ادب میں ایک غیر معمولی ادبی کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لکھے ہوئے سارے ناول اعلیٰ درجے کے ناول قرار نہیں دیئے جا سکتے لیکن آٹھ دس ناول پھر بھی بڑے ناولوں میں اپنی جگہ بنا ہی لیتے ہیں۔

بالزاک وکٹر ہیوگو کا بہت قریبی دوست تھا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے وکٹر ہیوگو سے طویل ملاقات کی۔ جی بھر کر باتیں کیں اور 18 اگست 1850ء کو فوت ہو گیا۔ (جب وہ مرا تو اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ ہنسکا (Hanska) اس کے ساتھ نہ تھی اور ہنسکا کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی کہ بالزاک مرے تو اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہو)

وکٹر ہیوگو نے قبرستان میں لوگوں سے کہا:

''آج سب لوگ سیاہ لباس میں ملبوس ہیں۔ اور سارا پیرس رو رہا ہے اس لئے کہ ایک بڑا مصنف، بڑا دماغ، بڑا ناول نگار ہم سے جدا ہو گیا ہے۔''

بالزاک پیرس کے (Per Lachaise) قبرستان میں دفن ہے۔ لندن کے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں اس کا مجسمہ رکھا ہے۔ جس کے نیچے سنہری الفاظ میں بالزاک کے مشہور ناول (The Wild Ass's Skin) کی یہ سطریں لکھی ہیں۔

''میں اپنی روح اور ضمیر کی سچائی سے یہ بات کہتا ہوں کہ میرے لئے ادب میں نام پیدا کرنا کسی حسین، خوبصورت اور شوخ دوشیزہ کا دل جیتنے کے مقابلے میں بہت معمولی بات ہے۔''

گستاوَ فلابیَر

(Gustave Flaubert)

19 ویں صدی کا فرانسیسی ناول نگار جس کا اسلوب اپنے ہمعصروں میں سب سے منفرد تھا۔ وہ School of Thought کا پرچارک بھی تھا۔ رومانویت پسند بھی اور حقیقت نگار بھی۔ ''مادام بواری'' اس کا لافانی شاہکار ہے۔ نقادوں کی نظر میں وہ بے مثال ناول ہے۔

پہلا ناول مکمل کیا تو فلابیئر نے ہمیں دعوت دی اور پورا ناول سنا دیا اور پھر کہنے لگا "اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟ ہم نے کہا ہم سب کی ایک ہی رائے ہے۔ اسے آگ کی نذر کر دو اور دوبارہ ناول لکھنے کی کوشش نہ کرنا۔

(میکسم ڈی کیمپ)

....

ناول نگاروں کو فلابیئر کا اسی طرح شکر گزار ہونا چاہیے جس طرح شاعر موسم بہار کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

(جیمز وڈ)

....

جو فلابیئر کی نثر سے واقف نہیں۔ جس نے مادام بواری کا مطالعہ نہیں کیا وہ نہ اچھی شاعری کر سکتا ہے نہ اچھی نثر لکھ سکتا ہے۔

(ایذرا پاؤنڈ)

....

میں محبت تو کرتا ہوں لیکن محبت کو زندگی میں دوسری حیثیت دیتا ہوں۔

(فلابیئر)

گستاؤ فلابیئر

دنیا کے کسی بڑے ادیب کے بچپن کے حالات پڑھ لیجئے۔ ماں باپ کو اس کے ادیب بننے پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے۔ بیشتر والدین نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ کوئی ڈھنگ کا کام کرو لکھنے لکھانے میں کیا رکھا ہے۔ ورجل، ہوریس اور اووڈ کو دیکھ لیں۔ ماں باپ نے ان کے لیے وکالت اور خطابت کا پیشہ چنا، مگر ہومر (Homer) ان کی جان کا عذاب بن گیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے مرید بن گئے اور لکھنے کا پیشہ اختیار کیا۔ فرانسیسی مصنف والٹیئر نے جب شاعری شروع کی تو اس کے باپ سے کسی نے پوچھا:

"آپ کے کتنے بیٹے ہیں"

والٹیئر کے باپ نے جواب دیا:

"دو" (جبکہ بیٹے تین تھے)

ہمکلام ہونے والے نے کہا:

"مگر آپ کے تو تین بیٹے ہیں"

والٹیئر کے باپ نے جواب دیا:

"دو ہی سمجھو، تیسرا شاعری کرنے لگا ہے۔ میری نظر میں تو وہ مر چکا ہے" اکثر ادیبوں کے والدین کو اولاد کے شاعر ادیب بننے پر اعتراض ہی رہا مگر گستاؤ فلابیئر کے باپ نے اسے خود لکھنے کی طرف راغب کیا، چاہے اس نے مجبور ہو کر ہی ایسا کیا مگر فلابیئر کو کہا تمہیں اجازت ہے "دل کھول کر لکھو"

گستاؤ فلابیئر کے والد ڈاکٹر Achille Cleophas اپنے بیٹے کی خراب صحت دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بس ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ اسے یہی کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ فلابیئر کی بھی یہی مرضی تھی کیونکہ لکھنے کی طرف وہ 8 سال کی عمر ہی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ بیماری نے ساری عمر اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور عمر کا زیادہ حصہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ ہی گزارا۔ اگرچہ اسے ماں کی مسلسل نگرانی کی وجہ سے بے شمار جذباتی دھچکوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فلابیئر کا باپ پیرس کے قریب ایک گاؤں (Rouen) کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ فلابیئر اسی گاؤں میں 1821ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ حاصل کی۔ 1840ء میں پیرس قانون پڑھنے گیا۔ پیرس شہر اسے بس یوں ہی لگا۔ لے دے کے ادیبوں سے دوستیاں نبھائیں، ان ادیبوں میں سرفہرست وکٹر ہیوگو تھا۔

فلابیئر نے سیر و سیاحت میں وقت گزارا لیکن جب اسے مرگی کے مسلسل دورے پڑنے شروع ہو گئے تو وہ پیرس چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس دریائے سین (Seine) کے قریب Croisset چلا گیا۔ جہاں وہ 1876ء تک رہا۔ ایک شاعرہ لوی کولٹ (Louise Colet) سے شدید عشق کیا مگر شادی نہ کر سکا۔ ایک مجبوری نے راستہ روکے رکھا اور یہ مجبوری اس کی

ماں تھی۔اس کے بائیوگرافر Emile Faguet کا کہنا ہے کہ محبت تو فلا بیئر نے لوسی کولٹ سے بہت کی مگر یہ شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور فلا بیئر نے کال گرلز اور بُری عورتوں کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔

فلا بیئر کی زندگی میں اس کے دوست میکسم ڈی کیمپ (Maxime du Camp) نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔میکسم اسے لے کر دنیا کی سیاحت پر نکلا۔یونان، مصر، بیروت اور عرب امارات میں وقت گزارا۔قسطنطنیہ کا دورہ کیا۔ان دوروں میں فلا بیئر نے کئی بیماریاں سمیٹیں اور اپنے ناول (Salammbo) کے لیے ڈھیر سارا مواد اکٹھا کیا۔

فلا بیئر نے پہلا عشق پندرہ سال کی عمر میں کیا۔اس کی محبوبہ ایک موسیقار کی بیوی تھی جو ایک بچے کی ماں تھی۔اس کا نام الیسا (Elisa) تھا۔ایک عرصے کے بعد فلا بیئر اس کا نقشہ اپنے ایک خط میں کچھ یوں کھینچتا ہے۔

''لمبا قد، لمبے بال جو اس کے شانوں پر کھلے رہتے تھے۔وہ بہت آہستہ بات کرتی تھی۔اس کی آواز بہت دھیمی اور سُروں میں رچی ہوئی تھی۔اس کی جلد سنہری اور چمکیلی تھی۔اس کی ناک بالکل یونانیوں کی طرح تھی۔آنکھوں میں شعلہ چمکتا تھا۔اس کی بھنویں بہت تیکھی تھیں'' فلا بیئر موسیقار اور اس کی بیوی کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا۔بہت اچھا وقت گزارا مگر محبوبہ سے بات نہ کر سکا۔چھٹیاں گزار کر گھر لوٹا تو اس کتاب میں جو وہ لکھنا شروع کر چکا تھا الیسا کے بارے میں کھل کر باتیں کیں۔فلا بیئر اپنی بہن کیرولین کو بہت چاہتا تھا۔دونوں دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔بیمار فلا بیئر کی زندگی اپنی ماں اور بہن کے ساتھ گزر رہی تھی کہ بچے کی پیدائش کے دوران کیرولین فوت ہوگئی۔فلا بیئر اداس رہنے لگا پھر وہ کیرولین کی تصویر سے ایک مجسمہ بنوانے کے لیے پیرس گیا، وہاں ایک مجسمہ ساز کے سٹوڈیو میں اس کی ملاقات ایک شادی شدہ شاعرہ لوسی کولٹ سے ہوئی۔

لوسی کولٹ ایک موسیقار (Colet) کی بیوی اور پیرس کے ادبی حلقوں میں بہت مشہور تھی۔اس کے وکٹر نامی ایک آدمی سے تعلقات تھے، جس سے اس کا ایک ناجائز بچہ بھی تھا۔فلا بیئر سے وہ 5 سال بڑی تھی۔24 گھنٹے کے اندر اندر فلا بیئر اس پر عاشق ہوگیا۔لوسی کولٹ کی شخصیت شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک جاذبِ نظر شخصیت تھی۔اس سے مل کر شاعر اور ادیب بڑی تخلیقی طاقت حاصل کرتے تھے۔یہی فلا بیئر کے ساتھ ہوا۔لوسی کولٹ (جو جاننے والوں میں (Muser) کے نام سے مشہور تھی) خود بھی فلا بیئر سے مل کر اس کی گرویدہ ہوگئی۔فلا بیئر نے (Croisset) جاتے ہی لوسی کو ایک طویل محبت بھرا خط لکھا اور پھر دونوں میں خطوط نویسی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور باقاعدہ عشق کا سلسلہ چل نکلا۔

لوسی کولٹ چاہتی تھی کہ فلا بیئر پیرس آ کر رہنا شروع کر دے مگر اسے یہ بات قبول نہیں تھی۔فلا بیئر کی ماں کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔فلا بیئر کی بیماریاں خاص طور پر مرگی کی بیماری نے اس کی ماں کو پریشان کر رکھا تھا۔وہ ہر وقت اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔لوسی کولٹ کے ساتھ فلا بیئر کے تعلقات دو تین سال رہے۔حیرت کی بات ہے کہ وہ لوسی سے صرف چھ بار مل سکا۔ایک بار وہ اسے Croisset ملنے آئی جو شاید آخری ملاقات تھی۔لوسی کولٹ کا خاوند فوت ہوا تو لوسی شدت سے فلا بیئر کو پیرس آ کر رہنے پر زور دینے لگی۔وہ انکار کرتا رہا لوسی کولٹ کو یہ بات بہت کھلتی تھی۔اس نے ایک بار فلا بیئر سے کہا ''تمہاری ماں تمہاری ایک کنواری لڑکی کی طرح رکھوالی کرتی ہے۔نہ تم پیرس میں قیام کرتے ہو نہ مجھے ملنے آتے ہو۔شاید تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔''

فلا بیئر نے اسے جواب میں لکھا:

''محبت تو کرتا ہوں لیکن میں محبت کو زندگی میں پہلی نہیں دوسری حیثیت دیتا ہوں۔''

لوسی کولٹ جب اسے اپنی کوئی نظم لکھ کر بھیجتی تو فلا بیئر اس پر بہت بُری تنقید کرتا تھا۔جب لوسی کولٹ نے اسے شادی کرنے پر زور دیا تو فلا بیئر نے صاف صاف کہہ دیا۔

''اپنے لیے کوئی اور آدمی ڈھونڈ لو۔''

لیکن لوسی شادی اسی سے ہی کرنا چاہتی تھی، حالانکہ اس بچے کے باپ وکٹر نے اسے شادی کے لیے پیش کش کی تھی۔

آخر میں لوسی کولٹ فلا بیئر سے ملنے کے لیے Croisset چلی گئی۔فلا بیئر نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا۔فلا بیئر کی ماں کو بھی اسکی یہ بات بہت بُری لگی۔لیکن فلا بیئر کو بیماری نے نفسیاتی مریض اور چڑ چڑا بنا دیا تھا۔

لوسی کولٹ نے اس ملاقات کے بعد فلا بیئر سے قطع تعلق کر لیا۔شاعری چھوڑ کر ایک ناول لکھا جس میں فلا بیئر کا بُرا کردار پیش کیا لیکن یہ ناول بُری طرح لکھا گیا تھا۔اسی لیے اس کے ساتھ قارئین نے بہت بُرا سلوک کیا۔فلا بیئر لوسی کولٹ کی محبت سے فارغ ہو کر اپنے پہلے باقاعدہ ناول La Tentation Estantoine جس کا انگریزی عنوان (The Temptation of St. Antony) کی طرف متوجہ ہوا۔

جب یہ ناول مکمل ہوگیا تو اس نے اپنے دوستوں میکسم کیمپ اور (Bouilhet) کو اپنے پاس بلوایا اور مسلسل چار دن یہ ناول پڑھ کر سنایا۔آخری دن وہ ساری رات ناول پڑھتا رہا اور دونوں دوست خاموشی سے سنتے رہے۔ان کی طرف دیکھ کر فلا بیئر نے میز پر ایک زوردار مکہ مارا اور کہا:

''اب کہو۔تم کیا کہتے ہو''

دونوں دوستوں نے بیک زبان کہا:

"We think you outh to throw it on the Fire and not Speak of it Again"

دونوں دوستوں کی یہ بات سن کر فلا بیئر سیخ پا ہوگیا۔دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنے ناول کے لیے کوئی ایسا موضوع تلاش کرو جو روزمرہ زندگی کے قریب ہوں جس کے کردار عام زندگی سے تال میل رکھتے ہوں۔

یہ مشورہ سن کر وہ دوستوں کے ساتھ پھر سیاحت پر چلا گیا۔1850ء میں واپس آ کر اس نے ''مادام بواری'' پر کام شروع کر دیا۔اس پر اس نے 5 سال صرف کئے اور یہ اس کی تخلیقی زندگی کا ایک شاندار کارنامہ ثابت ہوا۔

مادام بواری کی کامیابی کے بعد اس نے بقول اس کے اپنے لافانی شاہکار پر کام شروع کیا۔یہ اس کا ناول سلیمبو تھا۔جس میں اس نے (Carthage) کے تمام سفری تجربات شامل کر دیئے۔اس کتاب کو اس نے 1862ء میں شائع کیا لیکن اسے مادام بواری جیسی پذیرائی نہ ملی۔

اپنا ناول Sentimental Education اس نے سات سال میں مکمل کیا۔''تین کہانیاں'' کے نام سے اس کی کتاب 1877ء میں چھپی۔فلا بیئر کی آخری کتاب Bouvard et Pecuchet جسے وہ اپنی اعلیٰ ترین تخلیق کہتا تھا اس کی موت کے بعد چھپی۔یہ انسانی دانش اور علم پر بہت بڑی طنز تھی۔اس پر بہت بُرے تبصرے ہوئے اور یہ کتاب نقادوں کی بے توجہی کا شکار ہو کر رہ گئی۔

فلا بیئر بڑے زرخیز ذہن کا مالک تھا۔وہ بیک وقت مختلف School of Thoughts کا پرچارک تھا۔بحیثیت

مصنف وہ رومانویت پسند بھی تھا اور حقیقت نگار بھی۔ حقیقت نگاری نے فلا بیئر کی تحریروں ہی سے ابتدائی سفر شروع کیا۔ اس نے اپنے اسلوب کو نکھارنے کے لیے بہت محنت کی۔ کبھی کبھی تو وہ ایک صفحے پر دو دو ہفتے محنت کرتا تھا۔ اس کے خطوط پڑھ کر دیکھ لیں تو پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنا اسلوب بنانے کے لیے کتنی جانفشانی سے کام کیا۔

ایک نقاد اس کے بارے میں کہتا ہے:

"His Style was Achieved Through the Unceasing sweat of his brow"

اس کے اسلوب نے اپنے بعد آنے والے ناول نگاروں کو بے حد متاثر کیا۔ اس فہرست میں موپساں، زولا، ترگنیف، سارتر اور کافکا کے نام نمایاں ہیں۔ مشہور نقاد جیمز وڈ (James Wood) اپنی کتاب How Fiction Works میں کہتا ہے:

"Novelists Should Thank Flaubert the way poets thank spring"

فلا بیئر کے قریبی دوست مصنف میکسم کیمپ کا خیال تھا کہ فلا بیئر نے اپنے آپ کو Croisset کے مقام پر قید کر کے اپنے تجربات اور مشاہدات کو محدود کر لیا ہے۔ اسے پیرس میں آ کر رہنا چاہیے تھا تا کہ لوگوں سے مل کر زندگی کا وسیع تجربہ حاصل کرتا اور اپنے ناولوں کے لیے مواد حاصل کرتا۔ وہ دنیا کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ اس نے ساری زندگی اپنی ماں کی گود میں گزار دی۔ اگر کبھی نکلا بھی تو لوسی کے پاس چلا گیا لیکن اس سے ہاتھ چھڑا کر پھر ماں کے پاس چلا آیا۔ کیمپ نے لوسی کو خط میں لکھا۔

''فلا بیئر چار سال میں احمق بن جائے گا''

فلا بیئر نے اس بات کا بہت بُرا منایا اور جواب دیا کہ وہ جو زندگی گزار رہا ہے اس کے لیے موزوں ہے اور وہ اس زندگی سے مطمئن ہے۔ فلا بیئر نے اسی زندگی سے اپنے ناولوں کا مواد اکٹھا کیا اور ''مادام بواری'' جیسا عظیم ناول لکھ دیا اور کیمپ نے اس ناول کو قسط وار رسالے (Revue de Paris) میں شائع بھی کیا۔

میں نے پہلے لکھا ہے کہ جب فلا بیئر نے اپنے دونوں دوستوں کو اپنا ناول The Temptation of St. Antony پڑھ کر سنایا اور انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ اسے آگ میں پھینک دو تو فلا بیئر دوسرے ناول کے لیے کہانی کا پلاٹ تلاش کرتا رہا۔ اس کے دوست Bouilhet نے اسے ایک ہاؤس سرجن کی کہانی سنائی جو فلا بیئر کے باپ کے ساتھ Rouen ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ اس کا نام Delamare تھا۔ وہ ایک گاؤں میں پریکٹس کرتا تھا۔ جب اس کی بیوی فوت ہو گئی تو اس نے ایک نوجوان خوبصورت دوشیزہ سے شادی کر لی۔ وہ بہت فضول خرچ تھی۔ وہ جلد ہی اپنے ادھیڑ عمر خاوند سے اُکتا گئی اور مختلف نوجوان لڑکوں سے تعلقات قائم کرنے لگی۔ فضول خرچی کی انتہا کر دی اور مقروض ہو گئی۔ جب حد سے بڑھے ہوئے قرضے ادا نہ کر سکی تو زہر کھا لیا اور مر گئی۔ ڈاکٹر Delamare بیوی کی بدنامی برداشت نہ کر سکا اور اس نے خودکشی کر لی۔ فلا بیئر نے اس کہانی سے اپنی کتاب کا مواد حاصل کیا اور ''مادام بواری'' لکھ ڈالا ''مادام بواری'' 1856ء میں پیرس کے ایک رسالے (Revue de Paris) میں قسط وار چھپنا شروع ہوا جبکہ مکمل کتاب 1857ء میں چھپی۔

کتاب کے آغاز میں ہمارا تعارف چارلس بواری سے ایک سکول میں پڑھنے والے لڑکے سے ہوتا ہے۔ اس نے ایک ٹوپی پہنی ہوتی ہے جو اس کی بدصورتی میں اضافہ کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس نے یہ ٹوپی متوسط طبقے کی علامت کے طور پر پہنی تھی۔ چارلس بواری، نا اہل احمق اور میلا کچیلا لڑکا ہے لیکن ہمدرد اور صاحب دل ہے۔ وہ

میڈیکل سٹوڈنٹ ہے۔ دوبارہ امتحان میں ناکام ہو کر آخر ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیتا ہے۔ چارلس کی ماں اس کی شادی ایک 47 سالہ خبطی عورت سے کر دیتی ہے جو ہر وقت چارلس کی جاسوسی کرتی ہے۔ وہ ادویات کھاتی ہے اور جنس زدہ عورت ہے۔ ایک دن وہ مر جاتی ہے اور چارلس (Emma) نامی جوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ جو ایک کسان کی بیٹی ہے۔ اس کے باپ کا علاج چارلس نے کیا تھا۔ چارلس نے اس کے باپ کی ٹوٹی ٹانگ کو جوڑا۔ ایما کے باپ نے خوش ہو کر ایما اور چارلس کی شادی کر دی۔

ایما بواری ایک کم پڑھی لڑکی تھی۔ اس نے کرائے کی لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھی تھیں۔ وہ خوابوں اور حقائق کے درمیان کھڑی ایک بے وقوف لڑکی تھی۔ شاید چرچ میں (Nun) بن جاتی مگر اسے چرچ صرف لان میں کھلے پھولوں کی وجہ سے پسند تھے۔ چرچ کے اصول وقواعد سے اسے نفرت تھی۔ فلا بیئر نے اسے ایک احمق اور المیہ کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جارج سینٹ بری (George Saint Boury) کی نظر میں ایما کا کردار ایسا کردار تھا جو بہت سے آدمیوں میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن ان میں سے اسے پسند ایک بھی نہیں۔ وہ اپنے ہی بُنے ہوئے جال میں پھنس جاتی ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

چارلس بواری سے شادی کے بعد اس پر زندگی کے کئی اور دروازے کھلتے ہیں۔ ایک ڈانس روم میں جا کر اسے آسائش اور رنگ برنگی زندگی کی چکا چوند بہت متاثر کرتی ہے۔ شادی کے بعد وہ ایک بچی برتھ (Berthe) کو جنم دیتی ہے۔ خاندان Rouen سے 20 میل دور ایک شہر میں چلا جاتا ہے۔ جہاں جا کر وہ ایک نوٹری کلرک سے تعلقات قائم کر لیتی ہے جو جلد ہی پیرس چلا جاتا ہے چارلس بواری کی ماں بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ ایما بواری اس کی طنز بھری باتوں سے اُکتا چکی ہے۔ چارلس سے بھی اس کا دل بھر چکا ہے۔ وہ دونوں کے سلوک سے فرار حاصل کرنے کے لیے لوگوں سے تعلقات قائم کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک زمیندار روڈ ولف بولنجر سے وہ تعلقات پیدا کر دیتی ہے جو بہت چالاک ہے اور عورتوں کو کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اس کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بھی بناتی ہے لیکن روڈلف چالاکی سے ٹال دیتا ہے۔ چارلس بواری کی ماں کو ایما بواری کی حرکات پر اعتراض ہے وہ اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ وہ ایما کی فضول خرچی اور رومانوی کتابیں پڑھنے پر پابندی لگائے لیکن اب ایما بواری حد سے گزر چکی ہے۔ اس کی جنسی بے راہروی اور فضول خرچی کا گراف بہت بلندی پر جا چکا ہے۔ چرچ، بگھی اور پناہ گاہ اس کے لیے جنسی میدان ہیں۔ فضول خرچی اور قرض خواہوں کے تقاضے حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ اب ایما بواری پریشانی میں ہر جاننے والے سے قرض اتارنے کے لیے پیسے مانگتی پھر رہی ہے۔ روڈولف کی بے وفائی سامنے آ چکی ہے۔ اپنے پرانے عاشقوں سے مدد مانگتی ہے مگر بے سود۔ اسے اب Lheureux کا قرض اتارنا ہے۔ ایما بواری کو خوف ہے کہ بات چارلس اور اس کی ماں تک نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ جب اس کی پریشانی حد سے بڑھتی ہے تو وہ Homais کے سٹور سے (Arsenic Powder) چرا کر یہ زہر اپنے منہ میں بھر لیتی ہے اور گھر جا کر کمرے میں ایک عبرت ناک موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ ایما مر رہی ہے اور باہر ایک فقیر ایک جنسی گیت گا رہا ہے۔

چارلس بواری بہت غم زدہ ہے، وہ اُداس ہے اور ایما نے جو قرض Lheureux سے لیا تھا اس کے بلوں پر دستخط کر رہا ہے۔ اب اس پر اپنی بیوی کی بے وفائی اور بے راہروی کا راز کھل چکا ہے۔ چارلس بواری اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکتا اور کچھ عرصے کے بعد وہ بھی مر جاتا ہے۔

''مادام بواری'' چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو پبلشر اور مصنف دونوں کو عدالت میں بلا لیا گیا۔ ناول پر بہت لے دے ہوئی، سرکاری وکیل نے عدالت میں کتاب کے کچھ پیراگراف پڑھ کر سنائے اور کتاب پر بداخلاقی اور فحاشی کے الزامات عائد کر دیئے۔ وہ تمام باتیں جو آج کے ناولوں میں موجود ہیں جنہیں فلابیئر کے بعد بڑے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کا حصہ بنایا۔ 1875ء میں سرکاری وکیل نے فحش اور قابل گرفت قرار دے دیا...... وکیل صفائی نے پبلشر اور فلابیئر کی حمایت میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ یہ ناول فحاشی اور بداخلاقی کے زمرے میں نہیں آتا۔ فلابیئر نے اس ناول میں فرانس کی سوسائٹی اور اس میں رہنے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ مادام بواری ایک عورت کی بدکاریوں کی داستان ہے جو آخر میں ایک بُرے انجام سے دوچار ہوتی ہے۔ ایک عورت کی کہانی ہے جس کے خواب حقیقی دنیا سے ٹکراتے ہیں اور چکنا چور ہوتے ہیں۔ یہ ناول لکھ کر فلابیئر نے دوسرے لکھنے والوں کو Realistic ناول لکھنے کا ایک انداز بتایا ہے۔ ایک نئے اسلوب کا آغاز کیا ہے۔ جو پیراگراف اس میں سے نکال کر عدالت میں پیش کیے گئے، ان کی شمولیت ناول میں ضروری تھی۔ یہ سب ایک کردار کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کردار کو سوسائٹی کے اخلاقی اصول توڑنے کی سزا ناول کے آخر میں مل جاتی ہے۔

عدالت نے وکیل صفائی کے ان دلائل سے متاثر ہو کر پبلشر اور مصنف کو باعزت بری کر دیا اور ''مادام بواری'' کو ساری دنیا نے فلابیئر کا ایک شاہکار تسلیم کر لیا۔

فلابیئر کے اس ناول کو شروع میں لوگوں نے سمجھا نہیں لیکن مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے عظیم شاہکار تسلیم کر لیا گیا۔ فلابیئر کے اسلوب اس کی بھرپور فنی صلاحیت کے سامنے سب نے سر جھکا دیئے۔ مشہور نقاد شاعر ایذرا پاؤنڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا:

''جو فلابیئر کی نثر سے واقف نہیں، جس نے ''مادام بواری'' کا مطالعہ نہیں کیا وہ نہ اچھی شاعری کر سکتا ہے نہ اچھی نثر لکھ سکتا ہے......''

ایک نقاد نے زور دے کر کہا:

''اگر فلابیئر نہ ہوتا تو موپساں بھی نہ ہوتا۔ موپساں فلابیئر کو پڑھ کر ہی موپساں بنا''

فلابیئر نے اپنی نثر کو سنوارنے اور پختہ بنانے کی طرف بہت دھیان دیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب میں اپنی تحریر میں چیزوں کو بار بار دہراتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں ایک لفظ ایک صفحے پر دوبارا استعمال نہیں کرتا۔

فلابیئر لکھنے سے پہلے سوچتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، پھر وہ لکھتا تھا اور پھر لکھ کر پڑھتا تھا کہ جو میں نے سوچا، کیا میں نے ایسا ہی لکھا ہے، ایک خط میں وہ اپنے دوست Du Camp کو لکھتا ہے:

''پیر اور منگل کا پورا دن میں نے صرف دو سطریں لکھنے میں صَرف کیا......''

شاید نثر کا یہی انداز پڑھ کر ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ جس نے فلابیئر کی نثر نہیں پڑھی وہ اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔

''مادام بواری'' کے ایک منظر میں فلابیئر نے چارلس بواری اور ایما بواری کو زراعت کے ایک جلسے میں کھڑکی کے پاس لوگوں کے ساتھ بیٹھا دکھایا ہے۔ جہاں اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تقریریں سن رہے ہیں اور کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس جگہ کی فضا لوگوں کی نفسیات، ان کے انداز کو دکھانا، شاید کچھ مصنفین کے لیے اتنا مشکل نہ ہو مگر 27 صفحات کی اس تفصیل کو بیان کرنے کے لیے فلابیئر نے 2 مہینے صرف کیے۔

فلابیئر نے اپنے اسلوب کا یہی ورثہ بعد میں آنے والے ناول نگاروں کے لیے چھوڑا۔

مادام بواری لکھتے ہوئے فلابیئر اکثر کہا کرتا تھا کہ میں نے ناول میں اپنی طرف سے کچھ نہیں ڈالا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ناول نگار اپنے آپ کو ناول سے الگ نہیں کر سکتا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے دنیا کو ایسے دیکھا ہے جیسے خدا نے اسے بنایا ہے۔ اسے بہتر صورت میں دیکھ کر میں خدا سے زیادہ ذہین نہیں بننا چاہتا۔

لیکن اس کے باوجود فلابیئر نے ''مادام بواری'' کے کردار میں اپنی شاعر محبوبہ لوسی کولٹ کے کرداروں کی جھلک دکھا دی۔ لوسی کا Romantic رویہ۔ اس کی جذباتی کیفیت اور اس کا محبت میں والہانہ پن، لیکن ''مادام بواری'' کی طرح وہ احمق اور بے وقوف نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے ''مادام بواری'' کی طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔ اپنی ماں کے کردار کی جھلک بھی کہیں کہیں چارلس بواری کی ماں کے کردار میں دکھائی دیتی ہے۔

''مادام بواری'' ایما بواری کی بدقسمتی کی کہانی ہے۔ یہ المیہ نہیں بدقسمتی اور بدنصیبی کا قصہ ہے۔ تمام رونما ہونے والے واقعات بدنصیبی کی ایک داستان مرتب کرتے ہیں۔

یہ ایما کی بدقسمتی ہے کہ اس کی شادی چارلس بواری جیسے احمق آدمی سے ہوئی۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اسے بیٹے کی خواہش تھی مگر اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس کا عاشق روڈ ولف بے وفا ثابت ہوا۔ یہ بھی بدقسمتی ہے کہ اسے جو چاہنے والا ملا خود غرض نکلا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ فضول خرچی نے اسے قرضوں کے بوجھ تلے دبا دیا۔ روڈ ولف نے اسے پیسے نہ دیئے اور ذلیل کیا اور یہ ساری بدقسمتیاں اسے موت کی گود میں لے گئیں۔

''مادام بواری'' اپنے اسلوب، نثر کی خوبصورت بُنت اور واقعات کی ترتیب، کرداروں کے بھرپور تاثر کی بنا پر ایک عظیم ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول سے دنیا کے بے شمار ناول نگاروں نے اثر قبول کیا اور اس طرز پر ناول لکھے۔ کسی نے اس کی کہانی سے استفادہ کیا، کوئی فلابیئر کی نثر کے بہاؤ میں بہہ گیا۔ یہ ناول کل بھی شوق سے پڑھا جاتا تھا اور آج بھی قارئین اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اپنی ماں کی وفات کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے پیرس چلا آیا۔ پیرس میں اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جہاں وہ اپنے ملنے والوں کو کھانے پر مدعو کرتا اور ان سے ادبی گفتگو کرتا۔ پیرس میں قیام کے دوران بھی وہ ذہنی طور پر اپنے گاؤں ہی میں تھا۔ بقول ایک دوست کے کہ پیرس میں رہ کر بھی وہ اتنا ہی ''دیہاتی اور اُجڈ'' تھا جتنا Corisset میں۔ جب کبھی وہ کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتا تھا تو سب سے پہلے ایک خالی کمرہ بک کراتا تھا۔ وہ شور اور سب کے سامنے کھانا کھانے میں شرم محسوس کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ کوٹ اور جوتے اتار کر کھانا کھاتا تھا جو ریسٹورنٹ کے ہال میں ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ہمیشہ کمرہ بک کرا لیتا تھا تاکہ آسانی سے کھانا کھا سکے۔ پیٹ بھر کے کھانا کھا کر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اسے گھر پہنچانا موپساں کے فرائض میں شامل تھا۔

فلابیئر نے آخری عمر میں بہت سے عجیب و غریب اعترافات کیے۔ مثلاً ایک بار اس نے دوستوں کی محفل میں اعتراف کیا۔ ''میری زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں لیکن میں اب تک کنوارا ہوں۔ عورتوں کی حیثیت میرے نزدیک ''موٹے گدوں'' سے زیادہ نہیں رہی۔''

فلابیئر کی اس بات میں سچائی ہو سکتی ہے کیونکہ اس نے زندگی میں صرف ایک عورت سے محبت کی۔ جو اس کی پہلی اور آخری محبت ثابت ہوئی اور فلابیئر اس عورت کو حاصل نہ کر سکا۔ اس عورت کا نام الیسا Elisa تھا۔ موسیقار

موپساں

(Guy de Maupassant)

انیسویں صدی کا فرانسیسی ناول نگار، افسانہ نویس ،معاشرتی اور مجلسی زندگی کا سچا اور کھرا لکھاری۔اس نے جنس زدہ معاشرے کی عکاسی کی اور جنس کے موضوع پر کھل کے بات کی۔وہ اپنے عہداور آنے والے عہد کا سب سے بڑا کہانی کار تھا۔

Schlesinger کی بیوی الیسا۔ جسے فلا بیئر 15 سال کی عمر میں ملا اوراس سے اظہار محبت نہ کر سکا۔فلا بیئر نے اسے ساری عمریاد رکھا۔1871ء میں جب الیسا کا خاوندفوت ہوگیا تو فلا بیئر نے اسے پہلا اور آخری خط لکھا۔جو بہت ہی مختصر تھا۔

"My old Love , my only Loved one"

الیسا(Elisa) یہ خط پڑھ کر اسے ملنے کے لیے آئی۔سب کچھ بدل چکا تھا۔فلا بیئر کا چہرہ زرد تھا اور ڈھل چکا تھا۔موٹی موٹی مونچھوں نے اس کے دہانے کو چھپا رکھا تھا۔گنجے سر پر ٹوپی تھی۔پیٹ باہر نکل آیا تھا۔الیسا(Elisa) دُبلی ہو چکی تھی۔بال سفید ہو گئے تھے۔جلد کا سنہری پن زرد پڑ گیا تھا۔دونوں اس کے بعد صرف ایک بار ملے۔

میکسم ڈی کیمپ لکھتا ہے کہ فلا بیئر کی موت سے ایک سال پہلے وہ اور فلا بیئر کھانا کھا کر چہل قدمی کے لیے نکلے۔راستے میں کئی لوگ ملے اور فلا بیئر کو سلام کیا۔ایک درخت کے نیچے ایک خاتون نے جھک کر فلا بیئر کو سلام کیا اور ایک اداس سی مسکراہٹ لبوں پر تیر گئی۔یہ خاتون الیسا تھی۔

عشق ومحبت کے اس کھیل میں فلا بیئر، میر تقی میر جیسا کھلاڑی تھا۔جسے چاہا اسے عمر بھر یاد رکھا۔دل ایک بار جس کھونٹی سے اٹکا ساری زندگی اسی سے اٹکا رہا۔میر تقی میر''دلِ پرخوں'' کی سرشاری ساری عمر اپنی پہلی محبت کے گیت گاتے رہے۔فلا بیئر نے بھی الیسا کو ساری زندگی فراموش نہیں کیا۔اپنے ناولوں کے نسوانی کرداروں میں اسے سموتا رہا۔

فلا بیئر کا ناول(Sentimentle Education) اگرچہ''مادام بواری'' کی طرح قارئین میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا لیکن بعض نقاد اسے فلا بیئر کا شاہکار قرار دیتے ہیں۔

یہ ناول1830ء کے فرانس کے سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے جب Louis Phillip فرانس کا بادشاہ بنا اور اس ناول کا سارا Back - Drop سیاسی ہے لیکن مرکزی کہانی فریڈرک(Frederic) اور میڈم Arnoux کی محبت کی کہانی ہے جو شادی شدہ ہے اور فریڈرک جو عمر میں چھوٹا ہے اس سے عشق کرتا ہے۔اس ناول کے سارے جذباتی مناظر فلا بیئر کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔اس ناول کی ہیروئین الیسا(Elisa) ہے جسے فلا بیئر نے پندرہ سال کی عمر میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔فلا بیئر نے اس ناول میں اپنی پہلی محبت کو موضوع بنایا ہے۔اپنے کردار کو فریڈرک اور الیسا کے کردار کو میڈم Arnoux کا نام دے دیا ہے۔

فلا بیئر نے آخری سال بیماری اور تنہائی سے لڑتے ہوئے گزارے۔حد سے بڑھ کر تمبا کو نوشی کی۔کھانا بہت کم کھایا اور شراب جی بھر کر پی۔نہ سیر کی نہ ورزش۔اس کا جسم بھدا ہوتا گیا۔اخراجات بڑھ گئے، آمدنی گھٹ گئی،8 مئی 1880ء کو اس کی نوکرانی گیارہ بجے صبح اس کی لائبریری میں گئی تو وہ صوفے پر لیٹا تھا اور بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔وہ دوڑ کر گئی ڈاکٹر کو لے کر واپس آئی تو فلا بیئر مر چکا تھا۔

فلا بیئر کے دوست اسے احمق اور بے وقوف کہتے رہے۔اسے پیرس آ کر رہنے کا مشورہ دیتے رہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ گاؤں میں رہ کر وہ احمق بن جائے گا مگر اس نے ان کی بات نہ مانی اپنے نظریے پر قائم رہا اور ہمیشہ کہتا رہا۔

"To be stupid, and Selfish, and to have good Health are the three Requirements for Happiness."

بیماریاں اسے اندر سے نوچتی رہیں مگر وہ اپنے نظریئے پر قائم رہا اور اپنے آپ کو ایک خوش قسمت آدمی تصور کرتا رہا اور اسی خوش فہمی میں اس نے لائبریری میں اپنی پسندیدہ کتابوں کے حلقے میں جان دے دی۔

موپساں کی ماں نے موپساں کا ہاتھ فلا بیئر کے ہاتھ میں دے کر کہا ''لے فلا بیئر یہ تیرا ہوا اسے لکھنا سکھا دے'' اور فلا بیئر کی تربیت نے اسے سب سے بڑا کہانی نویس بنا دیا۔

....

اگر مجھے اس صدی کا کوئی مصنف منتخب کرنا ہو تو میں موپساں کا نام لوں گا۔

(نطشے)

....

موپساں بہت زود نویس تھا اس نے پیسوں کے لئے دھڑا دھڑ افسانے لکھے، لیکن اس کے باوجود نقادوں کی نظر میں وہ کم درجے کا مصنف نہیں تھا۔

....

موپساں کی حقیقت پسندی اور نیچرل ازم نے ساری دنیا کے ادیبوں کو متاثر کیا۔

ہنری رینے گائی ڈی موپساں

فلا بیئر کی عجیب وغریب عادات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ جب بھی کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتا تو ایک کمرہ کرائے پر لے لیتا تھا۔ لوگوں کے سامنے وہ کھانا کھاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ کمرے میں جا کر کوٹ اُتارتا' جوتے اُتار دیتا۔ بنیان قمیض اُتار کر ایک طرف رکھ دیتا۔ پھر شراب پیتا اور پیٹ بھر کر کھانا کھاتا جب کھا کر مدہوش ہو جاتا اور لڑکھڑانے لگتا تو اس کو سہارا دے کر گھر حفاظت سے لانے کا فریضہ اُس کا ہونہار شاگرد ادا کرتا تھا۔ یہ شاگرد کوئی اور نہ تھا۔ سترہ سالہ موپساں تھا۔

جس کا ہاتھ فلا بیئر کے ہاتھ میں دے کر موپساں کی ماں نے کہا تھا:

''لے فلا بیئر یہ تیرا ہوا۔ اسے لکھنا سکھا دے''

فلا بیئر نے موپساں کی ماں کی یہ بات سنی اور موپساں کو دنیا کا ایک بڑا کہانی نویس بنا دیا۔

موپساں کی ماں مادام (Lee Poittevin) اور اس کے باپ Gustave de Maupassant کے مزاج اور عادات میں بڑا فرق تھا۔ موپساں کی ماں ادبی اور شعری ذوق رکھتی تھی' پیرس کے ادیبوں اور شاعروں سے اس کا ملنا جلنا تھا۔ انگریزی کلاسیک ادب سے شُد بدھ رکھتی تھی۔ شیکسپیئر اُس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ موپساں کا باپ ایک سٹاک بروکر تھا۔ دونوں خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر موپساں کا باپ سب کچھ رکھتے ہوئے ادبی ذوق اور حس لطیف سے دور تھا۔ موپساں کی ماں اس کے باپ کے دو بچوں کی ماں بنی مگر پھر اس کے ساتھ گزارا مشکل سمجھا۔ وہ ایک آزاد خیال عورت تھی۔ عورت کا خاوند سے طلاق لینا اس زمانے میں بہت معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اس نے یہ معاشرتی اور سماجی بدنامی مول لی اور طلاق لے لی۔ اپنے دو لڑکوں کو ساتھ لے کر الگ رہنا شروع کر دیا۔ اس کا چھوٹا بیٹا 5 سال اور بڑا بیٹا موپساں 11 سال کا تھا...... جب 17 سال کا ہوا تو اسے ماں نے فلا بیئر کی شاگردی میں دے دیا۔

ہنری رینے گائی ڈی موپساں (Henri Rene Guy de Maupassant) 5 اگست 1850ء کو نارمنڈی (فرانس) کے مقام پر پیدا ہوا۔ صرف 42 سال زندہ رہا اور 6 جولائی 1893ء کو فوت ہو گیا۔ بہت مختصر زندگی پائی مگر مختصر کہانی اور افسانے کا امام کہلایا۔ وہ جدید افسانے میں حقیقت نگاری اور نیچرل ازم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ سب فلا بیئر کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ فلا بیئر اس کا گرو اور گاڈ فادر تھا۔ لکھنے اور کہانی کہنے کے ڈھنگ میں اس نے موپساں کو عملی اور فکری تربیت دی۔ جملے کی ساخت اور الفاظ کے استعمال کے گر سکھائے' کہانی شروع کرنے اور اسے احسن طریقے سے ختم کرنے کا طریقہ سمجھایا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کی...... الفاظ سے تصویر بنانے کا فن' الفاظ کو برمحل استعمال کرنے کا گر اور سادہ طرزِ تحریر' جملے کا اختصار۔ فلا بیئر کی بتائی ہوئی یہ باتیں اس نے پلّے باندھ لیں اور پھر اپنی محنت اور لگن سے وہ دنیا کا بڑا افسانہ نویس بن گیا۔ فلا بیئر اس کی تحریروں کی بار بار کانٹ چھانٹ کرتا تھا۔ ایک ہی موضوع پر اس سے بار بار کہانی لکھواتا تھا...... ایک بار موپساں نے ایک ڈراما لکھا۔ فلا بیئر نے اپنے گھر سب دوستوں کو اکٹھا کیا

(ان میں ایملی زولا بھی تھا) اور پھر موپساں کو یہ ڈراما اسٹیج کرنے کے لیے کہا۔ موپساں کی اچھائیاں ادبی دوستوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے فلابیئر اکثر ایسا کیا کرتا تھا۔ فلابیئر کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ موپساں کو ان ادبی لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور اس کی ادبی صلاحیت کو بہت تقویت ملی۔ روسی ناول نگار ترگنیف جو فلابیئر کا دوست تھا۔ موپساں کے مداحوں میں شامل تھا۔ موپساں کو ٹالسٹائی سے ادبی طور پر متعارف کرانے والا ترگنیف ہی تھا۔ اس نے موپساں کی کہانیوں کی کتاب روس جا کر ٹالسٹائی کو پیش کی اور موپساں کی بے حد تعریف کی۔ ٹالسٹائی نے موپساں کی کہانیوں کے روسی ترجمے کا دیباچہ لکھ کر موپساں کے فن کو بہت سراہا ہے۔

موپساں کا بچپن دیہاتی ماحول میں گزرا۔ جنگل دریا اور خوبصورت فطری نظاروں میں اس نے وقت گزارا۔ سمندر میں کشتی رانی کی۔ مچھلیاں پکڑنے وہ سمندر میں بہت دور نکل جاتا تھا۔ سمندری سفر کا شوق ساری زندگی اس کے ساتھ رہا۔ ایک بار نارمنڈی کے ساحل پر مشہور شاعر چارلس سونبرن (Charles Swinburne) سمندر میں ڈوبنے لگا تو موپساں نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی...... پہلی بار ایک اسکول میں داخل ہوا تو مذہب کے بارے میں اپنے منفی خیالات کی بنا پر اسکول سے نکال دیا گیا۔ دوسرے اسکول میں جا کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ شاعری میں دلچسپی لی اور ادب کا مطالعہ کیا۔ بی۔ اے کرتے ہی فرانس اور پروشیا کی جنگ چھڑ گئی۔ موپساں نے رضا کارانہ طور پر جنگ میں اپنا نام لکھوا دیا...... 1871ء میں جنگ سے فارغ ہو کر پیرس آ گیا اور نیوی کے محکمے میں دس سال کلرکی کرتا رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فلابیئر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے ادب اور صحافت کے میدان کا کامیاب کھلاڑی بنا دیا۔ زولا اور ترگنیف کی صحبت میں بٹھایا حقیقت نگاری اور نیچرل ازم کے سکول کے دروازے اس پر کھولے۔ اس نے اسی زمانے میں اخباروں کے لیے لکھا، ناول اور افسانہ نویسی کی طرف دھیان دیا۔

1880ء کی دہائی کا زمانہ موپساں کے تخلیقی عروج کا زمانہ ثابت ہوا۔ اس نے اپنا پہلا ناول Boule de Suif اسی زمانے میں لکھا۔ جسے فلابیئر نے زندہ رہنے والا شاہکار قرار دیا۔ ''مادام فی فی'' اور Mother Savage جیسی کہانیاں لکھیں اس زمانے میں اس نے بے حد دولت بھی کمائی۔ تخلیقی اور اقتصادی صلاحیتوں میں توازن قائم کیا۔ ادب بھی لکھا اور پیسے بھی کمائے...... کہانیوں کا مجموعہ La Maison Tellier چھپا تو دو سال میں 12 ایڈیشن آ گئے...... ناول (Vieune) جس کا انگریزی نام A Woman's Life) کی ایک سال میں 25000 کاپیاں بک گئیں...... ناول بل ایمی (Bel Ami) شاہکار ثابت ہوا۔ چار مہینے میں 37 ایڈیشن چھپ گئے۔

بل ایمی (Bel Ami) پیرس کی معاشرتی اور مجلسی زندگی کی حقیقی اور کھری تصویر ہے۔ پیرس کی مجلسی زندگی شادی شدہ عورتوں کے معاشقوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں مردوں کا ایک ایسا گروہ نظر آتا ہے جو دیہاتوں سے پیرس میں داخل ہوتا ہے۔ دولت اور مقام حاصل کرنے کے لیے وہ شادی شدہ مالدار عورتوں سے عشق کرتا اور سوسائٹی میں اپنا مقام پیدا کرتا ہے۔ 18ویں اور انیسویں صدی کے کئی ناولوں کا پلاٹ ایسے ہی مردوں اور اُن کی سرگرمیوں پر بُنا گیا ہے۔ روسو کے ''اعترافات'' سے اس کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ پیرس میں جب روسو بیکار زندگی گزارتے گزارتے تھک جاتا ہے تو اسے کافی ہاؤس کا بوڑھا یہی مشورہ دیتا ہے کہ نام کمانا چاہتے ہو تو کسی شادی شدہ مالدار عورت کا سہارا تلاش کرو...... چنانچہ ایسی مالدار عورتیں اسے مل جاتی ہیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے پیرس کی مجلسی زندگی میں مشہور ہو جاتا ہے۔ ستاں دال کا ''سرخ و سیاہ'' کا پلاٹ بھی شادی شدہ عورت اور کنوارے نوجوان کے عشق کی داستان ہے۔ بالزاک کے

''بوڑھا گوریو'' میں بھی ہیرو شادی شدہ عورت سے عشق کرنے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ بل ایمی Bel Ami کی کہانی بھی ایک ایسے مرد کے گرد گھومتی ہے جو دیہاتی علاقے سے پیرس کی زندگی میں آتا ہے اور شادی شدہ عورت کی مدد سے پیرس کی مجلس زندگی کا ایک کامیاب فرد بن جاتا ہے۔

بل ایمی کی کہانی جارج ڈیوررائے کی منفی سرگرمیوں کی کہانی ہے۔ جو ایک غریب آدمی ہے۔ لیکن اپنی چالاکیوں، سازشوں اور منصوبوں سے پیرس کی سوشل سوسائٹی کا ایک طاقتور آدمی بن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اسے اپنی ذہانت اور چالاکی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ ایسی کامیاب منصوبہ بندی کرتا ہے کہ اسے نام، مقام اور دولت مند محبوبہ مل جاتی ہے۔ یہ وہ سب کچھ ہے، جس کے لیے وہ پیرس کی مجلسی زندگی میں داخل ہوا تھا۔

ناول کی کہانی پیرس کے ماحول میں ایک کامیاب اخبار کے مالک، اس کے عملے اور دوستوں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ الجیریا میں تین سال فوجی خدمات سرانجام دینے والے Georges Duroy کی کہانی ہے۔ وہ پیرس میں آتا ہے۔ چھ مہینے کلرکی کرتا ہے پھر اس کی ملاقات اپنے ایک فوجی ساتھی، کامریڈ (Forestier) سے ہو جاتی ہے جو اسے صحافی بننے کا مشورہ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کی رپورٹنگ اور ہلکی پھلکی خبریں اخبار میں دینا شروع کر دیتا ہے اور چیف ایڈیٹر تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ ایڈیٹر اس کی توجہ اہم موضوعات پر مضمون لکھنے کی طرف دلاتا ہے۔ اس کا پہلا مضمون ہی اخبار میں اہم جگہ پاتا ہے اور پھر وہ اہم ترین سوشل، سیاسی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کرتا ہے جو پہلے صفحے پر مرکزی جگہ پاتے ہیں۔ ان تمام مضامین کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہے جو اس کے پرانے فوجی ساتھی کی بیوی ہے۔ Forestier کی بیوی اس کے لکھے مضامین دیکھتی ہے۔ ان کی کانٹ چھانٹ کرتی ہے اور پھر اسے اخبار میں دینے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے حکومت کے سیاسی آدمیوں سے تعلقات ہیں۔ ان سے وہ اہم راز حاصل کرتی ہے اور ان مضامین کا حصہ بناتی ہے اور (Duroy) کو سیاسی اور اہم شخصیتوں سے متعارف کراتی ہے۔ یہ ساری دعوتیں مادام (Forestier) کے ڈرائنگ روم میں ہوتی ہیں۔ جہاں پیرس کی اہم خواتین بھی آتی ہیں۔ ان میں ایک عورت مادام (MME De Marrelle) بھی ہے جو مادام Forestier کی سہیلی ہے۔ ناول کا ہیرو Duroy اس سے عشق شروع کر دیتا ہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مادام (Forestier) سے بھی جسمانی رسم و راہ بڑھانا چاہتا ہے۔ مادام اس کے اس اظہارِ عشق کا جواب نفی میں دیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ ہم اچھے دوست بن کر بہتر وقت گزار سکتے ہیں۔ چند ماہ بعد چارلس (Forestier) کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ مادام اسے لے کر آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے صحت افزا مقام پر لے جاتی ہے۔ اس کی حالت بگڑتی ہے تو وہ (Duroy) کو بلا لیتی ہے۔ چارلس فوت ہو جاتا ہے۔ Duroy مادام کو شادی کی پیش کش کرتا ہے، چند ہفتے سوچ بچار کے بعد مادام اس سے شادی کر لیتی ہے اور مادام Duroy بن جاتی ہے...... شادی کے بعد Duroy اسے اپنے ماں باپ کے پاس نارمنڈی لے جاتا ہے۔ جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہے، مادام وہاں جا کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتی۔ اسے وہ جگہ اور Duroy کے ماں باپ پسند نہیں آتے۔ چنانچہ دو تین دن رہ کر واپس پیرس آ جاتے ہیں۔ جہاں آ کر حالات بدلنے شروع ہوتے ہیں۔

اخبار کا سارا عملہ اس راز سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ Duroy کے مضامین اس کی بیوی لکھتی ہے چنانچہ وہ سب اسے باتوں باتوں میں اس کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور اسے ''بیوی کا دست نگر'' کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ Duroy اس بات سے بہت چڑتا ہے اور وہ اپنی بیوی میڈیلین Madeleine (جو مادام Forestier کا اصلی نام ہے) سے حسد کرنے لگتا ہے

اور اسے طعنہ دیتا ہے کہ وہ اس سے بے وفائی کر رہی ہے۔ جس کا وہ انکار نہیں کرتی۔ (Duroy) کا شک امر بیل کی طرح پھیلنے لگتا ہے۔ اسے مزید ستانے کے لیے وہ اخبار کے مالک کی بیوی مادام والٹر سے تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ کچھ عرصے بعد مادام والٹر کے بے وقت اور لاتعداد جسمانی تقاضوں سے وہ اُکتا جاتا ہے۔ بیوی سے فاصلہ بڑھتا رہتا ہے اور پھر اچانک اسے اپنی بیوی سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ ایک پولیس افسر کو ساتھ لے کر وہ ایک فلیٹ پر جاتا ہے جہاں اس کی بیوی ایک وزیر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ دونوں پکڑے جاتے ہیں اور دونوں پر بدکاری کا مقدمہ قائم ہو جاتا ہے۔

Duroy اب ایک آخری معرکہ مارتا ہے اور اخبار کے ایڈیٹر کی بیٹی سوسین والٹر (Susanne Walter) سے تعلق قائم کر لیتا ہے مادام والٹر اور والٹر بے بس ہیں کیونکہ سوسین والٹر شادی کرنے پر تلی ہوئی ہے...... ناول کے آخر میں Duroy کی شادی سوسین والٹر سے ہو رہی ہے۔ پیرس کی تمام سیاسی اور اہم شخصیات شامل ہیں۔ Duroy اہم ترین آدمی بن چکا ہے۔ لیکن شادی کے وقت بھی وہ اپنی پہلی محبت MME de Marrelle کے بارے میں سوچ رہا ہے وہ بھی شادی میں شامل ہے۔ اسے مبارک باد دیتی ہے اور کہتی ہے کہ شادی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب بھی تم سے ملنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی۔ میں اب بھی تم سے ملتی رہوں گی۔ بیل ایمی اس ناول کے ہیرو کا نِک نیم ہے۔

بل ایمی کو چھپتے ہی بڑی پذیرائی ملی اور چار مہینے میں اس کے 37 ایڈیشن چھپ گئے۔ شاید پیرس کے مردوں اور عورتوں کو اس ناول میں اپنے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔

بل ایمی کا بعض نقادوں نے زولا کے مشہور ناول نانا سے موازنہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں ناولوں میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔ بل ایمی کا ہیرو Duroy دیہات سے آتا ہے۔ غریب ہے اور امیر بننے کے لیے پیرس کی سماجی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔

نانا (Nana) بھی پیرس کی غریب بستی میں پیدا ہوتی ہے۔ حصولِ زر کے لیے وہ جدوجہد کرتی ہے اور پیرس کی سوشل زندگی میں مقبولیت حاصل کرتی ہے اور ایک مقام حاصل کر لیتی ہے۔

بل ایمی کا ہیرو Duroy عورتوں کے لیے ایک کشش رکھتا ہے۔ عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ نانا بھی مردوں کے لیے جنسی کشش رکھتی ہے اور مردوں کا ایک ہجوم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

Duroy اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے عورتوں کو بیساکھی استعمال کرتا ہے جبکہ نانا اپنی منزل پانے کے لیے مردوں کی مدد حاصل کرتی ہے۔ موپساں نے چھ ناول، شاعری کی ایک کتاب' تین سفرنامے اور تقریباً 275 کہانیاں لکھیں۔ پہلے پہل اسے شاعری کا شوق چرایا کتاب چھپی۔ موپساں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ شاعری اس کے بس کا روگ نہیں اور روسی مصنف گوگول کی طرح شاعری سے توبہ کر لی۔ فلابیئر کا مشورہ بھی تھا کہ ''تم افسانے لکھا کرو''۔

موپساں کا شمار دنیا کے عظیم افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ چیخوف بھی اس کی کہانیوں کا معترف ہے۔ موپساں نے معاشرے کے ان مسائل کو موضوعات بنایا جو تلخ حقائق تھے مگر کوئی انہیں لکھنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اس کی کہانیوں کے پس منظر فرانس اور پروشیا جنگ کے متاثرین ہیں۔ دوسرا اہم موضوع جنس ہے۔ جس پر موپساں نے کھل کر لکھا اور سچائی بیان کرنے میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اس کے ناول اور کچھ کہانیاں عدالتی نوٹس کی بدولت Ban بھی کر دی گئیں۔

موپساں کی حقیقت پسندی اور نیچرل ازم نے ساری دنیا کے ادیبوں کو متاثر کیا۔ مختصر انداز میں لکھی گئی کہانیاں' جنسی

مسائل کے باریک بینی کے بیان نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کی تقلید میں ہر زبان میں افسانے لکھے گئے اور موپساں کے بار بار مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے...... اردو میں منٹو کو اس کا پیروکار کہا جا سکتا ہے۔ سمرسٹ ماہم اور او۔ ہنری نے بھی اس کی تقلید میں افسانے لکھے۔ اردو میں راجندر سنگھ بیدی نے ایک مضمون میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسے چیخوف اور منٹو کو اُردو زبان کا موپساں نہ کہا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ منٹو موپساں سے حد درجہ متاثر تھا۔ منٹو نے موپساں کی کہانیوں کے تراجم بھی کیے اور اس سے اثر بھی قبول کیا۔ منٹو کی جو کہانی بھی پڑھی جائے اس کے کسی نہ کسی حصے پر موپساں کا رنگ ضرور نظر آتا ہے۔

موپساں بہت زود نویس تھا۔ اس نے پیسے کے لیے دھڑا دھڑ افسانے اور ناول لکھے۔ اس کے اس انداز پر تنقید بھی کی گئی مگر کچھ نقادوں نے یہ کہا کہ موپساں کو کم درجے کا مصنف نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہر افسانہ لکھنے میں تیز رفتاری سے کام لیا۔

موپساں کے ہاں انسانی زندگی کے باطنی نظام کا پورا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ریاکاری سے کام نہیں لیتا جو دیکھتا ہے لکھ دیتا ہے۔ وہ یونانی ڈراما نگار کی طرح سوسائٹی میں نظر آنے والی چیزوں کا مصور تھا' تصویر اچھی بنے یا بری وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ میں جو سوسائٹی میں دیکھتا ہوں۔ جو مجھے نظر آتا ہے وہی لکھتا ہوں۔

موپساں نے اپنے گرو فلابیئر کی ہر بات پر عمل کیا اور فنی طور پر مضبوط بن کر لوگوں کے سامنے آیا...... بس آخری دنوں میں اپنی نجی زندگی میں فلابیئر کی باتوں پر عمل نہیں کیا اور اپنی زندگی برباد کر لی۔ لذت پرستی کے ہاتھوں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ ابنارمل زندگی گزار دی۔ جنسی زندگی کی بے راہروی کے ہاتھوں اپنا دماغی نظام خراب کر بیٹھا۔ ایسا بیمار ہوا کہ جسم کے سارے بال جھڑ گئے۔ کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کی ناکام رہا۔ ایک بار اپنا گلا کاٹ لیا۔ یہ جنوری 1892ء کی بات ہے۔ پیرس میں Passy کے مقام پر اسے ہسپتال میں ڈاکٹر Esparit Balanche کی نگرانی میں رکھا گیا۔ اب اس کا دماغی توازن بالکل بگڑ چکا تھا۔ آخر 6 جولائی 1893ء کی صبح کو مختصر کہانی کا امام' جدید افسانے کا بانی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

موپساں نے چھ ناول لکھے۔ اس کی بے شمار کہانیوں کی فہرست دینا ممکن نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ افسانوں کے 16 مجموعے اس کی زندگی ہی میں چھپ چکے تھے۔ اس کی 60 سے زیادہ کہانیاں شاہکار تصور کی جاتی ہیں۔ جن میں موپساں کے فن کو دنیا کے بڑے بڑے نقادوں نے سراہا ہے۔ نٹشے (Nietzsche) اپنی سوانح عمری میں کہتا ہے کہ اگر مجھے اس صدی کا کوئی مصنف منتخب کرنے کے لیے کہا جائے تو میں موپساں کا نام لوں گا۔

ٹالسٹائی نے اپنے مضمون میں موپساں کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اور اسے بڑا کہانی نویس قرار دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ موپساں نے فرانسیسیوں کے کردار تشکیل دیتے وقت اسے مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ ٹالسٹائی اپنے مضمون میں کہتا ہے:

''میں روسی ہوں' فرانس کے ادیب اپنے ہم وطنوں کے بارے میں بہتر جانتے ہیں' لیکن انہوں نے جس طرح اپنی تحریروں میں فرانسیسیوں کو پیش کیا ہے لگتا ہے وہ سب سست مویشی ہیں۔ جنس زدہ ہیں اور مضحکہ خیز ہیں' حالانکہ انہوں نے آرٹ' سائنس اور فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے......''

بہر حال یہ ٹالسٹائی کا اعتراض ہے۔ لیکن موپساں نے اپنی تحریروں میں وہی کچھ پیش کیا ہے جو اس نے دیکھا ہے۔

روسی ادیب گوگول جب تک پشکن کے زیر سایہ رہا سلیقے کی زندگی بسر کرتا رہا۔ جب پشکن مرگیا تو اس کی زندگی اندھیروں میں بھٹک کے رہ گئی۔ دیوانہ ہوگیا۔ پاگل ہوگیا اور جنونی ہوگیا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اپنے لکھے کو جلا دیا اور لوگوں نے اسے مردہ سمجھ کر زندہ دفنا دیا۔

موپساں فلابیئر کے زیر اثر رہا تو بڑا مصنف بن گیا' زندگی اپنے انداز میں گزاری تو بکھر کر رہ گیا۔ دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا اور ہسپتال میں دردناک موت سے دوچار ہوگیا۔
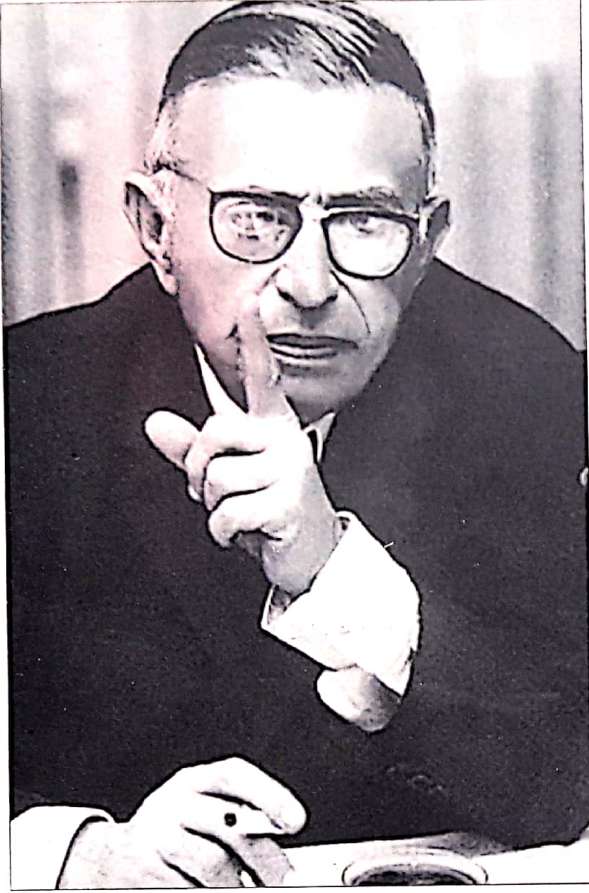
سارتر

(Jean-Paul Sartre)

وجودیت کا بانی فلسفی، بیسویں صدی کو جن دو فلسفیوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برٹرینڈ رسل اور سارتر ہیں، فلسفی، ڈرامہ نویس، ناول نگار، سارتر نے اپنی تحریروں میں دو جنگوں سے پیدا ہونے والی صورت حال کی منظر کشی کی۔ سماجی، مذہبی، ثقافتی، اخلاقی تباہی کے مناظر اس کی کہانیوں اور ناول میں ملتے ہیں۔

میں سارتر کی دوست ہوں۔لیکن جب مجھے کوئی سارتر سے بہتر آدمی مل جائے تو اسے چھوڑ دوں گی۔

(سیمون ڈی بوار)

....

''مرنے کے بعد تمہیں کس حوالے سے یاد رکھا جائے۔''

سارتر نے جواب دیا:

''میرے ناول نوسیا ،میرے دو ڈرامے No Exit اور The Devil and the Good Lord اور فلسفے کی کتاب اور میرا مقالہ Saint Genet اگر لوگوں نے ان کو یاد رکھا تو میں یاد رہوں گا۔''

(سارتر)

....

سارتر زندگی کو بے مقصد قرار دیتا ہے۔اس کی نظر میں زندگی کے کوئی معنی نہیں۔سارتر کے نزدیک زندگی کا مقصد مکمل آزادی ہے۔انسان کو چاہیے وہ کرب سے آزادی حال کرے۔

سارتر

1975ء میں ژاں پال سارتر سے کسی نے پوچھا:

''مرنے کے بعد تمہیں کس حوالے سے یاد رکھا جائے''

سارتر نے جواب دیا:

''میرے ناول نوسیا میرے دو ڈرامے No Exit اور The Devil and the Good Lord کے حوالے سے۔ ان کے علاوہ میرے فلسفے کی کتاب Al Rennson Critique of Dialectic اور میرا مقالہ Saint Genet...... اگر لوگوں نے ان کو یاد رکھا تو میں یاد رہوں گا۔اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔''

ژاں پال سارتر نے تو چند کتابوں' ڈراموں کا نام گنوایا ہے لیکن سارتر کا لکھا ہوا ہر لفظ لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے اور یاد رہے گا۔

بیسویں صدی کو جن دو فلسفیوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔وہ لارڈ برٹرینڈ رسل اور سارتر ہیں۔سارتر وجودیت کا بانی فلاسفر تھا۔اس نے انسان دوست فلاسفر کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔سارتر نے ڈرامے لکھے۔نوسیا جیسا ناول لکھا۔دنیا میں جہاں کہیں بھی افراد کی آزادی پر حرف آیا۔سارتر نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔فرانس پر نازیوں نے حملہ کیا تو اس نے آواز بلند کی لیکن جب فرانس نے الجزائر پر فوج کشی کی تو وہ فرانس کے خلاف ہو گیا۔ابتدا میں اس کی ساری ہمدردیاں اشتراکیت اور روس کے ساتھ تھیں لیکن جب روس نے افغانستان کے خلاف طاقت کا استعمال کیا اور اسے جارحیت کا نشانہ بنایا تو وہ روس کے خلاف ہو گیا۔سارتر اور برٹرینڈ رسل دونوں پہلے روس کی دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن جب روس کی پالیسیوں کو غور سے دیکھا اور اصل چہرہ نظر آیا تو دونوں اشتراکیت کے خلاف ہو گئے اور سب سے بڑے نقاد بن گئے۔

ژاں پال سارتر 21 جون 1905ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔اس کا باپ فرانس نیوی میں افسر تھا۔سارتر کی ماں این میری شوائٹزر جرمن زبان کے ماہر چارلس شوائٹزر کی بیٹی تھی۔سارتر دو سال کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ماں اُسے اپنے باپ کے پاس لے گئی' جہاں نانا نے سارتر کی پرورش کی۔سارتر کی ماں جوان عورت تھی اس نے دوسری شادی کر لی۔جس کا دکھ سارتر کو ساری عمر رہا اور ماں کی دوسری شادی نے عورت کے تصورات بدل دیئے۔اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔

سارتر ایک دبلا پتلا' بھینگا اور بیمار سا بچہ تھا مگر بچپن ہی سے بلا کا ذہین تھا۔سارتر کا نانا ایک پڑھا لکھا آزاد خیال آدمی تھا۔پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھتا تھا لیکن اس نے سارتر پر کبھی اپنے عقیدے کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کی۔چنانچہ سارتر لڑکپن ہی میں مذہب کا مخالف ہو گیا۔

ماں کی دوسری شادی نے اسے تنہائی پسند بنا دیا اور وہ ہر وقت کسی نہ کسی شے کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا تھا۔اپنی ذہانت اور تیز دماغ کے بارے میں وہ اپنی بائیوگرافی (Words) میں لکھتا ہے:

''اپنی ماں کے کہنے کے مطابق میں اپنی ماں کے پیٹ میں 9 کی بجائے دس مہینے رہا اور دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ دیر تنور میں پکتا رہا۔ میں خستہ اور تابناک بن کر باہر نکلا......''

سارتر ابتدائی عمر ہی میں برگساں سے متاثر اور فلسفے کی طرف راغب ہو گیا۔ فلسفہ پڑھنے لگا اور پیرس سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ پھر جرمنی چلا گیا۔ ہسرل اور ہائیڈیگر سے ملاقاتیں کیں۔ فرائی برگ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ تحقیق کی اور پھر پیرس واپس چلا آیا۔

1929ء میں اس کی ملاقات سیمون دی بوار سے ہوئی اور زندگی بھر کا رشتہ اس سے جڑ گیا۔ سیمون دی بوار سے اس نے شادی نہیں کی۔ دونوں ساری زندگی اکٹھے رہے شادی اور بچے پیدا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ سارتر کی موت تک دونوں کا ساتھ رہا۔

1939ء میں سارتر کو فرانس کی فوج میں نوکری کرنا پڑی۔ 1940ء میں نازیوں نے اسے پکڑ لیا وہ 9 مہینے تک جرمنوں کی قید میں رہا...... تنہائی اور قید کے اس زمانے میں سارتر نے ہائیڈیگر (Hiedegger) کو پڑھا۔ قید میں اس کی بینائی اور صحت دونوں بگڑ گئیں۔ اسے اپریل 1941ء میں جیل سے رہائی مل گئی اور وہ دوبارہ اُستاد کی حیثیت سے شہری زندگی میں شامل ہو گیا۔

سارتر نے ساری زندگی اپنے لیے کوئی گھر بنایا نہ ہی شادی کی۔ ماں کی دوسری شادی نے اسے ساری عمر شادی سے متنفر کر دیا تھا اور وہ شادی کے نام سے دور بھاگتا رہا۔ سیمون ڈی بوار اس کی ہم خیال تھی۔ دونوں بغیر شادی کے ساتھ ساتھ رہے اور یہ ساتھ سارتر کی موت پر ٹوٹا...... سارتر نے اپنی ساری کتابیں ہوٹل اور کیفے میں بیٹھ کر لکھیں...... ہوٹل ''فلور'' اس کا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ کچھ لوگ اس کے فلسفے ''جدیدیت'' کو ''کافی ہاؤس کا فلسفہ'' بھی کہتے ہیں۔ سارتر کے کیفے کے قیام پر کچھ لوگوں نے اعتراض اُٹھایا تو اس نے جواب دیا۔

''میں کیفے میں گھر سے زیادہ منہمک ہوتا ہوں''

پوچھنے والوں نے پوچھا: ''کیوں؟''

سارتر کا جواب تھا:

''لوگ وہاں نہ میری پروا کرتے ہیں نہ مجھے لوگوں کی پروا ہوتی ہے۔ اس ماحول میں مجھے کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور پھر گھر بار کا بوجھ میرے بس کی بات نہیں۔''

سیمون ڈی بوار سے اس کی ملاقات بھی عجیب حالات میں ہوئی۔ سیمون ایک ذہین اور اپنے آپ پر نازاں لڑکی تھی۔ مردوں کو کمتر سمجھنا اور ان کا مذاق اُڑانا اس کی عادت بن گئی تھی۔ لیکن جب اس کی ملاقات سارتر سے ہوئی تو اسے اپنی یہ عادت ترک کرنا پڑی اور سارتر کی ذہانت کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ دوستوں نے جب اس سے پوچھا کہ تم سارتر سے متاثر ہو گئی ہو یا اس کے سامنے سرنگوں ہو گئی ہو؟ تو اس نے جواب دیا:

''میں سارتر کی دوست ہوں لیکن جب مجھے کوئی سارتر سے بہتر آدمی مل جائے گا تو میں اسے چھوڑ دونگی۔''

مگر اسے سارتر سے بہتر آدمی نہ مل سکا اور یہ دوستی زندگی بھر رہی۔

سیمون ڈی بوار نے سارتر کے ساتھ ہوٹلوں میں وقت گزارا۔ اس کے ساتھ بہت سفر کیے۔ راتیں جاگ کر اور گھوم پھر کر گزاریں اور اس کے بارے میں بڑی عجیب باتیں لکھیں۔ وہ کہتی ہے سارتر بہت وہمی آدمی تھا۔ ایک بار وینس کی گلیوں

میں وہ ساری رات پھرتے رہے۔ صبح سارتر نے سیمون کو بتلایا کہ ایک جھینگا مچھلی ساری رات اس کا پیچھا کرتی رہی ہے۔ سیمون کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ وہم کی بیماری جاتی رہی۔

سارتر نے زندگی بھر لکھا اور بہت کچھ لکھا۔ لکھنے کا شوق اُسے بچپن ہی سے تھا۔ اس نے بچپن میں ایک کہانی لکھی اور پھر وہ ساری عمر لکھتا رہا۔ اس نے کئی بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں لکھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں اور لکھنے کی وجہ سے ہی میں زندہ ہوں۔

سارتر نے ڈرامے لکھے، ناول لکھے، بائیوگرافی لکھی، فلسفے پر کتابیں لکھیں، لیکن اس کی یہ ساری تحریریں اس کے فلسفے کے گرد گھومتی ہیں، جس کا وہ موجد یا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جب بھی وجودیت کا لفظ سامنے آئے تو سارتر کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔ سارتر اور وجودیت اس عہد میں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

وجودیت پر لکھنے والوں کا خیال ہے کہ سارتر کے ہاں یہ اصطلاح یا فلسفہ ہیگل، ہیسرل اور ہائیڈیگر کے مطالعے سے آیا ہے۔ سارتر سے پہلے بھی یہ موجود تھا لیکن سارتر نے اسے باقاعدہ فلسفے کی شکل دی...... سقراط سے پہلے تک اور سقراط کے بعد میں فلسفہ مخصوص لوگوں کی وراثت تھا۔ سقراط نے اسے بازاروں کا راستہ دکھایا لیکن فلسفہ رہا چند لوگوں کے پاس ہی۔ اسے عمومی درجہ نہ دیا گیا۔ وجودیت شاید فلسفے کی وہ پہلی اصطلاح ہے جسے گلی محلوں ہوٹلوں اور ادب میں زیر بحث لایا گیا اور یہ سب کچھ سارتر کی بدولت ہوا۔ البرٹ کامیو سے سارتر کی دوستی تھی۔ سارتر نے 1938ء میں اپنا ناول ناسیا لکھا اور پھر کامیو سے مل کر وجودیت کے فلسفے کو ادب میں شامل کر دیا۔ ساری دنیا کے ادیب اپنے اپنے شاہکاروں میں وجودیت کی بانسری بجانے لگے' کہ انسان اس دنیا میں بیگانگی کے ماحول میں زندہ ہے۔ وہ اکیلا ہے نہ اس کا کوئی خدا ہے۔ نہ زمین اس کی دوست ہے۔ اسے اس غلاظت میں مرنے کے لیے پھینک دیا گیا ہے۔ دنیا سراسر لغو ہے۔ بے معنی ہے، لیکن اس کے باوجود انسان قطعی طور پر آزاد ہے۔ اس کا وجود اس کی ذات پر مقدم ہے۔

سارتر زندگی کو بے مقصد قرار دیتا ہے۔ اس کی نظر میں زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ انسان اپنا خود خالق ہے اور اپنے افعال اور اقدام کا خود ذمہ دار ہے۔ کسی کو اس کے کردار، اس کی منزل یا اس کی زندگی کی سمت متعین کرنے کا حق حاصل نہیں۔ سارتر کے نزدیک زندگی کا مقصد کامل آزادی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کرب سے آزادی حاصل کرے اور اس بات سے چھٹکارا حاصل کرے کہ وہ آزاد نہیں ہے۔

ڈاکٹر سی۔ اے۔ قادر وجودیت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان درندوں اور وحشیوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرا دیا۔ اخلاق کا پاس رہا نہ مذہب کا۔ جنگوں نے اخلاق اور مذہب دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں نے محسوس کیا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل کا حل نہیں اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں' فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی دور کا مداوا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وجودیت نے دیا ہے......؟

سارتر انسان کو پرانے رواجوں اور روایتوں کے بندھن سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ وجودیت روایتی فکر کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ سارتر نے اپنے ناول نوسیا میں ہیرو کے کردار سے اس کی وضاحت کی کوشش کی ہے' ہیرو بے معنی اور لغویت میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہے کہ اس نے یہ کام خود منتخب کیا ہے اور آزادانہ طور پر کیا ہے، اس پر یہ کام تھوپا نہیں گیا۔

سارتر کے نزدیک انتخاب کرنا دراصل روایتی سوچ سے پیچھا چھڑانے کا مطلب ہے۔ سارتر اس کو کامل آزادی کا نام دیتا ہے۔ سارتر کہتا ہے:

''مجھے دوسری جنگ عظیم کی شکست کا تجربہ جون 1940ء میں ہوگیا تھا۔ میں نے خود اس کا انتخاب کیا۔ میں یہ بات قبول کرتا ہوں کہ میں ہر بات پر عمل اور ہر شے کا جو مجھ سے وابستہ ہے اس کا میں خود ذمہ دار ہوں......''

سارتر کے نزدیک ہر آدمی اپنی زندگی میں ایک ایسا کردار ضرور ادا کرتا ہے جو اس کی حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی آدمی حقیقی زندگی میں باورچی نہیں ہوتا لیکن وہ باورچی ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ ایسا کر کے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کرتا ہے مثلاً سارتر کا ڈراما (Intimacy) پر نظر ڈالیے۔ ایک عورت اپنے پاگل شوہر کے ساتھ ایک بلڈنگ میں رہتی ہے اسے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔ وہ اس سے الگ نہیں رہ سکتی اور نہ ہی وہ ذہنی مریض ہے' لیکن وہ شوہر کے ساتھ ذہنی مرض میں شریک نہیں ہونا چاہتی اور خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو اس کی حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا مگر وہ یہ کردار ادا کرنے کا خود انتخاب کرتی ہے۔ یہ اس نے مکمل اور کامل آزادی سے کیا جو اسے حاصل ہے۔

سارتر کا کہنا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کی اذیت سے جو لوگ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور آزادی کا انتخاب کرنے سے پرہیز کرتے ہیں وہ اپنے گرد مذہب' اخلاق اور معاشرتی اقدار کے ہیولے بنا لیتے ہیں جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے گرد ریشم کے تار بُنتا رہتا ہے اور پھر ایک دن وہ اپنے ہی بُنے ہوئے جال میں دم توڑ دیتا ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور وہ بھی اخلاق' مذہب اور معاشرتی ہیولوں میں پھنس کر مر جاتے ہیں۔

سارتر نے دو جنگوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی منظر کشی کی ہے۔ سماجی' مذہبی' ثقافتی اور اخلاقی تباہی کے مناظر پیش کر کے موجودہ انسان کو ایک نیا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور راستہ دکھانے کے لیے اس نے لوگوں کے سامنے وجودیت کا دیا جلایا ہے۔ نسلِ انسانی اس کے نظریات سے اختلاف تو کر سکتی ہے لیکن اس بات سے اِنکار نہیں کر سکتی کہ اس نے کوشش ضرور کی...... افلاطون نے جب ایک خیالی ریاست کا نقشہ پیش کیا تو اس کے ایک شاگرد نے جو ایک ریاست کا بادشاہ تھا افلاطون کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میری ریاست کے انتظامات کو آپ اپنے اصولوں اور قوانین کے مطابق چلائیں۔ افلاطون کچھ عرصہ اس کی ریاست میں رہا پھر وہ یہ کہہ کر ایتھنز واپس آ گیا کہ یہ قابل عمل فلسفہ نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا' سارتر کا فلسفہ وجودیت قابل عمل ہو یا نا قابل عمل مگر اس کے اس نظریے نے ایک بار پوری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ سوشل' ادبی اور معاشرتی زندگی میں اس نے خاطر خواہ اثر ڈالا لیکن شاید اس نظریے کی مخالفت زیادہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد سارتر خود بھی وجودی کہلانے سے کترانے لگا اور اپنی کچھ باتوں سے منحرف بھی ہونے لگا۔ مثلاً سارتر نے پہلے یہ بات کہی کہ انسان کی آزادی' خارجی حالات کی تابع نہیں ہوتی لیکن کچھ عرصے بعد سارتر اس بات سے انکار کرتا دکھائی دیتا ہے اور اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ خارجی حالات انسان کی آزادی پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔

سارتر انسان دوست تھا مگر اس نے انسان دوستی کی بنیاد دہریت پر رکھی۔ سارتر کے نزدیک انسان جو بنتا ہے اپنی مرضی سے بنتا ہے۔ (اس کے لیے سارتر اپنے ڈرامے Intimacy میں اس عورت کی مثال دیتا ہے جو پاگل نہیں ہے لیکن اپنے پاگل خاوند کے لیے وہ پاگل بننے کا ارادہ کر لیتی ہے جو اس کا اپنا فیصلہ ہے اور اس کی ذمہ دار وہ خود ہے)۔

سارتر کے نظریات کی مخالفت بھی کی گئی جس میں مذہبی حلقہ پیش پیش تھا چنانچہ پاپائے روم نے سارتر کی تمام کتابوں کو ممنوعہ فہرست میں شامل کر دیا۔ لوگوں کے نزدیک یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ سچائی اور اچھائی کے مقابلے میں جھوٹ اور

بے ہودہ بات ہی ''وجودیت'' کا درجہ رکھتی ہے۔ پیرس کی ایک عورت کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ جب وہ بات کرتے کرتے بے خیالی میں کوئی بے ہودہ اور مکروہ بات کر جاتی تو کہتی تھی ''میں وجودی ہونے لگی ہوں'' اور پھر لوگوں سے معافی مانگ لیتی تھی۔ سارتر نے بڑی بھرپور اور سادہ زندگی گزاری۔ عملی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' ظلم کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی۔ جارحیت کے خلاف عملی میدان میں اُتر آیا۔ 1968ء میں سٹوڈنٹ ہڑتال میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سول نافرمانی کے جرم میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ڈیگال کا زمانہ تھا اس نے ذاتی دلچسپی لے کر اسے رہائی دلائی اور کہا:

"You dont arrest France"

میونخ میں جب 11 اسرائیلی کھلاڑیوں کا فلسطینیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تو سارتر نے مخالفت کی۔ الجیریا پر فرانس کی جارحیت کی اس نے مخالفت کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ الجیریا میں مقیم فرانسیسی فوجیوں کو نوکری چھوڑ دینا چاہیے۔ 1960ء میں اس نے سیمون ڈی بوار کے ساتھ کیوبا (Cuba) کا دورہ کیا۔ چے گویرا Che. Gueveral سے ملاقات کی اور کہا:

''چے صرف ذہین آدمی ہی نہیں' ہمارے عہد کا ایک مکمل انسان ہے......''

اس کی موت پر اسے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

"He lived his words, spoke his own actions and his story and the story of the world Rah Parallel"

1964ء میں اسے نوبل پرائز کی پیشکش ہوئی مگر اس نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ ایک ادیب کو ایک ادارے میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے، اسے اپنی مکمل آزادی قائم رکھنا چاہیے۔ (سارتر کا نام 1957ء میں بھی نوبل انعام کے لیے تجویز ہوا تھا مگر وہ ان دنوں الجیریا کے خلاف سامراجی طاقتوں کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ اس لیے یہ انعام البرٹ کامیو کو دے دیا گیا۔ 1964ء میں اس نے خود انعام لینے سے انکار کر دیا)۔

جون 1964ء میں تیل کے ذخیروں پر امریکی بمباری کے خلاف اس نے احتجاج کیا' اگست 1966ء میں ایک غیر سرکاری ٹرائل کا اعلان کیا گیا' رسل' سیمون اور سارتر اس کے ممبر تھے۔ مئی 1967ء میں اس کا فیصلہ سنایا گیا جس میں شہری ٹھکانوں پر بمباری کے جرم میں امریکہ کو مجرم ٹھہرایا گیا۔ سارتر اس عدالت کا صدر تھا۔ سارتر اور البرٹ کامیو میں ابتدائی سالوں میں دوستی تھی اکٹھے منصوبہ بندی سے لکھنا شروع کیا لیکن پھر اختلافات ہو گئے اور دونوں الگ الگ راستوں پر چلنے لگے...... بس ایک سیمون ڈی بوار تھی جس نے عمر بھر ساتھ نہ چھوڑا۔ اس نے کہا تھا کہ سارتر سے اچھا آدمی مل گیا تو اسے چھوڑ دوں گی مگر ساری عمر اسے سارتر سے اچھا آدمی نہ ملا۔ سارتر ان تھک لکھنے والا تھا۔ اس نے فلسفے پر لکھا' ناول لکھے' ڈرامے لکھے' رسالہ نکالا' مضامین لکھے' سوانح عمری لکھی۔ لکھنا ہی اس کا کام تھا۔ اس کی تحریروں کی فہرست بہت طویل ہے۔

کام کی زیادتی اس کے لیے عذاب بن گئی۔ صحت خراب ہوگئی۔ آنکھوں کی بینائی جواب دے گئی۔ پھیپھڑوں کا مرض جان لیوا ثابت ہوا اور وہ 15 راپریل 1980ء کو فوت ہو گیا......

یوں تو سارتر کی سب کتابیں ساری دنیا میں بہت شوق سے پڑھی گئیں مگر ادب کے وہ قارئین جنہیں ''وجودیت'' سے اتنی دلچسپی نہ تھی' انہوں نے اس کے ڈراموں اور کہانیوں کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ ان میں سارتر کا ناول نوسیا

(Nausea)اس کے ڈرامے

(1) No Exit (2) The Flies

(3 Dirty Hands (4) The Respectful Prositiitute

ہیں......کہانیوں میں:

(1) The Wall (2) The Room (3) Erostratus

(4) Intimacy (5) The Childhood of a Leader

ہیں۔اس کی اپنی سوانح عمری (Words) کو بھی بہت شہرت ملی۔ان سب کہانیوں کا مرکزی فلسفہ ''وجودیت'' ہے۔
جسے اس نے بہت ہنرمندی سے اپنے ان تخلیقی شاہکاروں میں سمویا ہے......

اس کی کہانی (Intimacy) ایک عورت Lulu اور ہنری (Henri) کے رشتے کی کہانی ہے۔دونوں اکٹھے رہ رہے ہیں۔ہنری دماغی مریض ہے۔نفسیات کا شکار ہے۔دونوں میاں بیوی ہیں۔لولو اسے Gulliver's Travel کا Gulliver کہتی ہے۔ایک عرصہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے وہ اب شاید اس سے محبت نہیں کرتی اگر کرتی بھی ہے تو مجبوری میں......اس کی ایک سہیلی Rirette سے قلبی اور جسمانی تعلقات ہیں۔Rirette اس سے اکثر کہتی ہے:

"You cannot stay with Henri, because you dont love him"

Lulu ہنری کے ساتھ رہ رہی ہے اگرچہ ہنری کی عادات سے اسے اکتاہٹ ہوتی ہے لیکن اسے پھر بھی ہنری کا خیال ہے۔اس کی ضروریات کی فکر ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی سہیلی Rirette کا جسمانی پیکر بھی ہر پل اُداس رکھتا ہے۔Rirette اُسے بار بار اُکساتی ہے کہ Happiness اور Honour کی تلاش کرو......صرف خاوند کے لیے قربانی دینے کا خیال ذہن سے نکال دو۔

''میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں لولو (Lulu) ہم سیر پر جائیں گے۔کشتی گاڑی پر سواری کریں گے۔''

لولو (Lulu) اپنے خاوند کے پہلو میں لیٹی یہ سب کچھ سوچتی ہے اور پھر اپنا سامان Pack کرکے Rirette کے پاس چلی جاتی ہے اور کہتی ہے:

"I Left Henri, Fished, I dropped him"

اور پھر تفصیل بتلاتی ہے:

''میں نے بالکونی میں تالا لگا دیا' بڑا عجیب منظر تھا۔وہ ابھی تک پاجاما پہنے ہوئے تھا۔کھڑکی کے شیشے پر اُنگلی سے ٹک ٹک کر رہا تھا۔اس نے شیشہ توڑنے کی جرأت نہیں کی۔میں اس کی جگہ ہوتی تو کھڑکی توڑ کر بالکونی سے اندر آجاتی......''

Rirette اس کے اس اقدام سے بہت خوش ہے اور کہتی ہے پھر اور کچھ؟

لولو (Lulu) کہتی ہے:

''میں اس کی سہولت کے لیے کچن کی میز پر ایک چٹ لکھ آئی ہیں۔فریج میں سؤر کا گوشت پڑا ہے۔گیس کا چولہا بند کر دیا ہے۔اب اپنی مدد آپ کے تحت کام کرو۔میں اُکتا گئی ہوں۔میں قصہ تمام کر رہی ہوں۔الوداع۔''

(Rirette) دراصل لولو Lulu کو ایک آدمی Pierre کے ساتھ پیرس سے جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔لولو کو Fischer کی دکان سے کچھ سامان خریدنا ہے۔Rirette نہیں چاہتی کہ لولو اس سڑک پر جائے جہاں Fischer کی

دکان ہے کیونکہ ٹھیک 6 بجے Henri سیر کے لیے ادھر سے گزرتا ہے۔لولو اس سڑک پر جاتی ہے Henri انہیں دیکھ لیتا۔دونوں بھاگتی ہیں۔ہنری پیچھا کرتا ہے اور پاگلوں کی طرح پکار کر کہتا ہے:

''لولو! رک جاؤ......واپس آجاؤ......تم میری ہو۔میں تمہارا خاوند ہوں''۔

لولو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ہنری بے دم ہو کر گرتا ہے اور پھر لولو میں ایک تبدیلی آتی ہے اور وہ Pierre کے نام ایک خط لکھتی ہے اور ہنری کے پاس واپس چلی جاتی ہے:

ڈارلنگ!

میں ہنری کے پاس جا رہی ہوں۔کیونکہ وہ بہت غمگین ہے۔سب سے پہلے تو میں مزید آزادی چاہتی ہوں۔تم سے محبت کرتی ہوں۔کل تمہیں Dome کے مقام پر 5 بجے ملوں گی۔

لولو (Lulu)

دوسرا ڈراما The Respectful Prostitute ہے۔ان دونوں ڈراموں میں عورت اپنے فیصلے خود کرتی ہے اور ذمہ داری قبول کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر آزاد سمجھتی ہے۔یہی سارتر کا بنیادی فلسفہ تھا۔

معزز بیسوا۔سیاہ فام اور سفید فام نسل کے درمیان ایک تصادم ہے۔سیاہ فام سے سفید فام کی نفرت ڈھکی چھپی بات نہیں۔سیاہ فام جرم کرے یا نہ کرے وہ مجرم ہے۔اسے سزا ملنی چاہیے۔اس کا وجود بے معنی ہے۔سفید فام گناہ کر کے بھی بے گناہ اور معصوم ہے۔ڈرامے کا کردار لیزی عدالت میں حبشی کے خلاف گواہی دینے پر رضامند نہیں ہوتی لیکن سینٹر اپنی فطری چالبازی کو استعمال میں لاتا ہے اور انسانی جذبات کا تانا بانا پھیلا کر لیزی کو موم کر لیتا ہے اور جھوٹی گواہی پر دستخط کرا لیتا ہے۔وہ حبشی کو بچانا چاہتی ہے کیونکہ وہ بے گناہ ہے لیکن وہ سینٹر کی چال میں آجاتی ہے۔اسے اپنے کیے پر افسوس ہے لیکن وہ حبشی کو بچانے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔اسے فریڈ کی گولی کا نشانہ نہیں بننے دیتی اور حبشی بھاگ جاتا ہے۔

سارتر اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ایک نفسیاتی فضا قائم کرتا ہے اور اس فضا میں دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کی زد میں آنے والے کرداروں کو چلتے پھرتے دکھاتا ہے۔جنگ میں اپنا سب کچھ کھو دینے والی نسل "Lost Generation" ہے اور سارتر انہیں ایک فلسفہ ''وجودیت'' فراہم کرتا ہے۔جس کو اپنا کر وہ اپنی منزل' اپنا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔انہیں سارتر کامل آزادی کا احساس دلاتا ہے تاکہ وہ اپنے فیصلے خود کریں اور ذمہ داری قبول کریں۔سارتر کا یہ فلسفہ کہاں تک کامیاب رہا یا رہے گا۔کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ایک بار اس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور ادبی دنیا میں ایک ہلچل برپا کر دی۔

سیمون ڈی بوار

(Simone de Beauvoir)

بیسویں صدی کی نامور فرانسیسی فلسفی، ناول نگار، وجودیت کی پرچارک، سارتر کی شریک حیات، نسوانی تحریک کی اہم ترین کارکن۔ سیمون ڈی بوار نسوانیت پسندی کی تاریخ میں ہیروئن کا درجہ رکھتی ہے۔

سارتر ذہین آدمی ہے۔ سارتر سے بہتر اگر کوئی آدمی مل گیا تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔

(سیمون ڈی بوار)

....

سارتر میرا روحانی ساتھی تھا جس میں مجھے اپنے تمام جذبات کی گرمی اور حرارت ملی۔

(سیمون ڈی بوار)

....

''سیکنڈ سیکس'' نسوانیت پر ایک فلسفیانہ تاریخی، فکری دستاویز ہے۔

''سیکنڈ سیکس'' سیمون کی شہرت یافتہ اور بدنام کتاب جسے ''ویٹیکن سٹی'' نے ممنوعہ کتابوں میں سجا دیا تھا۔

سیمون ڈی بوار

باپ دونوں لڑکیوں کی پیدائش پر خوش نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ کاش ان کی بجائے ایک لڑکا ہو جاتا۔ لڑکا تو نہیں ہوا لیکن ان میں سے ایک لڑکی نے سب کچھ لڑکوں والا کیا۔ اس لڑکی کا نام سیمون ڈی بوار تھا۔ سیمون ڈی بوار کا بچپن اتنا اچھا نہ تھا۔ نہ تو وہ اتنی خوش شکل تھی اور نہ ہی وہ ایسے کپڑے پہنتی تھی کہ وہ کپڑوں میں خوبصورت نظر آئے۔ اس کے کپڑے گھر میں اس کی ماں سیتی تھی اور وہ برے کپڑے سینے والی کے نام سے مشہور تھی۔ ماں کے سلے کپڑے پہن کر وہ اور بھی بدوضع و بدصورت نظر آتی تھی۔ باپ بھی ہر وقت طعنے دیتا تھا کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔

سیمون کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کا نانا ایک بینک کا صدر تھا۔ بینک دیوالیہ ہو گیا۔ سارا خاندان پیسے پیسے کا محتاط ہو گیا۔ باپ کو چھوٹی موٹی نوکری کرنا پڑی بہر حال جوں توں زندگی کی گاڑی چلتی رہی اور سیمون ایک ''بگڑے بچے'' کے طور پر آگے بڑھتی رہی۔ نہ اس کا کوئی دوست تھا نہ ساتھی۔ ایک بہن ہیلین (Hellene) تھی جس کے ساتھ وہ ہر بات، ہر راز کہہ سن لیتی تھی۔ ان حالات میں سیمون نے کبھی اپنے آپ کو لڑکی نہ سمجھا اور لڑکا بن کر زندگی گزاری۔ اس کا باپ اکثر اپنے رشتے داروں سے کہا کرتا تھا:

"Simon Thinks Like a Man"

سیمون نے اپنے آپ کو کتابوں کی نذر کر دیا اور ہر کھیل اور دیگر مصروفیات کی طرف دھیان نہ دیا۔ کیتھولک سکول میں اپنی تعلیم جاری رکھی اس کی بہن بھی ساتھ تھی۔ دونوں لڑکیوں کی نگہداشت کیلئے کلاس میں ان کی ماں ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

باپ کو اپنی غربت کا خیال تھا اور اس نے اپنی لڑکیوں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تمہاری شادیاں نہیں ہو سکتیں کیونکہ میرے پاس دینے کیلئے جہیز نہیں ہے۔ چنانچہ تمہارے پاس غربت سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تم علم و دانش کی ڈھیر ساری دولت جمع کر لو۔ سیمون نے یہ بات پلے باندھ لی اور کتابوں کے سمندر میں غوطہ لگا دیا۔ 1924ء میں اس نے امتیازی نمبروں میں گریجویشن کر لی اور پھر فیصلہ کر لیا کہ وہ مصنف بنے گی۔

سیمون ڈی بوار نے ریاضی میں ڈگری لی۔ فلسفہ پڑھنے پیرس یونیورسٹی چلی گئی۔ یہاں بہت سے ذہین لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک سارتر بھی تھا۔

سیمون کہا کرتی تھی کہ مجھے کوئی ذہین مرد نظر نہیں آیا اور وہ اکثر مردوں کی حاکمیت اور ذہانت کو ہنسی میں اڑا دیا کرتی تھی۔ لیکن سارتر کے سامنے وہ ڈھیر ہو گئی۔

1929ء بڑا اہم سال تھا۔ سیمون کی عمر 21 سال تھی اور سارتر اس وقت 24 سال کا تھا۔ فلسفے کا رزلٹ آیا تو امتحان میں اس کی دوسری پوزیشن آئی۔ یہ ڈگری لینے والی 9 ویں خاتون تھی۔ اسے دوسری پوزیشن کا انعام ملا، پہلی پوزیشن سارتر کی تھی۔

یہ اکتوبر 1929ء کے مہینے کی دوپہر کا واقعہ ہے۔ سارتر اور سیمون دونوں بینچ پر بیٹھے تھے۔ سارتر نے سیمون کو شادی کی

پیش کش کی۔

''شادی تو ممکن نہیں'' سیمون نے کہا۔

''کیوں؟'' سارتر نے پوچھا:

''میرے پاس جہیز نہیں'' سیمون نے جواب دیا ''البتہ ہم دونوں دو سال ساتھ رہنے کا معاہدہ کر لیتے ہیں''۔

اور پھر دونوں ساتھ رہنے لگے......سیمون کے دوستوں نے سیمون سے پوچھا۔

''تم تو مردوں کو گھاس نہیں ڈالتی تھیں، سارتر کو کیسے قبول کر لیا''۔

سیمون نے جواب دیا:

''سارتر ذہین آدمی ہے۔ سارتر سے بہتر کوئی مرد مجھے مل گیا تو میں اسے چھوڑ دوں گی''۔

لیکن سارتر کی موت تک اسے کوئی مرد سارتر سے ذہین نہ ملا اور وہ مرتے دم تک سارتر کے ساتھ رہی۔ دونوں نے کوئی گھر نہ بنایا۔ نہ بچے پیدا کئے۔ بس لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیا اور پڑھ پڑھ کر ساری دنیا اسے اپنا روحانی ماں باپ ماننے لگی...... دونوں اپنی اپنی زندگی گزارتے تھے۔ دونوں اپنے اپنے افعال میں آزاد تھے۔ دونوں نے عشق کئے۔ تعلقات قائم کئے۔ دونوں کو ایک دوسرے پر اعتراض نہ تھا۔ سارتر کے دوسری عورتوں سے تعلقات تھے۔ سیمون نے کئی عورتوں سے تعلقات قائم کئے۔ ان تمام باتوں کا انکشاف سیمون نے اپنے ناولوں میں کیا ہے۔

سارتر اور سیمون کے تعلقات بڑی عجیب نوعیت کے تھے۔ اپنی سوانح عمری میں سیمون سارتر کے بارے میں کہتی ہے:

''سارتر میرا روحانی ساتھی تھا۔ جس میں مجھے اپنے تمام جذبات کی گرمی اور حرارت ملی''

دونوں الگ الگ اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ شام کو اکٹھے مل کر بیٹھتے اور بحث ہوتی۔ نظریات کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا ذکر ہوتا۔ اکٹھے تھے مگر فیصلے اپنی مرضی کے کرتے تھے۔ سیمون نے اپنی ایک تحریر میں کہا تھا۔

''میں اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے سوا کسی اور کی مرضی کے تابع نہیں بنانا چاہتی''۔

سیمون نے ساری زندگی سارتر کے ساتھ گزاری لیکن ہمیشہ اپنی کہی ہوئی اس بات پر عمل کیا......سیمون ڈی بوار نے کچھ عرصہ ایک سکول میں فلسفہ پڑھایا۔ کچھ کالجوں میں لیکچرز دیئے لیکن ساری زندگی لکھنے میں گزار دی اور سارتر کے ساتھ دنیا کی سیر کرنے میں صرف کر دی۔ سیمون ڈی بوار نے بہت لکھا۔ بڑے شاہکار تخلیق کیے۔ فلسفے کی کتابیں، ناول، ڈرامے اور مضامین اس کے کریڈٹ پر ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ عورتوں کی آزادی اور تحریک میں اسے ایک امام اور رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔

"She is Considered the Mother of Post 1968 Feminism".

تخلیقی طور پر سیمون اپنے ساتھی دوست اور روحانی ہمسفر سارتر سے کسی طور بھی کم نہ تھی۔ اس کے تخلیقی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ سیمون نے مختلف اصناف بھی لکھا اور اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ اس کی کتابوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(1) She Came to Stay
(2) The Blood of others
(3) The Mandrins

(4) All Men are Mortal
(5) When Things of the Spirit Came First
(6) The Women Destroyed
(7) Who shall Die (Drama)

یہ سیمون کے ناول، شارٹ سٹوری کے مجموعے ہیں اس نے تھیٹر کیلئے صرف ایک ڈرامہ Who Shall Die لکھا۔

سیمون کے سفرناموں میں دو نمایاں کتابیں شامل ہیں۔

(1) America Day by Day.
(2) The Long March.

پہلا سفرنامہ اس کی امریکہ کی تفصیلی روداد ہے جب وہ مختلف شہروں میں لیکچرز دینے گئی۔ یہ سفر اس نے 1947ء میں کیا۔ نیویارک، شکاگو، ہالی وڈ اور لاس ویگاس کا دورہ کیا۔ اسے نیویارک ٹائمز نے لکھنے کی دعوت دی اور اس کے مضامین لکھے The Long March۔ روس اور چین کے سفر کی روداد ہے۔ اس میں اس نے اس چیز کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی لوگوں کی بھلائی اور بہتری کیلئے بہت کام کر رہی ہے۔ بعد میں اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ چین کے کلچرل تجزیے کیلئے نہیں بلکہ صرف پیسہ کمانے کیلئے کیا تھا۔

سیمون ڈی بوار کا ناول She Came to Stay سیمون اور سارتر کے تعلقات اور جذباتی کشمکش پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ کہانی ایک افسانوی انداز میں سارتر اور سیمون کی جذباتی کھینچا تانی کی تفصیل ہے۔ ناول کا پس منظر دوسری جنگ عظیم کی ابتداء ہے۔ دو روسی لڑکیاں اولگا (Olga) اور وانڈا (Wanda) سیمون کے پاس ٹھہرنے کیلئے آتی ہیں۔ اولگا سیمون کی پرانی سٹوڈنٹ ہے جسے اس نے 1930ء میں ایک سکول میں پڑھایا تھا۔ اولگا سیمون کو پسند کرنے لگی تھی جب وہ چند دن ٹھہرنے کیلئے سیمون کے پاس آئی تو سارتر نے اولگا میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اولگا نے سارتر کو روکھا سا جواب دے دیا کیونکہ اولگا سیمون کو پسند کرتی تھی چنانچہ سارتر نے اس کی بہن وانڈا سے تعلق قائم کر لیا اور یہ تعلق وانڈا کی شادی تک قائم رہا......اس ناول کے بعد سیمون کے کئی ناول آئے لیکن اس کا شاہکار ناول The Mandarains ہے۔

اس ناول کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے فرانس کا سب سے بڑا انعام برائے ادب (Prix) دیا گیا۔ اس ناول میں ایک دانشور کی ذمے داریوں اور تعلقات کو دکھایا اور بتایا گیا ہے کہ اس کا اپنے معاشرے اور سوسائٹی سے کیا تعلق ہے اور اس کی کیا ذمے داریاں ہیں۔ اس ناول میں صحافیوں، تھیٹر کے اداکاروں اور ادبی ناموروں کی خامیوں اور خوبیوں اور پیرس کی منافقانہ زندگی اور مصلحتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

The Women Destroyed اور When things of the spirit came first

دونوں کہانیوں کی کتابیں ہیں......ان میں اکثر کہانیاں عورتوں کی زندگی اور ان کی خواہشات کو ظاہر کرتی ہیں۔ عورتوں کے ساتھ معاشرے کا سلوک اور پھر عورتوں کی جدوجہد اور معاشرے کے جبر سے رہائی......مثلاً The Women Destroyed تین عورتوں کی کہانی ہے۔ خاندانی ماحول میں وہ کس طرح حالات کا مقابلہ کرتی ہیں اور پھر کس طرح اپنی آزادی کیلئے جدوجہد کرتی ہیں۔

Second Sex۔ سیمون کی شہرت یافتہ اور بدنام کتاب ہے۔ یہ کتاب اور اس کا ناول (The Mandrins) ''ویٹیکن سٹی'' نے ممنوعہ کتابوں کے خانے میں سجا دیئے تھے۔

Second Sex ۔سیمون ڈی بوار کی ایک انقلابی کتاب ہے۔ رجعت پسندوں نے اس کتاب پر بہت تنقید کی اور اسے روایت کے خلاف بغاوت تصور کیا لیکن عورتوں نے اسے اپنی زندگی اور صورتِ حال پر پہلی مکمل کتاب قرار دیا۔ سیمون ڈی بوار کا یہ مؤثر کارنامہ حقوق نسواں کی تحریک کا سنگ میل بن گیا۔ عورتوں کی تحریک اور فرانس نے اس کتاب کا بڑا اثر قبول کیا۔ ''سیکنڈ سیکس''، عورت کی ابتدا، عہد بہ عہد اس کی معاشرتی حالت، سوسائٹی میں اس کا مقام۔ عورت اور مرد کے تعلق پر ایک تفصیلی اور فلسفیانہ تجزیہ ہے۔ سیمون ڈی بوار کا نظریہ ہے کہ ہر فرد کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ آزادی اس کی منزل ہے۔ اس کائنات میں اسے کیا بننا ہے اسے اپنے لیے کیا منتخب کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ ایک فرد کو کرنا ہے۔ سیمون ڈی بوار کا نکتہ نظر وجودی ہے۔ اس نے عورتوں پر بھی کڑی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ بھی مردوں کی طرح غیر معتبر ہیں کیونکہ وہ نسوانی رویہ چھوڑ کر مردانہ کھیلوں میں مصروف ہیں۔ سیمون ڈی بوار نے عورتوں کیلئے ''دوجا'' (The Other) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں معنویت یہ ہے کہ مرد کتنا ہی چاہے عورت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم جنس پرست ہونے کے باوجود وہ عورت کے اردگرد منڈلانے پر مجبور ہے...... یہ بات برسوں پہلے یونانی طربیہ نگار استوفینیز نے بھی اپنے ایک ڈرامے میں ایک عورت کے کردار سے کہلوائی تھی کہ عورتوں میں لاکھ برائیاں سہی، مرد عورت میں سو عیب نکالے لیکن وہ عورت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔

سیمون نے اس کتاب میں عورت کی تاریخی اور بیالوجیکل ہسٹری پر بھی بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہت سے معاملوں میں عورت کو مرد کے مقابلے میں بہت سے تجربات اور مشاہدات سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً بچہ کوکھ میں رکھنا اور پھر بچہ پیدا کرنا، یہ دو تجربات ایسے ہیں جو مردوں کے مقابلے میں عورت کرتی ہے۔ سیمون نے اس تحقیقی کتاب میں عورت کے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ بلاشبہ ''سیکنڈ سیکس'' نسوانیت پر ایک فلسفیانہ، تاریخی، فکری اور تحقیقی دستاویز ہے۔

The Ethics of Ambiguity سیمون کی وجودیت کے فلسفے پر مبنی کتاب ہے جو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں اس نے فرد کی آزادی خارجی محرکات اور آزادی کی راہ میں معاشرتی پابندیوں پر بحث کی ہے۔ اس نے مثال دے کر بحث کی ہے کہ عورتیں اور غلام معاشرے میں ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں جس میں انہیں کوئی آزادی نہیں۔ رسومات، مذہبی فرمان اور معاشرے کے قوانین نے انہیں آزادی نہیں دی بلکہ پابندیوں میں جکڑ دیا ہے اور انہیں بتلایا جاتا ہے کہ انہیں قدرت نے ایسا ہی بنایا ہے کیونکہ قدرت کے خلاف وہ بغاوت نہیں کر سکتے، چنانچہ انہیں ایسا ہی رہنا چاہیے۔ معاشرہ انہیں بغاوت نہیں کرنے دیتا اور وہ اسی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کتاب میں سیمون نے نائٹ، ہیگل، مارکس اور سارتر کے نظریات پر بحث کی ہے اور ان سے مکالمہ کیا ہے۔ جدید فلسفے کی تاریخ میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سیمون ڈی بوار کا آٹو بائیوگرافیکل کام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی سوانح اس لحاظ سے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتے وقت اس نے اپنے عہد کی نامور شخصیتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بیسویں صدی کی تمام نامور شخصیتیں جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں کارنامے سرانجام دیئے وہ سیمون کی بائیوگرافی میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سیمون کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے اس کی بائیوگرافی ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ سیمون کی شخصیت کی کئی پرتیں ہیں۔ وہ فلاسفر تھی۔ ناول نگار تھی، مصنف تھی، سوشل ورکر تھی۔ اس کی ایک سیاسی اور فنی حیثیت تھی۔ تمام پہلوؤں پر اس نے اپنی بائیوگرافی میں روشنی ڈالی ہے۔ سیمون نے علمی طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ نسوانی تحریک میں بڑھ چڑھ کر شمولیت

کی۔ جلسوں میں تقریریں کیں۔ احتجاجی مظاہروں میں حصہ لیا۔ عورتوں پر لاگو ناجائز قوانین کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان تمام پہلوؤں پر اس کی بائیوگرافی میں تفصیل ملتی ہے۔ جس سے سیمون کے فلسفے اور نظریات سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

سیمون ڈی بوار کی زندگی کی کہانی 5 حصوں پر مشتمل ہے۔

بائیوگرافی کے پہلے حصے میں اس نے اپنے بچپن، ماں باپ سے اپنے تعلقات اپنے سکول کے حالات، دوستوں سے اس کے شب و روز کے حالات، اپنی شخصیت میں روز بروز تبدیلی کی روداد ہے۔ دوسرا حصہ بلوغت کی عمر تک پہنچنے کی روداد ہے نیز جنگ اور امن کے زمانے میں اپنی ذمے داریوں کے احساس کے حالات درج ہیں۔ تیسرا حصہ بہت اچھا ہے۔ جس میں اس نے ادب اور فلسفے سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے اور نسوانی تحریک سے اپنے مضبوط رشتے کی بات کی ہے۔ کمیونزم اور کیپیٹل ازم کے نقصان اور فائدے پر بحث کی ہے۔ ادب، فلسفے پر اپنے نظریات پر کھل کر بحث کی ہے۔

سیمون ڈی بوار نے سارتر کے ساتھ 41 سال اکٹھے گزارے۔ اس حصے میں اس نے سارتر کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اس حصے پر کچھ اعتراضات بھی کیے گئے۔ سخت تنقید بھی کی گئی اس لئے کہ سیمون نے سارتر کے آخری دنوں کے حالات بیان کرتے وقت سارتر کی جسمانی اور ذہنی خرابیوں اور زوال پذیر ہونے کا ذکر کیا ہے جسے قارئین نے پسند نہیں کیا۔ لیکن ان اعتراضات کے باوجود یہ حصہ بہت جاندار اور قاری کیلئے سارتر کے حالات سے آگاہی کا باعث بنتا ہے۔ سیمون کے مختلف شخصیتوں کو لکھے خطوط بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ کچھ خط سارتر کے نام ہیں کچھ خطوط فیدل کاسترو کے نام یہ خطوط انہی عنوانات سے چھپ چکے ہیں...... سیمون کا امریکی موسیقار Nelson. Algren سے عشق بہت مشہور ہے۔ سیمون نے اس پر ایک ناول بھی لکھا ہے اس کے نام سیمون کے خطوط کو اکٹھا کر کے Love Affair کے نام سے شائع کیا ہے...... ان تمام خطوط سے بیسویں صدی کی نامور مصنف اور فلسفی کی زندگی کے بارے میں بہت سی مفید اطلاعات ملتی ہیں۔

سیمون ڈی بوار بیسویں صدی کی ایک بڑی تخلیق کار تھی جو وجودیت پسند فلسفی تھی۔ نامور ناول نگار تھی۔ نسوانی تحریک کی سرخیل تھی۔ اس نے عملی طور پر اس میں حصہ لیا۔ شہری دنیا کی آزادی کیلئے اس نے آواز اٹھائی۔ مزدوروں کے حق کیلئے تقریریں کہیں خاص طور پر نسوانی تحریک اس کی تحریروں کے دم سے زندہ بنے اور بقول ایک دانش ور ''نسوانیت پسندی کی تاریخ میں سیمون ڈی بوار ایک ہیروئن کا درجہ رکھتی ہے۔''

پشکن

(Alexander Pushkin)

18 ویں صدی کا عظیم روسی شاعر اسے روسی ادب کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ اس نے روسی ادب کو نئے راستوں پر قدم رکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔ روسی فطری حسن اور روسی جذبات کو نئے معانی اور مفاہیم بخشے اور انقلابی روح پھونکی۔

ساتھیو! یقین کرو
صبح ضرور طلوع ہوگی
اور آسمان فخر کی روشنی سے بھر جائے گا
روس، خواب غفلت سے جاگے گا
اور ظالموں کو شکست ہوگی

(پشکن)

....

دیواریں گریں گی
جیل کے تہہ خانے میں طوق وسلاسل ٹوٹیں گے
آزادی بڑی مسرت سے تمہیں خوش آمدید کہے گی
اور بھائی تمہیں تمہاری تلواریں واپس دے دیں گے

(پشکن)

....

درباری زندگی بھی کیا زندگی ہے
دربار میں بیٹھے لوگ سو رہے ہوتے ہیں
اگر کھڑے ہوں
تو اونگھ رہے ہوتے ہیں

(پشکن)

پشکن

18 ویں صدی کے مشہور روسی شاعر Derzhavin کو آج ایک سکول میں ایک تقریب کی صدارت کرنا تھی۔ سکول میں بڑی گہما گہمی تھی تقریب شروع ہوئی لڑکے سٹیج پر آتے اور اپنی اپنی نظم، تقریر یا مضمون سنا کر چلے جاتے۔ آخر میں ایک لڑکا آیا۔ سمارٹ، نوجوان، خوبصورت اور اپنی نظم جس کا عنوان (Memories in Tsarskoye) تھا سنائی۔ اپنے وقت کا عظیم شاعر (Derzhavin) اٹھا اور لڑکے کو گلے لگا لیا۔ لڑکا گھبرا کر بھاگا تو ڈرازویں چلایا۔ ''پکڑو......یہی تو آنے والے وقت کا (Derzhavin) ہے۔

بھاگنے والا لڑکا واقعی آنے والے وقت کا عظیم شاعر تھا لیکن اس کا نام (Derzhavin) نہیں تھا۔ بلکہ الیگزینڈر پشکن تھا۔

پشکن کی روسی ادب میں وہی اہمیت ہے جو ولی دکنی کی اُردو شاعری میں اور چاسر (Chaucer) کی انگریزی شاعری میں، تینوں کو آپ اپنی اپنی زبان اور ادب کے باوا آدم کہہ سکتے ہیں۔ چاسر کی زبان وہ نہیں تھی جواب انگریزی دان استعمال میں لاتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنی شاعری سے انگریزی شاعری کو چلنے کا ڈھنگ سکھایا یہی حال ولی دکنی کا ہے۔ اس نے فارسی شاعری سے خود استفادہ کیا۔ فارسی خیالات اور فارسی زبان کی خوبصورتیوں اور باریکیوں کو اُردو غزل میں سمو کر یوں گنگنائے کہ میر تقی میرؔ نے بھی ولی دکنی کو اپنا محبوب قرار دے دیا۔ پشکن نے بھی روسی ادب میں یہی کیا۔ اس نے روسی شاعری اور روسی ادب کو نئے راستوں پر قدم رکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔ روسی زمینی حسن اور روسی جذبات کو مفاہیم اور نئے اسلوب میں پیش کیا۔ وہ بائرن اور شیکسپیئر سے بے حد متاثر تھا، چنانچہ اُن کے اسلوب اور طرز بیان کو اپنی شاعری میں برت کر روسی ادب کو وسعت عطا کی۔ یہی نہیں اپنے اِردگرد کے ادیبوں کو تھپکی دے کر راہِ راست پر گامزن کیا اور اُن سے وہ کام لیا کہ وہ عالمی شہرت کے مستحق قرار پائے۔ مثلاً گوگول......گوگول ''انسپکٹر جنرل'' کا مصنف گوگول جس کا لافانی شاہکار (Dead Souls) نہ صرف روس بلکہ دنیا کا ایک بے مثال ناول ہے......گوگول کو اگر پشکن کا شاگرد خاص کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے اپنا ابتدائی زمانہ پشکن کے ساتھ گزارا۔ اسے کہیں رہنے کی جگہ نہ ملی تو وہ پشکن کے گھر ٹھہر گیا۔ وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے:

''میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں آج یہاں، کل نہ جانے کہاں، نہیں پتا کیا بتاؤں، بس تم مجھے پشکن کے پتے پر خط لکھ دینا، میں جہاں بھی رہوں پشکن کے پاس ہوتا ہوں''۔

پشکن پر لکھتے ہوئے گوگول کا ذکر اس لئے آیا کہ مجھے پشکن کے زرخیز ذہن کی داد دینا مقصود ہے۔ جن دنوں گوگول پشکن کے پاس رہتا تھا پشکن ایک منظوم ناول کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ چنانچہ پشکن نے اپنے اس منظوم ناول کا پلاٹ گوگول کو دے دیا کہ تم اس پر ایک ناول لکھ لو چنانچہ گوگول نے پشکن کے دیئے ہوئے پلاٹ پر ناول لکھ لیا اور یہ ناول دنیا کے دس بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور اس ناول کا نام (Dead Souls) ہے۔ گوگول

نے اپنے ''اعترافات'' میں اس کا اعتراف کیا ہے' وہ کہتا ہے۔

''اگر پشکن مجھے یہ خاکہ' ناول کا مواد نہ دیتا تو شاید میں (Dead Souls) کبھی نہ لکھ پاتا''۔

یہ حقیقت ہے کہ انسپکٹر جنرل' اوورکوٹ اور ڈیڈ سولز جیسے شاہکار تخلیق کرنے والے گوگول کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں پشکن کا بہت ہاتھ ہے۔ جس کا گوگول خود بھی معترف ہے۔

پشکن 6 جون 1799ء میں ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جاگیردار تھا لیکن اپنی بنجر زمینوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تھوڑی بہت آمدنی پر گزارا کرتا۔ ست زندگی گزارتا اور فیشن ایبل سوسائٹی میں وقت گزارتا۔ پشکن کی ماں ابراہام ہنی بال کی پوتی تھی جو کسی افریقی شہزادے کا بیٹا تھا۔ روس میں آ گیا تو عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ پشکن کی شکل وصورت پر غور کیا جائے تو افریقی اثر ضرور ملے گا...... پشکن کے ابتدائی دن فرانسیسی سیکھنے میں گزرے۔ چنانچہ اس نے شاعری کا آغاز کیا تو افرانسیسی اور روسی زبان میں۔...... پشکن ست کاہل۔ حساب سے سخت نفرت، سکول کی کتابوں سے بے زار، اگر دلچسپی تھی تو لائبریری کی ان کتابوں سے جو نصاب میں شامل نہ تھیں۔ اپنے باپ کی لائبریری میں جو کچھ تھا سب پڑھ لیا۔ سینٹ پیٹر برگ (St. Peters Burg) سکول کے سپرنٹنڈنٹ کی پہلے سال کی رپورٹ اس کے ابتدائی دنوں کا بہترین جائزہ ہے۔ اس نے لکھا......

''پشکن بہترین صلاحیتوں کا مالک ہے...... اس کا دماغ صرف ان مسائل کو حل کرتا ہے جن میں کم دماغ خرچ ہو...... مزاح سے بھرپور...... لیکن وہ اسے فضول باتوں میں صرف کرتا ہے''

عام آدمی کی ساری زندگی پشکن کے بارے میں یہی رائے رہی یا وہ لوگ جو اسے جانتے نہیں تھے۔ اس کے بارے میں یہی رائے رکھتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے شاعروں اور دانشوروں نے اس شاعر کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور پشکن نئے لکھنے والوں میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے لگا۔

سینٹ برگ سکول سے فارغ ہونے کے بعد پشکن کو 7 سو روبل سالانہ تنخواہ پر وزارت خارجہ میں ملازمت مل گئی، ان دنوں ایسے ملازم کوئی کام نہیں کرتے تھے صرف ترقی کا انتظار کرتے تھے۔ پشکن کے والدین بھی اس کے پاس آ گئے۔ پشکن اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں میل جول رکھنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ جہاں تک باپ کی آمدنی اور جائیداد کا تعلق تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھی اور اگر کچھ تھا بھی اس میں سے حاصل کرنا پشکن کے لے بہت مشکل تھا۔ وجہ...... وجہ اس کے باپ کی حد درجہ کنجوسی تھی۔ بہرحال پشکن نے اس فیشن ایبل سوسائٹی میں قدم رکھا۔ شراب پی، محبت کی، ڈانس کی محفلوں میں شرکت کی...... تھیٹر میں جاتا تو اپنے ناول کے ہیرو Eugenc Onegin کی طرح لوگوں کے پیروں پر پاؤں دھر کر گزرتا اور لوگوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا۔ لوگ سٹیج پر ہونے والا ڈرامہ نہ دیکھ سکتے۔ اگر وہ کچھ کہتے تو دنگا فساد شروع کر دیتا اور پھر اس کے دوستوں کو صلح صفائی کرانا پڑتی۔ لیکن ان تمام حرکتوں کے باوجود وہ شعر کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ چنانچہ ان ہنگاموں کے ساتھ ساتھ اس نے 1820ء میں اپنی نظم (Ruslan and Ludmila) مکمل کی۔ خوبصورت شعر مناظر کا حسن۔ کرداروں کی عمدہ تشکیل آسان اور تروتازہ زبان نے اس کو روسی زبان کیف خوبصورت شاعرانہ ناول کا درجہ دے دیا تھا اور وہ دن بدن شہرت کی طرف سفر کرنے لگا۔ زارِ روس کا عہد حکومت عام آدمی کی زندگی پر سختیوں اور مصیبتوں کا بارگراں بننے لگا تھا اور حکام روس کو جیل خانے کا نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ مغربی یورپ کے جمہوری نظام نے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان سرکاری ملازمین میں آزادی کی شمع روشن کر دی تھی۔

پشکن تو شاعر تھا چنانچہ اس کے اندر اس نظام کے خلاف ایک ردعمل جمع ہونا شروع ہوا اور وہ اس کا اظہار اپنے اشعار میں کرنے لگا۔ اپنی نظم Ode Ro Liberty میں اس نے زارِ روس کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ ظل سبحانی کہلوانے والے بادشاہ کو اس نے لوگوں کی لاشوں پر کھڑا ہونے کا طعنہ دیا۔ اپنی نظم دیہات یعنی Village میں اس نے کسانوں کی بری حالت کا رونا رویا۔ اور پھر نوید سنائی:

ساتھیو! یقین کرو
صبح ضرور طلوع ہوگی
اور آسمان فخر کی روشنی سے بھر جائے گا
روس خواب غفلت سے جاگے گا
اور ظالموں کو شکست ہوگی

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے یہ شعر زبان زد عام بن گئے۔ جب اس کی بھنک حکومت کے کانوں میں پڑی تو انہیں پشکن کی اس حرکت پر غصہ آیا۔ سینٹر برگ کے گورنر جنرل نے پولیس کو پشکن کے گھر کی تلاشی لینے کے لئے کہا۔ الیگزینڈر اول نے پشکن کو سائبریا میں جلا وطن یا قید سزا کا حکم سنایا۔ پشکن کے دوست پریشان ہوئے۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کی اور یہ فیصلہ کرا لیا کہ پشکن کو جنوبی روس میں بھیج دیا جائے۔ یہاں پہنچ کر پشکن کے اندر انقلابی بیج نے درخت بننا شروع کر دیا۔ ادھر دوستوں نے یہ کوشش جاری رکھی کہ اسے وہاں کسی اور جگہ بھیج دیا جائے کیونکہ پشکن یہاں خوش نہیں تھا۔ لیکن وہ مسلسل شاعری کرتا رہا اور لارڈ بائرن کے زیر اثر شاعری میں نئے نئے معنی کے چراغ روشن کرتا رہا۔ وہ خود لکھتا ہے کہ لارڈ بائرن کی شاعری نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ اس کی نظمیں The Robber Brothers اور The Fountain of Bakhchisarai۔ لارڈ بائرن کے انداز اور اسلوب میں کہی ہوئی نظمیں ہیں۔ لوگوں نے ان نظموں کو پسند کیا اور یہیں قیام کے دوران اس نے اپنا شعری ناول Eugeneonegin مکمل کیا۔ اور پھر اکتوبر 1829 میں اس نے اپنا ڈرامہ Boris Godunov مکمل کیا۔ یہ المیہ تھا اور اس نے سٹیج کے لئے لکھا تھا۔ ڈرامے میں وہ شیکسپیئر سے بے حد متاثر تھا اور روس کو وہ شیکسپیئر کا اسلوب دینا چاہتا تھا۔ وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے اپنے المیہ کو شیکسپیئر کے اسلوب میں ڈھالا ہے۔ کرداروں کی تشکیل کے سلسلے میں میں نے شیکسپیئر کی پیروی کی ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ڈرامے کے سلسلے میں شیکسپیئر کے اصول وضوابط ہمارے تھیٹر کے لیے نہایت موزوں ہیں۔

19 نومبر 1825ء کو الیگزینڈر اول مرا اور اس کے بھائی کونسٹائن کو تخت نشین ہونا تھا۔ لیکن اس کا چھوٹا بھائی نیکولس تخت نشین ہو گیا۔ یہ خبر فوجیوں میں پھیل گئی کہ کونسٹائن کو زبردستی حق سے محروم کیا گیا ہے۔ فوج میں بغاوت ہوئی لیکن نیکولس نے قابو پا لیا لیکن باغی افسر اس کے عذاب سے نہ بچ سکے۔ ان میں پشکن کے دوست شامل تھے۔ 5 کو پھانسی چڑھا دیا گیا اور باقی سائبریا بھیج دیئے گئے لیکن پشکن سزا سے بچ گیا اس لئے کہ وہ وہاں نہ تھا۔ اور پھر اسے ماسکو دربار میں بلا لیا گیا۔ نیکولس نے اسے بڑے احترام سے بلایا اور اس سے پوچھا:

''اگر تم سینٹر برگ میں ہوتے تو کیا اس بغاوت میں حصہ لیتے جو میرے خلاف ہوئی تھی''

''بے شک جناب۔ میرے سب دوست اس میں شامل تھے میں کیسے شامل نہ ہوتا میں تو وہاں نہ تھا اس لئے حصہ نہ لے سکا'' ''تو پھر اب کیا ارادے ہیں۔ کیا اب تم اپنی سوچ بدلو گے''۔

پشکن خاموش رہا اور بے دلی سے ہاں کر دی۔ پھر زار نے اس سے پوچھا:

''آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ سنسر شپ بہت کڑی ہے''

''مگر تم ایسی چیزیں لکھتے ہی کیوں جس پر سنسر کو اعتراض ہو''

''اسے تو معصوم اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی اعتراض ہے''

''چلو اب تمہاری چیزیں میں سنسر کروں گا۔ تم جو لکھو مجھے بھیجو''

پھر زار نے اس کا بازو پکڑا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

حضرات! دیکھیے یہ نیا پشکن ہے۔ آیئے پرانے پشکن کو بھول جائیں'' لیکن یہ الفاظ تھے۔ پرانے پشکن کو بھولنا بہت مشکل تھا۔ لوگوں کے لئے بھی اور خود پشکن کے لئے بھی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

ابتدا میں پشکن کو اونچی سوسائٹی میں جانے اور نام کمانے کا بہت شوق تھا لیکن 1825ء کے بعد اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ تنہائی محفل آرائی سے زیادہ پرکشش ہے۔ سال دو سال بعد پشکن ایک ڈانس پارٹی میں شرکت کے لئے گیا اور وہاں سولہ سال کی ایک لڑکی نا تالیا (Natalia) پر اس کی نظر پڑی اور پھر اسے اپنی خبر نہ رہی۔ اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے ماں باپ سے ملاقاتیں کیں۔ تھیٹر میں لوگوں کے پیروں کو روند کر چلنے والا نا تالیا کے حسن سے مات کھا گیا اسے ملتا تو لب نہ ہلا سکتا لیکن تنہائی میں پہروں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا نا تالیا پشکن کے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے اسے پسند نہ کرتی تھی اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ پشکن کے مرحوم الیگزینڈر راول کے بارے میں نظریات اچھے نہ تھے۔ پھر بھی اس نے نا تالیا سے دل کی بات کہہ دی اور شادی کی بات چھیڑ دی۔ نا تالیا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ شادی نہیں ہو سکتی۔ پشکن یہ بات سن کر ترکی کے خلاف جنگ لڑنے چلا گیا۔ کالا فراک کوٹ، ہاتھ میں ہنٹر۔ اس کے ساتھی اسے اس لباس میں جرمنی پادری کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن وہ سپہ گری کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو اسلوب کی بھٹی میں آنچ دے کر پختہ کرتا رہا۔

دیواریں گریں گی
جیل کے تہہ خانے میں طوق و سلاسل ٹوٹیں گے
آزادی بڑی مسرت سے تمہیں خوش آمدید کہے گی
اور بھائی تمہیں تمہاری تلواریں واپس دے دیں گے

1830ء کا موسم بہار پشکن کے لئے بڑا مہربان ثابت ہوا۔ پشکن ماسکو آیا تو نا تالیا اور اس کی ماں نے اسے بڑی محبت سے خوش آمدید کہا۔ آنا جانا پھر شروع ہوا پشکن نے وقت ضائع کئے بغیر 16 اپریل کو شادی کی دوبارہ درخواست کر دی اور نا تالیا نے ہاں کر دی۔ 18 فروری 1831ء شادی کا دن مقرر ہوا۔ وہ بہت خوش تھا لیکن جب وہ نا تالیا کو انگوٹھی پہنانے لگا تو وہ انگوٹھی فرش پر گر گئی اور موم بتی بجھ گئی۔ ''یہ'' دونوں چیزیں بدشگونی کی علامت ہیں''۔ اس نے سوچا اور اس کا رنگ زرد ہو گیا۔

1833 میں وہ اپنے آبائی گاؤں چلا آیا اپنی نامکمل تصانیف کی طرف دھیان دیا اور ایسی نئی کہانیاں لکھیں اور شاعری کی جس نے اسے عالمی شہرت کے تخت پر بٹھا دیا۔ ''مچھیرے کی کہانی اور مچھلی'' ''پیتل کا شہسوار'' اور "Queen of

"Spade" اس دور کے شاہکار ہیں۔ یہ کام مکمل کر کے وہ پیٹرز برگ واپس آ گیا۔

نا تالیا (Natalia) سے شادی کے بعد پشکن کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور وہ پرانی زندگی کو بھول کر نئی زندگی بسر کرنے لگا وہ شادی کے بعد کی زندگی کے بارے میں خود لکھتا ہے۔

''میری شادی ہو گئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اب میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں۔''

یہ خوشی اسے زیادہ دن تک نصیب نہ ہوئی۔ پشکن کی ساس اپنی بیٹی کے کان بھرتی رہتی اور ہر روز ایک جھگڑا پشکن کا منتظر ہوتا چنانچہ وہ ماسکو چھوڑ کر پیٹرز برگ منتقل ہو گیا اور پھر چند ذہنی صدموں سے اس کی ملاقات ہوئی۔

پیٹرز برگ میں اس کی ملاقات بادشاہ سے ہوئی اور پشکن کی خوبصورت بیوی اسے بھا گئی۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ نا تالیا سرکاری محفلوں اور دربار میں شریک ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک پشکن کو دربار اور محلات کی محفلوں میں آنے جانے کا اجازت نامہ نہ ملے۔ چنانچہ پشکن کو دفتر خارجہ میں ایک عہدہ دے دیا گیا۔ اب پشکن کی زندگی ڈانس کی محفلوں اور درباری تقریبات میں گزرنے لگی اور نا تالیا ہر محفل میں اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ پشکن ان محفلوں کی رنگینی اور دربار کی حاضری سے اکتا گیا تھا۔ اب وہ لکھنے لکھانے سے دور ہوتا جا رہا تھا اور بادشاہ کی اس چال کو سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک تیر سے دو نشانے کرنا چاہتا ہے پشکن کو وظیفہ دے کر خوش کرنا چاہتا ہے اور اسکی بیوی سے ملاقاتوں کا ذریعہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ پشکن نے محفلوں میں اکثر ناراضگی کا اظہار کیا اور پھر اس کی جذباتی زندگی میں اتار چڑھاؤ پیدا ہونے لگا جو اس کی موت کا باعث بنا۔

پشکن نے اپنے آپ کو درباری پنجرے سے آزاد کرانے کی کوشش شروع کی کیونکہ اس کا مزاج عوامی تھا درباری نہیں لیکن اپنے آپ کو اعلیٰ سوسائٹی میں نامور بنانے کے لالچ میں اس سے یہ فعل سرزد کرایا تھا۔ چنانچہ 25 جون 1834ء کو پشکن نے اپنا استعفیٰ زار کو بھجوا دیا۔ جس سے بادشاہ کی آتش انتقام اور بھڑک اٹھی۔ بعد میں پشکن نے درباری زندگی کی عکاسی کچھ اس طرح کی:

درباری زندگی بھی کیا زندگی ہے۔
دربار میں بیٹھے لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔
اگر کھڑے ہوں۔
تو اونگھ رہے ہوتے ہیں۔

پشکن نے بادشاہ کی نوکری چھوڑ کر اپنے تخلیقی کاموں کی طرف توجہ دی لیکن درمیان میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ اس کے سارے کام ادھورے رہ گئے۔

بادشاہ کا ایک سرکاری عہدیدار، ہیکرن ڈینٹس جو دل پھینک مشہور تھا اس نے پشکن کی بیوی نا تالیا کی طرف شناسائی کے قدم بڑھانا شروع کر دیئے۔ پشکن کو شک تھا کہ وہ نا تالیا سے ملتا رہتا ہے۔ پشکن کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی باتوں نے پشکن کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ جب یہ سب سرگوشیاں چل رہی تھیں تو پشکن کو ایک گمنام خط ملا جس کے بارے میں پشکن کو یقین کامل تھا کہ یہ خط ہیکرن نے لکھا ہے۔ پشکن یہ خط پڑھ کر غصے میں پاگل ہو گیا چنانچہ اس نے ہیکرن کو ایک خط لکھا جس میں اس کی شان میں برے الفاظ استعمال کئے گئے تھے جنہیں ہیکرن نے توہین ذات قرار

دیااور پشکن کو Duel لڑنے کا چیلنج کر دیا۔

ہیکرن اور پشکن دونوں وقت مقررہ پر Duel لڑنے کے لئے ایک ویران جگہ پر آمنے سامنے کھڑے ہوئے پشکن اشارہ ملنے پر فائر کرنے کے لئے اپنی پستول سیدھی کرنے ہی والا تھا کہ ہیکرن نے اس پر فائر کر دیا۔ پشکن کو آکر ہیکرن نے ہی کھڑا کیا دوبارہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر گئے۔ فائرز کا تبادلہ ہوا پشکن کی گولی سے ہیکرن بھی زخمی ہوا لیکن پشکن کے زخم ہیکرن سے زیادہ گہرے اور تکلیف دہ تھے۔ پشکن کو گھر لایا گیا۔ نا تالیا رات گئے ڈانس کی ایک محفل سے واپس آئی تو پشکن نے اسے اپنے کمرے میں آنے سے منع کر دیا۔ جب پشکن نے خون آلود کپڑے اُتار دیئے تو اسے اندر بلایا اور اس سے کہنے لگا۔

''اگر میں مر گیا تو میری موت کی ذمہ داری خود پر مت ڈالنا یہ لڑائی میرا ذاتی معاملہ تھا۔''

اس کے بعد اس نے بادشاہ کے نام خط میں لکھا کہ میری موت کا بدلہ ہیکرن سے نہ لیا جائے۔

پشکن دن بدن کمزور ہوتا گیا اور پھر 29 جنوری کو وہ فوت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے پشکن نے اپنے تمام مخالفوں کو دل سے معاف کر دیا اور تمام گلے شکوے بھلا دیئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کے چہرے پر ایک شانتی، ایک سکون اور اطمینان تھا۔

پشکن اپنے عہد کا ایک انتہا پسند اور باغی شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد روس میں ادب لکھنے والوں کے دو گروہ بن چکے ہیں ایک قدامت پسند تھے دوسرا گروہ ان ادیبوں کا تھا جو روایت سے بغاوت پر تلے ہوئے تھے پشکن کا تعلق شاعروں کے اسی گروہ سے تھا۔

پشکن نے زیادہ تر شاعری کی اور کہانیوں کو بھی شعر کی زبان دے کر پیش کیا۔ اس کی ابتدائی کہانیاں اور قصے فوک کہانیوں کی بنیاد پر ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جو بچپن میں اس نے اپنی انا (اینا روڈ وفنا) سے سنی تھیں۔ اپنی یادداشت کی بنا پر اس نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا چنانچہ اس نے ان کا بیان بڑی چابکدستی سے کیا اور انہیں فنی حسن بخشا۔

پشکن کے نقاد اس کی تحریری زندگی کے دو رخ بیان کرتے ہیں ایک راہبانہ اور دوسرا عیاشیانہ۔ آخری عمر میں پہلا رخ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا لیکن دوسرے رخ کو بھی وہ تحریروں سے خارج نہ کر سکا۔ پشکن کو روزمرہ زندگی کا شاعر کہا جاتا ہے۔

پشکن شاید پہلا روسی شاعری ہے جس نے رومانوی تحریک کو شروع کیا لیکن باوجود رومانوی ہونے کے وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند شاعر تھا۔ جوں جوں اس کے من میں پختگی پیدا ہوتی گئی وہ رومانوی انداز سے کنارہ کشی کرتا گیا۔ اسے اپنے وطن سے محبت تھی۔ فن سے پیار کرتا تھا۔ اسے دادِ سخن کی پروا نہیں تھی۔ وہ لوگوں کی داد سے بے پروا محبت، حسن اور وطن کی محبت کو اپنے نغموں اور گیتوں میں سموتا رہا۔

روسی نقادوں نے ایک عرصہ اسے نظر انداز کیا لیکن جب مشہور ناول نگار دستوئیفسکی نے 1880ء میں اس کی یادگار کی نقاب کشائی کی اور اس کی شاعری کو فن پارہ قرار دیا تو لوگوں نے اس کی طرف توجہ دی اور اس کے نغمے ہونٹوں پر سجنے لگے۔ اس نے جو اپنی آخری نظم میں پیش گوئی کی جو پوری ہو گئی کہ روس کا بچہ بچہ میرے گیت گاتا پھرے گا۔ اس کی آخری نظم کے مصرعے کچھ یوں تھے:

Russia will know my Name

Familiar it shall grow in every living Tongue

Throughout her Great Domain.

پشکن ایک عوامی شاعر تھا۔ دیر میں سہی لیکن عوام نے اسے دل میں جگہ دی۔ اس نے دلکش رومانوی کہانیاں لکھیں۔ اس کی ساری کہانیاں اور ناول منظوم ہیں۔ شعر کو پردہ بنا کر اس نے عوامی آواز کو شاہی محلات تک پہنچایا۔ پشکن اور زار روس کی آپس میں کبھی نہ بنی۔ پشکن عوام کی زبان بن کر زار کے احکامات کو للکارتا رہا اور زار چلاتا رہا کہ اس کی شاعری روس کو تقسیم کر رہی ہے۔ اسے سائبیریا بھیج دینا چاہیے۔ لیکن کوئی سزا کوئی حکم نامہ پشکن کے ارادے کو نہ بدل سکا۔ وہ کہتا رہا کہ زار لاکھ دیوار کھڑی کرے، روس کی فضاؤں میں میرا ہی نام گونجے گا اور پشکن کا نام روس کی وسعتوں میں گونجا اور آج بھی گونج رہا ہے۔

گوگول

(Nikolai Gogol)

گوگول ایک عظیم روسی ناول نگار جس نے ساری دنیا کے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ شاعری شروع کی مگر توبہ کر لی، ناول اور کہانیاں لکھیں تو اپنے اسلوب سے ساری دنیا کا ادبی ڈھانچہ بدل دیا۔ دوستوئیفسکی، ٹالسٹائی اور ترگنیف اس کے مداحوں میں شمار ہوتے ہیں۔

روس کا سارا ادب گوگول کے ''اوورکوٹ'' سے نکلا ہے۔

(دوستویفسکی)

....

اگر گوگول ''اوورکوٹ'' کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتا تو بھی اس کا شمار دنیا کے عظیم لکھنے والوں میں ہوتا۔

(ترگنیف)

....

میں نے اپنے کرداروں میں ان کی برائیوں اور دہشت کے ساتھ ساتھ اپنی برائیاں اور جنونی پن بھی شامل کر دیا ہے۔

(گوگول)

....

''ڈیڈ سولز'' کا بنیادی خاکہ اور مرکزی خیال مجھے پشکن نے دیا تھا۔

(گوگول)

گوگول

کبھی کبھی کچھ ناکامیاں آدمی کے لئے بڑی کامیابی اور ناموری کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ ایک لمبی ناک والا لڑکا 1809ء میں پیدا ہوا۔ باپ شاعر تھا، ڈراما نگار اور کہانیاں لکھتا تھا۔ اسے بھی شوق چرایا کہ وہ عشقیہ شاعری کرے گا۔ چنانچہ اس نے کچھ نظمیں لکھیں اپنا اصل نام چھوڑ کر اس نے اپنا نام (V-ALOV) رکھا۔ 1828ء میں پیسہ پیسہ جوڑ کر پیٹرز برگ سے اپنی نظموں کی کتاب خود چھپوائی۔ روس کے سب سے بڑے شاعروں کو کتاب بھجوائی کہیں سے اچھی اطلاع نہ آئی نہ کوئی کتاب بکی۔ اس نے ساری کتابیں بازار سے خرید لیں۔ ایک ویرانے میں جا کر ساری کتابوں کو آگ لگا دی۔ جب کتابیں جل رہی تھیں تو اس نے توبہ کی کہ وہ آئندہ شاعری کا نام نہ لے گا۔ شاعری سے توبہ کرنے والے اس نوجوان کا نام نکولائی ویسلی وچ گوگول تھا۔

گوگول نے شاعری سے توبہ کرنے کے بعد نثر لکھنا شروع کی اور کہانیاں، ڈرامے اور ناول لکھے اور روس کے ان ناول نگاروں میں شامل ہو گیا جن کے بغیر دنیا کے عظیم ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

گوگول یوکرائن کی ایک ریاست (Sorochintsi) میں 1809ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کاسک (Cossack) قبیلے کا ایک معزز فرد تھا۔ گوگول نے ادبی ذوق ورثے میں پایا۔ اس کے چچا کے گھر ڈرامے سٹیج ہوتے تھے چنانچہ اس نے ان ڈراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا اداکاری اس کا اضافی شوق تھا۔ سکول کے رسالے میں اس نے مبتدی کہانیاں لکھنا شروع کر دیں اور پھر چودھویں کلاس کا سرٹیفکیٹ لے کر گوگول سینٹ پیٹرز برگ آ گیا۔

1831ء میں اس کی کہانیوں کی ایک کتاب چھپی۔ اس کتاب کا نام ''ڈیکنکا کے قریب فارم میں گزری شامیں (Evenings on a form near dikanka) تھا۔ اس کے علاوہ کہانیوں کے دو ایک مجموعے (Mirgorod) کے نام سے چھپے۔ نقادوں نے ان کہانیوں پر بڑی لے دے کی اور اسے روسی مصنف ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی تحریروں میں یوکرائن کی فضا کی نشاندہی کی۔ اس وقت جس شخصیت نے اسے سہارا دیا اس کا نام پشکن تھا۔

گوگول بے کار اور بے گھر تھا۔ پشکن نے اسے اپنے گھر رکھا۔ وزیر تعلیم سے سفارش کر کے اسے عالمی تاریخ پڑھانے کی نوکری دلانے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ گوگول کی تعلیمی اہلیت اس تقرری کے لئے کافی نہ تھی لیکن 1834 میں اسے سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر لگا دیا گیا۔ پہلا افتتاحی لیکچر اس نے اِدھر اُدھر کی کتابوں سے رٹا لگا کر تیار کیا لیکن جب دوسرا لیکچر دینے کے لئے ہال میں آیا تو یہ اس کا یونیورسٹی میں آخری لیکچر ثابت ہوا۔ ہال میں طالب علم اس کے سامنے تھے اور وہ اپنے دو ساتھی لیکچرروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گوگول نے ایک کالا سکارف اپنے سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا اور دایاں ہاتھ اپنے دائیں گال پر رکھا تھا اس نے یہی مشہور کیا کہ اس کے دانت میں شدید درد ہے جب اس کو لیکچر دینے کے لئے بلایا گیا تو اس نے ڈائس پر آ کر ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کیں کہ اسے واپس بیٹھنے کے لئے درخواست کی گئی اور لیکچر اس کے ایک دوسرے ساتھی نے دیا اور اسے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ گوگول نے اس غیر ضروری مصروفیت

سے دامن چھڑا کر اپنے آپ کو لکھنے میں مصروف کر دیا۔

گوگول نے پشکن کی صحبت میں جو وقت گزارا وہ اس کی تخلیقی تربیت کا بہترین زمانہ تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی رہا پشکن کو اپنے آپ سے جدا نہ کیا۔ گوگول نے اپنے ایک دوست کو یوکرائن میں خط لکھا۔

''مجھے تم پشکن کے پتے پر خط لکھو۔ میں جہاں کہیں بھی رہوں، میں ہوتا پشکن کے پاس ہی ہوں۔''

پشکن نے اس کی ایک کہانی پڑھ کر اسے اپنے پاس بلایا تھا اور پھر یہ تعلق پشکن کی وفات تک قائم رہا۔ گوگول کا وہ ناول جس نے اسے دنیا کے عظیم ناول نگاروں میں شامل کر دیا وہ ناول اس نے پشکن کے مشورے پر ہی لکھا تھا۔ گوگول نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کا ناول بنیادی خیال اور خاکہ اسے پشکن نے دیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ایک بار پشکن نے مجھے کہا کہ میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس وقت نہیں تم اس پر ایک ناول لکھو۔ اور پھر ناول کا بنیادی خاکہ گوگول کے سامنے رکھ دیا۔ اس ناول پر گوگول نے محنت کی اور جب اس ناول کا ایک حصہ وہ پشکن کے سامنے لے کر گیا تو پشکن نے ناول پڑھ کر اداس لہجے میں کہا۔

''افسوس میرا روس کتنا اداس ملک ہے''

اس ناول کا نام مردہ روحیں(Dead Souls) تھا جس کا شمار دنیا کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے اور اسے روس کا پہلا جدید ناول کہا جاتا ہے۔

گوگول کی شہرت اس کی نمائندہ چار شاہکار تصانیف پر مبنی ہے ۔ تارس بلبا(Taras Bulba) جو یوکرائن کی کوسک(Cossack) تاریخ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ گورنمنٹ انسپکٹر (انسپکٹر جنرل) ایک سیدھے سادے نوجوان کی کامیڈی ہے جو ایک گاؤں میں پہنچتا ہے تو اسے انسپکٹر جنرل جان کر لوگ اس کا استقبال کرتے ہیں ۔ انسپکٹر جنرل نے اس گاؤں کا دورہ کرنا تھا لوگ اسے انسپکٹر جنرل سمجھتے ہیں یہ نوجوان صورت حال کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ گوگول نے اس ڈرامے میں حکومت کے افسران کی بے ایمانیوں اور بداعمالیوں کو بے نقاب کیا ہے اور صوبے میں رائج نظام کو بے ہودہ اور ناقص قرار دیا ہے۔ جب گوگول نے یہ ڈراما سٹیج کرنے کی اجازت طلب کی اور سنسر کے لئے مسودہ افسران کے سامنے بھیجا تو انہوں نے اجازت نہ دی۔ بات زارِ روس تک پہنچی تو اس نے خود ڈراما پڑھ کر اس میں چند تبدیلیاں کیں اور ڈراما پیٹرز برگ میں پیش کیا گیا۔ دیکھنے والوں میں زارِ روس بھی تھا۔ (گوگول نے اپنی ماں کو خط میں لکھا تھا کہ یہ ڈرامہ میں زارِ روس کی مہربانی سے سٹیج کر سکا ہوں)۔

جب ڈراما ختم ہوا تو زارِ روس نے کہا:

''اس ڈرامے میں ایک ایک آدمی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور سب سے زیادہ مجھے۔''

گوگول جو ساری زندگی لوگوں کے ردِعمل سے خوفزدہ رہا۔ جب زارِ روس اداکاروں اور مصنف سے ملنے گرین روم میں آ رہا تھا تو گوگول وہاں سے بھاگ گیا بلکہ روس سے بھاگ گیا۔ جرمنی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں وقت گزارا اور پھر روم میں رہائش اختیار کر لی اور اپنے ناول ''ڈیڈ سولز'' پر کام شروع کر دیا اور اپنے اس قیام کے بارے میں دوستوں کو لکھا۔

''پیامبروں کو ان کے وطن میں شاذ ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔''

"The Prophet Finds no honour in his homeland."

اس کی تین کہانیاں بڑی شہرت کی حامل ہیں:

1- Diary of a Mad Man

2- The Nose

3- The Overcoat

''ڈیڈ سولز'' گوگول کا عظیم ناول ہے ۔ یہ ناول 1842ء میں چھپا اسے روس کا پہلا جدید ناول کہا جاتا ہے۔ اسے کسانوں کی آزادی اور اصلاح کی آواز بھی کہا جاتا ہے۔ اس ناول نے اپنے ہم عصروں میں گوگول کو امتیازی حیثیت دلا دی۔ اور اسے دنیا کا عظیم ناول نگار بنا دیا۔ ''ڈیڈ سولز'' جس کا صرف ایک حصہ چھپ کر مارکیٹ میں آیا۔ نقادوں نے اسے دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کا(Counter part) کہا اور اسے جہنم کا نام دیا۔ دوسرا حصہ جسے برزخ کہا جاتا تھا وہ لکھا نہیں گیا۔ اس ناول کی کہانی ایک بدنیت اور مکار آدمی چیچکوف کے اردگرد گھومتی ہے جو ایک منفرد اور عجیب کاروبار کرتا ہے۔ غلامی روس میں رائج تھی ۔ زمینوں پر عام طور پر غلام اور(Serfs) کام کرتے تھے اور بڑے بڑے امیر آدمیوں کو اس بات پر بہت فخر تھا کہ ان کے پاس غلاموں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ ان غلاموں کے نام باقاعدہ رجسٹر پر درج ہوتے تھے، جو مر جاتا، اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جاتا تھا۔ چیچکوف نے زندہ غلاموں کی بجائے ان غلاموں کی روحوں کو خریدنا شروع کر دیا جو مر چکے تھے ۔ وہ دھوکہ دہی سے ان غلاموں کو آگے بیچنا چاہتا تھا۔ اور وہ یہ سودا سارے روس کے دیہاتوں میں جا کر کرتا ہے۔ گوگول نے ایک طرف تو چیچکوف کی عیاری کی عکاسی کی ہے اور دوسری طرف وہ روس میں غلاموں اور کسانوں کی حالت زار سے پردہ اٹھاتا ہے۔

گوگول یہ ناول لکھتے ہوئے خود بھی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گیا اسے کچھ نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن وہ لاشعوری طور پر ایک عظیم ناول کی تخلیق کر رہا تھا۔ وہ اپنے اس ناول کے بارے میں خود بھی الجھن کا شکار تھا کہ پہلی جلد میں جو بات میں کر رہا ہوں اس میں کیا راز ہے اور دوسری جلد میں کیا لکھوں گا وہ اس کے بارے میں کہتا ہے:

''ڈیڈ سولز'' کا روس کے کسانوں اور چند باغی کسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وقتی طور پر اس کا موضوع ایک راز ہے (جو میرے قارئین کے ذہن میں نہیں آ سکتا) یہ راز کیا ہے اس راز کو میں ''ڈیڈ سولز'' کی دوسری جلد میں افشا کروں گا۔''

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ غلاموں یاSerfs کا باقاعدہ رجسٹر میں اندراج کیا جاتا تھا۔ اور ان پر سالانہ ٹیکس دیا جاتا تھا جسے(Poll-tax) کا نام دیا گیا تھا۔ وہ غلام جو مر جاتے تھے ان پر بھی سال کے اختتام تک یہ پول ٹیکس لاگو ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مردہ غلاموں کو زمیندار یاLand Lord بڑی خوشی سے فروخت کر دیتا تھا اور خریدنے والا ان کو آگے من چاہی قیمت پر فروخت کر سکتا تھا اور یہ نہیں بتلاتا تھا کہ یہ مر چکے ہیں۔ چیچکوف(Chichikov) چھٹے گریڈ کا ایک سرکاری ملازم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ''ڈیڈ سولز'' خرید کر ایکLand Lord کی حیثیت اختیار کر گیا لیکن اس ناول کے گیارہویں باب تک یہ پتا نہیں چلتا کہ چیچکوف کی اس تجارت کے مقاصد کیا ہیں ۔ چیچکوف(NN) نامی گاؤں میں آتا ہے اور (Manilov) سے اپنا مقصد بیان کرتا ہے اور پھر زمیندار سے مل کر اس کاروبار کو آگے بڑھاتا ہے۔ (Plyushkin) نامی کنجوس آدمی سے سودا طے کرتا ہے۔ غلاموں کی ڈھیر ساری روحیں خرید کر وہ واپس گاؤں آتا ہے اور ایک امیر آدمی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ عورتیں اس کے آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ ایک بار روم کی تقریب میں وہ گورنر کی بیٹی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے شادی کا خواہاں ہے لیکن یہاں ایک کردارNozdryov آ کر اس کی اصلیت بتلاتا ہے۔ چیچکوف کے بارے میں افواہیں پھیلنا شروع ہوتی ہیں کہ آخر یہ کون ہے؟ کیا یہ ایک ڈاکو، چور یا لٹیرا ہے۔ اسے گرفتار کیا

جائے یہ ایک ایسا آدمی جو ہم سب کو خریدنے آیا ہے۔ Nozdrov چیچکوف کو بتلاتا ہے کہ پورا شہر اس سے خوفزدہ ہے اور پبلک اتھارٹی صرف تمہارے خوف کی وجہ سے مر گیا ہے اس مقام پر گوگول پہلی بار چیچکوف کے بارے میں بتلاتا ہے کہ وہ کون ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔

گوگول کے اس ناول کا پلاٹ بہت الجھا ہوا ہے اور اس الجھاؤ کو وہ خود بھی سلجھا نہ سکا۔ گوگول ایک جنونی آدمی تھا۔ اس کا یہ جنون اور پاگل پن بعض اوقات قاری کو اصل بات سے بہت دور لے جاتا ہے وہ خود تو دلدل میں دھنستا ہے قاری کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ لکھتا رہا اس لئے کہ وہ دوسرے لکھنے والوں سے مختلف انداز اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا سارا جنون، پاگل پن اور برائیاں اپنے ہیرو میں سمو دیں۔ اس کے بارے میں وہ خود ہی ہمیں بتلاتا ہے۔

''میں نے اپنے کرداروں میں ان کی اپنی برائیوں اور دہشت کے ساتھ ساتھ اپنی برائیاں اور جنونی پن بھی شامل کر دیا ہے۔''

چیچکوف کا کردار شاید اسی لئے قارئین کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس میں چیچکوف کا کوئی قصور نہیں گوگول کا ہے۔ وہ اسے جہاں لے جانا چاہتا تھا لے گیا۔ جو عمل کرانا چاہتا تھا اس سے وہ کرایا۔ اس نے ایک بار اپنے ایک دوست سے کہا بھی تھا۔

''کیا تمہیں مجھ میں چیچکوف کی مشابہت نظر نہیں آتی''

مشہور اور نامور نقاد بیلنسکی نے ٹھیک کہا ہے کہ گوگول ساری عمر اپنے آپ کو اپنے کرداروں سے الگ نہ کر سکا۔

گوگول نے قارئین سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ راز جو ''ڈیڈ سولز'' کی پہلی جلد میں چھپا ہوا ہے اسے وہ دوسری جلد میں افشا کرے گا مگر وہ اس وعدے کو پورا نہ کر سکا۔ وہ جنونی اور دماغی عارضے کا شکار تو پہلے ہی تھا۔ 1848ء میں یروشلم کی یاترا کر کے واپس آیا تو عیسائیت کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا اور ایک پادری Konstantinovs کے چنگل میں آ گیا جس نے اسے اس کی گزشتہ زندگی سے متنفر کر دیا اور گوگول یاسیت، ناامیدی، جنون اور پاگل پن کا شکار ہو گیا۔ پادری نے اسے یقین دلا دیا کہ اس کی تحریریں اور اس کا سارا تخلیقی کام گمراہ کن ہے اور ایک مذاق ہے جو شیطان نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ ایک رات گوگول نے اپنے سارے مسودے جلا دیئے۔ ان مسودوں میں ''ڈیڈ سولز'' کا غیر مطبوعہ مسودہ بھی تھا۔ پادری کے لیکچر اور اپنے جنون کے ہاتھوں اس نے کھانے پینے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ فاقے کرنے شروع کر دیئے۔ دوستوں نے بڑے حربے استعمال کئے۔ اس کے ناک میں جونکیں لگائی گئیں۔ بُری روحوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ختم اور درود پڑھے گئے مگر اس نے ایک دانہ منہ میں نہ ڈالا اور 4 مارچ 1852ء کو گوگول مر گیا۔ لوگوں میں یہ افواہ کافی عرصہ پھیلی رہی کہ اسے زندہ ہی دفنا دیا گیا ہے۔ بالکل ایڈگر ایلن پو کی ایک کہانی (The Premature Burial) میں پیدا ہونے والی صورت حال کی طرح جس میں آدمی کو زندہ دفنا دیا جاتا ہے۔ گوگول منہ کے بل پڑا ملا تھا جس سے یہ شک گزرا کہ اسے زندہ دفنایا گیا ہے۔ ایک روسی نقاد نے اس کی جیکٹ سے ایک ٹکڑا کاٹ لیا تھا تا کہ ''ڈیڈ سولز'' کی جلد کے طور پر استعمال کر سکے۔ آج گوگول کی قبر اس گھر کے سامنے ہے جس گھر میں وہ فوت ہوا تھا۔ ٹالسٹائی کے مجسمے کے ساتھ اس کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔

گوگول مر گیا (کاش پشکن زندہ ہوتا تو گوگول چند سال اس کی رہنمائی میں اور جی لیتا اور پادری کے چنگل میں نہ آتا) مگر ''ڈیڈ سولز'' زندہ ہے اور اس ناول کا دنیا کے عظیم ادب میں شمار ہوتا ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے یہ ایک نامکمل ناول ہے

اگر یہ مکمل ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ اس ناول نے اس کو دنیا اور دنیا کے ماحول سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ جب وہ سوئٹزرلینڈ گیا تو ایک ہوٹل کا چکر لگایا۔ ''ڈیڈ سولز'' کا مسودہ اس کے پاس تھا۔ لوگ کھا پی رہے تھے مے نوشی جاری تھی، شور وغل برپا تھا۔ وہ ان تمام چیزوں سے بے خبر ایک میز کے سامنے کرسی بچھائے ''ڈیڈ سولز'' کا ایک باب مکمل کر رہا تھا۔ گوگول نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ کوئی عورت اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ صرف روم کے قیام کے دوران ایک آدمی Losif Vielhorsky سے اس کا جذباتی تعلق قائم ہوا لیکن وہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

NOSE ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جس کی ناک کٹ جاتی ہے اور وہ بغیر ناک کے معاشرے میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ گوگول کی اپنی ناک بھی بہت لمبی تھی شاید لاشعوری طور پر اس نے یہ کہانی اپنے آپ کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہو لیکن اس میں پیش آنے والے واقعات اس کی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار کوفالیف (Kovalev) اپنی ناک کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماسکو آتا ہے اور سوشل سیٹ اپ میں اپنا مقام بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ماسکو کی سوسائٹی اسے قبول نہیں کرتی۔ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بغیر ٹانگ اور ہاتھ کا آدمی تو سوسائٹی کو قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن بغیر ناک کا آدمی قبول نہیں۔ اس کہانی کی نقادوں نے مختلف تشریحات کی ہیں آرا میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ڈی ایس مرسکی (D.S.Mirsky) نے تو اسے "A Piece of Horse Play , Almost Nonsense." کے الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے یعنی ایک ایسی کہانی جو مختلف اور الگ تھلگ ہے اور کلی طور پر واہیات کہانی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے تازہ ایڈیشن میں بھی گوگول کو اس کہانی کے حوالے سے داد اور بیداد سے نوازا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ''گوگول دنیا کے طنز و مزاح نگاروں میں اول حیثیت رکھتا ہے اور شاید روس کا (اس کہانی کے حوالے سے) واہیات مصنف ہے۔''

اوورکوٹ کا شمار دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اگر گوگول اس کہانی کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتا تو پھر بھی اس کا شمار دنیا کے عظیم لکھنے والوں میں ہوتا۔ گوگول کی اس کہانی نے پوری دنیا کے ادب پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ دوستوئیفسکی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ روس کا پورا ادب گوگول کے اوورکوٹ کی دین ہے۔

اوورکوٹ کی کہانی ایک سرکاری کلرک کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ کہانی ایک غریب آدمی کی تذلیل کی کہانی ہے۔ جسے اس عہد کے ان لوگوں کی نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اپنے آپ کو سوسائٹی کا اعلیٰ فرد سمجھتے تھے۔ یہ کلرک کی ہتک عزت نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تذلیل ہے۔

(Akaky Akakyevitch) ایک کلرک ہے جو اپنی شکل و شباہت اور رہن سہن سے ایک معمولی انسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاموش، مشین کی طرح دفتر میں کام کرتا ہے۔ سارا دفتر اس کا مذاق اڑاتا ہے اور وہ خاموشی سے ہر اچھے اور برے سلوک کو برداشت کرتا ہے اور کام کرتا رہتا ہے۔

''وہ ایک گورنمنٹ دفتر میں کلرک تھا۔ شکل وصورت سے وہ ایسا آدمی نہ تھا جسے قابل توجہ سمجھا جائے۔ چھوٹا قد، الجھے ہوئے سرخ بال، چہرے پر چھوٹے چھوٹے دھبے، چندھیائی سی آنکھیں، رخساروں پر سلوٹیں۔ چہرے کا رنگ زرد اور ہلکا سا سرخی مائل۔ جو جریان خون کا سبب تھا۔ یہ شاید پیٹرز برزگ کے موسم کا تحفہ تھا۔

اسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اسے زندگی کے کسی ہنگامے میں شریک ہونے کا شوق تھا۔ بس وہ سر جھکا کر مشین کی طرح کام میں جتا رہتا ہے۔ دفتر میں زیادہ کام ہوتا تو فائلیں گھر اٹھا لاتا اور روبوٹ کی طرح کھانا کھا کر پھر کام

میں مصروف ہو جاتا۔

گھر پہنچ کر سیدھا جا کر میز کے قریب بچھی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ میز پر رکھا سوپ پیتا، گوشت کا ایک ٹکڑا، پیاز اور لہسن کے ساتھ کھاتا۔ مزے اور ذائقے سے اسے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ کھاتا رہتا اور مکھیاں بھی خوراک کا حصہ بن جاتیں۔ جب وہ دیکھتا کہ اس کا معدہ بھر گیا ہے تو میز سے اٹھتا جا کر روشنائی کی دوات الماری سے نکالتا اور دفتر کی فائل نکال کر کاپیاں بنانا شروع کر دیتا۔ جس دن فائل نہ لاتا اور کوئی کام نہ ہوتا تو اپنی خوشی کے لئے ایک آدھ کاپی بنا لیتا۔

پیٹرز برزگ میں سردیوں میں بہت دھند ہوتی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں سے گزرنے والے اکثر ہڈیوں کے درد کا شکار رہتے تھے۔ (Akaky) نے بھی محسوس کیا کہ اس کے شانوں میں درد رینگنے لگا ہے چنانچہ اس نے ٹرنک سے اپنا اوورکوٹ نکالا جو اس کے پڑدادا نے اس کے دادا اور دادا نے اس کے باپ اور باپ نے اسے دیا تھا۔ اوورکوٹ اپنی عمر طبعی پوری کر چکا تھا۔ کالر ہر سال گھس گھس کر چھوٹے ہو گئے تھے۔ کوٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے۔ یہ اوورکوٹ (Akaky) کو بہت پسند تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں اتنی مالی استطاعت نہ تھی کہ نیا کوٹ خرید سکے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اوورکوٹ کو شہر کے ٹیلر ماسٹر کے پاس لے جائے گا تاکہ اسے ٹھیک کر دے۔ وہ کوٹ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر شہر کے مشہور درزی پیسٹرووچ کے پاس چلا گیا۔ کوٹ کی حالت سے وہ اتنا شرمندہ تھا کہ وہ کوٹ درزی کو دکھانے پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوٹ دیکھ کر پیسٹرووچ کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ پیسٹرووچ نے کوٹ کو میز پر پھیلا کر چند لمحے میز پر پڑی چیز کو دیکھا اور پھر پوچھا:

''یہ کیا ہے؟''

''اوورکوٹ''

''میرے پاس کیوں لائے ہو؟''

Akaky نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا۔ ''اسے رفو کر دو''۔ پہننے کے قابل بنا دو''۔

پیسٹرووچ نے سر ہلا کر کہا:

''کہاں Patch لگاؤں سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ سوئی کپڑے میں ٹھہرے گی نہیں۔ یہ اب کپڑا نہیں رہا۔ کوئی ایسی چیز بن گیا ہے جو ہوا کے سانس لیتے ہی تمہارے جسم سے اتر کر ہوا میں اُڑ جائے گی۔''

''اس کا کوئی علاج۔'' (Akaky) نے ناامید ہو کر پوچھا۔

''اسے پھینک دو اور نیا اوورکوٹ بنوا لو''۔

پیسٹرووچ کی اس نے بہت منت کی اپنی غربت کا واسطہ دیا لیکن پیسٹرووچ نہ مانا اور Akaky اوورکوٹ لے کر گھر آ گیا۔ اس نے پیٹ کاٹ کر بچت کی۔ قہوہ چھوڑ دیا۔ خوراک کم کر دی۔ دفتر سے کچھ قرضہ اٹھایا اور پھر پیسٹرووچ نے اس کیلئے کوٹ بنا دیا۔ کوٹ پہن کر جب وہ سڑک پر آیا تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک زندہ آدمی ہے۔

''وہ کوٹ پہن کر سڑک پر نکلا تو اس کی چال بدلی ہوئی تھی ہر قدم وہ اپنے آپ کو نیا نیا محسوس کر رہا تھا۔ یہ احساس اس کے لئے خوشی کا باعث تھا کہ اس کے شانوں پر نیا اوورکوٹ ہے۔ وہ اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اپنے پاس سے گزرنے والوں کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دفتر میں داخل ہوا۔ کوٹ اتار کر کوٹ کو دیکھا اور پھر بڑی احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا اور چند لمحوں میں سب کو پتا چل گیا کہ Akaky نے نیا اوورکوٹ خریدا ہے۔

اوورکوٹ نے دفتر میں ہنگامہ کر دیا۔ سب کلرک اسے مبارکباد دینے لگے اور کوٹ کی خوشی میں اس سے دعوت طلب کی۔ اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

''میں تو سب کچھ کوٹ پر خرچ کر چکا ہوں میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا''

ایک کلرک نے کہا'' کوٹ کی خوشی میں دعوت میں دوں گا''۔

شام کو سب لوگ اس کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ اوورکوٹ پہن کر Akaky بھی گھر سے نکلا۔

Akaky کو سڑک پر چلتے ہوئے ایک عجیب سا فخر محسوس ہو رہا تھا۔ برسوں سے وہ ان سڑکوں سے گزر رہا تھا اسے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑی دکان کے سامنے رکا جس کی کھڑکی میں ایک عورت کی تصویر لگی تھی جس میں وہ ایک خوبصورت ٹانگ ہوا میں اچھال کر ایک جوتی دکھا رہی تھی۔ اس نے عورت کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ اس کی طرف پھینکی اور آگے بڑھ گیا اور اس گھر میں پہنچ گیا جہاں دفتر کے سارے کلرک جمع تھے اور اس کے کوٹ کی خوشی میں ووڈ کا پی رہے تھے''

Akaky نے وہاں جا کر چائے پی، کچھ گوشت کی بوٹیاں کھائیں، دوستوں کے لطیفے سنے۔ انہوں نے اسے شراب پلانا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا آیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ سڑکوں پر گھومے اور اپنے اوورکوٹ کی نمائش کرے۔

وہ گھر سے نکل کر سڑکیں ماپنے لگا۔ لوگ اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے وہ سب سے بے نیاز چلا جا رہا تھا اور یہ نوٹ کر رہا تھا کہ چور نظروں سے سب لوگ اس کے اوورکوٹ کو دیکھ رہے ہیں۔ اسے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں بالکل اندھیرا تھا اور اس کے سوا اس جگہ پر کوئی نہ تھا۔ اچانک اندھیرے میں اسے کچھ آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ آپس میں کسی چیز پر لڑ رہے ہوں۔ آوازیں قریب آ گئیں۔

''نہیں اوورکوٹ میرا ہے''۔ ''نہیں یہ اوورکوٹ میرا ہے، تمہارا نہیں میرا ہے۔''

وہ ابھی ان آوازوں کو سن ہی رہا تھا کہ تین چار آدمی اچانک اس پر حملہ آور ہوئے، اسے زمین پر گرا دیا اور اس کا اوورکوٹ اتار کر غائب ہو گئے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اسے کچھ پتا نہ چلا۔ وہ برف پر پڑا تھا۔ جب برفیلی ہواؤں نے اسے جھنجھوڑا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اس کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ میرا کوٹ میرا کوٹ کہتا ہوا بھاگا اور چند فرلانگ کے فاصلے پر اسے ایک سپاہی ایک بنچ پر بیٹھا ملا جو آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ اکیکاوچ نے اس سے کوٹ چوری ہونے کی بات کی تو اس نے کہا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ سو گیا۔ برف باری بڑھ گئی۔ اکیکاوچ بھاگتا ہوا اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔ دروازے پر زور سے دستک دی۔ اس کی لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولا اسے بغیر کوٹ کے برف میں لت پت دیکھ کر اس نے پوچھا کیا ہوا تو اکیکاوچ نے ساری کہانی سنائی۔ لینڈ لیڈی نے اس سے کہا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ سے جا کر ملے۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ کو جا کر کہانی سنائی تو اس نے کہا۔

''تمہیں گھر سے اتنی دیر باہر نہیں رہنا چاہیے تھا'' اور پھر اسے ذلیل کر کے دفتر سے نکال دیا۔ دفتر گیا تو سب کو بہت افسوس ہوا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ چندہ اکٹھا کر کے اکیکاوچ کے لئے اوورکوٹ خرید جائے مگر چندہ اتنا اکٹھا نہ ہوا کہ کوٹ کی قیمت پوری ہو سکے۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ اکیکاوچ پولیس کے افسر اعلیٰ سے جا کر رپورٹ کرے۔ جب وہ بڑی

مشکل سے ملنے گیا تو وہ بہت غلط وقت تھا۔کلرک نے کہا کہ صاحب کے ایک پرانے دوست بڑی مدت کے بعد ان سے ملنے آئے ہیں تم پھر کبھی آنا لیکن اکیکاوچ نے کہا میں انتظار کر لیتا ہوں۔ وہ صبح گیا تھا، شام کو اسے ملاقات کا وقت دیا گیا۔ لیکن افسر اعلیٰ نے جو اس سے باتیں کیں وہ بڑی دل توڑنے والی تھیں۔افسر اعلیٰ نے کہا۔

''تمہیں براہ راست میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ پہلے تم میرے سیکرٹری کو درخواست دو۔ وہ ملاقات کا وقت دے گا۔'' پھر تم میرے پاس آنا''۔اکیکاوچ نے کہا۔

جناب میرا کوٹ گم ہو گیا ہے۔

صاحب نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

''تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو''

اور پھر افسر اعلیٰ نے اسے ذلیل کر کے باہر نکال دیا۔ بالکل ایک کتے کی طرح جو گھر میں گھس آئے اور اسے مار مار کر گھر سے نکال دیا جائے۔

''اکیکاوچ دفتر سے کیسے نکلا، گلی میں کیسے آیا، اسے کچھ یاد نہ تھا۔اس کے بازو اور ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں۔ ساری زندگی میں اس کی اتنی تذلیل نہیں ہوئی تھی۔ گلی میں ایک برفانی طوفان تھا۔ گلی میں ٹھنڈی ہوائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھیں۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا سارا بدن شل ہو چکا تھا۔ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا اور اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل رہا تھا۔

دوسرے دن اسے تیز بخار ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی لینڈ لینڈی نے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر کہا۔

''اب زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ اس کے کفن دفن کا انتظام شروع کرو۔ میرا خیال ہے اب اس کا تابوت تیار ہونا چاہئے۔ یہ کبھی بھی مر سکتا ہے''۔

اور پھر اکیکاوچ مر گیا اور اسے دفنا دیا گیا۔

اکیکاوچ کی موت کے چند دن بعد پیٹرز برگ میں ایک عجیب واقع ہوا۔ یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی کہ ایک بھوت رات گئے سڑک پر آ کر لوگوں کے اوورکوٹ چھین لیتا ہے۔ اکیکاوچ کے دفتر کے ایک کلرک کے ساتھ بھی یہ واردات ہوئی اور اس نے کہا کہ وہ بھوت اکیکاوچ کا تھا اور پھر یہ واقعات ایک رات میں کئی بار ہونے لگے۔ آخری بار یہ واقعہ افسر اعلیٰ کو پیش آیا۔ وہ رات گئے ایک دعوت سے واپس آ رہا تھا کہ سڑک پر بھوت نے اس کی گاڑی روکی۔ افسر اعلیٰ نے بھوت کو پہچان لیا۔ وہ اکیکاوچ تھا۔ افسر اعلیٰ اسے دیکھ کر ڈر گیا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تم کیا چاہتے ہو''

اکیکاوچ کے بھوت نے جواب دیا'' کچھ نہیں''۔

اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا اوورکوٹ اتار لیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

گوگول کی یہ کہانی دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے ہر زبان کے لکھنے والوں پر اپنے تاثرات مرتب کیے۔ اس کہانی میں دوستوئیفسکی کی کہی ہوئی بات سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوستوئیفسکی نے تو یہ کہا ہے کہ روس کا تمام ادب گوگول کے اوورکوٹ کی دین ہے۔ میرے خیال میں ہمارے اردو

ادب نے بھی اوورکوٹ سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ اوورکوٹ کو پڑھتے ہوئے مجھے غلام عباس کے دو افسانے ''اوورکوٹ'' اور'' کتبہ'' بہت یاد آئے۔ اوورکوٹ کے ہیرو کا سارا رویہ وہی ہے جو گوگول کے اکیکاوچ کا ہے۔ غلام عباس کا ہیرو ایک شوروم میں جا کر چیزوں کو دیکھتا ہے قیمت پوچھتا ہے۔ اکیکاوچ کھڑکی میں لگی عورت کی تصویر اور اس کی ٹانگ دیکھ کر مسکراتا ہے۔ غلام عباس کا ہیرو سڑک پر بہت تمکنت اور شان سے رواں ہے۔ اکیکاوچ کوٹ پہن کر فخریہ انداز میں چلتا ہے اور لوگ اس کے اوورکوٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ غلام عباس کے ہیرو کی بے سروسامانی ہسپتال جا کر کھلتی ہے۔ اکیکاوچ کی بدحالی گوگول پہلے دکھا دیتا ہے۔

ایک بار انتظار حسین صاحب نے کہا کہ غلام عباس کے افسانوں میں ایک دھیمے پن اور پرسکون فضا میں کہانی آگے بڑھتی ہے اور ان کی کہانی میں وہ بلند بانگ اور ہنگامہ خیز فضا نہیں جو ان کے ہم عصر لکھنے والوں میں تھی۔ غلام عباس نے شاید یہ ہنر گوگول سے سیکھا ہے کیونکہ ان کی کہانی ''کتبہ'' میں جس آہستگی سے کہانی اپنے انجام تک پہنچتی ہے اور کلرک کا جو (Mannerism) ہے وہ سارے کا سارا اوورکوٹ کے اکیکاوچ کا ہے۔ کتبہ گھر کے دروازے پر لگانے کی جو مسرت اس کلرک کے دل میں برسوں سے پل رہی تھی وہ قبر پر جا کر ختم ہوئی۔ اکیکاوچ کی جو بے تابی اور بے چینی اوورکوٹ کے لئے اس کے دل میں تھی وہ مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے اگر گوگول کی یہ کہانی نہ ہوتی تو شاید غلام عباس کے یہ دو افسانے بھی نہ ہوتے اگر ہوتے تو ان کی شکل کچھ اور ہوتی۔ یقیناً غلام عباس نے گوگول کا اوورکوٹ ضرور پڑھا ہوگا۔

گوگول ایک عظیم مصنف ہے۔ ناول افسانے اور ڈرامے کی بات اس کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ 1828ء میں اس نے اپنی شاعری کی کتاب نذر آتش کر کے شاعری سے توبہ کی۔ 24 فروری 1852ء کو'' ڈیڈ سولز'' کا مسودہ جلا کر لکھنے سے توبہ کر لی اور 4 مارچ 1852ء کو اپنی زندگی کی کہانی آگے بڑھانے سے انکار کر دیا اور قبر میں جا سویا۔

گوگول ایک بیمار آدمی تھا۔ مسلسل ملیریا کی قید میں رہا۔ اس پر نیم پاگل پن کے دورے پڑتے تھے۔ وہ اعصابی مریض تھا۔ عورتوں سے تعلقات رکھنے میں ناکام تھا۔ ہم جنس پرستی کا شوقین تھا۔ پشکن سے ملاقاتیں رہیں تو وہ ان تمام بری عادات سے بچا رہا۔ پشکن کی موت کے بعد وہ بالکل جنون اور پاگل پن کا شکار ہو گیا اور یہی سب کچھ اس کے اسلوب اور سٹائل میں شامل ہو گیا۔

اس نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا جیسی اسے نظر آتی۔ اداسی، یاسیت اور ناامیدی اس پر حاوی رہی۔ اس کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ اعصابی انتشار کا شکار تھا۔ مذہبی جنون اور پادری کی صحبت نے اسے اور بھی بدحواس اور جنونی بنا دیا۔'' ڈیڈ سولز'' اس نے غلاموں اور کسانوں کی حالت زار دکھانے اور ان کی ہمدردی میں لکھی لیکن آخری عمر میں اس نے کہا۔

"Slavery is justified in Bible, and need not to be Abolished"

گوگول ایک مشکل اسلوب کا مصنف ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اسالیب میں وہ تخلیقی طاقت اور حسن ہے جس نے اسے ایک عظیم تخلیق کار کا درجہ دلایا ہے۔ اس نے زندگی کی ان پرتوں کو الٹ کر دیکھا جو شاید کسی اور کو نظر نہیں آتیں۔ وہ جب کوئی بات سوچتا ہے تو دلدل میں اتر جاتا ہے اور اسے خود بھی نہیں پتا چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ کرداروں کو کیری کیچر کی شکل دیتا ہے اور کبھی اتنا بگاڑ دیتا ہے کہ اس میں ہی کہیں نہ کہیں اچھائی چھپی ہوتی ہے۔ جو قاری کو نظر نہیں آتی۔ قاری کے لئے یہی بات مشکلات کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے ایک نقاد، مارٹن، سیمور، سمتھ نے شاید اسی لئے اس کے اسلوب کے بارے میں کہا ہے کہ:

''شیکسپیئر، دوستوئیفسکی اور ٹالسٹائی کو سمجھنا آسان ہے لیکن گوگول تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔''
''ڈیڈ سولز'' اور (Diary of a Madman) پڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ بات حقیقت معلوم ہوتی ہے۔
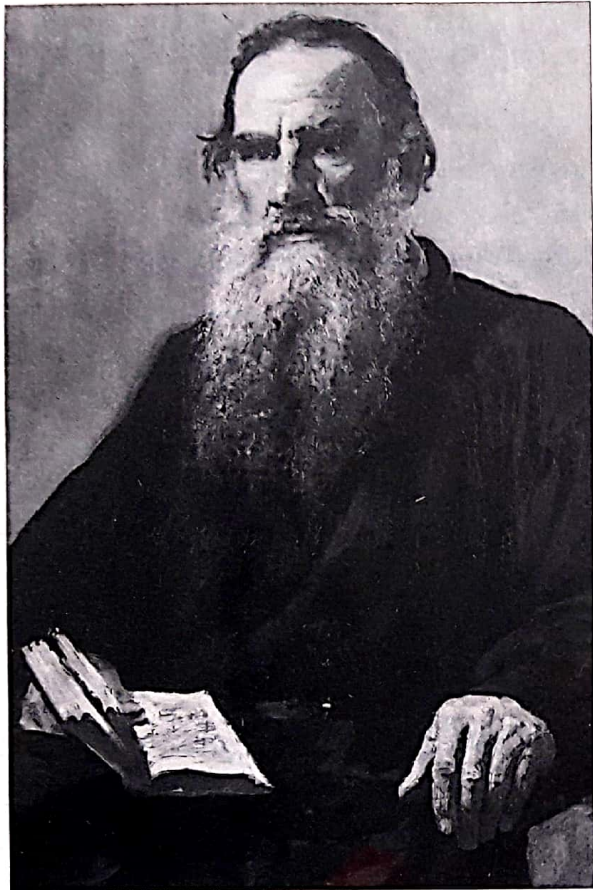
ٹالسٹائی

(Leo Tolstoy)

ٹالسٹائی صرف روس نہیں دنیا کا سب سے بڑا مصنف مانا جاتا ہے۔ناول، سوانح عمری، مقالے، سوشل اور فلاحی مضامین، بچوں کا ادب، تھیالوجی، نیچرل سائنس، ٹالسٹائی نے ان موضوعات پر لکھا۔ ''جنگ اور امن'' اور ''اینا کرینینا'' اس کے عالمی شہرت یافتہ ناول ہیں۔

انگریزی زبان کا کوئی ناول نگار ایسا نہیں جو ٹالسٹائی کا ہم پلہ ہو۔ ٹالسٹائی واحد ناول نگار ہے جس نے آدمی کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ گھریلو زندگی میں بھی میدان جنگ میں بھی۔

(E.M.Forster)

....

جب کسی ادب میں ٹالسٹائی جیسا ادیب موجود ہو تو کسی آدمی کے لئے ادیب بننا بڑا آسان ہوتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا وہ پھر بھی خوش ہوتا ہے کیونکہ جو سب ادیب مل کر کرنا چاہتے ہیں وہ ٹالسٹائی کر رہا ہوتا ہے۔

(چیخوف)

....

ناشتے کی میز پر سارا خاندان اکٹھا ناشتہ کرتا، ٹالسٹائی دنیا بھر کے لطیفے سناتا اور پھر خاموش ہو جاتا، کھڑا ہو کر کہتا:

''اب کام کا وقت ہو گیا ہے'' اور پھر لائبریری میں چلا جاتا۔

(پروفیسر سیمنز)

ٹالسٹائی

آج اس کی منگنی ہو رہی تھی محل کے بڑے ہال میں شاہی خاندان سے رابطہ رکھنے والے مہمانوں کا ہجوم تھا۔ اس کی 18 سالہ ہونے والی بیوی خوبصورت لباس میں اور بھی خوبصورت نظر آ رہی تھی، وہ اپنی ڈائری لے کر آگے بڑھا۔ ڈائری جو وہ برسوں سے لکھ رہا تھا، جس میں عبادتوں، نیکیوں کے ساتھ ساتھ اپنی جنسی غلط کاریوں کی تفصیل بھی لکھی ہوئی تھی۔ ان عورتوں کے نام تھے جن کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے، ایک ناجائز بیٹے کا ذکر بھی تھا۔ جوا کھیلنے کی تفصیل بھی درج تھی۔ قحبہ خانوں میں آنے جانے کا ذکر بھی تھا اور وہ سب کچھ تھا جسے پڑھ کر کوئی لڑکی خودکشی تو کر سکتی ہے مگر شادی کے لئے ہاں نہیں کر سکتی۔ بہرحال وہ آگے بڑھا اور ڈائری اپنی منگیتر کے ہاتھ میں دے دی اور کہا:

''اسے پڑھ لو اگر پھر بھی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

لڑکی نے رات ڈائری پڑھ کر اور رو رو کر گزاری، صبح اٹھی، آنسو پونچھے اور شادی کے لئے ہاں کر دی۔ لڑکی کا نام صوفیا تھا اور ڈائری دینے والا سچا اور صاف گو آدمی ٹالسٹائی تھا۔ شادی کے بعد دونوں نے بہت خوشگوار زندگی بسر کی۔ صوفیا نے گھر سنبھالا اور ٹالسٹائی نے تخلیقی کام کیا۔ صوفیا نے ٹالسٹائی کی تخلیقی عمل میں بہت مدد کی۔ اس نے خود اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ''جنگ اور امن'' جیسی ضخیم کتاب کا مسودہ میں نے سات بار نقل کیا ہے۔''

صوفیا نے ایک رات رو کر گزاری ٹالسٹائی کے سب گناہ معاف کر دیئے اسے خوشی اور مسرت دی مگر آخری عمر میں اتنے دکھ دیئے کہ ایک رات کا بدلہ لے لیا اور ٹالسٹائی کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ معاملات کے اس بگاڑ میں کس کا کتنا ہاتھ ہے یہ ایک لمبی کہانی ہے جس میں آپ کی شرکت مضمون کے آخری حصے میں ممکن ہو سکتی ہے۔

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی ایک معزز، دولت مند گھرانے میں 1828ء کو پیدا ہوا۔ ٹالسٹائی کی جنم بھومی کا نام لسانیا پولیانا تھا۔ ٹالسٹائی خاندان روس کا ایک معزز اور دولت مند خاندان تھا جس کا شمار شاہی خاندان میں ہوتا تھا۔ پشکن ٹالسٹائی کا رشتے دار تھا پشکن کو ٹالسٹائی اپنا ''چوتھا کزن'' کہتا تھا۔ ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ قریبی عزیز واقارب نے دیکھ بھال کی۔ پہلے ایک جرمن استاد اسے گھر میں پڑھاتا رہا پھر وہ کازان یونیورسٹی میں پڑھنے چلا گیا۔ پھر پیٹرز برگ اور پھر ماسکو۔ ٹالسٹائی معمولی نقش ونگار والا آدمی تھا وہ اپنے بارے میں خود لکھتا ہے۔ ''مجھے پتا تھا کہ میں قبول صورت نہیں۔ اس بات سے کبھی کبھی مجھے بڑی مایوسی ہوتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ میرے جیسے چوڑے ناک اور موٹے موٹے ہونٹوں والے آدمی کے لیے اس دنیا میں خوشی کا کوئی لمحہ نہیں ہوگا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں دیکھ کر میں خدا سے کہتا تھا کہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے جس سے میں خوبصورت بن جاؤں۔

ٹالسٹائی کی دعا خدا نے سن لی اسے جسمانی طور پر تو شاید خوبصورت نہ بنایا لیکن لوگوں کی آنکھوں میں ایسی چمک بھر دی کہ جب بھی وہ ٹالسٹائی کے چہرے پر پڑتی تھیں اس کا چہرہ دنیا کا خوبصورت ترین چہرہ نظر آتا۔ ٹالسٹائی کی شخصیت اور فنی عظمت نے اس کے چہرے پر ایسا حاشیہ لگایا کہ چہرے کے سارے نقش ونگار ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ ٹالسٹائی نواب

تھا، بے شمار دولت تھی، بے شمار جائیداد تھی اس نے اپنی ابتدائی زندگی بہت عیش وعشرت میں گزاری، جوا، عورتوں سے تعلقات، جنسی روابط، اس نے وہ سب کچھ کیا جواس نے اپنی ڈائری میں لکھ کر صوفیا کو دیا تھا۔

ٹالسٹائی کی پہلی کتاب جس نے اس کے نام کو پورے روس میں جانا پہچانا بنادیا وہ اس کی کتاب ''بچپن''، ''لڑکپن''، ''جوانی'' اور بے شمار کہانیاں۔ اور پھر ٹالسٹائی کی شہرت کو پر لگ گئے لیکن وہ دو کتابیں جن سے وہ یورپ، مغرب اور پوری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ وہ ''جنگ اور امن'' اور ''اینا کرینینا'' تھیں۔ ان دونوں ناولوں کا شمار دنیا کے عظیم ناولوں میں ہوتا ہے۔ یہ دو ناول ہیں جنہیں بنیاد بنا کر ای ایم فارسٹر (E.M.Forster) نے اپنی کتاب (Aspects of the Novel) میں کہا تھا:

''انگریزی زبان کا کوئی ناول نگار ایسا نہیں جو ٹالسٹائی کا ہم پلہ ہو اس لئے کہ وہ واحد ناول نگار ہے، جس نے آدمی کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ گھریلو زندگی میں بھی اور میدان جنگ میں بھی۔''

23 سال کی عمر میں ٹالسٹائی نے روسی فوج میں کمیشن لے لیا اور لیفٹیننٹ کا عہدہ سنبھال کر پہاڑیوں پر باغیوں سے لڑتا رہا۔ اس عرصے کے دوران اس نے فوجیوں کی زندگی، لڑائی کیمپ میں فوجیوں کی تنہائی اور ہنگاموں کو بہت قریب سے دیکھا۔ اپنے مشاغل جاری رکھے جب بھی موقع ملا، تاش، عورتوں اور جوئے سے دل بہلاتا رہا۔ 1856ء میں جب امن معاہدہ ہوا تو اس نے فوج کو الوداع کہہ دیا۔ اس دوران اس کا مزاج بہت بگڑ چکا تھا۔ بات بات پر لڑتا، تلخی اس کی طبیعت میں رچ بس گئی تھی۔ فوج کی نوکری کے دوران اس نے جو بہت سی کہانیاں لکھی تھیں جب وہ مختلف رسالوں میں چھپیں اور ان پر تنقید ہوئی تو وہ تنقید پڑھ کر لڑنے مرنے پر تیار ہوگیا۔ مشہور مصنف ترگنیف نے لکھا ہے کہ ایک بار کسی نقاد کی تنقید پڑھ کر اس نے نقاد کو ایک زوردار خط لکھا جس میں اسے لڑائی کے لئے للکارا گیا تھا لیکن دوستوں نے درمیان میں آکر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ فوج کی نوکری چھوڑ کر وہ اپنی جاگیر یاسنیا پولیانا میں واپس آگیا اور دیہاتیوں کے درمیان رہ کر ان کے مسائل سمجھنے کی کوشش کی۔ بچوں کے لئے ایک سکول کھولا اس کے اقدامات بڑے انقلابی تھے۔ بچوں پر سکول آنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ شام کو ان کے ساتھ اپنے گھر محفل سجاتا۔ کہانیاں سناتا، رات گئے تک ان کے ساتھ گانے گاتا۔ سکول کی مصروفیات سے فارغ ہو کر دیہات کی ایک عورت کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلتا اور اس کھیل کا نتیجہ ایک ناجائز بچے کی صورت میں نکلا جس کا نام ٹیموتھی (Timothy) تھا۔ یہ جوان ہوا تو ٹالسٹائی کے ایک بیٹے کی بگھی چلانے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ یہ سارا قصہ ٹالسٹائی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ اس کے ہمعصر نامور ادیب ترگنیف کا کہنا ہے کہ ٹالسٹائی ویسے تو دیہاتیوں کیلئے سہولتیں پیدا کرنے کی بات کرتا ہے لیکن اس نے یہ کیسے برداشت کیا کہ اس کا بیٹا (ناجائز ہی سہی) نوکروں کی زندگی بسر کرے (ترگنیف کی بھی ایک ناجائز بیٹی تھی لیکن اس نے اس کی شاندار طریقے سے پرورش کی۔ اچھی رہائش دی اور اعلیٰ تعلیم دلائی تاکہ وہ معاشرے میں اچھی زندگی گزار سکے)۔ ٹالسٹائی کا یہ سکون زیادہ دیر نہ رہا کیونکہ روس کی خفیہ پولیس اس انقلابی سکول کے خلاف ہوگئی۔

صوفیا سے ٹالسٹائی کی شادی ہوئی تو اس کی زندگی میں ایک باقاعدگی اور سلیقہ آگیا۔ اسے تخلیقی کام کرنے کیلئے وقت ملا اور صوفیا نے ٹالسٹائی کی زندگی میں ایک حسن اور ترتیب بھر دی۔ صوفیا کی خوبصورتی نے ٹالسٹائی کو لکھنے لکھانے کی تحریک دلائی اور صوفیا نے اس کے لئے بچے پیدا کئے اور گھر کے انتظامات سے ٹالسٹائی کو یکسر فارغ کر دیا۔ اس کی کتابوں کے مسودوں کو دھیان سے پڑھا اور نقل کیا...... ٹالسٹائی اپنی تحریروں کو بار بار پڑھتا تھا اور بار بار لکھتا تھا۔ صوفیا بار بار انہیں نقل

کرتی تھی۔ یہ بات مستند ہے کہ ''جنگ اور امن'' کا مسودہ صوفیا نے سات بار نقل کیا۔ دوسری کتابوں کے مسودے اس کے علاوہ ہیں۔ ٹالسٹائی وقت کا بہت پابند تھا۔ اور یہ وقت صوفیا اسے فراہم کرتی تھی۔ پروفیسر سیمنز ٹالسٹائی کے معمولات کے بارے میں لکھتا ہے:

''ناشتے کی میز پر سارا خاندان اکٹھا ناشتہ کرتا۔ مختلف باتیں ہوتیں۔ ٹالسٹائی دنیا بھر کے لطیفے سناتا، باتیں کرتا اور پھر وہ اچانک خاموش ہو جاتا۔ کھڑا ہو کر کہتا ''اب کام کا وقت ہوگیا ہے۔''

پھر اپنی لائبریری میں چلا جاتا۔ 5 بجے سیر کر کے واپس آتا۔ کھانا کھاتا، سیر کے دوران پیش آنے والا کوئی واقعہ سب کو سناتا پھر لائبریری میں جا کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ آٹھ بجے اُٹھ کر خاندان کے لوگوں کے پاس جاتا۔ چائے پیتا، ملاقاتیوں سے ملاقات کرتا۔ موسیقی سنتا۔ اونچی آواز میں کوئی کتاب پڑھ کر بچوں کو سناتا اور پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا......''

برسوں تک صوفیا اور ٹالسٹائی میں (باوجود بہت سے اختلافات کے) محبت اور اچھے تعلقات رہے۔ صوفیا نے 13 بچے جنے اور ان کی تربیت کی۔ ٹالسٹائی اپنے اعترافات میں لکھتا ہے۔

''مجھے ایک اچھی بیوی ملی جو مجھ سے پیار کرتی تھی اور جسے میں بھی چاہتا تھا۔ میری اولاد بہت اچھی تھی اور میری جاگیر بہت سرسبز اور خوشحال تھی جس کے لئے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ مجھے دماغی سکون حاصل تھا لیکن پھر اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میری زندگی فضول ہے اور ایک مذاق ہے جو مجھ سے کیا گیا ہے۔''

دیہاتیوں اور کسانوں میں رہتے رہتے اس میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں اور وہ بالکل بدل گیا۔ ہر وقت شراب پینے والے ٹالسٹائی نے شراب چھوڑ دی اور ایک دن اس نے تمباکو سے بھی توبہ کر لی۔ دولت، جاگیر اور جاہ وجلال سب کچھ اسے جھوٹ نظر آیا۔ شہری زندگی سے اسے نفرت تھی۔ معاشرے کے غیر منصفانہ رویے سے اسے نفرت ہوگئی۔ ظلم اور حرام خوری سے اسے چڑ ہونے لگی۔ روحانیت کی طرف نکل گیا اور مادی چیزوں سے اکتا گیا۔ دولت اس کے نزدیک اب ایک بدی تھی۔ اس نے کسانوں کے ساتھ مل کر کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنے کپڑے خود دھونے شروع کر دیئے۔ وہ اپنا چولہا خود جلاتا تھا، کنوئیں سے اپنا پانی خود بھر کر لاتا۔ کھیتوں سے کام کر کے جب وہ شام کو گھر واپس آتا تو پسینے اور مٹی کی وجہ سے اس کے کپڑوں سے بدبو آتی تھی۔ صوفیا اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:

''کبھی کبھی تو بدبو اتنی شدید ہوتی تھی کہ جب وہ کمرے میں آتا تو ہم فوراً کھڑکیاں کھول دیتے تاکہ ہوا بدبو اڑا کر لے جائے اور ہمیں سکھ کا سانس ملے''۔ ایک موچی سے ٹالسٹائی نے جوتے مرمت کرنے کا ہنر سیکھا اور اپنے جوتے خود مرمت کرنا شروع کر دیئے۔ خود لکڑیاں کاٹتا اور گھر اٹھا کر لاتا۔ صبح وشام کام کرنا شروع کر دیا اور ہر شے سے بے نیاز ہوگیا۔ جاگیر کی طرف توجہ نہ رہی اور 60 ہزار پاؤنڈ کی جائیداد 5 سو پاؤنڈ کی رہ گئی۔ اس کی یہ باتیں اس کی بیوی صوفیا کو ناپسند تھیں، دونوں میں اختلافات شروع ہوگئے۔ ٹالسٹائی وہ ادیب تھا جسے اپنی زندگی ہی میں Legend کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ اس کے گھر کو متبرک مقام سمجھ کر طالب علم، اخبار نویس، ملاقاتی ہر روز آتے تھے۔ صوفیا انہیں منہ نہ لگاتی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:

''جو کچھ وہ کرتا تھا مجھے اس کی یہ عادتیں پسند نہ تھیں وہ سب کچھ لوگوں کی خوشی کیلئے کرتا تھا جس سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اور اس کے ساتھ رہنا مشکل ہوگیا تھا۔''

اسی دوران ایک ایسی شخصیت صوفیا اور ٹالسٹائی کی زندگی میں آئی جس سے صوفیا بالکل باغی ہوگئی اور ٹالسٹائی کے ساتھ اس کے تعلقات بے حد خراب ہو گئے۔ وہ شخصیت کیپٹن چیتکوف کی تھی چیتکوف کیپٹن ایک دولت مند ذہین نوجوان تھا اور گارڈ ڈیپارٹمنٹ میں کپتان تھا۔ ٹالسٹائی سے ملا تو اتنا متاثر ہوا کہ نوکری چھوڑ دی اور اس کا مرید بن گیا اور صوفیا اس کی دشمن بن گئی۔

ٹالسٹائی دن بہ دن اپنے آپ میں گم ہوتا رہا اور ہر چیز اس کی نظر سے دور ہوگئی۔ کھانے پینے سے اس کا دل اٹھ گیا۔ اس نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اس کا نظریہ تھا کہ اپنی میزوں پر گوشت کے ڈھیر لگانے کیلئے جانوروں کو مارنا گناہ ہے چنانچہ اس نے دالیں اور سبزیاں کھانا شروع کر دیں اور سارا خاندان مل کر اس کے خلاف احتجاج کی آواز بن گیا۔ چیتکوف کا اثر ٹالسٹائی پر دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ کیپٹن چیتکوف نے اسے مجبور کیا کہ وہ کتابوں پر رائلٹی لینا بند کر دے اور اعلان کر دے کہ اس کی کتابیں جو چاہے شائع کرے وہ ایک پیسہ رائلٹی وصول نہیں کرے گا چنانچہ ٹالسٹائی نے کیپٹن کی باتوں میں آ کر صوفیا کو مجبور کیا کہ وہ تمام کتابوں کی رائلٹی لینے سے دستبردار ہو جائے صوفیا نے صاف انکار کر دیا اور وہ کیپٹن کے مقابلے میں پارٹی بن گئی۔ سوائے ٹالسٹائی کی لڑکی الیگزینڈرا جو کیپٹن کی ہم خیال تھی...... اسی دوران ٹالسٹائی نے ایک وصیت تیار کی جس میں اس نے تمام کتابوں کے حقوق عوام کے نام کر دیئے تھے۔ اس میں وہ ڈائریاں بھی تھیں جو ٹالسٹائی لکھا کرتا تھا۔ صوفیا اس پر بہت چیخی چلائی اور زہر کھانے کی دھمکی دے دی۔ یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ ایک اور ان ہونی ہوگئی اور وہ صوفیا کی ایک موسیقار تانائیف سے تعلقات کے بارے میں جان گیا۔ موسیقار عمر میں صوفیا سے بہت چھوٹا تھا۔ ٹالسٹائی کو اس بات سے بہت دکھ پہنچا اس نے صوفیا کو خط لکھا:

''اس موسیقار سے تمہارا تعلق میرے لئے بہت دکھ کا سبب ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح تمہارے ساتھ رہنا میرے لئے ایسا ہی ہے کہ میں ایک زہر بھری زندگی گزاروں۔''

موسیقار کی بے وفائی کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ صوفیا کے دن رات اب اس جستجو میں گزر رہے تھے کہ اسے ٹالسٹائی کی وہ وصیت مل جائے جس کی رو سے اس نے کتابوں کے حقوق اس سے لے لئے تھے۔ ایک رات جب ٹالسٹائی طویل بیماری سے غنودگی میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اسے اپنی لائبریری میں شور سنائی دیا۔ یہ صوفیا تھی جو کاغذات کے ڈھیر سے ٹالسٹائی کی وصیت تلاش کر رہی تھی۔ ٹالسٹائی بیماری کی حالت میں اٹھا کچھ سامان اکٹھا کیا۔ اپنی بیٹی الیگزینڈرا کو ساتھ لیا اور بگھی میں بیٹھ کر گھر چھوڑ کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا جب صوفیا کو پتا چلا کہ ٹالسٹائی گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے تو اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن بچالی گئی (وہ یہ کام اس سے پہلے بھی دو ایک بار کر چکی تھی)

الیگزینڈرا ٹالسٹائی کو لے کر (ASTAPOVO) کے اسٹیشن پر آ گئی۔ ٹالسٹائی کی حالت بگڑ گئی۔ سٹیشن ماسٹر کو جب پتا چلا کہ یہ بیمار آدمی ٹالسٹائی ہے تو اس نے اپنا گھر ٹالسٹائی کے حوالے کر دیا۔ چیتکوف کو الیگزینڈرا نے بلوا بھیجا جس نے ٹالسٹائی کی جاگیر کے قریب ہی اپنا مکان بنالیا تھا الیگزینڈرا نے ماسکو اپنے بڑے بھائی کو ٹیلی گرام دے دیا کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر کو لے آئے۔ اخبارات کے نمائندے سٹیشن پہنچ گئے۔ ایک اخبار نویس نے صوفیا کو اطلاع دی دی وہ بھی وہاں آ گئی مگر ٹالسٹائی کو الیگزینڈرا نے اس کے آنے کی اطلاع نہ دی۔ پولیس والے سرکاری افسران فوٹو گرافرز پریس والے ایک ہجوم تھا جو ٹالسٹائی کے آخری لمحات کی چشم دید رپورٹنگ کے لئے جمع ہو گیا تھا۔ ماسکو سے ڈاکٹروں کا ایک قافلہ آ گیا مگر ٹالسٹائی کی

حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ٹالسٹائی زندگی بھر موت سے خوفزدہ رہا تھا آج وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اس نے نحیف آواز میں کہا ''اب انجام قریب آ پہنچا۔'' چند لمحوں بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ صوفیا اس کے کمرے میں آئی۔ جھک کر اس کے ہاتھوں کو چوما لیکن ٹالسٹائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ صبح چھ بجے سات نومبر 1910 کو ٹالسٹائی اس دنیا سے رخصت ہوگیا کمرے میں بہت سے افراد جمع تھے ٹالسٹائی کے سرہانے رکھی سائیڈ ٹیبل پر دوستوئیفسکی کا ناول ''برادرز کرمازوف'' پڑا تھا ٹالسٹائی اب اس دنیا میں نہیں تھا چیخوف نے اس کی موت سے دس سال پہلے کہا تھا:

''مجھے ٹالسٹائی کی موت سے ڈر لگتا ہے ان کی موت سے میری زندگی میں ایک بڑا ویرانہ پیدا ہو جائے گا ان کے بغیر ہمارا ادب اس غلے کی طرح ہوگا جس کا کوئی غلہ بان نہ ہو۔''

(پیش لفظ۔ ٹالسٹائی کی آپ بیتی)

(ل۔ لینوف)

ٹالسٹائی صرف روس نہیں دنیا کا سب سے بڑا مصنف مانا جاتا ہے۔ اس نے بہت تخلیقی کام کیا۔ سوانح عمری، ناول، طویل ناول، مختصر ناول، کہانیاں، مقالے، سوشل اور فلاحی مضامین، بچوں کیلئے کہانیاں، تھیالوجی، مذہب، نیچرل سائنس پر مبنی کہانیاں، اپنے عقائد اور نظریات کے بارے میں تحریریں (میرا عقیدہ کیا ہے) دو ناولوں ''جنگ اور امن'' اور ''اینا کرینینا'' نے اسے عالمی شہرت بخشی اگرچہ آخری عمر میں وہ ''جنگ اور امن'' کو ناول نہیں کہتا اور اینا کرینینا کو اپنا اصل ناول کہتا تھا لیکن نقاد اس سے متفق نہیں ٹالسٹائی نے کسانوں اور عام آدمی کے بارے میں لکھا اور اس کی اہمیت کو ثابت کیا۔ مثلاً ''جنگ اور امن'' لکھتے وقت اس کی ہمدردیاں زار روس اور نپولین سے نہیں عام سپاہی کے ساتھ ہیں۔ وہ کہتا ہے:

''تاریخ میں جو بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں وہ محض دکھاوا ہیں زار روس اور نپولین نے جنگ میں کچھ نہیں کیا۔ واقعات میں ان کے کردار نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ وہ ہر فتح میں اپنا نام لکھوا لیتے ہیں اصل کام عام سپاہی کرتا ہے جسے لڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔''

''جنگ اور امن'' میں ٹالسٹائی نے عام سپاہی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے جو شخصی تصویر بنتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس مضمون میں ٹالسٹائی کے فن، اس کی کہانیوں اور ناولوں پر گفتگو نہیں ہوسکتی اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ میں صرف چند باتیں ''جنگ اور امن'' کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں۔

اس ناول کے تقریباً 580 کردار ہیں۔ تاریخی پس منظر میں لکھے گئے اس ناول کا کینوس اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کی out line بنانا بے حد مشکل کام ہے۔ اس ناول کے مرکزی ایکشن 1812-1805ء کے درمیان رونما ہوتا ہے۔ ناول کا لکھا ہوا ابتدائیہ قاری کو 1820ء تک لے جاتا ہے۔ ناول کا پس منظر نپولین بوناپارٹ اور روسیوں کے تعلقات اور جنگ کے اردگرد گھومتا ہے۔ نپولین نے 7-1805ء آسٹریا پر قبضہ کر لیا تھا۔ زار روس نے ایک خفیہ معاہدے کے تحت نپولین سے مل کر انگریزوں سے جنگ مقصود تھی۔ یہ معاہدہ ناکام ہوگیا۔ 1812ء میں نپولین نے روس پر حملہ کر دیا اور 14 ستمبر کو ماسکو پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں نے امن معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی فوجوں کو پسپا کر لیا اور نپولین کی فوجوں کو موسم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اکتوبر میں نپولین پیچھے کی طرف مڑا اور روسی فوج نے اس کا پیچھا کیا نپولین کے فوجی برفیلے موسم کی نذر ہوگئے اور وہ روسی علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔

ٹالسٹائی کے کچھ کردار حقیقی ہیں اور تاریخ کی صداقت ان کی تصدیق کرتی ہے جن میں نپولین بوناپارٹ نیپلز کا بادشاہ

Murat زار کا مشیر کاونٹ سپرنسکی اور کئی دوسرے کردار باقی سارے کردار فرضی ہیں جن میں کاؤنٹ کا صرامی بیٹا پیئرے (Pierre) نتاشا اسٹو۔ نیکولس کی بین نتالے۔ سونیا۔ نیکولس برلکنسکی اور اس کا بیٹا اینڈریو' جنگ اور امن'' کو دنیا کا سب سے بڑا ناول قرار دیا جاتا ہے۔ ٹالسٹائی اس ناول میں تاریخی صداقت کو بیان کرنا چاہتا ہے جنگ اور امن کی جلد نمبر ix میں اس نے تاریخ کے بارے میں اپنے نظریات بیان کئے ہیں اور حکمرانوں اور جرنیلوں کے بارے میں اعلان کیا ہے کہ یہ سب تاریخ کے غلام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ناول دراصل مؤرخیس کے نظریہ تاریخ کی اصلاح کے لئے لکھا ہے۔ ٹالسٹائی نے اس ناول کے بارے میں خود کہا ہے:

''میں آج کل کے یورپ کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا۔ میری زندگی کا شاید یہی مقصد تھا''

یہ بات ٹالسٹائی نے 20 سال کی عمر میں لکھی تھی جب وہ 30 اور 35 کے درمیان پہنچا تو ''جنگ اور امن'' مکمل ہو چکی تھی۔ ٹالسٹائی نے اس ناول میں تاریخی اور فرضی مسائل کو بے نقاب کیا ہے وہ ایک حقیقت پسند مصنف تھا۔ انسانوں کے بارے میں اس کا نظریہ تھا کہ وہ بالکل بُرے ہیں اور نہ بالکل اچھے۔ انسانوں کے بارے میں اس کا نظریہ بڑا یقینی تھا اور اس کے تحت اس نے اپنے کردار تشکیل دیئے ہیں۔ وہ اپنی کتاب Resurrection میں کہتا ہے۔

آدمی دریا کی طرح ہوتے ہیں سب انسانوں میں یہ دریا بہتا ہے۔ کسی جگہ یہ دریا کم چوڑا ہوتا ہے کسی جگہ اس کی چوڑائی زیادہ ہوتی ہے، کہیں اس کا بہاؤ تیز ہوتا ہے کہیں اس کی رفتار تیز ہوتی ہے کہیں اس کا پانی گدلا ہوتا ہے کہیں شفاف۔ انسانوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے انسان اپنے اندر ملی جلی نیکیاں اور برائیاں رکھتے ہیں جنہیں وہ مختلف وقت اور صورت حال میں استعمال میں لاتے رہتے ہیں لیکن وہ رہتے انسان ہی ہیں۔''

انسان کی یہی تعریف اور عمل اس کے کرداروں میں ملتا ہے۔ آیئے جنگ اور امن کی دو مثالیں دیکھیں اس ناول کے دو کردار Andrei اور Pierre دو مختلف نظریات کے کردار ہیں جن کی سوچ مختلف ہے اور دونوں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑتے رہتے ہیں (یہ جھگڑا خالص فکری اور نظریاتی ہے، ٹالسٹائی ان کے ذریعے انسانوں کے بارے میں اپنے نظریات کا پرچار کرتا ہے) مثلاً Pierre کہتا ہے کہ اس نے ساری زندگی اپنے لئے گزار دی لیکن خوشی نہ ملی۔ خوشی ملی تو اس وقت جب اس نے دوسروں کے لئے جینا شروع کیا اس کی بات سن کر Andrei فوراً کہتا ہے میں نے جب لوگوں کا پیچھا چھوڑ کر عزت اور اعزازات سے منہ موڑا صرف اپنے لئے جینا شروع کیا تو مجھے زندگی کی صحیح خوشی نصیب ہوئی۔

''جنگ اور امن' بلاشبہ دنیا کا سب سے بڑا ناول مانا جاتا ہے تاریخی پس منظر میں لکھا ہوا یہ ناول اپنے بیان' مواد' واقعات' منظر کشی' مکالماتی فضا' کرداروں کی داخلی اور خارجی کیفیات ان کی نفسیاتی کشمکش' خود کلامی کی بنا پر بڑا ناول کہلاتا ہے۔ ڈبلیو سمرسٹ ماہم کی رائے میں یہ بڑا ناول ایک ایسا آدمی ہی لکھ سکتا تھا جو اعلیٰ ذہن اور مضبوط قوت تخیل رکھتا ہو جس کا تجربہ وسیع ہو جو انسانوں کے اندر جھانکنے کا ہنر جانتا ہو جسے تاریخ کا شعور ہو اور کرداروں کی تشکیل پر عبور رکھتا ہو اور یہ سب کچھ ٹالسٹائی میں موجود تھا۔

''جنگ اور امن' خاندان سے نپولین کے فوجی ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے کی کہانی ہے۔ یہ 19 ویں صدی کے یورپ کے سیاسی اور معاشی انتشار کی کہانی ہے جسے ٹالسٹائی نے نہایت خوبصورتی سے ناول کے فریم ورک میں پیش کیا ہے ''جنگ اور امن'' کے نقادوں میں نثر میں لکھی رزمیہ EPIC قرار دیا ہے۔

''بچپن، لڑکپن اور جوانی'' ایک امیر باپ کے بیٹے کے تینوں زمانوں کی روداد ہے۔ جس میں ان کسانوں کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن میں اس نے زندگی گزاری۔ (The Cossacks) ناول ایک امیر زادے کا ایک Cossack عورت سے عشق کا قصہ ہے۔ اپنے دوسرے بڑے ناول اینا کرینا میں ایک عورت کی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ٹالسٹائی نے ایک زمیندار کے روپ میں اپنے کردار کو بھی روشناس کرایا ہے جو کسانوں کے ساتھ کھیتوں میں بھی کام کرتا ہے اور کسانوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے منصوبے بھی سوچتا ہے۔

اس نے کہا کہ خدا کو ڈھونڈنے کے لئے چرچ جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو۔ انسانیت کی خدمت کرو اور خدا کو اپنے اندر تلاش کرو۔ اس کی سلطنت تمہارے دل میں ہے۔

1908ء میں ٹالسٹائی نے ہندوستان کے اخبار میں ایک خط چھپنے کے لئے بھیجا جس کا عنوان تھا "A letter to a Hindu" جس میں اس نے عدم تشدد پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس کے اس نظریے سے ایک آدمی نے بہت اثر قبول کیا۔ اس کا نام تھا ''موہن داس گاندھی''۔ گاندھی اس وقت ساؤتھ افریقہ میں اپنی تحریک چلا رہا تھا۔ اس نے ٹالسٹائی سے اتفاق کیا۔ خط و کتابت جاری رکھی۔ اور ٹالسٹائی کو ''عیسیٰ کا آخری حواری'' کا نام دیا۔ وہ ٹالسٹائی سے اتنا متاثر تھا کہ ساؤتھ افریقہ میں قائم اپنے آشرم کا نام ''ٹالسٹائی کالونی'' رکھ دیا۔

دوستوئیفسکی اور ٹالسٹائی ہمعصر تھے لیکن عجیب بات ہے کہ دونوں کی آپس میں کوئی ملاقات نہ ہوئی، ٹالسٹائی کا ناول اینا کرینا چھپا تو دوستوئیفسکی نے اس پر ایک رسالے میں تبصرہ کیا اور ناول کی تعریف کی مگر ٹالسٹائی کو شاید یہ تبصرہ پسند نہ آیا۔ جب دوستوئیفسکی کا ناول ''جرم و سزا'' چھپا۔ ٹالسٹائی نے ناول پڑھ کر رائے دی کہ یہ کیسا ناول ہے۔ پہلے دو باب پڑھ کر ہی پتہ چل جاتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ دونوں بڑے لکھنے والوں کا درمیانی فاصلہ مٹانے کے لئے ایک مشترکہ دوست نے دونوں کی ملاقات کرانے کا منصوبہ بنایا۔ جگہ کا انتخاب بھی کیا۔ لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ ٹالسٹائی کی دوستوئیفسکی سے ملاقات تو نہ ہو سکی جب اس نے دوستوئیفسکی کی موت کی خبر سنی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور کہا ''میرا دوست مر گیا ہے'' اور جب اسٹیشن ماسٹر کے گھر 82 سال کی عمر میں خود فوت ہوا تو اس کے سرہانے دوستوئیفسکی کا ناول برادرز کرامازوف رکھا ہوا تھا۔

ٹالسٹائی نے بائیبل، ارسطو، افلاطون، پشکن، چارلس ڈکنز، روسو اور گوگول سے بہت اثر قبول کیا۔ 61-1860 میں اس نے فرانس کا دورہ کیا تو وکٹر ہیوگو سے ملاقات کی اور بڑی نیازمندی سے وکٹر ہیوگو کی لافانی تصنیف (Les. Miserables) کی بہت تعریف کی۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ ''جنگ اور امن'' کے میدان جنگ کے مناظر کی تفصیل میں وہ وکٹر ہیوگو کا عکس نظر آتا ہے۔ وکٹر ہیوگو کی ملاقات اور پیرس میں ایک آدمی کو سرِ عام پھانسی کی سزا دیکھ کر اس نے اپنے خیالات میں ایک تبدیلی محسوس کی اور وہ ہر قسم کی حکومت اور تشدد سے نفرت کرنے لگا۔ عدم تشدد کا فلسفہ اسی دورے کی پیداوار ہے۔ پیرس سے آ کر اس نے اپنے ایک دوست (V.P.Botkin) کو خط لکھا اور سرِ عام پھانسی کی تفصیل بیان کر کے خط یوں ختم کیا:

''سچائی یہ ہے کہ حکومت اور حکومت کے قانون دراصل معصوم شہریوں کو مارنے اور خراب کرنے کی ایک سازش ہیں۔ چنانچہ میں نے عہد کیا ہے کہ میں کسی حکومت میں کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کروں گا۔''

دوستوئیفسکی، ترگنیف، گورکی، ورجینیا وولف، پروست اور جیمز جوائس، سب نے ٹالسٹائی کی عظمت کو قبول کیا ہے۔

اس کے فن اور شخصیت پر مقالے لکھے ہیں لیکن مجھے چیخوف کی رائے بہت اچھی لگی۔ چیخوف ٹالستائی کے فنی قد کاٹھ کو سلام کرتا ہے اور کہتا ہے۔

''جب کسی ادب میں ٹالستائی جیسا بڑا ادیب موجود ہو تو کسی آدمی کے لئے ادیب بننا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ جبکہ اسے پتا بھی ہو کہ وہ کچھ نہیں کر رہا، لیکن پھر بھی وہ خوش ہوتا ہے کیونکہ جو سب ادیب مل کر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلا ٹالستائی ہی کر رہا ہوتا ہے۔''
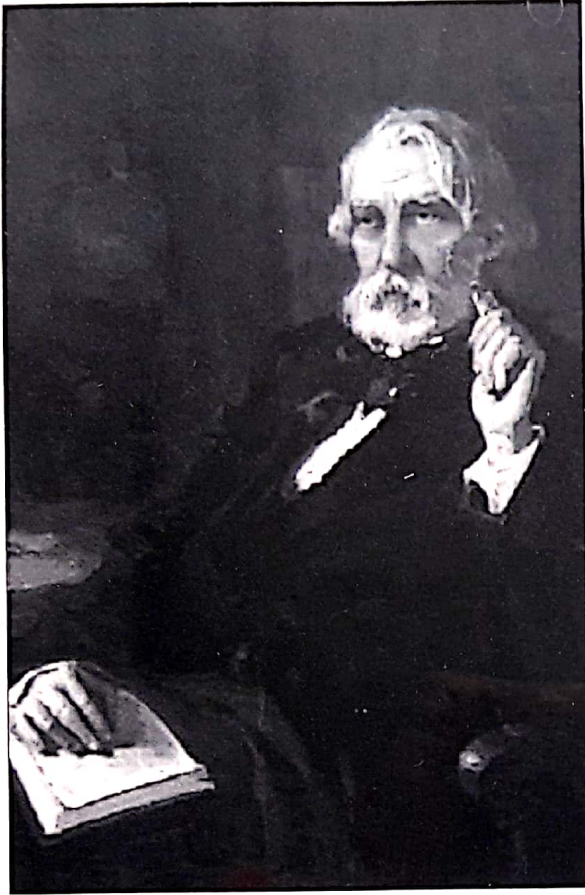
ترگنیف

(Ivan Sergeyevich Turgenev)

دوستویفسکی اور ٹالستائی کا ہمعصر روسی ناول نگار، اس نے اپنے ناول روس کی دیہاتی زندگی اور غلاموں کو حقوق دلانے کے لیے لکھے۔ جاگیردار تھا مگر اس نے ساری زمینیں غلاموں میں بانٹ دیں۔ ''باپ اور بیٹے'' اسکا عالمی شہرت یافتہ ناول ہے۔

ترگنیف نے ہمیں روسی نسل کی اصل روح اور نفسیات سمجھنے کا موقعہ دیا۔

(فلا بیئر)

....

ترگنیف ہمیں صرف روس کے بارے میں آگاہ نہیں کرتا اس کی تحریروں میں اور بھی بہت کچھ ہے۔

(ہنری جیمز)

....

''تمہاری نظم واقعی اچھی ہے۔ بلاشبہ تم ذہین آدمی ہو۔ اس وقت میں سٹرابری کھا رہی ہوں۔ تمہاری نظم سے سٹرابری کی خوشبو آ رہی ہے۔''

(ترگنیف کی ماں کے خط سے)

ترگنیف

ماں کی ممتا پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ماں بچے کو زندگی دیتی ہے، اسے بولنا، چلنا، زندگی کو ڈھنگ سے جینا سکھاتی ہے لیکن کبھی کبھی یہی ماں بچے کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ بچے کو اپنے ڈھنگ سے زندگی بسر نہیں کرنے دیتی۔ من مانی پر اتر آتی ہے اور یہ ہوتا ہے کہ ماں اور بچے کے درمیان فاصلے بڑھنے لگتے ہیں اور آخر کار بچہ بغاوت کر دیتا ہے، ایسا کئی بار ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال انگریزی شاعر لارڈ بائرن کی ہے۔ ماں غصیلی تھی، چڑچڑا پن اپنے عروج پر تھا۔ اس پر جب غصے کا بھوت سوار ہوتا تو وہ لارڈ بائرن کے بال نوچتی، اسے بُری طرح مارتی، بائرن اس سے ہر پل خائف رہتا تھا۔ جب وہ سکول میں پڑھتا تھا تو اس کے ساتھی اس سے اکثر پوچھتے تھے:

''کیا تمہاری ماں پاگل ہے؟''

بائرن کو اس بات کا بڑا افسوس تھا۔ اسے بچپن میں ماں کا پیار نہ ملا۔ وہ ساری عمر اپنی محبوباؤں میں ماں کا پیار تلاش کرتا رہا۔ فرانسیسی ناول نگار گستاؤ فلا بیئر کے ساتھ الٹا حساب ہوا۔ فلا بیئر کی ماں نے اسے اتنا پیار دیا، اتنی توجہ دی کہ فلا بیئر کی زندگی برباد کر دی اور ساری عمر ماں کی بغل میں سمٹ کر بیٹھا رہا۔ نہ کسی عورت سے شادی کر سکا، نہ کھل کے محبت کر سکا۔ اگر کبھی شادی کے لئے دل نے رضامندی ظاہر بھی کی تو محبوبہ کو چھوڑ کر ماں کے پاس چلا آیا۔ ماں اس کی کمزوری بن گئی۔ کھانا، پینا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، سب کچھ ماں کے اشارے پر کرتا تھا۔ گاؤں سے کبھی پیرس گیا، اپنی محبوبہ سے ملا۔ ماں یاد آ گئی تو پیرس سے بھاگ کر گاؤں چلا آیا۔ ایک بار اس کی شاعر محبوبہ نے اس سے کہا:

''تمہاری ماں تمہاری ایسے دیکھ بھال کرتی ہے جیسے تم کوئی کنواری لڑکی ہو۔''

یہی حال ترگنیف کا تھا لیکن اس نے اپنی ماں سے کھل کر اختلاف کیا۔ اس کی ماں بہت بڑی جاگیر کی وارث تھی۔ اس کی جاگیر میں 5000 غلام (Serfs) تھے۔ ان پر وہ دل کھول کر ظلم کرتی تھی۔ ہلکی سی غلطی پر انہیں کوڑوں سے مارتی۔ ترگنیف کو ماں کی اس عادت سے نفرت تھی۔ یہ نفرت ساری زندگی اس کے ساتھ رہی۔ وہ ماں سے اختلاف کرتا رہا۔ وہ اپنے غلاموں کو انسانی حقوق دینا چاہتا تھا۔ ماں اس پر رضامند نہ تھی۔ وہ اذیت پسند تھی۔ ترگنیف اس کی اس عادت سے بیزار رہتا تھا۔ 1834ء میں ترگنیف کا باپ مر گیا جو روسی فوج میں اعلیٰ افسر تھا۔ ترگنیف کی ماں کے لیے اب کھلا میدان تھا اس نے جی بھر کے غلاموں پر تشدد کیا۔ ترگنیف نے کبھی دبے الفاظ میں ایسا نہ کرنے کے لیے کہا تو ماں نے اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی۔ ترگنیف کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا وہ خاموشی سے ماں کی بات مانتا رہا مگر ترگنیف نے ماں کے ظالمانہ سلوک کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

18 اکتوبر 1818 کو (Orel) شہر میں ایک امیر خاندان کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی ماں Varvara Petr شاعرانہ اور ادبی ذوق رکھنے والی ایک رئیس اور اذیت پسند خاتون تھی۔

ترگنیف کے گھر میں فرانسیسی زبان بولی جاتی تھی۔ ماں کی لائبریری بہت بڑی تھی۔ ترگنیف کی ذہنی تربیت میں اس کا

بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں کام کرنے والی ایک غلام خاتون نے اسے کہانیاں سنا سنا کر کہانی کار بننے میں بڑی مدد کی۔ اپنی جاگیر میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ترگنیف سینٹ پیٹرز برگ پڑھنے چلا گیا اور پھر ماسکو یونیورسٹی۔ بعد ازاں ماں نے اسے تاریخ اور فلسفہ پڑھنے جرمنی بھیج دیا۔ جرمنی سے پڑھ کر ترگنیف واپس آیا تو وہ ایک نیا آدمی تھا۔ اس کے خیالات مزید انقلابی ہو چکے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ روس کے نظام میں تبدیلی لانے کے لیے روشن خیالی کو اپنانا چاہیے۔ یورپ کی تعلیمات کا اس پر بہت اثر ہو چکا تھا۔ اس کے ایک ہمعصر ادیب کے بقول وہ ''یورپ زدہ'' ہو گیا تھا۔ غلاموں کو آزادی دینے کا جذبہ انتہائی صورت اختیار کر چکا تھا۔ 1850ء میں اس کی ماں فوت ہوئی تو اس نے سب سے پہلے ان غلاموں کو آواز دی اور انہیں انسانوں کی زندگی بسر کرنے کے حقوق دے دیئے۔ اسے کاروبار، زمینداری سے اتنی دلچسپی نہ تھی مگر وہ ساری زندگی خوشحال رہا۔ اپنے ہمعصر لکھنے والوں میں شاید ٹالسٹائی کے بعد وہ دوسرا خوشحال آدمی تھا (اور شاید دوستوئیفسکی سب سے زیادہ تنگ دست۔ دوستوئیفسکی ترگنیف سے اکثر پیسے ادھار لیتا رہتا تھا اور ترگنیف دے دیتا تھا جب کبھی اس نے ہاتھ کھینچا دوستوئیفسکی ناراض ہو جاتا تھا ایک بار تو دوستوئیفسکی اتنا ناراض ہوا کہ اپنے ایک ناول میں ترگنیف کا بہت بُرا کردار لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی)۔

ترگنیف نے زیادہ وقت فرانس اور جرمنی میں گزارا اس کی کئی وجوہات تھیں پہلے وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کے ظالمانہ رویے سے دور رہنا چاہتا تھا لیکن شاید دوسری اور اہم وجہ Pauline Viardot کا عشق تھا، جو سپین کی خوبصورت مشہور گلوکارہ تھی۔ اس سے ترگنیف کا تعلق ساری زندگی رہا۔ اس کے خاندان سے ترگنیف کے گہرے تعلقات تھے۔ جہاں وہ (Pauline) گانے کے لیے جاتی ترگنیف سایا بن کر اس کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس گلوکارہ کے ساتھ اس کا تعلق جسمانی تھا یا روحانی، اس کے بارے میں کہیں سے کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا مگر جسمانی تعلقات کے بارے میں ایک غلام عورت کا ذکر آتا ہے جس سے ترگنیف کے تعلقات تھے۔ اس سے ترگنیف کی ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا ترگنیف نے بہت خیال رکھا۔ اس کی شاندار طریقے سے پرورش کی اور اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سنا ہے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ماسکو یونیورسٹی تک بھیجا۔ ایک بار دوستوئیفسکی ایک حمام میں گیا۔ ایک لڑکی سے تعلق قائم ہو گیا۔ اس سے بچہ پیدا ہو گیا، اس نے ترگنیف سے پوچھا اب وہ کیا کرے۔ ترگنیف نے اسے مشورہ دیا اس بچے کی دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کرو اور پھر اپنی مثال اس کے سامنے پیش کی۔

ترگنیف یورپ اور فرانس کے ادیبوں میں بہت مقبول تھا۔ فلا بیئر کے ساتھ اس کے بہت گہرے مراسم تھے۔ ترگنیف اپنا زیادہ وقت فرانس ہی میں گزارتا تھا۔ روس کے ادیب جن میں ٹالسٹائی بھی شامل تھا اس کی اس حرکت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ روس کے ادیبوں اور نقادوں کا خیال تھا کہ ترگنیف کو روس سے کوئی دلچسپی نہیں وہ ذہنی طور پر ''یورپ زدہ'' ہو کر رہ گیا ہے لیکن یہ بات درست نہ تھی۔ ترگنیف کی تحریروں سے واضح ہے کہ اسے روس سے بہت محبت تھی۔ روس کے کسانوں اور دیہات میں بسنے والے لوگوں کی حالت زار پر اس کا دل لہو روتا۔ روس کے ادیب صرف حسد میں یہ باتیں کرتے تھے کیونکہ یورپ اور دیگر ممالک میں ترگنیف اپنے تمام ہمعصر لکھنے والوں سے زیادہ مقبول تھا۔

ترگنیف باوجود ٹالسٹائی اور دوستوئیفسکی کے نامناسب رویے کے ان کی عزت کرتا رہا اور اپنے دل میں ان کے لیے اچھے جذبات رکھتا تھا۔ ٹالسٹائی اور ترگنیف کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ ٹالسٹائی نے ترگنیف کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس کی تحریروں کو یوں ہی سرسری نظر سے دیکھتا رہا۔ اس میں سرفہرست ترگنیف کا یورپ اور فرانس والوں سے متاثر

ہونا تھا۔ حالانکہ فرانس کے مصنفین سے ٹالسٹائی خود بھی متاثر تھا۔ ٹالسٹائی بڑی عقیدت سے پیرس وکٹر ہیوگو سے ملنے گیا۔ اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور بعد میں اس نے اپنے دوست سے خط لکھ کر اس بات کا اقرار کیا کہ وکٹر ہیوگو سے ملنے کے بعد اس کی زندگی بدل گئی ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ''جنگ اور امن'' پر وکٹر ہیوگو کی لامزرا-یبلز کا بہت اثر ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن ترگنیف کے بارے میں یورپ کے ادیبوں کی مدح سرائی ٹالسٹائی کو پسند نہ تھی۔ ترگنیف کے ساتھ 17 سال اس نے بات نہیں کی۔ پہلے پہل یارانہ بھی رہا مگر پھر سترہ سال کی لمبی دراڑ آ گئی۔ اس دوران ٹالسٹائی نے ترگنیف کو ڈوئل لڑنے کے لیے للکارا۔ ترگنیف چپ رہا۔ ٹالسٹائی نے بعد میں اس سے معذرت بھی کی مگر تعلقات جوں کے توں ہی رہے۔ ترگنیف ٹالسٹائی کے لیے اچھے جذبات رکھتا تھا۔ 4 ستمبر 1883ء اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ اس کی موت فرانس میں (Bougival) کے مقام پر ہوئی جب وہ آخری سانسیں لے رہا تھا تو اس نے ایک آخری جملہ ٹالسٹائی کے نام لکھا۔ ٹالسٹائی زندگی کے آخری سالوں میں لکھنا چھوڑ چکا تھا اور اس نے کہہ دیا تھا کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ سب ایک حماقت تھا۔ ترگنیف کو اس بات کا افسوس تھا کہ ایک عظیم لکھاری ادب کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے آخری جملہ ٹالسٹائی کے لیے لکھا اور وہ جملہ یہ تھا:

"My Friend return to Literature"

سنا ہے کہ ٹالسٹائی نے یہ جملہ پڑھ کر ترگنیف کی بات پر عمل کیا اور (The Death of Ilyich) جیسی تخلیق کی۔ (میکسم گورکی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ اور چیخوف ایک بار ٹالسٹائی سے ملنے اس کی جاگیر میں گئے۔ ٹالسٹائی نے اس تحریر کا آخری باب پڑھ کر سنایا اور پڑھتے پڑھتے اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا)

جہاں تک دوستوئیفسکی کے ساتھ اس کے تعلقات کا قصہ ہے تو دوستوئیفسکی نے ترگنیف کے ساتھ بڑی زیادتی کی لیکن ترگنیف نے اسے بھی معاف کر دیا۔ 1880ء میں جب پشکن کی یادگار کی نقاب کشائی کے وقت دوستوئیفسکی نے پشکن پر مضمون پڑھا تو سامعین میں ترگنیف بھی بیٹھا ہوا تھا۔ دوستوئیفسکی کی جذباتی تقریر سن کر ترگنیف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اُٹھ کر دوستوئیفسکی کو گلے لگا لیا۔

اپنی ماں کی وفات کے بعد بھی ترگنیف روس میں زیادہ دن نہ رہا۔ پیرس اور برلن (جرمنی) میں زیادہ وقت گزارا، اسے ایسا کرنے پر روس کے نقادوں، ادیبوں اور زار حکومت نے بھی مجبور کیا۔ یہ 1852ء کا واقعہ ہے جب اس کی ایک تحریر نے زار حکومت کو ناراض کر دیا۔ سینٹ پیٹرز برگ کے گزٹ میں گوگول کے بارے میں اس کا ایک مضمون چھپا۔ مضمون اس طرح شروع ہوتا تھا:

''گوگول مر گیا ہے۔ ان الفاظ سے روس کا دل نہیں دھڑکا۔ وہ چلا گیا ہے جسے ہم اب بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ عظیم لکھنے والا تھا۔''

سینٹ پیٹرز برگ کی انتظامیہ نے اس مضمون کو سنسر کر دیا لیکن ماسکو سنسر شپ نے اسے چھپنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حکومت نے ماسکو سنسر شپ کو معطل کر دیا۔ ترگنیف کو ایک ماہ کے لیے جیل بھیج دیا۔ پھر دو سال کے لیے اسے اس کی دیہاتی ریاست میں نظر بند کر دیا۔ 1854ء میں ترگنیف یورپ کے ممالک میں چلا گیا۔ 1855ء جب سکندر II تخت پر بیٹھا اور سیاسی حالات میں کچھ نرمی آئی تو یہ واپس آیا۔

ترگنیف بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ سینٹ پیٹرز برگ ماسکو سے اس نے گریجوایشن کی۔ برلن جا کر فلسفے اور تاریخ میں

اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگلستان وہ کئی بار گیا۔ 1879ء میں گیا تو انگلستان والوں نے اس کی ذہانت اور علمی قابلیت سے متاثر ہوکر (Civil-Law) میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ یہ تو اس کی اسناد کی کہانی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پیرس، برلن، لندن میں بڑے بڑے لکھنے والوں سے ملا۔ ان سے ترگنیف نے بہت کچھ حاصل کیا جس کا اثر اس کے ناولوں، شعروں اور کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ یہی تاثیر تھی جس نے یورپ والوں کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے مضامین لکھ کر اسے روس کا سب سے منفرد اور بڑا ناول نگار اور کہانی کار تصور کیا۔ روس کے مصنفین کو یہی بات اچھی نہ لگی اور اس کے خلاف ہو گئے۔ روس کے نقاد نابوکوف (Nabokov) نے تو یہاں تک کہہ دیا:

"Turgenev is not a Great writer , but a Pleasant one."

ترگنیف کو ٹالسٹائی، گوگول، چیخوف کے بعد چوتھا نمبر دیا ہے لیکن دوستویفسکی سے پہلے رکھا ہے۔ مغرب اور یورپ کے نقادوں اور ناول نگاروں کا ترگنیف کے بارے میں نظریہ مختلف تھا گستاؤ فلابیئر کہا کرتا تھا کہ روس اور روس کے لوگوں کو جاننے کے لیے ترگنیف کافی ہے۔ فلابیئر کا یہ جملہ بہت مشہور ہے:

"Turgenev is a key to the Russian Spirit. He gave us the Psychology of a whole race."

ترگنیف جب ہنری جیمز سے ملا تو اس نے ترگنیف کو (Beautiful Genius) کے خطاب سے مخاطب کیا۔ ای۔ ایم۔ فاسٹر نے 1915ء میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ترگنیف کو صرف روس کے بارے میں اطلاعات کے لیے نہ پڑھا جائے اس کی تحریروں میں اور بھی بہت کچھ موجود ہے۔

ترگنیف نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اس کی نظم میں فطرت کی خوبصورتی اور بلبل کے مدھر گیتوں کا ارتعاش تھا اور اردگرد بکھرا ہوا فطرت کا خوبصورت حسن تھا۔ عجیب بات ہے اس نظم کی داد اسے سب سے پہلے اس کی اذیت پسند ماں نے خط لکھ کر دی اور داد دینے کا اسلوب بھی عجیب تھا:

''تمہاری نظم واقعی اچھی ہے۔ بلاشبہ تم ذہین آدمی ہو۔ میں اس وقت سٹرابری کھا رہی ہوں۔ تمہاری نظم سے سٹرابری کی خوشبو آرہی ہے۔''

ترگنیف جس ادبی شاہکار کی وجہ سے پہچانا گیا وہ اس کی کہانیاں (A Sports man's Sketches) ہیں، دوسرا نام Sketches from a Hunter's Album ہے۔ یہ مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں ایک شکاری اپنے کتے کے ساتھ شکار کھیلتا پھر رہا ہے۔ ان کہانیوں کی معرفت ترگنیف نے غلاموں کی زندگی، جنگل اور دیہات کی خوبصورتی کو کہانیوں کا مواد بنایا ہے۔ یہ کہانیاں روسی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کی بڑائی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کہانیوں کی ٹالسٹائی نے بھی تعریف کی ہے۔ ترگنیف نے بھی ان کہانیوں کو اپنی بہترین کہانیوں کا درجہ دیا ہے۔ ان کہانیوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان میں روس کے دیہاتی زندگی، غلاموں کی بدحالی اور فطرت کے حسین نظاروں کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔

ترگنیف کا ناول رودین ایسے نوجوان کی کہانی پر مبنی ہے جو اپنے خوابوں کو نکولس اکے روس میں جلتے ہوئے دیکھتا ہے اور مخدوش سیاسی حالات کی بنا پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتا۔ یہ ناول 1840ء میں خیالوں میں ڈوبے نوجوانوں کی ماضی پرستی کا آئینہ دار ہے۔

1858ء میں اس کا ناول A nest of gent try آیا۔ جو ماضی کی یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ روس کے دیہاتی علاقے کی محبت اس ناول میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس ناول کا ایک نسوانی کردار لیزا (Liza) بہت اہم ہے جو روسی نسوانی کرداروں میں ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ دوستویفسکی اس کردار کو ٹالسٹائی کے نسوانی کردار نتاشا کے مقابلے کا کردار شمار کرتا ہے۔ ترگنیف کا ناول پہلی محبت (First Love) بڑا عمدہ ناول ہے جس میں ترگنیف نے اپنے بچپن کی یادوں کو بڑی ہنرمندی سے اکٹھا کیا ہے۔ اگرچہ یہ یادیں بہت تلخ اور دکھ بھری ہیں لیکن ان میں ترگنیف کا اچھوتا اسلوب بڑی نفاست کے ساتھ موجود ہے۔

محبت میں آدمی بہت کچھ کرتا ہے۔ ترگنیف نے یوں تو کئی اہم کام کئے مگر ایک کام ایسا ہے جس نے ادب کی بھی خدمت کی۔ ترگنیف سپین کی گلوکارہ (Pauline) کا عاشق تھا۔ محبوبہ کی زبان سے اسے عشق تھا۔ سروانتیز کا شاہکار ناول (Don Quixote) اسے بے حد پسند تھا چنانچہ اس نے محبت کے اس کھیل میں روسی ادب پر بڑا کرم فرمایا اور اس ناول کا روسی زبان میں ترجمہ کر دیا جس سے روسی ادیبوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ دوستویفسکی ان ادیبوں میں پیش پیش تھا۔

دُھواں (Smoke) اور Virgin Soil اس کے دو ناول 1877ء میں چھپے جن میں روسی سوسائٹی میں پیدا ہونے والے مسائل حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ناول اتنے کامیاب نہ ہوئے۔ ترگنیف نے شاعری بھی کی، اس کی نظموں کا مجموعہ Poem in Prose کے نام سے چھپا۔

ترگنیف کے موضوعات دوستویفسکی اور ٹالسٹائی سے ملتے جلتے تھے مگر ترگنیف کے ہاں ایک بنیادی فرق تھا۔ ترگنیف مذہبی تصورات کو اپنے ان دونوں معاصرین کی طرح زیرِ بحث نہ لایا۔ اس کا مزاج اپنے دوست گستاؤ فلابیئر اور جرمن شاعر تھیوڈر سٹارم کے زیادہ قریب تھا جو ماضی کی یادوں اور فطرت کی خوبصورتی کو اپنے موضوعات بناتے تھے۔ شاید اسی بنا پر ہنری جیمز اور Joseph Conard اسے ٹالسٹائی اور دوستویفسکی پر ترجیح دیتے ہیں۔

''باپ اور بیٹے'' (Fathers and Sons) اس کا عالمی شہرت یافتہ شاہکار ہے۔ یہ ناول 1862ء میں چھپا۔ اس ناول کا ہیرو بازووف 1860ء کی نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ نوجوان Nihilist تحریک سے تعلق رکھتا ہے۔ جو مذہب سمیت تمام پرانے عقائد اور اداروں کو رد کرتی ہے۔ مغربی یورپ میں اسے پہلے روسی ناول نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔

''باپ اور بیٹے'' دو نسلوں کی کہانی ہے۔ یہ ناول اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو 1830ء اور 1840ء کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ ناول روسی ادب کا پہلا جدید ناول سمجھا جاتا ہے۔

(Fathers and Sons) کا سارا پلاٹ 1859ء کے دو مہینوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ (Arkady) اپنے دوست بازووف (Bazarov) کے ساتھ اپنے باپ نیکولائی کی جاگیر میں واپس آتا ہے۔ Arkady کا دوست میڈیکل کا طالب ہے۔ وہ Nihilist خیالات کا مالک ہے۔ ہر عقیدے اور ہر پرانی بات کو رد کرتا ہے۔ Arkady کا باپ پرانے خیالات کا زمیندار ہے جو اپنے غلاموں سے اچھا سلوک کرتا ہے لیکن غلام اسے دھوکہ دیتے ہیں۔ اس کے ایک غلام عورت کے ساتھ تعلقات ہیں اور اس سے اس کا ایک بچہ بھی ہے جس کا نام mithya ہے۔ نیکولائی کا ایک بھائی پافل پیٹرووچ ہے جس کی زندگی ناکام معاشقے نے تباہ کردی ہے وہ خفیہ طور پر ایک خاتون (Fenichka) سے عشق کرتا ہے۔

(Arkady) اپنے دوست بازووف کے زیر اثر اس کی ہر بات مانتا ہے۔ پافل اور Arkady کا باپ نیکولائی بازووف کی باتیں سنتے ہیں دونوں نسلوں کے درمیان بحث جاری رہتی ہے۔ Arkady اور بازووف شہر میں جاتے ہیں ان کی ملاقات ایک بیوہ عورت Anna Odints ovs سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بہن Katya بھی رہتی ہے۔ بازووف Anna پر عاشق ہو جاتا ہے۔ Arkady بھی Anna کو دل دے بیٹھتا ہے لیکن محبت وہ Katya سے بھی کرتا ہے۔ بازووف اور ANNA ایک ملاقات میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محبت خیالی چیز ہے۔ بازووف Anna سے ملاقات کر کے اپنے ماں باپ کے پاس آ جاتا ہے۔ اپنی جاگیر میں آ کر بیمار ہو جاتا ہے۔ بیماری بڑھتی ہے تو وہ Anna کو بلاتا ہے، وہ آ جاتی ہے اس کی حالت دیکھ کر افسوس کرتی ہے کہ اس نے بازووف کی محبت کا جواب پہلے کیوں نہیں دیا۔ بازووف مر جاتا ہے۔

Arkady کی جاگیر میں دو شادیوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ بیٹے Arkady کی شادی Katya سے ہوتی ہے اور Fenichka کی شادی نیکولائی سے۔ پافل جاگیر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور ناول بازووف کی قبر پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں اس کے ماں باپ بیٹھے افسوس کر رہے ہیں:

''بازووف کے ماں باپ تھکے قدموں سے چل رہے تھے۔ جب وہ قبر کی ریلنگ کے پاس پہنچے تو اپنے گھٹنوں پر جھک کر بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک بیٹھے رہے اور روتے رہے۔ بیٹے کی قبر سے چند باتیں کیں، قبر پر پڑی مٹی صاف کی اور ایک بار پھر دعا مانگی۔ وہ اس کی یادوں کو اکٹھا کر کے اسے اپنے قریب محسوس کر رہے تھے۔''

اس ناول کو روسی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ترگنیف بحیثیت شاعر تو ناکام رہا لیکن بحیثیت ناول نگار اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اسے ''ناول نگاروں کا ناول نگار'' کہا جاتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو بازووف ایک ایسی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو مر کر بھی زندہ رہی۔ جس نے اپنے آپ کو اپنے خیالات کی بھینٹ چڑھا دیا، جس نسل کے خیالات ان کی بزرگ نسل نہ سمجھ سکی۔ وہ جب مر رہا ہے تو لکھتا ہے:

"I was needed in Russia"

لیکن پھر کہتا ہے:

"No it is Clear I was not needed."

قدیم اور جدید نسلوں کے اس تصادم میں اگرچہ بازووف کو شکست ہوگئی لیکن وہ پھر بھی زندہ رہا اگرچہ اس کا نظریہ وہی تھا جو Nihilists کا تھا۔

ترگنیف بلاشبہ ایک ایسا ناول نگار تھا جس نے ہمیں بتلایا کہ زندگی کیا ہے۔ انسان کی مختلف پرتیں کیا ہیں۔ وہ کیا ہے جو تاریخ کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ وہ بھید کیا ہے جو انسانوں کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ قاری اگر ترگنیف کے ناولوں کا مطالعہ کرے تو ان کا انہیں تمام چیزوں سے تعارف ہوتا ہے۔

دوستوئیفسکی

(Fyodor Mikhaylovich Dostoevsky)

روس کا عظیم ناول نگار جس نے عالمی ادب پر شدید اثرات مرتب کئے۔ اس کے ناول، ڈائریاں ، افسانے، رومانی اور نفسیاتی جہان کے دکھ درد کے مناظر دکھاتے ہیں۔ دنیا کے عظیم ناولوں کی تاریخ دوستوئیفسکی کے ''جرم و سزا'' اور ''برادرز کرماژوف'' کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

دوستوئیفسکی کے ناولوں میں ایک تلاطم ہے، آندھیاں، بگولے اور پانی کے بھنور ہیں۔ جنہیں خالص رومانیت سے تشکیل دیا گیا ہے۔ یہ سب ہماری مرضی کے خلاف ہے کیونکہ ان میں ہماری بینائی کھو جاتی ہے دم گھٹنے لگتا ہے لیکن پھر بھی ہمیں ایک بے پایاں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

(ورجینا وولف)

دوستوئیفسکی فوت ہوا تو ٹالسٹائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا ''میرا دوست فوت ہو گیا ہے۔''

(اخبار کی رپورٹ)

....

دوستوئیفسکی واحد نفسیات دان ہے جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

(ول ڈیورانٹ)

....

مجھے قرآن بھیجو اور ہیگل کی تاریخ، فلسفہ۔ میں اب ناول اور ڈرامے لکھنے چاہتا ہوں لیکن پہلے ڈھیر سارا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

(بھائی کے نام خط)

دوستوئیفسکی

ہسپتال ماسکو کے نہایت پس ماندہ علاقے میں واقع تھا جہاں ہسپتال کے گرد و نواح میں جرائم پیشہ لوگوں کا قبرستان تھا اور لاوارث بچوں کا ایک فلاحی ادارہ تھا۔ ہسپتال کا ریٹائرڈ ملٹری سرجن نہایت ترش مزاج اور غصیلا تھا۔ اس کا منجھلا بیٹا اس کی آنکھ بچا کر ہسپتال کے گراؤنڈ میں مریضوں اور پژمردہ لوگوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور ان کی تکالیف اور مسائل کو بڑے غور سے سنتا تھا اس بچے کا نام دوستوئیفسکی تھا۔

پیٹر پال قلعے کی قبر نما جیل کے وسیع احاطے میں چھ قیدیوں کو کالی ٹوپیاں پہنا کر لایا گیا۔ انہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی ان کے چہروں پر نقاب چڑھائے گئے۔ سامنے کھڑے سپاہیوں نے بندوقیں سیدھی کیں۔ ان کی انگلیاں بندوق کی لبلبی کی طرف بڑھنے والی تھیں کہ احکامات آ گئے کہ ان کی پھانسی 7 سال قید میں بدل گئی ہے۔ سب سے پہلے جس قیدی کے ہاتھ کھولے گئے اور چہرے سے نقاب اتاری گئی اس قیدی کا نام دوستوئیفسکی تھا۔

ریٹائرڈ ملٹری سرجن کے 6 بچے تھے دو لڑکیاں اور چار لڑکے، جب وہ ہسپتال سے اپنا غصیلا چہرہ لے کر گھر آتا تو گھر میں ہُو کا عالم چھا جاتا تھا۔ وہ ووڈکا (Vodka) پی کر لیٹ جاتا اور چاروں لڑکوں کو اپنے گرد کھڑا کر لیتا اور حکم دیتا کہ میں سو رہا ہوں کوئی مکھی میرے جسم پر نہ بیٹھنے پائے۔ وہ سو جاتا اور چاروں لڑکے پنکھا جھلتے رہتے۔ سست رفتاری پر جس بچے کو سب سے زیادہ مار پڑتی اس لڑکے کا نام دوستوئیفسکی تھا۔

دوستوئیفسکی ماسکو کے سینٹ میری ہسپتال کے سرجن کے گھر 28 جنوری 1821ء میں پیدا ہوا۔ باپ میخائل وچ دوستوئیفسکی ہسپتال کے سرکاری کوارٹروں میں اپنے چھ بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ بچوں کے باہر آنے جانے پر پابندی تھی۔ انہیں مارا جاتا اور نہایت کم خوراک دی جاتی۔ دوستوئیفسکی کا بچپن جوں توں گزرا۔ 16 سال کا ہوا تو ماں مر گئی۔ پیٹرز برگ کے ایک سکول میں دوستوئیفسکی اور بھائی میخائل کو داخل کر دیا گیا۔ پھر ملٹری انجینئرنگ سکول میں داخلہ کرانا چاہا تو دوستوئیفسکی کے بڑے بھائی کو بری صحت کی بنا پر داخلہ نہ ملا۔ دوستوئیفسکی داخل کیا گیا۔ جہاں وہ تنہا تھا اور ناخوش تھا۔ میخائل سے دور رہ کر اس کی اداسی اور بڑھ گئی۔ باپ نے نہ کتابوں کے لئے پیسے بھیجے، نہ کپڑوں کے لئے کچھ دیا۔ باپ نے اپنے باقی لڑکوں کو ان کی ایک خالہ کے سپرد کیا اور خود لڑکیوں کو لے کر اپنی زمینوں پر چلا گیا۔ جی بھر کر شراب پی، اپنے مزارعوں کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ مزارعے پہلے تو گالیاں سنتے رہے پھر ایک رات تنگ آ کر اسے قتل کر دیا۔ دوستوئیفسکی اور اس کا بھائی خالی ہاتھ اس کی لاش کو دیکھتے رہے۔ دوستوئیفسکی نے پڑھائی ہی کے دوران پیسہ کمانے اور پیسہ جوئے میں ہارنے کا فن سیکھ لیا اور مرتے دم تک کمانے اور کما کر جوئے میں ہارنے کی الجھن کا شکار ہوتا رہا۔

دوستوئیفسکی کو اپنا بڑا بھائی میخائل بہت عزیز تھا۔ اپنا اور اس کا خرچہ چلانے کے لئے دوستوئیفسکی نے اکیڈمی کی پڑھائی کے دوران ہی لکھنا شروع کر دیا اور اپنی پہلی کتاب مکمل کر لی جس کا نام Poor Folk تھا۔ کتاب پبلشر کو دکھائی گئی۔ اس نے مسودہ لوٹا دیا۔ دوستوئیفسکی کے دوست یہ ناول اس زمانے کے مشہور نقاد بیلنسکی (Belinsky) کے پاس

لے گئے۔ اسے ناول پسند آیا۔ بیلنسکی نے Poor Folk کا دیباچہ لکھا اور دوستوئیفسکی کی تعریف کی۔ کتاب چھپ گئی اور دوستوئیفسکی دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہوگیا۔ لیکن اس ناول کے چھپتے ہی دوستوئیفسکی پر آہستہ آہستہ مشکلات کے دروازے کھلنے لگے۔ اسے پورا یقین ہوگیا تھا کہ وہ بہت بڑا لکھاری ہے بیلنسکی نے دیباچے میں اس کی تعریف کم کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ اس سے لڑا۔ دوستوں سے جھگڑا کیا۔ پبلشر سے ایڈوانس لیا۔ کتاب مکمل نہ کی۔ قرضے بڑھ گئے۔ کہانیاں لکھیں، فضول ثابت ہوئیں۔ مرگی کے مرض نے گھیرا ڈال لیا اور سب سے بڑا اور خوفناک واقعہ اس کی گرفتاری تھی۔

دوستوئیفسکی کو 29 اپریل 1849ء میں گرفتار کیا گیا۔ پیٹر پال کے قلعے میں مقدمہ چلا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ نوجوانوں کی ایک ایسی تنظیم کا فعال رکن تھا جو سنسر شپ کے خلاف تھی جو کسانوں اور عام آدمی کے حقوق کے لئے لڑ رہی تھی۔ مقدمہ 15 آدمیوں کی پھانسی کی سزا پر ختم ہوا۔ پیٹر پال کے احاطے میں انہیں ایک صبح پھانسی کی سزا دینے کے لئے لے جایا گیا۔ دوستوئیفسکی نے چند دن بعد اپنے بڑے بھائی میخائل کو خط لکھا جس کی چند لائنیں کچھ اس طرح ہیں۔

"یہ 22 دسمبر کی بات ہے۔ ہمیں گولی مارنے کے لئے احاطے میں لے جایا گیا اور ہمیں پھانسی کا حکم نامہ پڑھ کر سنایا گیا۔ ہمیں آخری بار صلیب کو چومنے کی اجازت ملی۔ سفید کپڑے پہنائے گئے، چہرے پر کالے نقاب چڑھائے گئے، مجھے 6 کی قطار میں کھڑا کیا گیا۔ مجھے اس وقت سب بہن بھائی یاد آئے۔ مجھے تم سب سے زیادہ یاد آئے اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں اور پھر اچانک تنی ہوئی بندوقیں نیچے جھک گئیں اور ہمیں ایک حکم نامہ پڑھ کر سنایا گیا کہ ظلِ سبحانی نے ہماری پھانسی 7 سالہ قید میں بدل دی ہے......"

اور پھر دوستوئیفسکی کو 7 سال کے لئے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ جو دوستوئیفسکی کی فنی زندگی میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ یوں تو ہر اچھا لکھنے والا اپنی زندگی، اپنے ماحول اور اپنی سماجی اور معاشی زندگی سے لکھنے کا مواد حاصل کرتا ہے لیکن دوستوئیفسکی کے ہاں اس عنصر کی پرچھائیاں کچھ زیادہ اور پراعتماد اور فن کارانہ انداز میں ملتی ہیں اور اسی ہنر مندی نے اسے دنیا کا ایک بڑا ناول نگار بنا دیا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اس کی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز آئے۔ اسے نفسیاتی، معاشی، رومانوی، سیاسی، جذباتی اور طبقاتی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس جنگ میں وہ ثابت قدم رہا اور حالات بگڑتے اور سنورتے رہے۔ اس بگاڑ اور سدھار میں اس کے اعتماد اور ثابت قدمی کا بڑا دخل تھا۔ اور یہ سب باتیں، واقعات اور (Twists) اس کی تحریروں، ناولوں، ناول کے کرداروں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثلاً دوستوئیفسکی کا باپ شراب میں دھت یہ کہتا تھا کہ میرے منہ میں ووڈ کا (Vodka) انڈیل دو اور دوستوئیفسکی کی ناول (Notes from the underground) میں یہ کیفیت ایک کردار کی دکھائی گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ دوستوئیفسکی کے والد کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑا کمینہ، جذباتی اور بے وقوف تھا۔ برادرز کرمازوف میں باپ کا کردار دوستوئیفسکی کے باپ کی کاربن کاپی ہے۔ دوستوئیفسکی مرگی کا مریض تھا۔ اس کے ناول (IDIOT) کا شہزادہ مشکین اور برادرز کرمازوف میں چوتھا ناجائز بیٹا اسی مرض میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔

دوستوئیفسکی 1863ء میں یورپ کے دورے پر گیا۔ جوئے کے اڈے پر اس کی ملاقات ایک ماڈل عورت سے ہوئی جو بہت خوبصورت تھی جس کا نام اپولی ناریا سس لووا (Apolli Naria Suslova) تھا۔ (دوستوئیفسکی نے اس سے اظہار محبت بھی کیا لیکن اس نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ دوستوئیفسکی ساری عمر اس کی محبت میں مبتلا رہا) دوستوئیفسکی نے اپنی

دو کتابوں جرم و سزا اور برادرز کرمازوف کی مفرور ہیروئن اسی عورت کو ماڈل بنا کر تشکیل دی ہیں۔

دوستوئیفسکی کے وہ خطوط جو اس نے سائبیریا سے اپنے بھائی کو لکھے دوستوئیفسکی کی فنی اور تخلیقی زندگی کے بارے میں باعلم ہونے کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دوستوئیفسکی کا تخلیقی نظام کن اصولوں کے تحت تشکیل پاتا تھا؟ وہ فن پارے کی تشکیل میں کتنا سنجیدہ تھا؟ اور اپنی تحریروں کی نوک پلک کس طرح سنوارتا تھا؟ ایک بار اس کے بھائی نے اسے خط میں لکھا کہ اس نے ایک نشست میں اپنی (Painling) مکمل کر لی ہے۔ دوستوئیفسکی نے اسے 31 مئی 1858ء کو ایک خط میں لکھا:

"کیا کہا تم نے تصویر ایک نشست میں مکمل کر لی ہے۔ یہ تم نے کہاں سے سیکھا۔ بھلے آدمی۔ تخلیقی کام کے لئے مسلسل محنت درکار ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ پشکن کے لکھے چند مصرعے ایک نشست میں کہے گئے ہیں۔ نہیں تم کیا جانو اس پر کتنا وقت لگا۔ پشکن نے ان کی کتنی کانٹ چھانٹ کی۔ کہا جاتا ہے کہ شیکسپیئر کبھی اپنے لکھے کی کانٹ چھانٹ نہیں کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے ہاں بے شمار غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ کاش اس نے اپنے کام پر محنت کی ہوتی......"

ایک دوسرے خط میں وہ لکھتا ہے:

"برادرز کرمازوف کا پلاٹ مجھے تین سال پریشان کرتا رہا میں نے 9 سال اس پر محنت کی اور ناول مکمل کیا۔"

اپنے لکھے ہوئے مسودے کو بار بار پڑھنا۔ اس کی کانٹ چھانٹ دوستوئیفسکی کی عادت ثانیہ تھی۔ اسی لئے ایک نقاد کی نظر میں "دوستوئیفسکی کا ایک ایک حرف قابلِ مطالعہ ہے......"

سائبیریا کی جیل میں گزارے ہوئے سات سال نے دوستوئیفسکی کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ اس زندگی کو (Shut up in Coffin) کا نام دیتا ہے۔ جیل کے دن رات، جیل کا ماحول، سوتی جاگتی تنہائی اور خاموشی نے اسے انسانوں کے اندر جھانکنے کا عادی بنا دیا۔ موت کا خوف ہر وقت وہاں اس کے ذہن میں سمایا رہا اور وہ چڑچڑا اور تلخ مزاج ہوتا گیا۔ قید کی بیرک کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"ہم سب ایک بیرک میں رہتے تھے جو کبھی ناقابل استعمال قرار دے دی گئی تھی۔ ٹوٹے دروازے، ٹوٹی دیواریں، سردیوں میں شدید سردی، اس میں دن کی روشنی رات کی سیاہی کی طرح تھی۔ ہم سب میں سے خنزیروں کی بدبو آتی تھی۔ اسی میں ہم نہاتے اور اسی کو بیت الخلا کے طور پر استعمال کرتے۔ فرش پر ایک ایک انچ گندگی جمی رہتی تھی۔ لکڑیوں کو جلایا جاتا تھا لیکن کھڑکیوں پر برف جمی رہتی تھی۔ میں تمہیں بتلا نہیں سکتا کہ میری روحانی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ میں تم سے صرف ایک بات کہوں گا۔ مجھے بھول نہ جانا، مجھے دو چیزیں چاہئیں۔ پیسے اور کتابیں"۔

دوستوئیفسکی نے سائبیریا کے قیام کے دوران بہت مطالعہ کیا۔ وہ اپنے خطوط میں بھائی سے صرف اور صرف کتابوں کی فرمائش کرتا ہے (پیسے اس کا بھائی اسے بغیر کہے بھجوا دیتا تھا)۔

دوستوئیفسکی نے اس قیام کے دوران کن کن کتابوں کا مطالعہ کیا (جبکہ دن کو بھی جیل میں رات کا سماں تھا) ان کتابوں کی فہرست پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ جولائی 1840ء کے خط میں وہ اپنے بھائی کو لکھتا ہے:

"مجھے اخبارات نہ بھیجو۔ یورپ کی تاریخ، ہیروڈوٹس، کلاسیک کتابیں، معاشیات کی کتابیں، پلوٹارچ، اور قرآن (جرمنی ترجمہ)"

قرآن شریف کی فرمائش دوستوئیفسکی نے دو خطوط میں کی۔

ایک خط میں وہ بھائی کو لکھتا ہے:

''مجھے قرآن بھیجو اور ہیگل کی تاریخ فلسفہ...... میں اب ناول اور ڈرامے لکھنا چاہتا ہوں لیکن پہلے ڈھیر سارا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں...... پتا کرو کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ میری تحریریں چھپ سکیں۔ مجھے پیسے چاہئیں پلیز......''

سائبیریا کے اس قیام نے ایک عالمی سطح پر نام کمانے والے ناول نگار کو تیار کیا۔ دوستوئیفسکی کا ناول House of the dead اور Notes from underground میں وہ ذہنی کرب اور روحانی آہ وفغاں سنائی دیتی ہے جو اس ماحول کی وجہ سے اس کی تحریر میں آئی۔ Notes from underground پڑھ کر بھی نطشے (Nietzsche) نے کہا تھا کہ یہ Cried truth from blood ہے اور ان الفاظ میں دوستوئیفسکی کو داد دی تھی۔

''دوستوئیفسکی واحد نفسیات دان ہے جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ مصنف اور اس کی تحریریں میری زندگی کی واحد مسرت ہیں'' ول ڈیورانٹ (Will Durant) نے اپنی مشہور کتاب نشاط فلسفہ (The Pleasure of Philosophy) میں دوستوئیفسکی کی کتاب (Notes from underground) کو وجودیت (Existentialism) کا بنیادی کارنامہ قرار دیا ہے۔

دوستوئیفسکی 1854ء میں سائبیریا سے واپس آیا۔ سائبیریا میں اپنے دوست (جب دوست مر گیا) کی بیوی ماریا سے شادی کی اور پھر لکھنے کی طرف توجہ دی۔ جن کرداروں کو اس نے جانا پہچانا تھا، انہیں اپنے ناولوں میں بروئے کار لایا۔ نفسیاتی طور پر الجھے کرداروں کو Complex -Story- Line میں استعمال کیا اور روحانی کرب میں مبتلا کرداروں کو اپنے طرز زندگی کا انداز دیا۔ جدید اور روائتی روسی طرز احساس کی کش مکش پیدا کی۔

اس سارے سفر میں جوا اور روپے کا لین دین۔ قرضوں کی بہتات اس کا پیچھا کرتی رہی۔ بیوی فوت ہوگئی اور بھائی مر گیا جو اسے بے حد عزیز تھا۔ اس دوران قرضے اور خالی جیب نے اسے اور پریشان کر دیا۔ اداسی، بے چینی اور ناامیدی نے زور پکڑا اور وہ نفسیاتی مریض بنتا چلا گیا لیکن ایک چیز میں یہ دیوانہ ہوشیار تھا اور وہ تھا پیسہ کمانے کا ہنر۔

جب وہ ''جرم وسزا'' پر کام کر رہا تھا اور پبلشر اس کی کئی کتابیں چھاپ چکا تھا۔ ایک عجیب واقعہ ہوا ''جرم وسزا'' کے معاہدے کے وقت اس نے پبلشر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ایک چھوٹا ناول لکھ کر دے گا۔ اگر وہ یہ ناول نہ دے سکا تو تمام کتابوں کی رائلٹی سے وہ محروم ہو جائے گا۔ جب تاریخ قریب آ گئی تو اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اس نے ایک دوست سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے، اس نے کہا کہ ایک سٹینوگرافر رکھا جائے جسے دوستوئیفسکی ناول لکھوا دے۔ چنانچہ 20 سال کی ایک لڑکی اینا (Anna) کو یہ کام سونپا گیا اور دوستوئیفسکی نے اپنا ناول گیمبلر (The Gambler) 26 دن میں مکمل کر لیا۔

اینا نے ان 26 دنوں میں دوستوئیفسکی کا بہت خیال رکھا۔ چنانچہ اس نے 1867ء میں اس سے شادی کر لی۔ قرضے پھر بڑھ گئے اور وہ روس چھوڑ کر چار سال کے لئے باہر بادن بادن Baden-Baden چلا گیا۔ وہاں بڑی ہنرمندی سے جوا کھیلا اور 4000 فرانک اکٹھے کر لئے۔ پھر کیا ہوا۔ وہی جو ایک لالچی جواری کے ساتھ ہوتا ہے۔ آیئے دوستوئیفسکی کے ایک خط ہی سے حالات کا جائزہ لیتے ہیں:

''اینا نے مجھے منت سماجت سے سمجھایا کہ اب واپس چلتے ہیں۔ یہ کافی رقم ہے لیکن میں چار ہزار کو 20 ہزار بنانا چاہتا تھا۔ اور میں جوئے میں سب کچھ ہار گیا، کپڑے اور جوتے تک۔ بیوی نے اپنی انگوٹھی، زیور بیچ دیئے۔ گھر کا کرایہ بھی نہ

دیا، پبلشر کو پیسوں کے لئے لکھا تو اس نے جواب تک نہ دیا اور پھر رات کے اندھیرے میں بیوی کو لے کر میں بادن بادن سے بھاگ آیا''۔

لیکن کبھی کبھی اس کا اعتماد اس کے لئے فائدہ مند بھی ثابت ہوا۔ ایک بار وہ کیسینو (Casino) سے سب کچھ ہار کے باہر نکلا۔ اس کی جیب میں صرف ایک سونے کا سکہ تھا۔ اس نے سوچا صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا چل جائے گا۔ وہ یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ کیا میں اس ایک سکے کو داؤ پر لگا کر قسمت نہیں آزما سکتا چنانچہ وہ دوبارہ (Casino) میں چلا گیا اور 170 سکے جیت کر گھر واپس گیا۔ (یہ واقعہ اس نے لفظ بہ لفظ اپنے ناول Gambler میں شامل کیا ہے)

''جرم وسزا'' تک پہنچتے پہنچتے اس نے بہت کچھ لکھا۔ ان میں بے شمار کہانیاں، ڈائری اور مضامین شامل ہیں اور چار مشہور ناول بھی ہیں۔ ایک The House of Dead اور دوسرا The Insulted and Injured اور تیسرا (Possessed) اور چوتھا Double۔

جیل کے دوران اسے علم ہو گیا تھا کہ آدمی قتل کرے یا چوری کرے یا ڈاکہ ڈالے خطرناک جرائم کا مرتکب ہو۔ اس میں کچھ صفات بھی ہوتی ہیں۔ بہادری، جرأت، ہمدردی، ایثار کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ صفات اس میں موجود تھیں۔ اس کے آنے والے ناولوں میں اس کے کردار کچھ ایسے ہی تھے۔ دوستوئیفسکی کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے کردار حقیقت سے زیادہ حقیقی کردار ہیں۔

دوستوئیفسکی کے چار ناولوں کو عالمی سطح پر بڑے ناول خیال کیا جاتا ہے۔ جرم وسزا، برادرز کرمازوف، شیطان (The Devils) اور (Idiot) لیکن آخری دو ناولوں کے مقابلے میں جرم وسزا اور برادرز کرمازوف کی مقبولیت بے مثال ہے اور جب بھی دنیا کے بڑے ناولوں کی فہرست بنائی جاتی ہے ان دو ناولوں کی شمولیت کے بغیر یہ فہرست نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

ان ناولوں میں Complicated پلاٹ بھی ہیں۔ جو ایسے ڈرامائی مناظر سے بھرے ہوئے ہیں جن میں اس کے جذباتی اور سکینڈلز سے بھرے کردار سقراط کے لہجے میں مکالمے بولتے نظر آتے ہیں۔ انہیں خدا کی تلاش ہے اور معصوم کردار بدی اور گناہ کے مسائل میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خودکشی، مجروح انا، روحانی کرب میں مبتلا، خاندانی اقدار کی توڑ پھوڑ...... دوستوئیفسکی اپنے کرداروں کو ایسے موڑ پر کھڑا کر دیتا ہے جہاں ایک ناقابل برداشت صورت حال ان کی منتظر ہوتی ہے اور دوستوئیفسکی ان کی روح اور نفسیات کی گہرائیوں میں اترتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ اسے وقت کے نشیب وفراز نے عطا کیا۔ شاید اس کے بائیوگرافر (Frank) نے بھی یہی جان کر دوستوئیفسکی کو اپنی کتاب ''دوستوئیفسکی اور یہودی'' کے دیباچے میں دوستوئیفسکی کا (Procluct of Time) کے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

''جرم وسزا'' ایک غریب طالب (Raskolinikov) کی کہانی ہے جو پیٹرز برگ میں پڑھنے کیلئے آتا ہے۔ حادثاتی طور پر وہ ایک بدمزاج بوڑھی عورت کا قتل کر دیتا ہے، ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے، جب یہ دباؤ بڑھتا ہے تو وہ جرم کا اقرار کر لیتا ہے اور اسے آٹھ سال کے لئے سائبیریا بھیج دیا جاتا ہے۔ اس مرکزی پلاٹ کے ساتھ ساتھ دو ضمنی پلاٹ اور بھی ہیں۔ ایک پلاٹ (Marmeladov) خاندان کی بدقسمتی کی داستان ہے جو لمحہ بہ لمحہ بربادیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ دوسرا پلاٹ راسکولینی کوو (Raskolinikov) کی ماں اس کی بہن دونیا اور اس کے دوست راز میخن (Razumikhin) کے گرد گھومتا ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ قتل کرنے کی حمایت میں Raskolinikov کے پاس بہت سے جواز ہیں۔ وہ کہتا ہے بوڑھیا نے تو ویسے ہی مر جانا تھا میں اس کی دولت حاصل کر کے سوسائٹی میں تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ کچھ لوگوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں، بہن کے حالات درست کرنا چاہتا تھا اس کا کہنا ہے کہ اس معاشرے میں دو طرح کے نپولین رہتے ہیں۔

پہلی قسم وہ نپولین ہیں جن کے پاس اختیارات اور طاقت ہے۔ وہ معاشرے میں سپر مین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنے قوانین بناتے ہیں۔ دوسری قسم کے نپولین کے پاس نہ طاقت ہے، نہ قانون، نہ پیسہ، چنانچہ وہ چوری کرتا ہے، قتل کرتا ہے، پہلی قسم یہ نہیں کرتی۔ چنانچہ وہ پہلے سوفیا کے سامنے اور پھر پولیس کے سامنے اقرار جرم کر لیتا ہے۔

برادرز کرمازوف کا ادبی تجزیہ کرتے ہوئے مشہور انگریزی ادب کے نقاد اور مصنف مارٹن سیمور سمتھ (Martin Seymour Smith) کہتا ہے ''کیا یہ ناول ایک عظیم ناول ہے؟ کیا دوستوئیفسکی اس کی تشکیل میں کامیاب رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں دوستوئیفسکی کامیاب رہا۔ چند چھوٹی چھوٹی ناکامیوں کے باوجود یہ ناول دنیا کا عظیم ناول ہے''

یہ چھوٹی چھوٹی ناکامیاں جن کی طرف مارٹن نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں کہ دمتری (Dimitri) کا مقدمہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ الوشا (Alyosha) ایک نیک اور شریف آدمی کے کردار میں ڈھالنے میں دوستوئیفسکی ناکام رہا ہے۔ اسلوب کہیں کہیں ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ لیکن ان کے باوجود دوستوئیفسکی اس سے پہلے ایسا شاہکار اور مضبوط فن پارہ تخلیق نہیں کر سکا جیسا کہ برادرز کرمازوف۔

بوڑھا کرمازوف جس کی پہلی بیوی (جو اسے مارتی بھی تھی) بھاگ گئی تھی۔ فیڈرو کرمازوف نے دو شادیاں کیں۔ اس کے تین بیٹے دمتری (Dimitry) ای وان (Ivan) اور الوشا (Alyosha) ہیں اور چوتھا بیٹا سمرڈیاکوف (Smerdyakov) اس کی ناجائز اولاد ہے۔ بوڑھا کرمازوف لالچی اور ہوس پرست ہے۔ وہ بڑا کمینہ اور ناقابل یقین مزاج کا مالک ہے۔ اس کا بیٹا دمتری (Dimitry) اور وہ خود ایک گروشنکا (Grushenka) کو چاہتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ گروشنکا دمتری کو بیک وقت بچانا اور برباد کرنا چاہتی ہے۔ دمتری کھلے عام اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو مارے گا اور ایک موقع پر وہ اس پر حملہ آور بھی ہوتا ہے۔ جس رات باپ مرتا ہے اس کے قتل کا شبہ دمتری پر ہوتا ہے اور اسے 20 سال کی سزا ہو جاتی ہے۔ مقدمے کے دوران اس کا بھائی ای وان (Ivan) خاموش رہتا ہے۔ جس نے بوڑھے کرمازوف کے قتل پر اس کے ناجائز بیٹے کو اکسایا تھا۔ پھر وہ اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھ کر نادم ہوتا ہے۔ اور دماغی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ای وان (Ivan) خدا کی عظمت کا قائل ہے لیکن اس کی بنائی ہوئی دنیا پر اس کا ایمان نہیں۔ وہ الوشا کو ایک بچے کی کہانی سناتا ہے جو حادثاتی طور پر اپنے مالک کے کتے کی ٹانگ پر پتھر مار دیتا ہے۔ مالک نے بچے کو ننگا کر کے اس پر کتے چھوڑ دیئے اور کتوں نے بچے کو اس کی ماں کے سامنے بوٹی بوٹی کر دیا۔ دوستوئیفسکی کا نظریہ ہے کہ نیکی اور بدی کو دنیا میں موجود ہونا چاہیے اور آدمی کو مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ دونوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کر لے

سمرڈیاکوف (Smerdyakov) بوڑھے کرمازوف کا چوتھا ناجائز بیٹا ہے۔ اسے چاروں بیٹوں میں سے پُر اعتماد اور دماغی طور پر راہِ راست پر دکھایا گیا ہے۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اپنے دماغ کو استعمال میں لایا اور باپ کو قتل کر دیا۔ اور پھر وہ خودکشی کر لیتا ہے۔

اس ناول کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے میں ایک عظیم ناول نگار کا سہارا لوں گا۔ اس کا نام ٹالسٹائی ہے۔

ٹالسٹائی اور دوستوئیفسکی ایک عہد میں سانس لیتے تھے مگر دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ٹالسٹائی دوستوئیفسکی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے دوستوئیفسکی کی ''جرم و سزا'' پڑھی اور ہنس کر کہا:

''اس کتاب کے تین چار باب پڑھ کر پتا چل جاتا ہے کہ آگے کیا ہوگا'' اس ناپسندیدگی کی شاید وجہ یہ تھی کہ ٹالسٹائی کی ''اینا کرینینا'' پڑھ کر جو تبصرہ دوستوئیفسکی نے کیا تھا وہ ٹالسٹائی کو پسند نہ تھا۔ لیکن جب 1881ء میں دوستوئیفسکی فوت ہوا تو ٹالسٹائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کہ ''میرا دوست فوت ہو گیا ہے''

کتنی عجیب بات ہے اور کتنی عجیب محبت ہے۔ جب ٹالسٹائی (Astapovo) کے اسٹیشن ماسٹر کے گھر فوت ہوا تو اس کے سرہانے دوستوئیفسکی کی کتاب ''برادرز کرمازوف'' رکھی ہوئی تھی۔

دوستوئیفسکی ایک عظیم ناول نگار ہے۔ جس کی تحریریں، ناول، خطوط، ڈرامے اور ڈائریاں، افسانوں کے روحانی اور نفسیاتی جہان کے دکھ درد کے مناظر دکھاتی ہیں۔ ہم انہیں پڑھ کر دکھی بھی ہوتے ہیں اور روحانی مسرت بھی حاصل کرتے ہیں۔ بقول محمد حسن عسکری دوستوئیفسکی کو صرف وہی لوگ نہیں پڑھنا چاہتے ہیں جو اپنے اندر کا دوزخ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

دوستوئیفسکی نے یورپ اور مغرب کے لکھنے والوں کو اپنے اسلوب سے متاثر کیا اور اپنے اسلوب کی چھاپ ان کی تحریروں پر لگائی۔ امریکی ناول نگار ارنسٹ ہیمنگوے نے اپنی کتاب (Moveable Feast) میں اعتراف کیا ہے کہ اس کے تمام کام پر دوستوئیفسکی کا بہت اثر ہے۔

معروف مصنفہ ورجینیا وولف (Virginia Woolf) نے اپنے مضمون (The Russian Point of View) میں دوستوئیفسکی کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے۔

''دوستوئیفسکی کے ناولوں میں ایک تلاطم ہے۔ آندھیاں اور بگولے ہیں پانی کے بھنور میں جنہیں خالص روحانیت سے تشکیل دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری مرضی کے خلاف ہے کیونکہ ان میں ہماری بینائی کھو جاتی ہے دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں ایک بے پایاں مسرت کا احساس ہوتا رہتا ہے''۔

دوستوئیفسکی پر یہ باتیں لکھتے ہوئے نہ جانے بار بار مجھے مرزا غالب کیوں یاد آ رہے ہیں۔ جب میں دوستوئیفسکی کے خطوط دیکھ رہا تھا تو مجھے یوں ہی احساس ہوا کہ دوستوئیفسکی اور مرزا غالب کی زندگی میں کتنی مماثلتیں ہیں۔ ایک شاعر اور ایک ناول نگار کو اس نظر سے دیکھنا بڑا عجیب لگتا ہے۔ نہ دوستوئیفسکی نے کبھی غزل لکھی اور نہ غالب نے کبھی ناول نگاری کی طرف دھیان دیا۔ مجھے چند مماثلتیں ڈھونڈنے کا دھیان اس وقت آیا ہے جب دونوں کی زندگی اور شخصیت میں کچھ باتیں تقریباً ملتی جلتی نظر آئیں۔

غالب اور دوستوئیفسکی دونوں انیسویں صدی کے دور کے بڑے لکھاری ہیں۔ دوستوئیفسکی غالب سے 24 سال بعد پیدا ہوا۔ اور گیارہ سال بعد فوت ہوا لیکن دونوں کی صدی ایک ہے۔

مرزا غالب کے خطوط غالب کی ذاتی زندگی اور ان کی فنی زندگی اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دوستوئیفسکی کے خطوط کا بھی یہی حال ہے۔ دوستوئیفسکی کی ذاتی زندگی نظریہ فن کو جاننے کے لیے یہ بےحد ضروری ہیں۔

دوستوئیفسکی مے نوشی کا دلدادہ اور رسیا تھا۔ غالب بھی مرتے دم تک کہتے رہے کہ رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے

آ گے۔ دوستو یفسکی حسن پرست تھا۔ خوبصورت عورتوں سے محبت کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ مغرور اور نک چڑھی عورتوں سے رسم وراہ رکھتا تھا۔ غالب کا واسطہ بھی اس قسم کی عورتوں سے رہا اور وہ انہیں اپنی شاعری میں محفوظ کرتا رہا۔

غالب اور دوستو یفسکی دونوں کو قرض لینے کی عادت تھی دونوں مرتے دم تک مالی الجھنوں کا شکار رہے۔ دوستو یفسکی کو کئی بار ماسکو سے یورپ کی طرف قرض خواہوں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ غالب کو یہ قرض اتارنے کے لئے کلکتہ کا سفر کرنا پڑا تا کہ پنشن کی بحالی کے بعد قرض اتارے جا سکیں۔

دوستو یفسکی کی ساری زندگی Casinos اور جوئے خانوں میں گزری، نہ وہ ناول لکھنا چھوڑ سکتا تھا نہ جوا کھیلنا۔ غالب نے بھی اس راستے پر سفر کیا۔ گھر میں جوئے کی محفلیں سجائیں۔

دوستو یفسکی نے سائبیریا میں سات سال لمبی جیل کاٹی۔ غالب نے بھی کچھ دن جیل میں گزارے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے چاہنے والوں اور شاگردوں کو شاعری اور حرف و بیان کے گُر بتلائے۔ دوستو یفسکی نے اپنے بھائی کو سمجھایا کہ فن کیا ہے اس کی آبیاری کیسے کی جائے، اس نے اسے بتلایا کہ فن پارے کی جتنی کانٹ چھان کی جائے فن پارہ اتنا ہی عظیم بنتا ہے۔ غالب نے بھی اپنے فن پارے کو عظیم سے عظیم تر بنانے کا گُر سمجھایا۔

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پہ انگشت

دوستو یفسکی بڑی بے باکی سے بھائی کو خطوط میں لکھتا ہے کہ کوئی جاننے والا ایسا نہیں جس سے میں نے قرض نہیں لیا۔ ایک آخری آدمی بچتا ہے اسے 200 روبل کے لئے لکھا ہے اگر دے دے تو ٹھیک نہیں تو سب کچھ تباہ ہو جائیگا۔ غالب نے بھی ایک خط میں اشارہ کیا ہے کہ جب کوئی قرض واپس مانگنے والا دروازے پر دستک دیتا ہے تو کہتا ہوں کہ لے غالب ایک جوتی اور پڑی۔ نوکر کو ایک آدمی سے کچھ لینے کے لئے بھیجا ہے اگر وہاں سے کچھ مل گیا تو ٹھیک ورنہ اللہ ہی اللہ۔

اور ایک آخری مماثلت یہ کہ اگر چہ دونوں کا علاقہ مختلف زبان مختلف، پیرایہ اظہار مختلف مگر دونوں بڑے، دونوں عظیم لکھنے والے۔ ایک کے بارے میں نقادوں نے کہا کہ اس سے بڑا ناول نگار کوئی نہیں۔ دوسرے کے بارے میں نقاد نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان کی دو مقدس کتابیں ہیں۔ ایک وید اور دوسری دیوانِ غالب۔
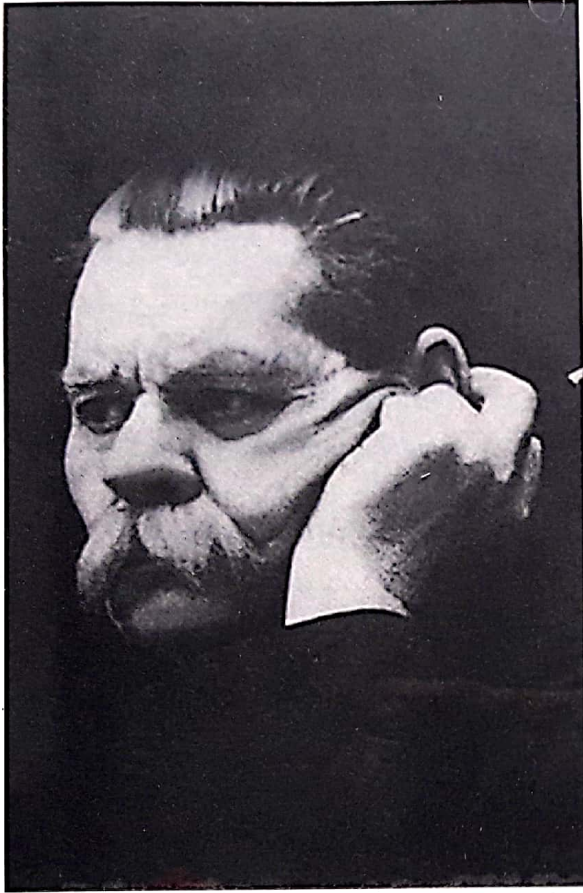
میکسم گورکی

(Maxim Gorky)

روس کا عظیم ناول نگار ''ماں'' کا خالق، شاعری کی، ڈرامے لکھے، روسی ادب میں روایتی حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی۔ مضامین اور کہانیاں لکھیں، سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ زارِ روس کے خلاف لکھا اور کئی بار جیل گیا۔ کہانیوں اور ناولوں میں آفاقی سچائی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

پتا نہیں کیوں مجھے میکسم گورکی اچھا نہیں لگتا۔ ہر وقت اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے جیسے اس نے جا کر اپنے خدا کو ساری تفصیل بتلانی ہے۔

(ٹالسٹائی)

....

تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے اسے ضرور لکھو۔

(لینن)

....

تمہاری کہانی ''لڑکی اور موت'' گوئٹے کے ''فاؤسٹ'' سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں موت محبت سے شکست کھاتی ہے۔

(سٹالن)

....

ہم اس نظام کے خلاف ہیں جس نظام کی حفاظت کے لیے تمہیں کرسی پر بٹھایا گیا ہے۔ تم روحانی طور پر غلام ہو، ہم جسمانی طور پر غلام ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان نظام کی تبدیلی تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

(ماں سے ایک اقتباس)

میکسم گورکی

ہر زبان میں چند ایسے ادیب اور شاعر ضرور پیدا ہوئے جن کی عظمت کو صدیوں یاد رکھا گیا۔ بے شک ان بڑے ادیبوں کے درمیان معاصرانہ چشمک جاری رہی، وہ ایک دوسرے میں خامیاں ڈھونڈتے رہے، ایک دوسرے پر اپنی قادرالکلامی کی دھونس جماتے رہے لیکن آنے والی نسلوں نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا اور وقت کی دھول ان کے خدوخال نہ دھندلا سکی۔ اردو ادب پر نظر ڈالئے۔ میرؔ، دردؔ اور سوداؔ تینوں اساتذہ ایک ہی عہد میں جئے اور اب تک زندہ ہیں۔ میر انیسؔ اور دبیرؔ دونوں اساتذہ شعرا کی عظمت مسلّم ہے۔ غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ ایک ہی زمانے کے مستند شعرا ہیں۔ انگریزی شاعری میں بائرن، ورڈز ورتھ، کولرج، شیلے اور کیٹس نے ایک عہد میں آنکھ کھولی اور شاعرانہ عظمت کی بلندیوں کو چھوا۔ فرانس کے لوگوں نے وکٹر ہیوگو، فلا بیئر، موپساں اور بالزاک کو ایک زمانے میں سانس لیتے دیکھا۔ چاروں اپنے اپنے فن میں بے مثال تھے۔ ایسا ہی عہد روس میں بھی آیا جب پانچ بڑے نثر نگار، ڈراما نویس، ناول نگار بیک وقت گھومتے پھرتے نظر آئے۔ چھوٹی موٹی معاصرانہ چشمک جاری رہے مگر پانچوں کے پانچوں عالمی ادب میں نامور کہلائے اور دنیا نے ان کے فن کی عظمت کو تسلیم کیا۔ یہ ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی، چیخوف، میکسم گورکی اور ترگنیف تھے۔ سینئر ناول نگار ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی اور میکسم گورکی کے بارے میں کبھی کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا لیکن گورکی اور دوستوئیفسکی نے کبھی کھل کے ٹالسٹائی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ دوستوئیفسکی ہمیشہ مقروض رہا، وہ اکثر ترگنیف سے پیسے ادھار لیا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ پیسے دینے سے انکار کر دیتا تو دوستوئیفسکی اس سے ناراض ہو جاتا اور اس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا۔ ایک بار تو اس کو اتنا غصہ آیا کہ ترگنیف کا کردار اپنے ناول میں لکھ ڈالا اور اپنا سارا غصہ اس کردار کی تشکیل میں اُتار دیا اور اس کردار کو جی بھر کر بُرا بنایا۔ جہاں تک میکسم گورکی کا تعلق ہے تو ٹالسٹائی شاید اس سے حسد کرتا تھا اور اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اس بات کا گواہ چیخوف ہے۔ ایک بار ٹالسٹائی نے باتوں باتوں میں کہا:

''پتا نہیں کیوں مجھے میکسم گورکی اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہر وقت ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے جیسے اس نے جا کر اپنے خدا کو ساری تفصیل بتلانی ہے۔''

چیخوف نے کہا:

''نہیں ایسی بات نہیں۔ میکسم گورکی بہت اچھا آدمی ہے'' ٹالسٹائی نے کہا:

''بالکل نہیں۔ اس کی ناک بالکل بطخ جیسی ہے۔ صرف بدمزاج لوگوں کی ناک ایسی ہوتی ہے۔ عورتیں اسے پسند نہیں کرتیں۔ عورتیں تو کتوں کی طرح اچھے آدمی کو پہچان لیتی ہیں''

ٹالسٹائی کی ناپسندیدگی اپنی جگہ۔ میکسم گورکی اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ اکثر چیخوف کے ساتھ ٹالسٹائی کو ملنے ٹالسٹائی کی جاگیر Yasnaya Polyana جاتا تھا۔ اس نے کئی مضامین میں ٹالسٹائی کی تعریف کی ہے اور اس کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

Aleksey Makismovich Peshkov نامی شخص کو ساری دنیا میکسم گورکی کے نام سے جانتی ہے۔ وہ روس کا نامور ادیب، ناول نگار، ڈراما نویس، سیاسی تجزیہ نگار اور عملی سیاست کا سرگرم رکن تھا۔ میکسم گورکی 16 مارچ 1868ء کو روس کے شہر Nizhny Novgorod میں پیدا ہوا۔ بچپن میں باپ فوت ہوگیا۔ اس کا بچپن بہت مفلسی اور بھاگ دوڑ میں گزرا۔ 12 سال کی عمر میں وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس فرار کی وجہ اپنی دادی کی تلاش تھی۔ دادی بہت اچھی داستان گو تھی بس اس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا۔ گورکی اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ دادی کی موت نے اسے ذہنی طور پر پریشان کر دیا۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی مگر بچالیا گیا۔ دادی کی موت کے بعد اس کی دربدری کا زمانہ شروع ہوا اور وہ پانچ چھ سال سارے روس میں خشک پتوں کی طرح اُڑتا پھرتا رہا اور مختلف کام اور مزدوریاں کرتا رہا۔ اس کی سوانح عمری ''بچپن'' میں اس دربدری کی تفصیل موجود ہے۔ جب اس کی لینن سے دوستی ہوئی تو ایک ملاقات میں اس نے لینن کو اپنے بچپن کی یہ روداد سنائی۔ یہ 1908ء کی بات ہے جب وہ اٹلی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ لینن نے یہ تفصیل سن کر کہا:

''تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے اس کو ضرور قلم بند کرو''۔

گورکی نے لینن کی بات کو عملی جامہ پہنایا اور 1915ء میں اس کے بچپن کی یہ داستان بچپن کے نام سے روس میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد آرمینیا کے ایک مصنف نے گورکی کو لکھا تھا:

''میرے خیال میں یہ کتاب روسیوں کی زندگی کی حقیقی کہانی ہے لیکن اسے پڑھ کر فرانس کے لوگ بھی اسے اپنی کہانی سمجھیں گے۔ میں روسی نہیں ہوں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آرمینیا کے لوگوں کی کہانی ہے۔ تمہاری اس کتاب کا یہ وصف ہے کہ یہ بنی نوع انسان کی کہانی بن گئی ہے۔''

ایک روسی نقاد نے اس کتاب کو پڑھ کر کہا:

''اس کی صرف یہی اہمیت نہیں کہ یہ آرٹ کا شاندار نمونہ ہے بلکہ یہ ایک مصنف کی سوانح عمری ہے جسے پڑھ کر ہم اس کی تحریروں کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت آنسو ہیں، بہت زخم ہیں، بہت اداسی ہے لیکن پھر بھی یہ ایک مسرت سے لبریز گیت ہے۔''

میکسم گورکی نے روسی ادب میں سوشلسٹوں کی روایتی حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی۔ ایک عرصے تک گورکی اخباروں میں نام بدل کر لکھتا رہا۔ نام بدلنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ وہ تحریریں اور مضامین روسی حکومت کے خلاف تھیں۔ گورکی کا بحیثیت مصنف تعارف اس کی پہلی کتاب ''مضامین اور کہانیاں'' سے ہوا۔ اس کتاب میں اس نے سماج میں جبر کے زیرِ اثر زندگی گزارنے والے لوگوں کے بارے میں لکھا۔ ان سختیوں اور زیادتیوں کا ذکر کیا جو وہ زندگی میں برداشت کر رہے تھے۔ ان ذلتوں اور مظالم کا ذکر کیا جو ان کا مقدر بن چکی تھیں اور ان کے اندر چھپی اچھائیوں اور خوبیوں کو بے نقاب کیا۔ ایسا کرتے ہوئے دراصل وہ روسی سوشل زندگی کے خلاف ایک آواز بن چکا تھا۔ 1899ء میں وہ مارکسسٹ سوشل ڈیموکریٹک تحریک کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ لوگوں کو اردگرد کی سماجی برائیوں کے بارے میں باخبر کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انقلابی ذہن کی تیاری میں تحریک کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ وہ زار حکومت کے خلاف لکھنے لگا اور کئی بار اسے جیل جانا پڑا۔ 1902ء میں اس کی لینن سے دوستی ہوگئی۔ اس نے پریس کی آزادی کے لیے حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ 1902ء ہی میں اسے ادبی اکیڈمی کا ممبر بنا دیا گیا۔ چیخوف بھی اس اکیڈمی کا ممبر تھا۔ لیکن کچھ عرصے

بعد گورکی کو بادشاہ کے حکم سے نکال دیا گیا۔ احتجاجی طور پر چیخوف نے بھی ممبرشپ سے استعفیٰ دے دیا۔ روسی انقلاب کے دوران میکسم گورکی فعال حیثیت سے سرگرم رہا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی بالشویک شاخ سے منسلک رہا۔ اس زمانے میں گورکی کے سیاسی ڈراموں نے بہت دھوم مچائی۔ اس کا ڈراما The Lower Depths بڑا مقبول رہا۔ 1906ء میں بالشویک پارٹی نے اسے فنڈز اکٹھا کرنے کے لیے امریکہ کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس دورے کے دوران اس نے Adirondack کے مقام پر اپنا مشہور زمانہ ناول ''ماں'' لکھا۔ انقلابِ روس کے دوران اس نے پال اور پیٹر نامی قلعوں میں جیل بھی کاٹی۔ اسی دوران اس نے ایک ڈراما (Children of the Sun) بھی مکمل کیا۔ یہ ڈراما 1862ء میں پھیلنے والی ملیریا کی بیماری کے پس منظر میں لکھا گیا تھا جس میں شامل واقعات میں آفاقی سچائی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

میکسم گورکی روسی انقلاب سے پہلے بھی وقفے وقفے سے جلاوطنی کی سزا کاٹتا رہا۔ انقلاب کے بعد بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے ملک سے باہر جاتا رہا۔ 1906ء سے 1913ء تک کا اٹلی میں قیام خرابی صحت کی وجہ سے ہی تھا۔ اس قیام میں خرابی صحت کے ساتھ ساتھ پارٹی سے سیاسی اختلافات بھی تھے۔ گورکی روس کی سوشل جمہوریت کے گن گاتا رہا اور اس نظریے کا قائل رہا کہ روس کے انقلاب میں معاشی اور سیاسی حالات سے زیادہ کلچر کا ہاتھ ہے۔ اس نے اپنی اس فلاسفی کو God Building کا نام دیا۔ لینن اس سے اختلاف رکھتا تھا لیکن گورکی انسان کی اخلاقی و روحانی آگاہی پر زور دیتا رہا۔ 1913ء میں وہ واپس روس آیا۔ تنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ اپنی سوانح عمری کا پہلا حصہ لکھتا رہا۔ اپنا اخبار نئی زندگی (New Life) نکالتا رہا۔ بالشویک پارٹی نے اس کے مضامین پر سنسرشپ لگا دی۔ ان مضامین میں میکسم گورکی نے لینن کا زارِ روس سے موازنہ کیا تھا اور سخت تنقید کی تھی۔

1921ء میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس کی ایک ساتھی مصنفہ (ANNA) کے خاوند Nikolai Gumilyov کو نظریاتی اختلاف کی بنا پر پولیس نے گرفتار کر لیا۔ گورکی ماسکو گیا لینن سے ملاقات کی اور اس کی رہائی کے احکامات حاصل کیے۔ لیکن جب گورکی Petrograd پہنچا تو (Gumilyov) کو گولی ماری دی گئی تھی۔ گورکی اسی سال اکتوبر میں اٹلی چلا گیا۔ اس کی بیماری حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ وہ مالی حالات کے ہاتھوں بہت پریشان رہا۔ کئی بار روس آیا اور پھر اٹلی چلا گیا۔ 1932ء میں جوزف سٹالن نے اس سے درخواست کی کہ وہ اب روس واپس آ جائے۔ اسے سٹالن نے لینن انعام دیا۔ رہنے کے لیے عالی شان گھر دیا (جواب گورکی میوزیم ہے) سٹالن اس کے گھر آیا۔ گورکی نے اس کے سامنے اپنی ایک کہانی پڑھی جس کا نام ''ایک لڑکی اور موت'' (A Girl and Death) سٹالن کو یہ کہانی اتنی اچھی لگی کہ اس پر خوش ہو کر ایک جملہ لکھ کر دستخط کر دیئے۔ جملہ یہ تھا:

''یہ کہانی گوئٹے کے ''فاؤسٹ'' سے کہیں زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں موت محبت کے ہاتھوں شکست کھا جاتی ہے۔''

یہ تعریف اپنی جگہ مگر سٹالن اور گورکی کے درمیان اب اختلافات پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے۔ یہ اختلافات سرد جنگ کی صورت اختیار کر گئے۔ اندر ہی اندر گورکی کو سٹالن سے خطرہ محسوس کرنے لگا اور گورکی کو غیر علانیہ طور پر ماسکو میں اس کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ 1934ء میں گورکی کا بیٹا فوت ہوا۔ جون 1936ء کو میکسم گورکی فوت ہوگیا۔ سٹالن اور مالوخوف نے اس کے جنازے کو کندھا دیا اور اس کے تابوت کو قبر میں اتارا۔ ایک عرصہ اس کی موت ایک معمہ بنی رہی۔ مشہور یہ ہے کہ اس کی موت ایک سرکاری آدمی کے ہاتھوں ہوئی جس کا تعلق ایک خفیہ سرکاری ایجنسی سے تھا۔ سٹالن حکومت کے پولیس چیف (Genrikh Yagoda) کو گورکی کی موت کا ذمے دار قرار دیا گیا تھا جس کی شہادت 1938ء

کے ایک مقدمے کی انکوائری سے ملتی ہے۔

میکسم گورکی کو انقلاب روس کا ایک زبردست کارکن، سپاہی قرار دیا جاتا ہے جس نے اپنی تحریروں سے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ ناول لکھے، شاعری کی، ڈرامے لکھے، سیاسی مضامین لکھے، انقلاب کی حمایت میں تقریریں کیں۔ پھر اپنے دوستوں سے اختلاف کیا۔ انقلاب کے بعد حکمرانوں کی غلط منصوبہ بندی کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے انجام کو پہنچا۔

گورکی نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، ڈرامے لکھے، شاعری کی، اشتراکی نظریات کے فروغ کے لیے مضامین لکھے، کہانیاں لکھیں اور ان کہانیوں میں روسی عوام کی زندگی کے دکھ بھرے مناظر کھینچے اور نظام کی تبدیلی کے لیے ذہنوں کو تیار کیا۔ گورکی مقصدیت پسند تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں اشتراکی نظریات کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس نے اپنی ہر تحریر میں ان نظریات کو ادبی رنگ دے کر پیش کیا۔ ماسکو تھیٹر میں ڈرامے کئے اور پھر اس کا جال پورے روس میں پھیلا دیا اور تھیٹر آرٹ سکول قائم کئے جب ڈراموں پر سنسر شپ لگا دی گئی تو اس نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ اس نے تقریباً بارہ ڈرامے لکھے جن میں سے:

1) The Lower Depths
2) Summer Folks
3) Barbarians
4) Enemies
5) Queer People
6) The Children of Sun

بہت مشہور ہیں۔

گورکی بہت اچھا شاعر بھی تھا اس کی شاعری کا ایک مجموعہ بھی ہے جس کا نام The Songs of Stormy Petrel ہے۔ کہانیوں کے ایک مجموعے کا نام ''26 آدمی اور ایک لڑکی'' ہے۔

میکسم گورکی کا سب سے مشہور ناول ماں ہے۔

میکسم گورکی کا یہ ناول عالمی شہرت رکھتا ہے اور دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ناول نگاری کی سو سالہ تاریخ میں اس ناول کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

ناول ''ماں'' انقلاب روس سے پہلے کے حالات، جدوجہد اور انقلاب میں عوامی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول انقلاب روس میں عورتوں کی جدوجہد کو Focus کرتا ہے۔ انقلاب سے پہلے روس جن معاشی حالات سے دوچار تھا، عوام کی زندگی جن دشواریوں سے دوچار تھی، زار حکومت میں اندھے قانون اور سوشل ناانصافیوں نے عوام کی زندگی کو کس طرح دوزخ بنا دیا تھا اور پھر وہ سب انقلاب اور تبدیلی لانے کے لیے کیسے کمربستہ ہوئے۔ یہ سب واقعات اس ناول کے پلاٹ میں شامل ہیں۔

ناول ''ماں'' روسی ادب میں ایک تبدیلی کا باعث بنا۔ انقلابِ روس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ لینن (Lenin) نے اس ناول کی اہمیت اور پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ ناول بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مزدور اور محنت کش جو بغیر سوچے سمجھے انقلاب لانے والے قافلے میں شامل ہوئے۔ یہ ناول پڑھ کر انہیں پتا چل جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔''

ناول ''ماں'' کا مرکزی کردار ناول کے ہیرو پافل (Pavel) کی بوڑھی، ان پڑھ ماں Pelagea Nilovna ہے جو

انقلاب کے فلسفے سے قطعی طور پر لاعلم ہے۔ وہ غربت میں پلی بڑھی مظلوم عورت ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت ہے جس کی زندگی تشدد اور ظلم سہتے ہوئے بسر ہوئی۔ اسے اپنے خاوند اور سماج کے ستم برداشت کئے ہیں۔ اسے اپنے بیٹے پافل سے بہت پیار ہے۔

پافل وہ نوجوان ہے جو اپنے باپ کی وفات کے بعد فیکٹری میں ملازم ہو جاتا ہے۔ فیکٹری میں لوگوں سے مل کر انقلابی ذہن رکھنے والے دوستوں سے بحث مباحثے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ صرف مزدور ہی ہیں جو نظام میں ایک تبدیلی لا سکتے ہیں۔ وہ سوشلسٹ دوستوں کے ساتھ مطالعاتی نشستوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے اس کے ذہن میں انقلاب جڑیں پکڑ لیتا ہے۔

پافل سوشلسٹ نظریات سے متاثر ہوتا ہے اور گھر کتابیں لانا شروع کرتا ہے۔ گھر میں پافل کے دوستوں کی مجلس جمنا شروع ہوتی ہے۔ پافل کی ماں پہلے پہلے تو بیٹے کے منہ سے نکلے الفاظ سمجھنے سے قاصر ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ باتیں اچھی لگنا شروع ہوتی ہیں جو پافل دوستوں سے کرتا ہے اور پھر بوڑھی ماں اپنے آپ کو ان جوان لڑکوں کا حصہ سمجھنا شروع کر دیتی ہے جو سوشلزم کا پرچار کر رہے ہیں اور انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

پافل کی ماں کے علاوہ اس ناول میں اور بھی کئی نسوانی کردار ہیں۔ ساشا (Sasha) لڈمیلا (Ludmilla) صوفیا (Sophia) اور نتاشا (Natasha) اپنے رشتے داروں اور گھر والوں کو چھوڑ کر انقلابیوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ نتاشا ایک امیر باپ کی بیٹی ہے، جو صاحبِ جائیداد ہے لیکن نتاشا انقلاب کے لیے سب کچھ ٹھکرا دیتی ہے۔ گورکی نے اس کردار کی بُنت اس طریقے سے کی ہے کہ وہ قارئین کا پسندیدہ کردار بن گیا ہے۔

ساشا کا کردار ایک لحاظ سے ہیروئین کا ہے۔ وہ پافل سے محبت کرتی ہے۔ جدوجہد کے دوران جیل جاتی ہے۔ جیل کا وارڈن اس سے ہتک آمیز رویہ اختیار کرتا ہے۔ ساشا بھوک ہڑتال کر دیتی ہے اور معافی نہ مانگنے تک ہڑتال جاری رکھتی ہے۔ آٹھ دن تک کچھ نہیں کھاتی۔ وارڈن معافی مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پافل کی ماں Pelagea Nilovana صرف پافل کی ماں نہیں اس کے دل میں سب کامریڈز کے لیے محبت ہے۔ اسے پافل کے ایک دوست (Andrei Nikhodka) سے بہت پیار ہے جو یوکرائن کا رہنے والا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے (Nenko) کہہ کر بلاتا ہے جو یوکرائن کی زبان میں ''ماں'' کو کہتے ہیں۔ پافل کی ماں کا غصہ اس وقت دیکھنے کے قابل ہے۔ جب فیکٹری کی انتظامیہ علاقے کی بہتری کے لیے ہر مزدور کی تنخواہ سے ایک (Kopek) کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔ پافل اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور ایک جلوس نکالنے کی تیاری کرتا ہے لیکن اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

پافل کی ماں کا اب ایک اور روپ سامنے آتا ہے۔ فیکٹری کے اندر سوشلزم کا لٹریچر لے جانے پر پابندی ہے۔ وہ اپنے کپڑوں میں چھپا کر پمفلٹ اندر لے جاتی ہے اور مزدوروں کو خبریں پہنچاتی ہے۔

یوم مئی کا واقعہ ناول میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پافل پر مقدمہ چلتا ہے۔ وہ عدالت میں جج کے سامنے زوردار تقریر کرتا ہے اور کہتا ہے:

''ہم اس نظام کے خلاف ہیں جس نظام کی حفاظت کے لیے تمہیں کرسی پر بٹھایا گیا ہے۔ تم روحانی طور پر اس نظام کے غلام ہو اور ہم جسمانی طور پر۔ ہمارے اور تمہارے درمیان نظام کی تبدیلی تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔''

اندر بیٹا تقریر کر رہا ہے اور باہر ماں کو لوگ بیٹے کی جرأت کی داد دے رہے ہیں۔

پافل کو سائبیریا جلاوطنی کی سزادی جاتی ہے۔ ماں لوگوں کے سامنے تقریر کرتی ہے اور کہتی ہے:

''اگر ہمارے بیٹے جو ہمارے دل کے ٹکڑے ہیں۔ نظام کی تبدیلی کے لیے جان دے سکتے ہیں تو ہم اپنی جانوں کی قربانی کیوں نہیں دے سکتے''۔

ناول کا یہ حصہ بہت جذباتی اور متاثر کن ہے۔ پافل کو سائبیریا روانہ کیا جانے والا ہے۔

ماں اس کی تقریر چھپوا کر لوگوں میں بانٹنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ چوری چھاپہ خانے میں جاتی ہے۔ پافل کی تقریر سائیکلوسٹائل کراتی ہے۔ اسٹیشن پر جاتی ہے اور لوگوں میں تقریر کے صفحات بانٹتی ہے۔ زارحکومت کے سپاہی اسے مارتے ہیں اس کے بال نوچتے ہیں، ٹھڈے مارتے ہیں وہ مار کھاتی رہتی ہے اور چلاتی رہتی ہے:

"Not Even an Ocean of Blood Can Drown The Truth"

میکسم گورکی کا یہ ناول نہ صرف روس کے ادب میں ایک سنگِ میل ثابت ہوا بلکہ عالمی ادب پر بھی اس نے بہت اثرات مرتب کیے۔ جرمنی کے مشہور ڈراما نگار بریخت (Brecht) نے میکس ناول ''ماں'' پر ایک خوبصورت ڈراما (Die Mutter) لکھا اور اسے سٹیج کیا۔ جب یہ ڈراما دکھایا جارہا تھا تو ہٹلر کے عروج کا زمانہ تھا۔ ڈرامے کے دوران نازی فوجیوں نے چھاپہ مارا اور اس ڈرامے کے مرکزی کردار کو گرفتار کر کے لے گئے۔ ناول نگاروں نے ''ماں'' کے کردار سے متاثر ہو کر مختلف زبانوں میں اس کردار سے ملتے جلتے کردار تشکیل دیئے مگر میکسم گورکی کی ''ماں'' جیسا شاہکار تخلیق نہ کر سکے۔

میکسم گورکی کے ناول کی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ جس طرح غالب کے خطوط نثر میں ایک جدید طرزِ اسلوب کے ساتھ ساتھ جنگِ آزادی اور زمانے کے بدلتے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان سے جنگِ آزادی کے حالات کی ایک چھوٹی موٹی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اسی طرح میکسم گورکی کی ''ماں'' ناول کی تاریخ میں ایک ادب پارہ ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابِ روس کی مکمل تاریخ بھی ہے۔ اشترا کی حقیقت نگاری کی ایک دستاویز بھی ہے......!
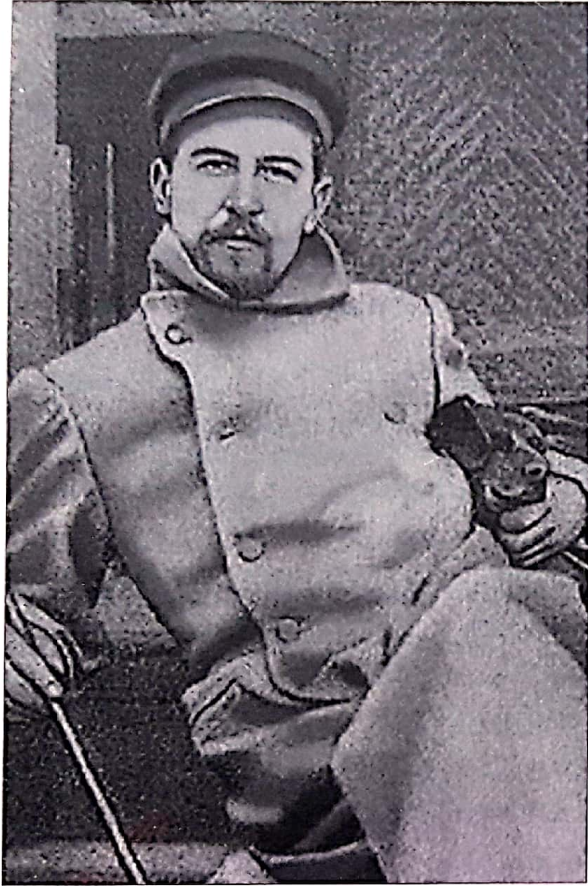
چیخوف

(Anton Chekhov)

چیخوف صرف روس کا نہیں دنیا کا عظیم کہانی کار اور ڈرامہ نویس ہے۔ اس کا شمار دنیا کے چند بڑے کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔ چیخوف نے روس میں جدید ڈرامے اور تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ چیخوف نے روس میں وہی کیا جو ابسن نے ناروے میں ڈرامے کے فروغ کے لیے کیا۔

چیخوف ادب میں ایک نیا انداز لے کر آیا۔

(جیمز جوائس)

....

کل شام جب میں نے یہ کہانی ختم کی تو میرا دم اس قدر گھٹنے لگا میں بے اختیار تھا اور باہر چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خود وارڈ نمبر 6 میں مقفل کر دیا گیا ہوں۔

(لینن)

....

ابھی چند دن پہلے میں نے آپ کا ڈرامہ ''چچا وانیا'' دیکھا۔ میں کوئی کمزور دل آدمی نہیں مگر میں عورتوں کی طرح رو پڑا۔

(گورکی)

....

ہمارا تھیٹر آپ کی ذہانت اور تخلیقات کا مقروض اور شکر گزار ہے۔ آپ کو یہ پورا استحقاق حاصل ہے کہ آپ یہ کہہ سکیں کہ جدید روسی تھیٹر آپ کی دین ہے۔

(سٹنسووسکی)

چیخوف

''اگر میرے پاس ڈھیر ساری دولت ہوتو میں معذور دیہاتی استادوں کے لیے ایک خوبصورت سینی ٹوریم تعمیر کروں۔ بڑا روشن اور ہوا دار سینی ٹوریم۔ جس میں بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے ہوں۔ ایک بہت خوبصورت لائبریری، جہاں انہیں زراعت اور دیو مالائی کہانیوں پر لیکچر دیئے جائیں۔ استادوں کو ہر شے کا علم ہونا چاہیے۔ تم میری ان افسانوی باتوں سے بور ہو رہے ہو لیکن مجھے یہ باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ روس کے دیہات کو ایسے استادوں کی ضرورت ہے جو باشعور ہوں۔ پڑھے لکھے ہوں۔ ہمیں اساتذہ کو ہر سہولت دینا چاہیے اور یہ جتنی جلدی ہو سکے کرنا چاہیے۔ ورنہ روس کچی اینٹوں سے بنے گھر کی طرح زمین پر گر جائے گا۔''

یہ گفتگو چیخوف نے میکسم گورکی سے اپنے گاؤں Koutchouk Koy میں اپنے ڈبل سٹوری گھر میں بیٹھ کر کی۔ میکسم گورکی چیخوف کی دعوت پر اس سے ملنے گیا تھا اور پھر اسی نے چیخوف کی موت پر یادوں کے نہایت خوبصورت پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ میکسم گورکی کا یہ طویل اور جاندار مضمون پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ چیخوف کو روس کا کتنا خیال تھا اور روس سے بڑھ کر ان لوگوں کی تکلیف کا کتنا احساس تھا جو روس میں ناگفتہ بہ زندگی گزار رہے تھے۔ خاص طور پر استاد جو علم بانٹتا ہے مگر خود اس کی زندگی قابل رحم ہے اس کا احساس سب سے زیادہ چیخوف کو تھا۔ اسی مضمون میں میکسم گورکی نے لکھا کہ چیخوف کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے استاد کی زندگی کے سارے دکھ اس نے خود جھیلے ہوں۔

''استاد بھوکا رہتا ہے، ظلم برداشت کرتا ہے۔ اسے ایک وقت کی روٹی کی فکر رہتی ہے۔ اس کا لباس بدتر ہے۔ سردی میں ٹھٹھرتا ہے اور پھر 30 سال کی عمر میں اسے (T.B) ہو جاتی ہے یہ اس آدمی کا حال ہے جو گاؤں گاؤں علم بانٹتا ہے۔ ہمیں شرم آنی چاہیے۔ جانتے ہو گورکی، جب میں کسی ایسے ٹیچر سے ملتا ہوں تو شرم سے میرا سر جھک جاتا ہے۔''

یوں تو ہر روسی ادیب نے زار حکومت کے اندھے اور ظالمانہ قوانین کے زیر تحت زندگی گزارنے والے لوگوں کے دکھ درد اور ان کی بدحالی کو کھلی آنکھ سے دیکھا اور اپنی کتابوں کا حصہ بنایا مگر چیخوف کا انداز کچھ اپنا ہی تھا۔ چیخوف یار باش آدمی تھا۔ جاننے والوں کا ایک ہجوم اس کے گرد اگرد جمع رہتا تھا۔ اس کے خطوط پر نظر ڈالیں (جو چار یا پانچ ہزار کے درمیان ہیں) تو ہر نوعیت کا کردار اس کے واقف کاروں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایکٹر، شاعر، اداکار، ڈاکٹر، جواری، شرابی، بچے، بوڑھے، نوجوان، اس کی ڈائری ناموں اور ان کے بارے میں چیخوف کی یادداشتوں سے بھری پڑی ہے۔ چیخوف نے مصروف زندگی گزاری۔ اسے گھر سجانے، اپنے باغیچے میں پھول لگانے، مریض دیکھنے، دوائیاں دینے، اخباروں میں مضامین اور افسانے لکھنے، پیسہ کمانے کا شوق تھا۔ شراب پینے کا شوق، دوستوں سے گپ شپ کا شوق، سیر سپاٹے کا شوق، انسانوں سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ اور پھر تھیٹر میں اس کی مصروفیت تھے۔ چیخوف نے اپنی مختصر زندگی میں یہ سب کچھ کیا اور ساری زندگی اپنی بیماری سے لڑتا رہا لیکن اس نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو فراموش نہیں کیا اور تخلیق کا ایسا دیا روشن کیا جس کی روشنی میں سب لکھنے والے چل رہے ہیں۔ اپنی موت سے چند ماہ پہلے اس نے اپنے دوست مصنف

(Ivan Bunin) سے کہا:

''لوگ شاید مجھے سات سال تک یاد رکھیں''

دوست نے کہا:

''سات سال کیوں؟''

''چلو سات نہیں تو ساڑھے سات سہی۔ یہ کافی ہے۔ میں شاید 60 سال اور زندہ رہوں''۔

چیخوف خود تو چند ماہ بعد دنیا سے چلا گیا مگر اس کا فن اس کی کہانیاں، اس کے ڈرامے، دوستوں سے اس کی گفتگو، بات چیت میں اس کا مزاج اور ظرافت اب تک قارئین کے ذہن میں محفوظ ہے۔ دنیا کی کونسی زبان ہے جس میں چیخوف کا ترجمہ نہیں ہوا۔ کون نقاد ہے، جس نے اس کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ بات درست ہے کہ ابتدا میں چیخوف نے پیسہ کمانے کے لیے دھڑا دھڑ کہانیاں لکھیں، مضامین اخباروں میں چھپوائے اور نقادوں نے اسے بُرا بھلا بھی کہا۔ لیکن جب اس کے فن نے انگڑائی لی تو نقادوں کے سر اس کے فن کے سامنے جھک گئے۔ چیخوف خود ہی اپنا نقاد تھا اور اپنی تحریروں کو دشمن کی نظر سے دیکھنے والا۔ اس نے نقادوں کو ساری زندگی اہمیت نہ دی۔ اس کے نزدیک نقاد وہ زہریلی مکھی ہے جو چلتے گھوڑے کو بار بار چھیڑتی ہے اور اس کے کام میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس نے خود کہا تھا کہ میری کہانیوں پر 25 سال سے تبصرے ہو رہے ہیں لیکن کسی نقاد نے کبھی کوئی کام کی بات نہیں کی۔ ان تبصرہ نگاروں میں میکسم گورکی بھی تھا جس نے اس کی کہانیوں پر کچھ کڑوی باتیں کی تھیں لیکن چیخوف کی موت پر گورکی نے جو مضمون لکھا اس میں گورکی نے نقادوں کے بارے میں چیخوف کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ چیخوف کو صرف ایک نقاد کی بات پسند آئی جس نے چیخوف کی شراب نوشی کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

''چیخوف شراب کے نشے میں دھت کسی نالے میں گر کر مر جائے گا۔''

چیخوف کا بچپن، بھاگ دوڑ، کام کاج اور باپ کی گالیاں اور مار کھانے میں گزرا۔ چیخوف کا دادا ایک زمیندار کا غلام تھا۔ کچھ پیسے جمع کر کے اس نے غلامی سے چھٹکارا حاصل کیا اور چیخوف کے باپ کو ایک پنساری کی دکان کھول دی۔ چیخوف کے باپ نے ایک کپڑا بیچنے والے بزاز کی بیٹی سے شادی کر لی۔ چیخوف نے اسی کے بطن سے جنم لیا۔ 6 بہن بھائیوں میں چیخوف کا تیسرا نمبر تھا۔ چیخوف کی پیدائش 29 جنوری 1860ء کو تگان روگ میں ہوئی۔ چیخوف کی ماں بہت ذہین عورت تھی۔ کہانیاں سنانے میں بڑی ماہر تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ کہانیاں اس نے باپ کے ساتھ سفر کے دوران مختلف مقامات میں پڑاؤ کے دوران سنی ہیں۔ چیخوف کا نانا گاؤں گاؤں جا کر کپڑا بیچنے کا کام کرتا تھا۔ چیخوف نے کہانی کہنے کا فن اپنی ماں سے سیکھا۔ چیخوف کہا کرتا تھا کہ میں نے ساری صلاحیتیں باپ اور روحانی طاقت ماں سے حاصل کی ہیں۔

چیخوف کا بچپن بڑا مصروف اور ہنگامہ خیز تھا۔ وہ دن بھر باپ کے ساتھ دکان پر کام کرتا، گاہکوں کو سودا سلف بیچتا۔ معمولی غلطی پر باپ سے گالیاں کھاتا اور پٹائی کی اذیت برداشت کرتا۔ چیخوف کی ماں اور باپ دونوں سُر تال سے واقف تھے۔ موسیقی کے دلدادہ، چنانچہ دکان سے فارغ ہو کر بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر موسیقی کا سبق اپنی ماں اور باپ سے حاصل کرتا۔ آواز سے آواز ملا کر مذہبی گیتوں کی مشق کرتا اور پھر بہن بھائی مل کر چرچ کی دعا میں یہ گیت گاتے تھے (موسیقی کی یہ تربیت جارج برنارڈ شا کے حصے میں بھی آئی تھی اور وہ بے دلی سے یہ کام کرتا تھا۔ جی۔ بی۔ شا کی والدہ نے

موسیقی کو بطور پروفیشن اختیار کیا لیکن چیخوف کی والدہ نے اسے اولاد کو سکھانے کی حد تک اختیار کیا۔ چیخوف اور جی۔ بی۔ شا نے موسیقی کے اس عنصر کو تھیٹر میں ڈراما لکھتے وقت شاید مفید پایا ہو۔ جی۔ بی۔ شا نے تو اس بات کا اقرار کیا ہے)۔ موسیقی کی مشق کے بعد چیخوف ڈراموں کے مکالمے بہن بھائیوں کو سناتا۔ نقلیں اتارنے میں وہ بڑا ماہر تھا۔ بہن بھائیوں کو ہنسانے کا فن اسے آتا تھا۔ لوگوں کی حرکات اور انداز اپنے اوپر طاری کر کے اور پھر بہن بھائیوں کے سامنے پیش کر کے وہ ڈرامے کا سماں پیدا کر دیتا تھا۔ باپ بہت غصے والا اور بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا آدمی تھا۔ اولاد اور بیوی پر وہ رُعب جھاڑتا رہتا تھا۔ چیخوف آگے چل کر اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ میرا باپ میری ماں کو قدم قدم پر احساس دلاتا رہتا تھا کہ وہ بے وقوف ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کھانے کی میز پر سب کچھ سلیقے سے رکھا ہوا ہوتا، کھانا ہر طریقے سے ٹھیک اور مزیدار ہوتا لیکن میرا باپ سوپ میں ڈھیر سارا نمک ڈال دیتا اور پھر میری ماں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ میری ماں بے وقوف ہے، اسے کوئی سلیقے کا کام کرنا نہیں آتا۔ اس کٹھن اور حبس زدہ ماحول میں چیخوف کی جگت بازی مزاحیہ انداز اور نقلیں اتارنے کا فن ہی تھا جو باپ کی غیر حاضری میں گھر والوں کو تھوڑی بہت ذہنی تسکین فراہم کرتا تھا (آنے والے دنوں میں جب چیخوف نے اخبارات میں مزاحیہ مضامین لکھے اور طنز و مزاح کے انداز میں اخبارات کے لیے کہانیاں لکھیں تو چیخوف کی یہ تربیت اور مشق بہت کام آئی)

چیخوف کے باپ کی پنساری اور شراب فروشی کی یہ دکان زیادہ دن نہ چلی، دکان بند ہو گئی، چیخوف کا باپ مقروض ہو گیا۔ چیخوف اس زمانے میں ماسکو میں طب پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے گھر والوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی فکر لاحق ہوئی۔ اس نے اخباروں میں ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین، کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ یہ کام صرف پیسے کمانے کے لیے تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے کچھ پیسے ہاتھ لگیں جس سے گھر کا چولہا جل سکے۔ اپنی کالج کی فیس اور گھر والوں کو خرچہ دینے کا یہی ذریعہ تھا۔ اس نے ابتدا میں کچھ تحریریں نام بدل کر لکھیں اپنا نام اس نے Antosha Chekhonte رکھا۔ اور Oskolki نامی اخبار میں مسلسل لکھنا شروع کر دیا برائے نام آمدنی شروع ہو گئی۔ یہ آمدنی کبھی کبھی ملتی بھی نہیں تھی اور ایڈیٹر عجیب و غریب طریقے سے ٹرخانے کا انداز اختیار کرتا تھا۔ ایک بار چیخوف نے اپنے بھائی میخائل کو ایک رسالے کے دفتر بھیجا تا کہ پیسے حاصل کر سکے اس رسالے میں چیخوف کا ناول قسط وار چھپتا تھا (یہ واقعہ چیخوف پر لکھی کتاب میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے لکھا ہے) میخائل ایڈیٹر کے دفتر چلا گیا اور تین گھنٹے سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہا۔ تین گھنٹے بعد ایڈیٹر نے پوچھا:

''آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

''میں چیخوف کا بھائی ہوں۔ تین روبل لینے آیا ہوں''

ایڈیٹر نے جواب دیا:

''میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ تھیٹر کا ٹکٹ چاہیے تو لے جاؤ۔ اگر نئی پتلون چاہیے تو فلاں درزی کے پاس چلے جاؤ۔ میرے حساب میں پتلون بنوالو''

1884ء میں چیخوف نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ اسے ڈاکٹری کا پیشہ بہت عزیز تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:

''ڈاکٹری میری قانونی بیوی ہے اور ادب میری محبوبہ''

اس محبوبہ نے چیخوف کو بہت کچھ دیا۔ دولت، شہرت اور مقبولیت۔ ڈاکٹری اس نے بے بس انسانوں اور غریب بیمار

لوگوں کے لیے وقف کر دی۔ کچھ نہ کمایا، ڈاکٹری سے اس کی ایک دمڑی کی آمدنی نہیں تھی۔ اس نے ساری عمر دور دراز علاقوں میں بسنے والے مریضوں کا مفت علاج کیا اور خود بھی خون تھوکنے لگا۔ اسے 1885ء میں تپ دق کی بیماری ہو گئی جس نے ساری عمر اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسی بیماری سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

1884ء میں چیخوف کی ملاقات پیٹرز برگ کے مشہور اخبار 'نیو ٹائم' کے امیر ترین ایڈیٹر اور مالک الیکسی سوورین سے ہوئی اور یہ ملاقات چیخوف کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ الیکسی سوورین روسی صحافت کا بہت اہم ترین نام تھا اور اس کا اخبار ''نیا زمانہ'' سیاست کا اہم رکن۔ الیکسی سوورین ایک دیہاتی کا بیٹا تھا۔ ایک عرصہ ماسٹر رہا پھر اخبار نکالا اور حکومت کی سرپرستی حاصل کر کے امیر ترین پبلشر، ایڈیٹر اور شخصیت بن گیا۔ اپنے عہد کے ادیبوں اور لکھنے والوں کو بنانے میں اس کا بہت ہاتھ تھا۔ چیخوف کو اس نے خط لکھ کر ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ چیخوف نے اس سے ملنے کا ذکر بہت ڈرامائی انداز میں کیا ہے۔ چیخوف بن سنور کر سوورین سے ملنے ''نیا زمانہ'' کے دفتر گیا۔

''سوورین نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔ نوجوان تم اچھے جا رہے ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ چرچ جانے میں کوتاہی نہ کرنا۔ آواز لگائی: لڑکے۔ ایک لڑکا آیا۔ اسے چائے اور شکر کے ٹکڑے لانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد سوورین نے مجھے رقم دی اور کہا کہ آدمی کو روپے کے معاملے میں محتاج رہنا چاہیے۔ اپنا پتلون کس لو۔''

(ترجمہ: ڈاکٹر ظ۔ انصاری)

چیخوف نے پتلون کس لی اور ''نیا زمانہ'' کے لیے لکھنا شروع کر دیا، سوورین سے چیخوف کی دوستی مرتے دم تک رہی۔ بے شمار پیسہ کمایا اور اخبار کے لیے بے تحاشا لکھا۔

''نیا زمانہ'' میں چیخوف نے اپنے اصل نام سے کہانیاں لکھنا شروع کیں اور اس کی کہانیوں کی واہ واہ ہونے لگی۔ اس عہد کے مشہور نقاد (دمتری گریگرووچ) نے اس کی کہانیاں پڑھ کر اسے خط لکھا:

''شاباش، تم میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ایسی صلاحیت جو تمہیں صفِ اول کے لکھنے والوں میں جگہ دلا سکتی ہے۔''

اور پھر چیخوف کو کم لکھنے کا مشورہ دیا اور سوچ سمجھ کر توجہ کے ساتھ کام کرنے کی تاکید کی۔ چیخوف نے دمتری کے مشورے پر عمل کیا اور اسے جواب میں لکھا:

''میں نے ہمیشہ اپنی کہانیاں یوں لکھی ہیں جیسے کوئی اخباری رپورٹر خبروں کے نوٹس تیار کر رہا ہو۔ میں نے نہ کبھی اپنی پرواہ کی اور نہ قاری کو دھیان میں رکھا۔''

اس کے بعد اس نے مسلسل دمتری کی نصیحتوں پر عمل کیا۔ دمتری اسے مشورے دیتا رہا۔ چیخوف نے لکھنے میں سنجیدگی دکھائی۔ 1887ء میں جب اس کی کہانیوں کا مجموعہ (A Dusk) چھپا تو اس کتاب پر اسے ''پشکن'' انعام دیا گیا اور روسی ادب میں ان کہانیوں کو امتیازی حیثیت کا حامل قرار دیا گیا۔

چیخوف نے اس عرصے میں (87-1884ء) بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ ''کلرک کی موت''، ''حمام میں''، ''البیون کی بیٹی''، ''عہدے کا امتحان'' بہت اہم کہانیاں ہیں۔ چٹکیوں میں یا ایک ہی نشست میں کہانیاں مکمل کرنے والا چیخوف اور سنجیدگی اور توجہ سے لکھنے لگا تھا۔ بقول اس کے نقاد ہرمیلوف ''اب چیخوف نوجوانی میں استاد کے سانچے میں ڈھل گیا تھا''۔

اب چیخوف نے مختلف رسائل اور اخبارات میں لکھنا بند کر دیا اور ''نیا زمانہ'' سے مسلسل رابطہ رکھا۔ افسانوں کے دو

مجموعے 1887ء میں چھپے اب اس کی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ گھر کے حالات بھی ٹھیک ہو گئے۔ چنانچہ چیخوف نے اب سفر پر جانے کا ارادہ کیا۔ اس میں اس کا ایک مقصد تو آب و ہوا کی تبدیلی تھی۔ دوسرے وہ مختلف علاقوں میں جا کر زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا وہ جنوبی روس کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ تاریخی مقامات پر گیا۔ قزاقوں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا۔ سٹیپی کے کھلے میدانوں میں قیام کیا۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں شمولیت کی اور پھر سٹیپی جیسا لافانی افسانہ لکھا۔ یوکرائن کے علاقے خارکوف میں ایک بنگلہ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرا اور پھر کرائمیا اور قفقاز کی طرف چلا گیا۔ سٹیمر پر سفر کیا اور ایک جزیرے میں چلا گیا۔ یالٹا کی بندرگاہ پر دن گزارے جہاں مچھیروں، ماہی گیروں اور سیاحوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آذربائیجان گیا، باکو میں دن گزارے اور وہ ماسکو واپس آ گیا۔ اس کا گھر ہوٹل بن گیا۔ ملنے والے دن رات اسی کے اردگرد بیٹھے رہتے۔ چیخوف خود تو کسی پارٹی میں جاتا نہ تھا لیکن اپنے گھر والوں کو بلا کر پارٹی کا اہتمام کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اس کی شہرت عروج پر تھی۔ آمدنی معقول تھی اور بیماری بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ باوجود بیماری اور نقاہت کے دوستوں کی محفل میں ہنستا رہتا تھا۔ چیخوف کا سب سے طویل تکلیف دہ اور چونکا دینے والا سفر سکھالین جزیرے کا سفر ہے جسے آپ سزا یافتہ افراد کی کالونی بھی کہہ سکتے ہیں۔ چیخوف اس جزیرے میں تین مہینے ٹھہرا اور تین مہینے اس نے ٹرین، دریائی سٹیمر اور گھوڑا گاڑیوں کے سفر میں گزارے۔ یہ سفر ایک بیمار آدمی کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو چیخوف نے اخبار والوں اور اپنی بہن کو لکھے۔ اس سفر کے دوران بیمار اور کمزور چیخوف نے بڑی جسمانی اور روحانی تکلیفیں برداشت کیں۔ شدید بارش کے موسم میں اسے کھلے آسمان کے نیچے وقت گزارنا پڑا۔ سمندری سفر میں کئی دل ہلا دینے والے مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے اور خون کے آنسو رو دیے۔ اسے وہ مناظر نہیں بھولتے جب کئی مردہ مسافروں کی لاشوں کو کھلے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ چیخوف کا کہنا ہے کہ میں نے زندگی کے ایسے روپ دیکھے جو کبھی کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہونگے اور جنہیں وہ لکھنے سے بے بس تھا۔ چیخوف بیمار اور ناتواں تھا مگر سزا یافتہ افراد کی اس کالونی میں اصلاحی جذبہ اسے لے گیا۔ وہ ان سیاسی اور اخلاقی مجرموں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرے تاکہ ان مجرموں کی زندگی میں کوئی سدھار اور تبدیلی آ سکے۔

چیخوف سکھالین جزیرے میں تین مہینے ٹھہرا اس نے گھر گھر جا کر لوگوں میں مردم شماری کے فارم بانٹے۔ ان کے حالات دریافت کیے اور ان کے جرائم کی تفصیل معلوم کی۔ قیدی عورتوں اور مردوں کے درمیان جنسی تعلقات کے بارے میں جانچ پڑتال کی۔ ہزار ہا ایسے بچوں کی فہرست تیار کی جو لاوارث تھے۔ جن کے باپ کے بارے میں پتا تھا نہ ماں کے بارے میں۔

''میں نے وہاں بھوک سے بلکتے بچے دیکھے۔ 13 برس کی بچیاں دیکھیں جو کھیل رہی تھیں اور 15 برس کی حاملہ عورتیں 16 برس کی بچیاں وہاں پیشہ کرنے لگی تھیں۔ نہ وہاں گرجا تھا، نہ سکول، ماحول اور جلاوطنی کے حالات انہیں اپنی راہ پر لگا لیتے ہیں۔''

تین ماہ وہاں رہ کر چیخوف واپس ماسکو آ گیا۔ اس نے ماسکو آ کر اخبارات اور رسائل میں سکھالین جزیرے کے دل ہلا دینے والے واقعات لکھے۔ اس نے اپنی بچی کھچی ساری توانائی سکھالین جزیرے کی رپورٹ بنانے میں صرف کر دی۔ دو سال میں یہ رپورٹ مکمل کی اور اس دوران صرف دو چار کہانیاں لکھیں۔ جن میں ''گھوڑا چور''، ''ڈوئل'' قابل ذکر ہیں۔ سکھالین رپورٹ پر چیخوف کو بہت ناز تھا۔ یہ ادبی نہیں سوشل اور رفاہی کام تھا جسے چیخوف نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو

بروئے کار لا کر ایک زندہ دستاویز بنا دیا ہے۔ بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ ''جزائر سکھالین''، ''وارڈ نمبر 6'' اور ''ڈوئل'' نے چیخوف کو ٹالسٹائی کے بعد روسی ادب کا سب سے بڑا ادیب بنا دیا ہے۔ ''جزائر سکھالین'' جب چھپی تو سارا روس اس کی گونج سے لرز گیا۔ یہاں تک کہ زارِ روس کو کمیشن بٹھانا پڑا کہ اس جزیرے کے معاملات پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔

بحیثیت افسانہ نگار عالمی ادب میں چیخوف ایک منفرد اور بڑا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں۔ اسے جدید افسانے کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے افسانے کو جدید اور نئے رنگ میں رنگا۔ بقول جیمز جوائس:

"He Brought Something new into Literature."

بقول پروفیسر محمد مجیب چیخوف نے مرد اور عورتوں کو نہ تو دیویاں بنا کر پیش کیا ہے نہ قابلِ نفرت۔ اس نے تو اپنے کرداروں کو بشری خوبیوں اور خامیوں کا پیکر بنا کر کہانیوں میں سمو دیا ہے۔

چیخوف کہانی لکھتے وقت نہ فیصلے دیتا ہے اور نہ نصیحت کرتا ہے۔ بس وہ جو دیکھتا ہے وہ لکھ دیتا ہے۔ فیصلہ قاری کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اس کا کام صرف وہ لکھنا ہے جو ہو رہا ہے۔ یا جیسا ہو رہا ہے۔ ارسطو نے یونانی ڈرامانویس یوری پیڈیز کے بارے میں کہا تھا کہ یوری پیڈیز زندگی کو ایسے دکھاتا ہے جیسی وہ ہے۔ وہ اسے ایسی نہیں دکھاتا جیسی اسے ہونا چاہیے۔ چیخوف بھی اپنی کہانیوں میں یہی انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ کرداروں میں اور واقعات میں چھپا وہ سچ ڈھونڈ نکالتا ہے جو شاید کسی دوسرے ادیب کے بس کی بات نہیں۔ اس کے اسی وصف نے اسے سب سے بڑا افسانہ نگار بنا دیا ہے۔ واقعات کو حقیقی شکل دینے اور سچ کو ڈھونڈنے میں وہ اس قدر آگے نکل جاتا ہے کہ قاری اس کی کہانی پڑھ کر لرز اٹھتا ہے۔

اس کی کہانی وارڈ نمبر 6 پڑھ کر لینن نے اپنی بہن کو خط لکھا تھا۔

''کل شام جب میں نے یہ کہانی پڑھ کر ختم کی تو میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ٹھہر سکا۔ بے اختیار اٹھا اور باہر نکل گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں خود وارڈ نمبر 6 میں مقفل کر دیا گیا ہوں۔''

بحیثیت ڈرامانویس چیخوف کا وہی مقام ہے جو مقام اس کا افسانہ نگاری میں ہے۔ اسے روسی تھیٹر کا انقلابی ڈرامانگار کہا جاتا ہے۔ اس نے کل پانچ ڈرامے لکھے اور ڈرامے کی تاریخ میں یکتا اور بے مثال ڈرامانگار کہلایا۔

1- ایوانوف۔
2- مرغابی
3- تین بہنیں
4- ماموں وانیاں
5- چیری باغ

جب پہلی بار اس کا ڈرامامرغابی (Seagull) پیٹرز برگ میں اسٹیج ہوا تو خاطر خواہ پذیرائی نہ ملی۔ چیخوف تماشائیوں کی سرد مہری دیکھ کر خود بھی ڈراما ہال سے باہر چلا گیا۔ لیکن جب دوبارہ اسی ڈرامے کی باقاعدہ ریہرسل کے بعد اسے ماسکو کے تھیٹر میں پیش کیا گیا تو تماشائیوں کا سیلاب آ گیا۔ اس نے ماسکو میں نیو تھیٹر کی بنیاد رکھی اور باقاعدہ ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے ''تین بہنیں''، ''چیری باغ'' اور ''چچاوانیا'' نے ڈرامے اور تھیٹر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ میکسم گورکی

نے ''چچاوانیا'' دیکھا تو چیخوف کو خط لکھا:

''ابھی چند دن پہلے میں نے آپ کا ڈراما 'چچاوانیا' دیکھا۔ میں کوئی کمزور دل آدمی نہیں، مگر عورتوں کی طرح رو پڑا۔''

جدید روسی تھیٹر کے بانی سٹینسوسکی نے ''تین بہنیں'' دیکھ کر چیخوف سے کہا:

''ہمارا تھیٹر آپ کی ذہانت اور عظیم تخلیقات کا مقروض اور شکر گزار ہے۔ آپ کو یہ پورا استحقاق حاصل ہے کہ آپ یہ کہہ سکیں کہ جدید روسی تھیٹر میری دین ہے۔''

چیخوف یوری پیڈیز کا پیروکار تھا۔ یوری پیڈیز کہا کرتا تھا:

"I Present on Stage what I See in Society."

چیخوف یوری پیڈیز کا ہم خیال تھا۔ وہ کہتا تھا:

میں لوگوں کو سٹیج پر ویسا ہی دکھاتا ہوں جیسے وہ زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہنستے گاتے اور روتے لوگ۔''

ڈرامامرغابی کی ہیروئن جرمن اداکارہ اولگا (Olga) تھی۔ ڈرامے کی ریہرسلیں چیخوف خود بھی کراتا تھا۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور چیخوف نے اولگا (Olga Knipper) سے شادی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے خط میں لکھا:

''اگر تمہاری خواہش ہے تو میں شادی کر لوں گا لیکن شادی کے بارے میں میری کچھ شرائط ہیں۔ میری بیوی ماسکو میں رہے گی اور میں گاؤں میں۔ میں ماسکو آ کر اسے مل لیا کروں گا۔ مجھے ایک بیوی چاہیے جو چاند کی طرح آسمان پر روز نظر نہ آئے۔''

چنانچہ شادی کے بعد ایسا ہی کیا گیا۔ اولگا ماسکو میں رہنے لگی تاکہ ڈراموں میں کام کرتی رہے اور چیخوف زیادہ تر یالٹا (Yalta) میں رہا لیکن چیخوف کی موت اولگا کی بانہوں میں ہوئی۔ 1904ء میں جب چیخوف شدید بیمار ہو گیا تو اولگا اسے لے کر بیڈن ویلیئر (جرمنی) لے گئی۔ وہاں 15 جولائی 1904ء کو چیخوف فوت ہو گیا۔

1908ء میں اولگا نے ایک مضمون لکھا جس میں اس نے چیخوف کے ساتھ گزارے وقت کو مضمون کا حصہ بنایا ہے۔ چیخوف کے آخری لمحوں کا وہ یوں ذکر کرتی ہے:

''آخری وقت میں چیخوف سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چلانے لگا۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگا کر اسے خاموش کیا اور شمپین کا گلاس بھر کر چیخوف کو دیا۔ چیخوف اسے فوراً پی گیا اور پھر بائیں طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب گئی لیکن وہ خاموش تھا۔ اس کی سانسیں رُک گئی تھیں۔ وہ معصوم بچے کی طرح ابدی نیند سو رہا تھا۔''

یہ تھا دنیا کے منفرد اور بڑے کہانی نویس اور ڈرامانگار کا انجام جس کے بارے میں ٹالسٹائی نے گورکی سے کہا تھا:

''دیکھو کس قدر پیارا اور لاجواب آدمی ہے چیخوف۔ با اخلاق، انکسار پسند، خاموش طبع، بالکل نواب۔ چلتا بھی ہے تو جوانوں کی طرح۔ کمال کا شخص ہے چیخوف۔''

سروانٹیز

(Miguel de Cervantes)

جدید ناول کا سنگِ بنیاد رکھنے کا سہرا اسپین کے سروانٹیز کے سر ہے۔ 16 ویں صدی کے اس ناول نگار کے اثر سے دوستویفسکی اور ہنری فیلڈنگ بھی نہیں بچ سکے۔ ''ڈان کہوٹے'' نے دنیا کے تمام ناول نگاروں کو متاثر کیا۔ سروانٹیز کا اسلوب منفرد تھا۔ جس کو آج تک کوئی ناول نگار نہ اپنا سکا لیکن متاثر ضرور ہوا۔

قلم روح کی زبان ہے اور میں لوگوں کی روحوں کے قصے اس زبان میں بیان کرتا ہوں۔

(سروانٹیز)

....

''ڈان کہوٹے'' نے دنیا کے ہر بڑے لکھنے والے کو متاثر کیا اور اپنا اثر چھوڑا اور سروانٹیز کا اسلوب ان میں رچ بس گیا۔

(پکاسو)

....

یہ دنیا پل میں ختم ہو جائے اگر اس کا ہر فرد ڈان کہوٹے بن جائے لیکن اگر اس میں ڈان کہوٹے نہ ہو پھر بھی یہ دنیا پل میں ختم ہو جائے۔

(ایک فرانسیسی نقاد)

....

سروانٹیز اپنے عہد کے مقبول ناول کی پیروڈی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ کام کیا اور اس کا ناول جدید ناول نگاری کا سنگ میل بن گیا۔

(ایم۔ایس۔سمتھ)

سروانٹیز

عالمی ادب میں ایک ناول ایسا بھی ہے کہ چار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کی شہرت، مقبولیت اور پسندیدگی کا گراف وہی ہے جو چار صدیاں پہلے تھا۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو اور قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ نہ لیا ہو۔ جدید ناول ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے اور کچھ نقاد تو یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے ناول کا سہرا بھی اسی کے سر پر سجا ہوا ہے۔ عالم گیر مقبولیت حاصل کرنے والے اس ناول کا نام ڈان کہوٹے (Don Quixote) ہے اور سپینش زبان کا مشہور شاعر، ڈرامہ نویس سروانٹیز (Cervantes) اس کا مصنف ہے۔ سروانٹیز اپنے ناول Exemplary Novels کے دیباچے میں اپنا حلیہ کچھ یوں بیان کرتا ہے۔ (اس کی تصویر کتاب میں چھپی تھی)

''یہ آدمی جسے آپ دیکھ رہے ہیں، جس کا بیضوی چہرہ، بھورے بال، چوڑا ماتھا، چمکدار آنکھیں، ستواں ناک، چاندی سی داڑھی جو 20 سال پہلے سنہری تھی، لمبی مونچھیں، چھوٹا دہانہ، دانت نہ ہونے کے برابر صرف چھ رہ گئے ہیں۔ یہ آدمی ہے جس نے Galatea اور ڈان کہوٹے یعنی Mancha کا آدمی لکھی ہے۔ اس لکھنے والے کا نام سروانٹیز ہے''۔

سروانٹیز 1547ء میں میڈرڈ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی ہر بڑے ادیب کی طرح جہاں گردی میں گزری۔ سکول کالج کا منہ نہ دیکھا، بس لکھنا شروع کر دیا۔ اٹلی جا کر فوج میں نام لکھوا دیا۔ ترکوں کے خلاف جنگ لڑی۔ توپ کے تین گولے بائیں ہاتھ پر گرے۔ ہاتھ بیکار ہو گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو گھر کی طرف جہاز پر سفر شروع کیا ہی تھا کہ بحری قزاقوں نے جہاز پر حملہ کر دیا۔ اسے اور اس کے بھائی کو الجیریا لے جا کر بیچ دیا۔ جہاں وہ پانچ سال غلام بن کر رہا۔ تین بار زنجیریں توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ہر بار پکڑا گیا۔ پادریوں کی سفارش سے سروانٹیز کو غلامی سے رہائی ملی۔ سروانٹیز نے 5 سال کے اس عرصے میں جو ظلم برداشت کیے وہ سب اس کی آنے والی تحریروں میں بڑے خوبصورت انداز میں ملتے ہیں۔

سپین واپس آ کر اس نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ باقاعدہ شروع کیا اور اپنے عہد کی مقبول طرز میں ناول لکھنا شروع کر دیئے۔ 1585ء میں اس کا ناول La.Galatea چھپا جو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ یہ ناول چرواہوں کی زندگی کے بارے میں ہے۔ اس ناول میں کرداروں کے ذریعے سروانٹیز نے چرواہوں کی روزمرہ زندگی، محبت اور محبت سے پیدا ہونے والی صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ اس ناول کی اشاعت سے اسے اتنے پیسے تو نہ ملے لیکن ادبی دنیا میں اس کی شہرت کا گراف بلند ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت کے بعد اس نے تاریخی واقعات پر مبنی دو المیہ ڈرامے لکھے جن کے نام The Siege of Numantia اور The Trafic of Algeria ہیں۔

جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ ادبی اور تخلیقی کام کر کے گھر کی دال روٹی نہیں چل سکتی۔ اس کی زندگی میں اب دو افراد مزید بھی آ گئے تھے جن کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی یعنی اس کی ناجائز بیٹی ازابیل اور اس کی بیوی کیٹیلینا۔ چنانچہ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے چھوٹی موٹی نوکریوں کا سہارا لیا۔ اسی دوران کیٹیلینا نے اس سے طلاق لے لی لیکن اپنی وصیت میں یہ لکھ دیا کہ میں طلاق تو لے رہی ہوں لیکن جب مر جاؤں تو مجھے سروانٹیز کے پہلو میں دفن کیا

جائے۔ یہ دریا عبور کرنے کے بعد ایک اور دریا اس کا منتظر تھا جس کے کنارے خوش بختی اور بدبختی دونوں اس کی منتظر تھیں۔

سروانٹیز کی ادبی حیثیت کو دیکھ کر اسے ٹیکس وصولی کی ایک اچھی نوکری دے دی گئی۔ کام یہ تھا کہ اسے مختلف شہروں میں جا کر لوگوں سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا تھا۔ شاعر، ناول نگار اور ڈراما نویس سروانٹیز کے لیے یہ کام ذرا مشکل تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ یہ کام کرتا رہا پھر اچانک اسے ٹیکس میں بے ایمانی کرنے کے ایک مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس میں اس کا قصور بالکل نہ تھا لیکن جھوٹے گواہوں کی گواہی پر اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے 5 سال جیل میں گزارنے پڑے اور یہی بدبختی اس کے لیے خوش قسمتی کا پیغام لے کر آئی۔ سروانٹیز نے غلامی اور سمندری ڈاکوؤں کی قید میں بُرے حالات کا سامنا کرنا سیکھا تھا۔ پہلے وہ غیروں کی قید میں تھا اب اپنوں کے ستم برداشت کر رہا تھا چنانچہ جیل میں رہ کر اس نے کچھ تعمیری اور تخلیقی کام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہاں اس نے ایک ناول لکھنے کی منصوبہ بندی کی اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔ ایک ایسا ناول (Don Quixote) جس نے اسے عالم گیر شہرت بخشی جو چار صدیوں سے دنیائے ادب پر حکمرانی کر رہا ہے۔

مزاحیہ فینٹسی پر مبنی یہ ناول 1605ء میں چھپا۔ ناول نویسی کی تاریخ میں اسے ایک بنیادی سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے دنیا کے بڑے بڑے لکھنے والوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ناول سے اثر قبول کرنے والوں میں دو بڑے نام ہنری فیلڈنگ اور مشہور روسی مصنف دوستوئیفسکی بھی ہیں۔ ہنری فیلڈنگ کا مشہور ناول جوزف اینڈریو سروانٹیز کے ناول کی طرز پر لکھا ہوا ناول ہے۔ دوستوئیفسکی کا ناول The Idiot بھی سروانٹیز کے اثر سے نہ بچ سکا۔ اس ناول میں پرنس کا کردار اور اس کا نفسیاتی رویہ سارے کا سارا ڈان کہوٹے سے ملتا جلتا ہے۔

مشہور مصور پکاسو نے ڈان کہوٹے کے دو لافانی کرداروں ڈان کہوٹے اور سانچو پانزا (Sancho Panza) پر تصویروں کی ایک سیریز بنائی اور ان کی مقبولیت کا اعتراف کیا۔ نقادوں کا خیال ہے کہ ''ڈان کہوٹے نے دنیا کے ہر بڑے لکھنے والے کو متاثر کیا اور اپنا اثر چھوڑا۔ سروانٹیز کا (Duixotic) اسلوب ان میں رچ بس گیا''۔

اردو زبان بھی اس کے سحر سے نہ بچ سکی، ''فسانہ آزاد'' کے خالق رتن ناتھ سرشار نے ڈان کہوٹے کا ترجمہ ''خدائی فوجدار'' کی صورت میں کیا۔ ان کی لافانی تصنیف ''فسانہ آزاد'' کے دو کردار ''آزاد اور خوجی'' سروانٹیز کے ڈان کہوٹے اور سانچو پانزا کے پیچھے پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک ''خدائی فوجدار'' کا تعلق ہے تو یہ ترجمہ اصل سے بہت دور نظر آتا ہے۔ اس ترجمے میں سرشار نے اپنا رنگ اور انداز شامل کر کے اس میں ایک خاص بات پیدا کر دی ہے جو اس کا حسن ہے۔ اگر آپ اسے سروانٹیز کے ناول کا ترجمہ سمجھ کر پڑھیں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ محمد حسن عسکری صاحب نے ایک بار اس ترجمے کے بارے میں کہا تھا کہ اگر میں ڈان کہوٹے کا ترجمہ کرتا تو شاید سرشار سے اچھا ترجمہ کر لیتا مگر میں اس میں وہ خاص انداز اور حسن پیدا نہ کر سکتا جو رتن ناتھ سرشار نے ''خدائی فوجدار'' میں بھر دیا ہے۔

سروانٹیز کا عہد ایک اور بڑی ادبی شخصیت کا عہد بھی ہے اور وہ بڑی شخصیت شیکسپیئر کی تھی۔ دونوں کی شہرت عالم گیر ہے۔ دونوں نے دنیا کو اپنے اسلوب اور انداز سے متاثر کیا۔ دونوں ایک ہی سال ایک ہی تاریخ کو فوت ہوئے دونوں کا سن وفات 1616ء اور تاریخ وفات 23 اپریل ہے۔ شیکسپیئر کے آخری ایام بڑی خوشحالی میں گزرے اور اسے بڑے پرسکون حالات میں موت آئی مگر سروانٹیز کے آخری ایام بہت تنگدستی اور غربت میں گزرے۔

سروانٹیز کے آخری ایام میں کاؤنٹ آف لیموس نے سرپرستی کی۔ وظیفہ مقرر کر دیا اور سیولی (Seville) کے آرچ بشپ نے سہارا دیا۔ اس کی ناجائز بیٹی کی بے ہودہ حرکات اور مقدمات نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی اور وہ پریشان رہنے لگا۔ لکھنے کی طرف خیال ہوا، ڈان کہوٹے کا دوسرا حصہ لکھنے کی طرف توجہ دی۔ اس دوران ایک جعلی مصنف نے اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی اور ڈان کہوٹے کا دوسرا حصہ اپنی طرف سے لکھ کر چھاپ دیا اور دیباچے میں سروانٹیز پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ جعلی مصنف کی کتاب کو لوگوں نے دیکھا لیکن پسند نہ کیا بقول شخصے:

''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''

سروانٹیز کے ناول کی دوسری جلد 1615ء میں شائع ہوئی، جسے پسند کیا گیا۔ اس حصے میں مصنف کی زیادہ توجہ سانچو پانزا پر ہے کیونکہ اب وہ اپنے آپ کو ڈان کہوٹے کا مقرر کیا ہوا گورنر سمجھتا ہے اور مہمات سر کرنے نکلتا ہے۔

ڈان کہوٹے کے دوسرے حصے کے ساتھ سروانٹیز نے کہانیوں پر مبنی ایک مجموعہ بھی شائع کیا جس میں 12 رومانوی کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب اس کی وفات سے چند دن پہلے شائع ہوئی۔ ان کہانیوں میں کچھ کہانیاں اپنی ہیئت اور مواد کے لحاظ سے بڑی انقلابی سمجھی جاتی ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اس نے طنزیہ سانیٹ بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ یہ اس نے فلپ II کی وفات پر 1598ء میں لکھے تھے۔

سپینش زبان پر سروانٹیز کے بڑے احسانات ہیں۔ اس نے اپنی شاعری (اگرچہ وہ درمیانے درجے کا شاعر تھا) ڈراموں اور ناولوں سے سپین کے ادب کو نیا ذائقہ اور اسلوب بخشا، عام فہم اور روزمرہ بولی جانے والی زبان کو اپنے ناولوں میں استعمال کیا اور وہ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ اپنی زبان کو Spanish Language نہیں کہتے تھے، سروانٹیز کی زبان کہتے تھے۔ اسے قارئین اور نقادوں نے The Prince of Wits کا خطاب دیا تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں اسپین کی زندگی اور لوگوں کو اس طرح استعمال کیا کہ نقاد Carlos Fuentes کو یہ کہنا پڑا کہ:

''سروانٹیز لوگوں کے سامنے کتاب کے صفحات کھول کر رکھ دیتا ہے اور اس میں پڑھنے والے اپنے آپ کو دیکھ لیتے ہیں''

سروانٹیز خود بھی کہتا تھا:

''قلم روح کی زبان ہے اور میں لوگوں کی روحوں کے قصے اس زبان میں بیان کرتا ہوں۔''

سروانٹیز نے اپنے ہمعصروں کی لڑائی میں کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ کسی گروپ میں شامل نہیں ہوا۔ سب کی تعریف کی اور اپنا کام کیا۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے۔ ہم عصروں کو کم جانا جاتا ہے۔ 23/اپریل 1616ء میں وہ میڈرڈ میں فوت ہو گیا۔ اسے بہت اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔

سروانٹیز دراصل اپنے عہد کے مقبول ترین ناول کی ایک مزاحیہ اور طنزیہ پیروڈی کرنا چاہتا تھا۔ جنگ و جدل، بہادری اور شجاعت سے بھرپور رومانوی ناولوں کی پیروڈی۔ اس نے یہ کام کیا اور اس کا یہ ناول جدید ناول نگاری کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ ناول کا ہیرو ڈان کہوٹے پریشان رومانویت کا استعارہ بن گیا اور ناموافق حالات کے سامنے اس کی معصومیت، احمقانہ حرکات کی ایک نہ چلی۔ وہ حقائق کو جانے بغیر اپنی خیالی دنیا میں گھومتا پھرتا رہا اور اس کا سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک فرانسیسی نقاد کا کہنا ہے:

''یہ دنیا پل میں ختم ہو جائے اگر اس کا ہر فرد ڈان کہوٹے بن جائے لیکن اگر اس میں ڈان کہوٹے موجود نہ ہو پھر بھی یہ

دنیا پل میں ختم ہو جائے۔''

روسی ناول نگار دوستو یفسکی کا کہنا ہے کہ یہ ناول انسانی فکر کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سروانٹیز نے یہ ناول لکھنے کا منصوبہ جیل میں بنایا اور بقول اس کے:

''خیال یہ تھا کہ سپین کے لوگوں کی حقیقی زندگی اور ان کی عادات و خصائل کو اس ناول میں روزمرہ کی زبان میں پیش کیا جائے اور ناول نگاری کے اس اسلوب اور انداز کی پیروڈی پیش کی جائے جو ایک صدی سے سپین میں رائج ہے۔''

چنانچہ پہلے حصے میں سروانٹیز کا پختہ اسلوب، مکالموں پر اس کی گرفت، زور بیان اور واقعات کی بنت بہت زوردار ہے۔ پن چکیوں اور بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ۔ نائی کی دکان پر سرائے کے اندر کے مناظر بہت دلچسپ ہیں۔ لیکن شاید سروانٹیز کو اپنی کچھ کمزوریوں کا احساس بھی تھا۔ اسی لیے اس نے دوسرے حصے کے دیباچے میں بار بار پہلے حصے میں کی گئی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ دوسرے حصے میں مزاحیہ واقعات کی بنت قدرے کمزور ہے لیکن عمل اور اسلوب پر سروانٹیز کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔

ڈان کہوٹے کے کردار کے ساتھ سروانٹیز کی ہمدردیاں بہت زیادہ ہیں۔ سروانٹیز نے اس کی تشکیل میں بہت مہارت سے کام لیا ہے۔ وہ اسے ایک معصوم اور ایسا کردار سمجھتا ہے، جس میں نیکی اور اچھائی موجود ہے۔ وہ دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا پاگل پن اور بے وقوفی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

آیئے اس ناول کا خلاصہ دیکھیں۔

(Alonso Quijano) ایک پختہ عمر کا نہایت معصوم آدمی ہے جو کوئی کام نہیں کرتا۔ بس گھر میں بیٹھا شجاعت، بہادری اور جنگ و جدل کے رومانوی ناول پڑھتا رہتا ہے۔ گاؤں میں اس نے بہت سے لوگوں کا قرض ادا کرنا ہے۔ وہ کتابوں کے سحر میں اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ اس کا حقیقی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ وہ خیالات میں ڈوبا رہتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ کیوں نہ وہ بھی کسی ملک پر حملہ کر کے بادشاہ بن جائے۔ یہ خیال اسے بے وقوفی کی حد تک اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ وہ پختہ ارادہ کر لیتا ہے کہ وہ کسی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوگا۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ فوجی سردار کے پاس ایک گھوڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ گاؤں کا مریل، کمزور اور نحیف سا گھوڑا حاصل کرتا ہے۔ گھر میں ایک زنگ آلود تلوار اور ڈھال پڑی تھی اسے صاف کرتا ہے اور ایک نیزے کا انتظام کرتا ہے۔ کتابوں میں اس نے پڑھا تھا کہ ہر فوجی سردار کا ایک معاون بھی ہوتا ہے۔ اچانک اسے گاؤں کے چوکیدار کا خیال آتا ہے جس کا نام سانچو پانزا ہے اسے وہ مہم پر چلنے کے لیے راضی کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ جوں ہی وہ کوئی ملک فتح کرے گا اسے گورنر بنا دے گا۔ پھر اپنا نام بدلتا ہے اور ڈان کہوٹے رکھ لیتا ہے۔ مہم پر روانگی کے لیے وہ رات کا وقت مقرر کرتا ہے۔ دن میں اس لیے روانہ نہیں ہوتا کہ کہیں قرض لینے والے اسے پکڑ نہ لیں۔ سانچو پانزا کے لیے گھوڑے کا انتظام نہیں ہو سکتا اس لیے گاؤں کا ایک گدھا چرا لیا جاتا ہے۔ ڈان کہوٹے اپنے مریل گھوڑے پر بیٹھ کر مہم پر روانہ ہوتا ہے۔ مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اچانک خیال آتا ہے کہ ہر سردار کی ایک محبوبہ بھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس کی نظر گاؤں کی بدصورت لڑکی الڈونزا (Aldonza) پر جاتی ہے۔ اسے یہ نام پسند نہیں چنانچہ وہ اس کا ایک جاہ و جلال اور شاہی وقار والا نام (Dilcinea) رکھتا ہے اور اس سے وعدہ کرتا ہے کہ جوں ہی وہ پہلا ملک فتح کرے گا اسے ملکہ بنا دے گا کیونکہ بقول ڈان کہوٹے وہ اس دنیا سے ہر برائی کو ختم کرنے جا رہا ہے اور خدا اسے جلد ہی اس نیک کام کا صلہ دے گا۔

ڈان کہوٹے اپنے مریل گھوڑے پر اور اس کا معاون سپہ سالار گدھے پر جا رہے ہیں۔ گھوڑا اور گدھا دونوں لڑکھڑا کر چل رہے ہیں مگر دونوں کے چہروں پر ایک وقار اور فاتح کا سا جذبہ ہے۔ وہ صبح کے وقت ایک ایسے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں تیس چالیس ہوائی چکیاں نظر آتی ہیں۔ ڈان کہوٹے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور سانچو پانزا سے کہتا ہے:

''مبارک ہو سانچو پانزا۔ خوش قسمتی وقت سے پہلے ہمیں ہماری محنت کا پھل دے رہی ہے۔ دیکھو ہمارے سامنے تیس چالیس جن کھڑے ہیں۔ میں ان سے مقابلہ کر کے انہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ خدا ہمیں اس نیک کام کا معاوضہ ضرور دے گا کیونکہ برائیوں کو اس زمین سے ختم کرنا نیکی ہے۔''

سانچو پانزا جو اپنے آقا جتنا بے وقوف نہیں تھا حیران ہو کر کہتا ہے:

''آقا کون سے جن؟''

''وہ سامنے جن کے ہاتھ کئی کئی میل لمبے ہیں'' ڈان کہوٹے نے جواب دیا۔

''میرے آقا سمجھ سے کام لیں'' سانچو پانزا نے کہا:

''جنہیں آپ جن سمجھ رہے ہیں یہ جن نہیں ہوائی چکیاں ہیں اور یہ بازو ان چکیوں کے پنکھے ہیں جو ہوا کے ساتھ ہلتے ہیں تو چکیاں چلتی ہیں۔''

ڈان کہوٹے نے بڑے اعتماد سے کہا:

''ظاہر ہو گیا کہ تمہیں کوئی جنگی تجربہ نہیں۔ بے وقوف آدمی یہ پن چکیاں نہیں جن ہیں۔ اگر تم خوفزدہ ہو تو پیچھے جا کر دعا مانگو اور عبادت کرو میں ان بدروحوں کو جا کر مزہ چکھاتا ہوں''

یہ کہہ کر ڈان کہوٹے نے گھوڑا آگے بڑھایا سانچو پانزا روکتا رہا، چلاتا رہا، خبردار کرتا رہا مگر ڈان کہوٹے نے نیزہ بلند کر کے ہوائی چکیوں پر حملہ کر دیا۔ ہوا تیز تھی چکیوں کے پنکھوں نے ڈان کہوٹے کو گھوڑے سمیت اٹھا کر پھینک دیا۔ نیزہ ٹوٹ گیا، ڈان کہوٹے سے زیادہ گھوڑا زخمی ہوا۔ دونوں زمین پر زخمی پڑے تھے۔

سانچو پانزا اپنے گدھے کو تیزی سے آگے بڑھا کر اپنے آقا کے پاس جا کر رکتا ہے۔ اسے سنبھالتا اور کہتا ہے:

''میں نے آپ کو سمجھایا تھا جہاں پناہ، یہ جن نہیں ہوائی چکیاں ہیں۔ مگر آپ نے میری بات نہیں مانی''۔

ڈان کہوٹے زخموں کی تکلیف کے باوجود مسکرا کر کہتا ہے:

''ایسی بات نہیں سانچو پانزا۔ یہ جنگ کی چالیں ہیں۔ وہی بلا جس نے تیرا گھر اور میری کتابیں برباد کی ہیں اسی بلا نے ان جنوں کو ہوائی چکیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، یہ بلائیں اور برائیاں میری تلوار سے نہیں بچ سکتیں''۔

''خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔'' سانچو پانزا نے اپنے آقا کو سہارا دے کر اٹھایا جس کے دونوں کاندھوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ سانچو پانزا اپنے آقا کو واپس گاؤں لے کر جاتا ہے۔ آقا کی خیالی دنیا اسی طرح آباد ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں سے چند افراد کو ڈیوک اور نائٹ (Knight) سمجھ کر لڑائی لڑتا ہے۔ اور زخمی ہوتا ہے۔ اس کی آخری لڑائی (Moon Knight) سے ہوتی ہے جو اس کا پڑوسی ہے اس جنگ میں وہ شدید زخمی ہوتا ہے۔ بیمار پڑ جاتا ہے۔ پاگل پن اور بے وقوفی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور اسی جنون اور بیماری میں وہ مر جاتا ہے اس کا معاون گورنر سانچو پانزا اس کی تیمارداری کرتا ہے اور سارا وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتا ہے۔

ڈان کہوٹے کو ایک عرصہ ایک (Farce) کی حیثیت سے دیکھا گیا لیکن اٹھارویں صدی میں نقادوں نے اسے ان لوگوں پر ایک بھرپور طنز قرار دیا جو حقیقی دنیا سے نظریں چرا کر خیالی دنیا میں رہنے کے عادی ہیں۔ جو زندگی کو سنجیدہ انداز میں گزارنے سے نظریں چراتے ہیں لیکن رومان پسند ڈان کہوٹے کے کردار کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں وہ ڈان کہوٹے کو ایک ''عقل مند بیوقوف'' اور ''مقدس پاگل'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

''ڈان کہوٹے'' سروانٹیز کے ماحول اور سپین کی سماجی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ سپین کے لوگوں کی ایک تمثیل ہے۔ سروانٹیز نے اپنے عہد میں سانس لینے والے لوگوں کی حماقتوں، بے وقوفیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی زندگی کے دونوں رُخ پیش کیے ہیں۔ جن میں محبت، ہمدردی ہے اور حماقتیں اور بے وقوفیاں بھی ہیں۔ جہاں تک سروانٹیز کے اسلوب کا تعلق اور ناول کی تکنیک کا تعلق ہے ان میں کوئی ابہام اور الجھن نہیں۔ بقول M. Seymour-Smith

"None of Technical Problems that Trouble Modern Writers is Absent from it"

نقادوں کے نزدیک ''ڈان کہوٹے'' جتنا بڑا ناول ہے۔ اس کا مصنف اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔

ڈان کہوٹے کی بنت اور ماحول میں ایک بڑی عجیب بات ہے اور وہ یہ کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے مصنفین کے ہاں ان کی اپنی زندگی اور (Life Style) کی جھلک ان کے کرداروں یا واقعات میں ضرور مل جاتی ہے۔ ٹالسٹائی، ڈکنز، دوستو یفسکی کی ناولیں پڑھ لیں ان کے کردار یا زندگی کے واقعات کی جھلک ضرور مل جاتی ہے لیکن ڈان کہوٹے میں سروانٹیز نے اپنی مہم جو زندگی کا کوئی واقعہ یا اپنے کردار کی کوئی شبیہہ اس ناول کے کرداروں پر نہیں پڑنے دی۔ سروانٹیز خود بہت حقیقت پسند، مہم جو، جنگجو، باعمل اور سمجھداری سے مشکلات کا سامنا کرنے والا آدمی تھا (سوائے الجیریا سے تین بار فرار ہونے کی ناکام کوششوں کے) اس نے جنگ کے میدان، ڈاکوؤں سے مقابلے اور غلامی کے دوران بہت ثابت قدمی سے وقت گزارا۔ لیکن ''ڈان کہوٹے'' کے دو مرکزی کردار اس کے مقابلے میں اتنے ہی بے وقوف اور احمق تھے۔ سروانٹیز حقیقت پسند، وہ دونوں خیالوں کی دنیا میں رہنے والے، سروانٹیز عقل مند اور معاملہ فہم ''ڈان کہوٹے'' صورت حال کو سمجھنے سے لاعلم۔ یہ شاید اس لیے تھا کہ سروانٹیز اپنی نہیں قارئین کو سپین کے لوگوں کی تصویر دکھانا چاہتا تھا۔ اس لیے نقادوں کا یہ کہنا کہ ''ڈان کہوٹے'' جتنا بڑا ناول ہے سروانٹیز اس کے مقابلے میں چھوٹا ہے شاید درست نہ ہوگا کیونکہ جس ذہن نے ''ڈان کہوٹے'' کو بڑا شاہکار بنایا اس کے بڑے ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔

''ڈان کہوٹے'' ایک ادبی فینٹیسی ہے۔ جس میں شاید سروانٹیز یہ بتلانا چاہتا ہے کہ اگر یہ ناول غیر حقیقی ہے تو پھر شاید ادب بھی غیر حقیقی ہے۔

اویلنیڈا (Avellaneda) جو ذہنی طور پر مفلس مصنف تھا اور جس نے ''ڈان کہوٹے'' کا دوسرا حصہ لکھ کر سروانٹیز کو بہت صدمہ پہنچایا اور خود قارئین کی نفرت حاصل کی۔ سروانٹیز کے لیے ایک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ سروانٹیز نے جب دوسرا حصہ لکھنا شروع کیا تو اپنی توجہ سانچو پانزا پر زیادہ دی کیونکہ سانچو پانزا کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ''ڈان کہوٹے'' کا نامزد گورنر ہے۔ وہ مہمات سر کرنے خود نکل کھڑا ہوتا ہے اور اپنے آقا کی موت سے پہلے واپس آجاتا ہے۔

''ڈان کہوٹے'' کے مصنف نے ڈان کہوٹے کی شکل میں ایک منفرد اور ریجنل کردار تخلیق کیا ہے۔ اس نے 4 سو سال پہلے انسان کی شناخت کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ اسی کردار کو لے کر بیسویں صدی کے لکھنے والوں نے اسے اپنے اپنے انداز میں ڈھالا ہے۔ سروانٹیز کا اپنا منفرد اسلوب تھا جسے اب تک کوئی نہیں اپنا سکا۔

''ڈان کہوٹے'' ایسے سینکڑوں واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ جو انسانوں کی معصوم حماقتوں سے بھرے ہیں۔ جنہیں مختصر خلاصے میں پیش کرنا مشکل ہے۔ سنجیدہ نقادوں کا خیال ہے کہ ڈان کہوٹے کے پلاٹ میں ایسے کئی مسائل کی چاپ سنائی دیتی ہے جن پر بیسویں صدی میں کئی کامیاب ناول لکھے گئے۔ لیکن ''ڈان کہوٹے'' جیسا کوئی نہیں لکھا گیا۔ اس ادبی ہیرے کی چمک اب بھی جوں کی توں ہے۔

سروانٹیز کے ہیرو ''ڈان کہوٹے'' کا گھوڑا مریل تھا۔ کمزور تھا، نحیف تھا، چند قدم چل کر ہوائی چکیوں کے سامنے جا کر ڈھیر ہو گیا مگر سروانٹیز کی شہرت اور مقبولیت کا گھوڑا چار صدیوں سے وقت کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ نہ اس کے قدم لڑکھڑائے ہیں نہ سانس پھولی ہے۔ وہ اب تک پہلے دن کی طرح تازہ دم اور شہ زور دکھائی دیتا ہے۔
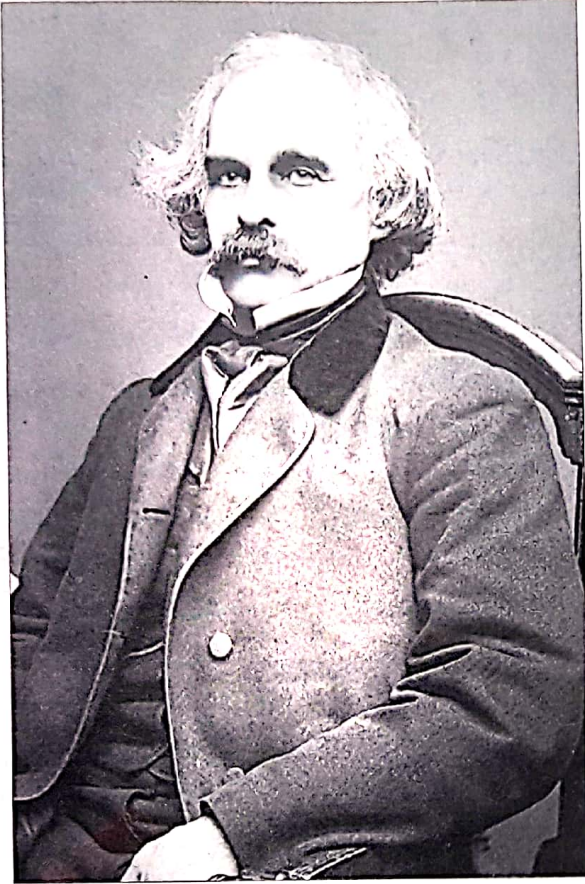
نتھینل ہاتھورن

(Nathaniel Hawthorne)

ہاتھورن کا امریکہ کے نامور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے اس کے ناول اور کہانیاں، گناہ، بدی اور جرم کے تصورات کی عکاسی کرتی ہیں۔اس کا شمار شارٹ سٹوری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔اس کا ناول ''سکارلٹ لیٹر'' عالمی شہرت یافتہ شاہکار ہے۔

ہاتھورن کا اسلوب اس کا اپنا تھا اور شدید اثر رکھتا تھا اس کے موضوعات فکر اور سوچ کی گہرائی رکھتے تھے۔

(ایڈگر ایلن پو)

میں نے زندگی گزاری نہیں صرف زندگی کا خواب دیکھا ہے۔

(ہاتھورن)

میں اب اس دنیا سے خوش قسمت رخصت ہو جاؤں گا کیونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے۔ آپ کو دیکھنا میرے نزدیک مقدس بائبل کو دیکھنے کے برابر ہے۔

(ہرمن میلول)

''سکارلٹ لیٹر'' ایک بے مثال ناول ہے۔ جسے صدیوں تک یاد رکھا گیا اور صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔

(صوفیہ ہاتھورن)

نتھینل ہاتھورن

کبھی کبھی زندگی میں یوں بھی ہوتا ہے کہ آوارہ گردی اور لاابالی پن میں آدمی وہاں جا پہنچتا ہے جہاں اس کی منزل ہوتی ہے۔ نشانہ کہیں اور ہوتا ہے تیر کہیں جا لگتا ہے۔ اردو کے مشہور ادیب مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے جوانی میں مسمیریزم کے بھاؤ بھید بڑے شوق سے سیکھے اور محلے میں اعلان کر دیا کہ وہ بیماروں کا اس سے علاج کر سکتے ہیں۔ ان کی منگنی ہو چکی تھی۔ اتفاق سے ان کے محلے میں ایک لڑکی بیمار ہوگئی۔ مولانا نے اپنی خدمات پیش کر دیں اور اس کا علاج بذریعہ مسمیریزم کرنے لگے۔ چند دنوں بعد لڑکی تو ٹھیک ہوگئی مگر مولانا بیمار ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ میری بیماری کا علاج یہی ہے کہ اس لڑکی سے شادی کر دی جائے چنانچہ پہلی منگنی ٹوٹ گئی اور مولانا کی شادی ''صحت یافتہ'' بیمار لڑکی سے ہوگئی۔ ہاتھورن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہاتھورن Bowdoin میں رہتا تھا۔ عمر 30 سال ہوگئی مگر وہ ابھی کنوارا تھا۔ چنانچہ اس نے شہر کی خوبصورت عورتوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ان عورتوں میں ایک Elziabeth Peabody تھی۔ اس عورت کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی صوفیہ۔ صوفیہ ہر وقت بیمار رہتی تھی۔ کئی بار ہسپتال میں اس کا علاج ہو چکا تھا۔ بستر پر لیٹی رہتی تھی۔ الزبتھ نے ایک بار ہاتھورن کا تعارف کروایا اور پھر ہاتھورن اسی کا ہو کر رہ گیا۔ صوفیہ کے بدن میں جان آنے لگی وہ اچھی بھلی ہوگئی۔ صوفیہ نے اظہارِ محبت کیا۔ ہاتھورن نے ہاں کر دی اور 1842ء میں اس سے شادی کر لی اور شادی شدہ جوڑا Old Mansel میں رہنے لگا۔ دونوں وہاں تین سال رہے۔ تین سال کے قیام کے دوران ہاتھورن نے اپنی کہانیوں کی کتاب Mosses from an old manse مکمل کی۔

صوفیہ ہاتھورن کے لیے مثالی بیوی ثابت ہوئی۔ اس کے دکھ سکھ کی ساتھی بنی اور مرتے دم تک اس کے ساتھ رہی۔ ہاتھورن کی تخلیقی زندگی میں بھی وہ اس کی معاون ثابت ہوئی۔ بُرے دنوں میں ہاتھورن کو حوصلہ دلا کر زندگی کی جنگ لڑنے کے قابل بنایا۔ ہاتھورن خود بھی صوفیہ کی محبت اور بے لوث چاہت کا اعتراف کرتا تھا۔

"She is my Sole Companion. I Need no other, there is no vacancy in my mind, and in my Heart."

صوفیہ ہاتھورن کی تحریروں کی بے حد معترف تھی۔ اس نے اپنی یادداشتوں میں بار بار اس کے اسلوب کی تعریف کی ہے۔ ایک بار اس نے ایک رسالے میں لکھا :

''میں ہمیشہ ہاتھورن کی کہانیوں اور اس کے انداز بیان سے حیران ہوتی۔ اس کی تحریروں میں ایک گہرائی، حقیقت اور جذباتی رفعت ہوتی ہے۔ ایک خوبصورتی ہے اور میں بار بار پڑھتی ہوں تاکہ گہرائی میں ڈوب کر لطف اندوز ہو سکوں۔''

صوفیہ کا ذکر مضمون کی ابتدا میں اس لیے ضروری تھا کہ ہاتھورن کی تخلیقی زندگی میں اس کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ ہاتھورن کو لکھنے پر اکسایا۔ موبی ڈک کا خالق ہرمن میلول اس بات کا گواہ ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ اگر

صوفیہ ہاتھورن کی زندگی میں نہ آتی تو دنیا کو The Scarlet Letter اور House of Seven Gables جیسے شاہکار ناول نہ ملتے۔

نتھینل ہاتھورن 1804ء میں امریکہ کے شہر سیلم میں پیدا ہوا۔ اسے امریکہ کے صف اول کے ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا باپ سمندری جہاز کا کپتان تھا۔ اس کے دادا نے عرصہ پہلے انگلینڈ چھوڑ کر امریکہ میں سکونت اختیار کی تھی۔

ہاتھورن کی ابتدائی تعلیم سیلم میں ہوئی۔ باپ مر گیا تو چچا نے پرورش کی۔ اس کو اپنا بچپن اور دیہاتی علاقے میں گزارا وقت ساری عمر یاد رہا۔ وہ پڑھائی کے دنوں میں اپنی ماں اور بہنوں سے دور رہا۔ گھر کی بہت یاد آئی لیکن اس نے اس جدائی سے بھی بہت تخلیقی فائدہ حاصل کیا اور ایک چھوٹا سا گھریلو اخبار ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا نام اس نے The Spectator رکھا اور پھر اس کے سات شمارے ہاتھ سے لکھ کر گھر والوں کو بھجوا دیئے۔ ان میں مختلف نوعیت کی تحریریں تھیں جو اس نے اپنے نام سے لکھ کر اخبار میں شامل کیں۔ یہ غربت اور مفلسی کے دن تھے جو ہاتھورن نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کاٹے۔ ہاتھورن اپنے چچا کی مالی مدد کے ذریعے کالج تک پہنچا۔ کالج میں مشہور شاعر H.W. Longfellow اس کا کلاس فیلو تھا۔ پڑھائی میں اس کی دلچسپی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کی زیادہ توجہ یونانی ادب کی طرف تھی۔ وہ خود لکھتا ہے کہ اس نے یونانی ادبی شاہکار اور یونانی علم و دانش کی تلاش میں بیشتر وقت صرف کیا۔ کالج کے زمانے میں ہاتھورن کو ایک کاہل طالب علم، کالج کے اصول و قواعد کا باغی اور نصاب تعلیم سے منحرف سمجھا جاتا تھا۔ ہاتھورن ساری زندگی خواب دیکھتا رہا اور ان خوابوں کو کہانیوں میں ڈھالتا رہا۔ اس نے اس بات کا کئی بار اعتراف کیا ہے کہ

"I have not Lived, but only Dreamed about Living."

ہاتھورن کی زندگی سیدھی لکیر کی طرح آگے بڑھی۔ اس میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں سوائے اس کے کہ اس نے 12 سال کی عمر میں ایک ناول لکھا جس کا نام Fanshawe تھا۔ یہ ایک رومانی ناول تھا۔ یہ ناول اس نے اصلی نام سے نہیں لکھا تھا بعد میں لوگوں کو پتہ چل گیا لیکن ہاتھورن نے آگے چل کر اسے فضول قرار دے کر اس سے جان چھڑا لی۔ ابتدا میں وہ ایک اخبار کی ادارت کرتا رہا یہ اخبار مفید علمی مضامین کا مجموعہ تھا جسے دلچسپ پیرائے میں مرتب کیا جاتا تھا۔

ہاتھورن فطری طور پر ایک خاموش طبع اور تنہائی پسند آدمی تھا۔ محفلوں اور سماجی تقریبات سے اس کا کچھ لینا دینا نہ تھا مگر شادی کے بعد صوفیہ نے اسے گھر سے باہر وقت گزارنے کی ترغیب دی۔ اپنے ہمعصر ادیبوں سے میل میلاپ رکھنے اور ادبی تقریبات میں جانے پر اکسایا اور پھر وہ سماجی زندگی میں شمولیت اختیار کرنے لگا۔

ہاتھورن امریکہ میں مختصر کہانیوں کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی کہانیوں کی دو کتابوں

1) Mosses from an old Manse
2) Twise told Tales

کی ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe) نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ہاتھورن کا اسلوب اس کا اپنا تھا جو اپنا شدید اثر چھوڑتا ہے۔ ہاتھورن کے موضوعات فکر اور سوچ کی ایک گہرائی رکھتے ہیں اور قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

ہاتھورن کے دو مجموعے چھپے مگر ان سے اتنی آمدنی نہ ہو سکی کہ گھر کے اخراجات پورے ہو سکیں چنانچہ دوستوں کی مدد سے اسے شہر کے کسٹم ہاؤس میں ملازمت مل گئی۔ وہ پانچ سال ملازمت کرتا رہا، کہانیاں لکھتا رہا۔ ملازمت ختم ہوئی تو بیوی

نے اس رقم سے خرچہ چلانا شروع کر دیا جو اس نے بچا کر رکھی تھی۔ اس بے کاری کے عرصے میں اس نے اپنا شاہکار ناول ''سکارلٹ لیٹر'' مکمل کر لیا۔ یہ ایسا ناول تھا جس کا سارا ایڈیشن 15 دن کے اندر اندر بک گیا۔ یہاں سے وہ ویسٹ نیوٹن چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنا دوسرا مشہور ناول The House of Seven Gables لکھا جو ایک خاندانی گھر کے بارے میں ہے۔ جس کے سات چھجے (Gables) تھے۔ اس گھر کے پس منظر میں اس نے ایک خوبصورت، دلچسپ کہانی لکھی، جسے لوگوں نے بہت دلچسپی سے پڑھا اور پسند کیا۔ چند سال اس نے اٹلی اور انگلستان میں بسر کئے۔ آخری چند سالوں میں اسے بیماری نے بہت پریشان کیا۔ صحت بگڑتی رہی۔ معدے کے درد نے پریشان رکھا۔ 1864ء کے ابتدائی مہینوں میں صحت مزید بگڑ گئی۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ مئی کے شروع میں سیر و تفریح پر نکل کھڑا ہوا۔ White Mountains کی سیر کے بعد اس نے Play Mouth میں قیام کیا۔ 19 مئی 1864ء کو سویا تو نیند ہی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

ہاتھورن کے ہمعصر ادیبوں سے اچھے تعلقات رہے مگر ہرمن میلول نے اسے پیر مان کر عقیدت جتائی۔ جب ہرمن میلول Pitts Field میں رہتا تھا تو ہاتھورن کا گھر اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ ہرمن میلول اسے روز ملنے کے لیے جاتا تھا۔ اس سینئر ناول نگار نے ہرمن میلول کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان دنوں ہرمن میلول ''موبی ڈک'' لکھ رہا تھا۔ ہرمن میلول ہاتھورن کے نام ایک خط میں اسے لکھتا ہے۔

''میں اب اس دنیا سے بہت خوش قسمت رخصت ہو جاؤں گا کیونکہ آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔ آپ کو دیکھنا میرے نزدیک مقدس بائبل کو دیکھنے کے برابر ہے۔''

جب ہرمن میلول نے اپنی کتاب ''موبی ڈک'' چھپوائی تو اس کا انتساب ہاتھورن کے نام کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کتاب پڑھ کر ہاتھورن نے اسے کچھ نہیں لکھا۔ بہر حال ہرمن میلول نے جب تک Pitts Field میں قیام کیا اپنی ہر شام ہاتھورن کے ساتھ گزاری۔

ہاتھورن اپنے دونوں شاہکار ناولوں 'سکارلٹ لیٹر' اور 'ہاؤس آف سیون گیبلز' کی وجہ سے دنیا کا ایک منفرد اور بے مثال ناول نگار تصور کیا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات، گناہ اور پچھتاوے کی بے مثال کیفیتوں کو شاید کسی دوسرے امریکی ادیب نے اس شاندار اسلوب میں بیان نہیں کیا۔ انسانی معاشرے میں انسان کس طرح مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ معصومیت کس طرح دنیا کے خود ساختہ اصولوں کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ اس کی مثالیں ہاتھورن کے علاوہ شاید اور کہیں نہیں ملتیں۔ جذبات انسان کی جبلت میں شامل ہیں جنہیں معاشرہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہاتھورن کے ناول اور کہانیاں انسان کے ان خود ساختہ اصولوں کے گرد گھومتی ہیں، جو وہ فطری جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر توڑتا ہے اور پھر سختیوں اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔

بہت سے نقادوں نے ایڈگر ایلن پو اور ہاتھورن میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن معروف ناقد ایمرسن کا کہنا ہے کہ ہاتھورن کا اپنا الگ اسلوب ہے۔ وہ امریکہ کے ان چند لوگوں میں سے ہے جنہوں نے شارٹ سٹوری کی بنیاد رکھی۔

ہاتھورن نہ صرف شارٹ سٹوری کے بانیوں میں سے تھا بلکہ اس کے اسلوب میں گناہ، بدی اور جرم کے تصورات کی عکاسی ملتی ہے۔ انسانوں کے اندر چھپے ہوئے ان جذبات کو ہاتھورن نے جس طرح اپنی کہانیوں میں استعمال کیا ہے اور

بے نقاب کیا ہے وہ ہنر کسی اور ناول نگار کے ہاں نہیں ملتا۔ ہاتھورن ماضی اور تاریخی پس منظر کو اپنی کہانیوں میں دکھا کر زمانہ حال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ مثلاً اس کے ناول ''ہاؤس آف سیون گیبلز'' میں وہ مکان کی تاریخی اہمیت بیان کرتا ہے اور پھر زمانہ حال کی کہانی اور زندہ کرداروں کو کہانی میں پرو کر ایک خوبصورت ناول کی تخلیق کرتا ہے۔ ہاتھورن کا یہ وصف ہے کہ وہ انسانوں کے اندر اتر کر ان کی ذات کے نقشے بناتا ہے اور انہیں اس طرح قاری کے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے اصلی روپ کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اور ان کی کوئی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔

امریکہ کے مصنفین میں ہاتھورن واحد مصنف ہے جو منفرد ہے اور جینئس ہے وہ انسانوں کی خارجی اور باطنی تصویریں بنانے میں اپنی مثال آپ ہے۔

سکارلٹ لیٹر ہاتھورن کا وہ شاہکار ناول ہے جسے عالمی ادب میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ سکارلٹ لیٹر کو امریکی ادب کا کلاسیک ناول قرار دیا جاتا ہے۔

یہ ناول 17 ویں صدی کے شہر بوسٹن کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جہاں ایک متعصب مذہبی معاشرہ ہے۔ یہ کہانی متعصب مذہبی لوگوں، نوجوان بیوی ہسٹر، اس کے شوہر چیلنگورتھ، نوجوان پادری اور اس کی ناجائز بیٹی پرل کے گرد گھومتی ہے۔

چیلنگورتھ ایک بوڑھا حکیم ہے جسے جڑی بوٹیاں تلاش کرنے کا جنون ہے اس کی نوجوان بیوی ہسٹر ہے۔ حکیم جڑی بوٹیاں تلاش کرنے کے لیے ایک طویل عرصے کے لیے جنگل کی طرف چلا جاتا ہے اور جوان بیوی کو تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ ہسٹر ایک جوان لڑکی ہے۔ خاوند کی غیر موجودگی میں وہ جذباتی بہاؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ ایک بچی کی ماں بن جاتی ہے۔ جس کا نام پرل رکھتی ہے۔ گاؤں کے قانون کے مطابق اسے پادری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پادری جوان ہے جس کا نام Dimmesdale ہے گاؤں والے ہسٹر سے بچی کے باپ کا نام پوچھتے ہیں لیکن ہسٹر خاموش رہتی ہے۔ ہسٹر کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ وہ ایک سفید گاؤن پہن کر اس پر سرخ رنگ کا کڑھا ہوا حرف (A) لگائے تاکہ گاؤں کے لوگ اسے دیکھ کر دور سے پہچان لیں کہ یہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اس گناہ کا سہارا لے کر اس نے ایک بچی کو پیدا کیا ہے۔ اسی حرف کی وجہ سے اس ناول کا نام سکارلٹ لیٹر رکھا گیا ہے۔

ہسٹر سینے میں سرخ رنگ کا نشان سجا کر شہر میں محنت مزدوری کرتی پھرتی ہے اور اپنی بیٹی کی پرورش کرتی ہے۔ گاؤں والے جب بھی اسے دیکھتے ہیں اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ گاؤں کے بوڑھے اس سے بچی کے باپ کا نام بار بار پوچھتے ہیں مگر وہ ہر بار نام بتلانے سے انکار کر دیتی ہے۔ گاؤں والے اس سے بچی کو چھیننے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر پادری کی حمایت کی وجہ سے وہ ہسٹر سے بچی لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ چیلنگورتھ بوسٹن واپس آچکا ہے۔ وہ ہسٹر سے الگ رہ رہا ہے لیکن ایک چیز اسے ہر پل پریشان رکھتی ہے کہ ''بچی پرل کا باپ کون ہے'' وہ اس کھوج میں لگا رہتا ہے۔

پرل اب ایک خوبصورت بچی کا روپ دھار چکی ہے اور گاؤں کا پادری اسے مل کر بہت خوشی اور مسرت محسوس کرتا ہے۔ ہسٹر اور بچی پرل کو گاؤں والوں نے گاؤں سے باہر نکال دیا ہے، اور دونوں ماں بیٹی گاؤں سے باہر ایک جھونپڑی میں رہتی ہیں۔

چیلنگورتھ پرل کے باپ کی تلاش میں کچھ سراغ تلاش کرنے کے لیے پادری کے پاس جاتا ہے تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ جاتا ہے کہ رات کے آخری حصے میں پادری اپنے آپ کو کوڑوں سے مارتا ہے۔ پادری یہ کام ہر رات کرتا ہے۔ چیلنگورتھ

پادری کے پاس آنا جانا شروع کرتا ہے۔ پادری بیمار رہنے لگتا ہے۔ چیلنگورتھ ایک رات اس کی تیمارداری کے لیے جاتا ہے تو پادری کو بستر پر دیکھتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پادری کے سینے پر دل کے اوپر (A) کا لفظ کھدا ہوا ہے۔ بالکل ایسا (A) جیسا ہسٹر کے گاؤن پر ہے۔ یہاں چیلنگورتھ پر یہ راز کھلتا ہے کہ پادری ہی پرل کا باپ ہے۔ چیلنگورتھ خاموش رہتا ہے۔ پادری کوڑوں کی سزا جاری رکھتا ہے۔ ہسٹر چوری چوری جا کر اسے سمجھاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو یہ اذیت دینا بند کر دے مگر پادری یہ اذیت ناک سزا جاری رکھتا ہے۔ آخر ہسٹر ایک فیصلہ کرتی ہے اور پادری سے مل کر منصوبہ بناتی ہے کہ وہ پرل کو لے کر یورپ کی طرف نکل جائیں گے جہاں وہ خوشگوار زندگی گزار سکیں۔ پرل بھی اس راز سے واقف ہو چکی ہے کہ پادری ہی اس کا باپ ہے۔ ہسٹر گاؤن اتار دیتی ہے۔ اور اپنی بیٹی کے پاس جاتی ہے لیکن بیٹی بغیر گاؤن کے اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ پادری جب پرل کے ماتھے پر بوسہ دیتا ہے تو پرل ندی پر جا کر اپنا ماتھا دھونے لگتی ہے اور پھر پادری سے کہتی ہے کہ وہ سب کے سامنے اس بات کا اقرار کرے کہ وہ اس کا باپ ہے۔ پادری کی حالت بیماری کی وجہ سے مزید بگڑ چکی ہے۔ بحری جہاز یورپ جانے کے لیے تیار ہے۔ پرل اس کے اعتراف کی منتظر ہے۔ آخر پادری شہر کے لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ شہر کے سب لوگ جمع ہیں اور پادری اعتراف کرتا ہے کہ وہ ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کر سکا۔ ہسٹر نے میری عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ خود اذیت برداشت کر لی۔ دراصل گناہگار میں ہوں۔ پرل میری بیٹی ہے اور پھر اپنا گریبان پھاڑ کر اپنے سینے پر قدرتی طور پر کھدا ہوا لفظ (A) دکھاتا ہے۔ یہ اعتراف وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے کرتا ہے۔ جہاں وہ جھونپڑی بنی ہوئی ہے۔ جس میں پرل اور ہسٹر رہتی ہیں۔ اس اعتراف کے بعد پادری گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ چیلنگورتھ انتقام کی آگ میں اندر ہی اندر جلتا رہتا ہے اور ایک سال کے بعد مر جاتا ہے۔ ہسٹر اور پرل شہر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ کئی سالوں کے بعد ہسٹر اکیلی واپس بوسٹن آتی ہے۔ گاؤں والے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ اس نے وہ گاؤن پہنا ہوا ہے جس پر سرخ نشان (A) کڑھا ہوا ہے۔ ہسٹر اسی جھونپڑی میں رہنا شروع کر دیتی ہے جس میں وہ پرل کے ساتھ رہتی تھی اور اب وہ اپنا سارا وقت فلاحی کاموں میں صرف کرنے لگتی ہے۔ پرل کے اسے یورپ کے کسی شہر سے خط آتے رہتے ہیں جہاں اس نے کسی اعلیٰ افسر سے شادی کر لی تھی۔ چیلنگورتھ نے مرتے وقت وصیت کر دی تھی کہ میری ساری جائیداد پرل کو دے دی جائے۔ ہسٹر جب مر گئی تو اس کی قبر ایک خستہ اور ویران قبر کے پاس (ذرا فاصلہ چھوڑ کر) بنا دی گئی۔ یہ قبر پادری Dimmesdale کی تھی۔ ان دونوں قبروں پر ایک ہی کتبہ لگا دیا گیا جس پر ایک حرف کھدا ہوا تھا یہ حرف (A) تھا۔

''سکارلٹ لیٹر'' ایک ایسا ناول ہے جس کا سحر ناول ختم ہونے کے بعد بھی قاری پر طاری رہتا ہے۔ ہاتھورن نے ہسٹر اور پادری کے کرداروں کو جس ہنرمندی سے تشکیل دیا ہے اور کہانی کو جس مثالی انداز میں آگے بڑھایا ہے وہ اس کے پختہ کہانی کار ہونے کا ثبوت ہے۔ پادری کے اندر جلتی ہوئی پچھتاوے کی آگ و گناہ کا احساس، اس کی خاموشی، ہسٹر کے ساتھ اس کی خاموش محبت، ہسٹر کا لعنت اور ملامت کو خاموشی سے برداشت کرنا، پادری کی عزت پر حرف نہ آنے دینا، چیلنگورتھ کا کردار، اس کا انتقامی جذبہ، پادری کے ساتھ ملاقاتیں اور پھر پادری کا راز فاش ہونے پر اس کے انتقام کی آگ کا بڑھنا، سب ناول کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ چیلنگورتھ کا کردار جب بدلتا ہے تو ناول میں ایک Twist آتا ہے۔ چیلنگورتھ مرتے وقت جب اپنی ساری جائیداد پرل کے نام منتقل کرتا ہے تو اس کا کردار ایک مثبت شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پادری کا اعترافِ جرم کرنا ناول کی جان ہے۔

ہاتھورن نے ناول میں قدم قدم پر کہانی میں خوبصورت موڑ پیدا کر کے کہانی کی دلچسپی کو بڑھا دیا ہے۔ مثلاً جب پادری پرل کے ماتھے کو چومتا ہے تو پرل ندی پر جا کر اپنا ماتھا دھوتی ہے اور کہتی ہے کہ پہلے لوگوں کے سامنے اقرار کرو کہ میں تمہاری بیٹی ہوں۔ پادری جب اقرار کر لیتا ہے تو وہ اس کا ماتھا چوم لیتی ہے۔ ناول میں چند چونکا دینے والے مقامات بھی ہیں۔ مثلاً جب تک ہسٹر (A) حرف والا گاؤن پہنے رکھتی ہے تو سورج اس پر نہیں چمکتا۔ ہسٹر کے سر پر بادل رہتا ہے۔ جوں ہی وہ گاؤن اتارتی ہے اس کے سر پر سورج کی روشنی پڑنے لگتی ہے۔ جو آزادی کی علامت ہے۔ یا پرل کا گاؤن کے بغیر ماں کو پہچاننے سے انکار کرنا۔ یا ہسٹر کا گاؤن پہن کر دوبارہ بوسٹن آنا اور پادری کے سینے پر سرخ (A) کا کھدا ہونا۔

ناول کی سب سے زیادہ چونکا دینے والی صورتِ حال ہسٹر کی قبر پادری کے قریب بنانا ہے اور پھر دونوں کی قبر پر ایک ہی کتبے کا لگایا جانا ہے جس پر (A) کا حرف کھدا ہوا ہے۔ ناول ختم ہونے کے بعد بھی قاری اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ بلاشبہ ''سکارلٹ لیٹر'' ایک بے مثال ناول ہے اور ہاتھورن کا شاہکار ناول، جسے صدیوں تک یاد رکھا گیا اور صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔

ہرمن میلول

(Herman Melville)

نامور امریکی ناول نگار ''موبی ڈک'' اس کا عالمی شہرت یافتہ ناول ہے۔ یہ ہومر کی ایپک اوڈی سی کے بعد سب سے بڑا سمندری سفر نامہ ہے۔ ہرمن میلول کو کرداروں کی تشکیل، خدوخالی، نفسیاتی پرتیں کھولنے کا فن آتا ہے جو اسے اپنے ہمعصروں سے الگ کرتا ہے۔

بڑی کتاب لکھنے کے لیے موضوع بڑا ہونا چاہیے اور اس موضوع کے لیے اسلوب اور زبان بھی بڑی ہونی چاہیے۔

(ہرمن میلول)

....

''موبی ڈک'' ہرمن میلول کا عظیم شاہکار ہے اور اسے ہر عہد کا بڑا ناول سمجھا جاتا ہے۔

(Susau Cheevers)

....

''موبی ڈک'' لکھتے وقت میلول کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ سارا دن قلم ہاتھوں میں لے کر بیٹھا رہتا اور ایک حرف نہ لکھتا۔ شام ہوتی تو گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل جاتا۔ کبھی جا کر درخت کاٹنا شروع کر دیتا۔ ہم سب اس کی حالت دیکھ کر بہت فکر مند ہوتے تھے۔

(میلول کی بیوی کی یادداشتوں سے)

....

میرے خیال میں ہر آدمی کے پاس سواری کے لیے دو گھوڑے ہونے چاہیے۔ ایک سمندر اور ایک خشکی۔

(ہرمن میلول)

ہرمن میلول

''مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑ رہا ہے کہ میں نے زندگی میں جو منصوبہ بھی بنایا ناکام ہوا۔ میں زندگی میں کچھ کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا۔ آخر میں نے سمندر کا رُخ کیا اور جہاز پر نوکری کر لی''

میلول کے اس اعتراف میں اس کی زندگی کی ساری تفصیل چھپی ہوئی ہے۔ 1819ء میں وہ ایلن میلول کے گھر پیدا ہوا، جو فرانس سے امریکہ خشک میوہ جات درآمد کرتا تھا۔ البانے (Albany) میں کاروبار اکھڑا تو آٹھ بچوں اور بیوی سمیت نیویارک چلا آیا۔ نیویارک میں حالات مزید بگڑ گئے۔ کاروبار تباہ ہو گیا۔ دمڑی دمڑی کو محتاج ہو گیا اور اسی حال میں مر گیا۔ خاندان واپس البانے چلا گیا۔ میلول سکول میں پڑھتا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں سکول چھوڑنا پڑا۔ نیویارک کے ایک بینک میں کلرک ہو گیا۔ بھائی کے سٹور پر کام کیا۔ پھر اپنے چچا کے فارم ہاؤس پر کھیتی باڑی کی۔ ایک سکول میں کچھ عرصہ پڑھایا جو کچھ کیا اس میں ناکامی ہوئی۔ گھر والوں نے اسے ناکارہ، سست اور کام چور ہونے کا طعنہ دیا۔ گھر اس کے لیے عذاب بن گیا۔ اس کے بھائی کا ایک دوست نیویارک میں رہتا تھا۔ بھائی نے میلول کو نیویارک بھیج دیا۔

ہرمن میلول نیویارک پہنچا تو اس کی پینٹ پر بے شمار پیوند لگے تھے۔ اس نے ایک شکاری کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کی جیب خالی تھی۔ بھائی کے دوست کے ہاں اس نے رات گزاری۔ صبح ہوئی تو بھائی کا دوست اسے ایک جہاز کے دفتر لے گیا۔ جہاز لیور پول (Liver Pool) جا رہا تھا۔ ہرمن میلول کو اس جہاز پر نوکری مل گئی۔ تنخواہ 3 ڈالر ماہانہ تھی اور جہاز پر اسے ''کیبن بوائے'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سمندر کو ہرمن میلول اسقدر اچھا لگا کہ برسوں تک اس کا ہاتھ پکڑے رکھا۔ سمندر نے اسے سوائے تجربات اور مشاہدات کے کچھ نہ دیا۔ یہی تجربات اور مشاہدات اس کی کتابوں کے موضوعات بن گئے۔ اس کا بائیوگرافر Raymond Weaver کہتا ہے کہ اس ساری بھاگ دوڑ میں وہ جہاز کے مستول کے پاس کھڑے ہو کر بھی شیکسپیئر، ملٹن، بائرن اور کولرج کی کتابیں پڑھتا رہا اور انسانوں کے مطالعے میں مصروف رہا۔

Acushnet نامی جہاز پندرہ مہینے سمندر کی لہروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ کپتان بڑا ظالم اور سخت گیر تھا۔ میلول اور اس کا دوست Toby دونوں اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ چنانچہ دونوں جہاز سے بھاگنے کے منصوبے بناتے رہے اور مناسب موقع کا انتظار کرتے رہے اور آخر انہیں موقع مل ہی گیا۔

ایک رات جہاز Nuka Hive نامی جزیرے کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو دونوں جہاز سے تمباکو اور بسکٹوں کے تھیلے بھر کر جہاز سے فرار ہو گئے تا کہ جزیرے کے باسیوں کو رشوت کے طور پر دے کر ان سے پناہ حاصل کر سکیں اور جہاز کے کیپٹن سے ان کی جان چھوٹ جائے لیکن وہ بے خبر تھے کہ وہ ایک چھوٹی مصیبت سے بچ کر بڑی مصیبت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

جہاز سے بھاگ کر وہ سخت اور پتھریلے راستے طے کرتے ہوئے ایک آبادی میں پہنچے۔ میلول پتھروں پر کئی بار گرا اور زخمی ہو گیا۔ ٹوبی فوراً آبادی میں گیا تا کہ کسی حکیم کو لا سکے لیکن وہ پھر واپس نہ آیا۔ اصل میں یہ جزیرہ آدم خوروں سے بھرا پڑا

تھا۔میلول کو یقین تھا کہ وہ کسی آدم خور کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔میلول کی پھر ٹوبی سے ملاقات نہ ہوئی۔

میلول اس جزیرے کے دوسرے قبیلے میں 4 مہینے رہا۔لوگوں نے اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ Tybees قبیلے کی ایک لڑکی Fayaway سے اس کی دوستی ہوگئی۔اس کے ساتھ اس نے وقت گزارا، کشتی رانی کی اور کئی بار وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی۔لڑکی نے کئی بار آدم خوروں سے اس کی جان بچائی۔چار مہینے بعد ایک جہاز جزیرے پر لنگر انداز ہوا۔کیپٹن کو پتا چلا کہ ایک ملاح جزیرے میں Tybees کے قبضے میں ہے۔اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور میلول کو اس جزیرے سے لے گیا۔ہرمن میلول خشکی سے ایک بار پھر سمندری لہروں پر چلنے لگا۔اب وہ جولیا نامی جہاز پر نوکری کر رہا تھا اور وہیل مچھلیوں کی تلاش ان کی منزل تھی۔جولیا جہاز کے عملے پر ایک جزیرے میں مقدمہ چلا اور انہیں جیل بھیج دیا گیا۔قید سے رہائی ملی تو اس کی ڈاکٹر لانگ گھوسٹ (Dr. Long Ghost) سے ملاقات ہوئی۔اس نے اسے آلوؤں کی کاشت پر لگا دیا لیکن اس کام میں اس کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔وہ ایک جہاز United States پر کلرک بن گیا۔جہاز امریکہ واپس پہنچا تو یہ اپنے گھر چلا گیا۔البانے میں رہنے لگا اور یہاں اس نے اپنا پہلا ناول لکھنا شروع کر دیا جس میں اس نے Tybees قبیلے میں گزارے چار مہینوں کی تفصیل لکھی ہے۔وہ بہت دلچسپ ہے۔ Fayaway کے ساتھ گزارا ہوا وقت، اس کی نوازشات، قبیلے کے لوگوں کا رہن سہن، آدم خور قبیلے کے خطرناک واقعات، اپنے فرار ہونے کی تفصیل یہ سب کچھ اس نے بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔کچھ نقادوں کا کہنا ہے کہ میلول نے خواہ مخواہ ہیرو بننے کی کوشش کی ہے اور واقعات نگاری میں بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔

دوسرا ناول Omoo جنوبی سمندروں پر اس کی مہمات کی روداد ہے۔سمندری طوفان، ساحل سمندر پر قیام، ملاحوں کی عادات اور روزمرہ زندگی کے معمولات، سمندری سفر میں خطرناک وہیل مچھلیوں سے مقابلے۔ہرمن میلول نے سمندر کی زندگی کی ساری تفصیل بہت مہارت سے تحریر کی ہے۔یہ دونوں ناول لوگوں نے بہت پسند کیے۔

ایک طویل عرصہ سمندری سفر کر کے ہرمن میلول اب شاید سمندر سے اُکتا گیا تھا چنانچہ اب اس نے باقاعدہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔White Jacket اور Redburn اسی اکتاہٹ کا نتیجہ تھیں۔مالی حالات پھر بھی نہ ٹھیک ہوئے۔وہ گھر والوں کو لے کر ایک بار پھر نیو یارک چلا گیا۔وہاں اس کی چیف جسٹس شا سے ملاقات ہوئی جس کے اس کے خاندان سے گہرے مراسم تھے۔جسٹس نے ان مراسم کو اور مضبوط بنانے کے لیے 1849ء میں اپنی بیٹی الزبتھ کی شادی ہرمن میلول سے کر دی اور اس کے مالی حالات میں بہتری لانے کے لیے Pittsfield میں ایک فارم خرید دیا جسے میلول ایرو ہیڈ (Arrow Head) کا نام دیتا ہے۔

ایرو ہیڈ میں ہرمن میلول نے ایک کسان کا روپ دھار لیا اور کھیتوں میں جا کر باقاعدہ کھیتی باڑی شروع کر دی اور آلوؤں کی فصل اگانا شروع کر دی۔اس نے یہ کام کبھی نہیں کیا تھا۔چنانچہ وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے:

''میرے ہاتھوں کو دیکھو ہتھوڑا اور پھاوڑا چلا کر چند دنوں میں ان پر کیسے نشان پڑ گئے ہیں۔میں کمرے میں بیٹھا ہوں، بارش ہو رہی ہے تمام کام رُکا ہوا ہے۔میں بہت خوش ہوں''۔

ایرو ہیڈ میں قیام کے دوران اس نے اپنی تخلیقی زندگی کا سب سے اہم کام کیا اور وہ White Whale or Moby Dick تھا۔جس سے وہ ساری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔Moby Dick کو ایک بے مثال ناول سمجھا جاتا ہے۔ہرمن میلول اسے لکھتے ہوئے کس ذہنی کرب سے گزرا اس کی تفصیل اس کی بیوی نے مختلف خطوط میں لکھی ہے۔وہ اپنی

یادداشتوں میں بھی اس کا ذکر کرتی ہے۔وہ لکھتی ہے:

''موبی ڈِک لکھتے ہوئے میلول کی عجیب کیفیت تھی۔وہ سارا دن کاغذ قلم لے کر بیٹھا رہتا اور ایک حرف نہ لکھتا۔شام ہوتی تو گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل جاتا۔کبھی کبھی جا کر درخت کاٹنا شروع کر دیتا۔ہم سب اسکی یہ حالت دیکھ کر بہت فکر مند ہوتے تھے۔''

اس کیفیت کو ایک ہستی نے دور کیا، اس ہستی کا نام نتھینل ہاتھورن تھا۔اس سینئر ناول نگار نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی۔میلول اسکی بہت عزت کرتا تھا۔وہ ہاتھورن کو ایک خط میں لکھتا ہے:

''میں اب اس دنیا سے بہت خوش رخصت ہو جاؤں گا کیونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے۔آپ کو دیکھنا میرے نزدیک مقدس بائبل کو دیکھنے کے برابر ہے۔''

ہاتھورن اس کے گھر کے نزدیک رہتا تھا۔میلول اپنا زیادہ وقت ہاتھورن کے ساتھ گزارتا تھا۔مسز ہاتھورن نے میلول کو دیکھ کر اسکا بہت اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔اس نے اپنی ماں کے نام ایک خط میں میلول کے بارے میں لکھا ہے:

''میلول ایک سچا، ذہین، کھلے دل اور وسیع دماغ کا آدمی ہے۔زندگی اس کی انگلیوں کی پوروں پر لکھی ہے۔وہ بہت ایماندار اور ہمدرد آدمی ہے۔اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ناک بہت خوبصورت، قد لمبا، چہرہ پُرکشش ہے، جب وہ بات کرتا ہے تو دلیل اور اعتماد کے ساتھ کرتا ہے۔میں حیران ہوں کہ وہ اتنی چھوٹی آنکھوں کے ساتھ دنیا کو کیسے دیکھتا ہے۔وہ بات کرتا ہے تو آپ کو اس کی بات سن کر تردید کرنے کی جرأت نہیں ہوتی بلکہ آپ اس کی باتوں میں بہہ جاتے ہیں''

اس نے موبی ڈِک مکمل کی اور اس کتاب کا انتساب ہاتھورن کے نام کیا۔ہاتھورن ایرو ہیڈ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔اس کتاب کو اس عہد کے قارئین نے پسند نہ کیا۔حیرت کی بات ہے کہ کتاب ہاتھورن کو بھی پسند نہیں آئی۔میلول نے کتاب اسے بھیجی لیکن ہاتھورن نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔کتاب نہ بکی، نہ اس کتاب سے لوگ خوش ہوئے اور نہ ہی پبلشر۔میلول کے مالی حالات پھر بگڑ گئے۔میلول کا سسر ایک بار پھر مشکل وقت میں کام آیا۔اسے واپس نیو یارک لے گیا۔مکان کرائے پر لے کر دیا۔چند دنوں بعد سسر فوت ہو گیا۔ساری جائیداد اس کی بیوی الزبتھ کو مل گئی۔مالی حالات ٹھیک ہو گئے۔کچھ ماہ بعد اس کی بیوی کی ایک رشتے کی بہن فوت ہوگئی اس کی ساری جائیداد بھی الزبتھ کو مل گئی۔اسی دوران ہرمن میلول کو کسٹم کے محکمے میں انسپکٹر کی نوکری مل گئی۔ہرمن میلول اب معاشی حالات کی دلدل سے باہر نکل آیا۔بس اس عرصے میں اسے دو جذباتی جھٹکے لگے۔اس کے بڑے بیٹے Malcolm نے خودکشی کر لی اور چھوٹا بیٹا گھر سے بھاگ گیا۔میلول نے 20 سال نوکری کی پھر اس نے نوکری چھوڑ دی۔1878ء میں 20 ہزار اشعار کی نظم Clarel شائع کی 1891ء میں وہ فوت ہو گیا۔اس کا آخری ناول Billy Budd اس کی موت کے بعد 1924ء میں شائع ہوا۔

ہرمن میلول کا بچپن اور جوانی دونوں مالی پریشانیوں اور ذہنی کرب میں گزرے۔بچپن میں وہ مختلف منصوبے بناتا رہا اور ناکامیوں سے دوچار رہا۔جوانی سمندری سفر، وہیل مچھلیوں کی تلاش اور مختلف جزیروں میں قید کی صعوبتیں برداشت کرتے گزری۔شادی کے بعد مالی حالات میں کچھ تبدیلی آئی۔کسٹم کی نوکری سے معاشی صورتحال میں استحکام آیا۔آخری عمر میں دو بیٹوں کے مرنے سے ذہنی پریشانی تکلیف دہ ثابت ہوئی مگر وہ لکھنے کا کام کرتا رہا۔

ہرمن میلول نے Type اور Omoo کے بعد ایک ناول Mardi لکھا مگر قارئین نے اسے پسند نہ کیا۔ایک ناول

PIERRE، پھر Israel Potter ان سب ناولوں اور کہانیوں کے بارے میں نقادوں کا ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ مثلاً اس کے بائیوگرافر اور نقاد Anderson کی رائے ہے کہ ہرمن میلول نے ان کتابوں میں ایک ہی جیسی غلطیوں کو بار بار دہرایا ہے۔ ان میں سے شاید اہم غلطی مختلف واقعات اور چیزوں کا بار بار سامنے آنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہرمن میلول نے بہت سی سفری داستانیں اور سفرنامے پڑھے ہوئے تھے وہ ان سے بہت استفادہ کرتا ہے۔ دوسرے مصنفین کے مشاہدات اور واقعات کو اپنی تحریروں میں اپنے انداز میں لکھ جاتا ہے اور کبھی کبھی تو بقول اینڈرسن

"In Various Instances used the very words of their Authours"

ہرمن میلول کی Typee اور Omoo کا اسلوب لوگوں کو پسند آیا کیونکہ اس نے ان دونوں کتابوں میں سادہ اسلوب اختیار کیا لیکن بعد میں آنے والی کتابوں میں اس نے قدم قدم پر مشکل زبان کی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پہلی کتابوں اور بعد میں آنے والی کتابوں میں اسلوب کا وہی فرق تھا جو ہمارے ہاں اردو ادب میں میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کی نثر میں تھا۔ موبی ڈک تک پہنچتے پہنچتے اس کی زبان بہت مشکل ہو گئی، شاید یہی وجہ تھی کہ ''موبی ڈک'' کو اس کے اپنے زمانے میں پسند نہیں کیا گیا اور لوگوں نے تقریباً اسے فراموش کر دیا۔ بیسویں صدی میں جب نقادوں نے اس کتاب کی طرف دھیان دیا تو اس پر سیر حاصل تنقیدیں کی گئیں۔ تب اس کے محاسن سامنے آئے اور اسے اہم ترین ناول قرار دیا گیا۔ آیئے ''موبی ڈک'' کی کہانی سنیں جو اس کا ایک کردار اسماعیل سناتا ہے۔

موبی ڈک (Moby Dick) کپتان آہاب (Ahab) کے انتقام کی کہانی ہے۔ آہاب کا کاروبار یا مشغلہ وہیل مچھلیوں کو مارنا ہے۔ وہ یہ کام ایک عرصے سے کر رہا ہے۔ ایک بار ایک خطرناک مچھلی موبی ڈک سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ موبی ڈک باوجود آہاب کی جرأت اور ہمت کے آہاب کے قابو نہ آئی بلکہ آہاب کی ایک ٹانگ اس کے جبڑے میں پھنس گئی اب آہاب اپنی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ موبی ڈک کو سمندر میں تلاش کرتا پھر رہا ہے تا کہ اس سے اپنا انتقام لے سکے۔

وہیل مچھلی کے جبڑے سے بنی ٹانگ والا کپتان آہاب ایک بہادر آدمی ہے۔ اس کے جہاز کا نام ''پیکاڈ'' ہے جس پر اس نے تجربہ کار ملاحوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا ہے۔ ان کا اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ سمندری وہیل مچھلیوں پر نظر رکھیں جو سب سے پہلے سفید وہیل مچھلی موبی ڈک کی نشان دہی سب سے پہلے کرے گا اسے 16 ڈالر کا وہ سونے کا سکہ انعام میں دیا جائے گا جو آہاب نے جہاز کے مستول کے ساتھ چپکا دیا ہے۔

''پیکاڈ'' جہاز کے اس عملے میں ''اسماعیل''، ''سٹار بوک''، ''سٹاب''، ''نیزہ باز تاشی ٹیگو'' حبشی ''کوئیک'' اور ''فلاسک'' جیسے ماہر اور تجربہ کار ملاح ہیں۔ یہ سب کپتان آہاب کے اندر جلتی انتقام کی آگ بجھانے کے لیے جہاز پر ملازم ہیں۔ آہاب کو موبی ڈک کے بچ نکلنے اور اپنی ٹانگ کے ضائع ہونے کا بہت دکھ ہے، یہ دکھ انتقام بن کر اسے دن رات پریشان اور بے چین کر رہا ہے، اس بے چینی کا علاج موبی ڈک کی موت ہے۔

کیپٹن آہاب اپنے عملے کو وہیل مچھلیوں کے بارے میں ایک سیر حاصل لیکچر دیتا ہے۔ موبی ڈک کی عادات اور اس کے ڈیل ڈول کے بارے میں بتلاتا ہے اور نشانی یہ بتلاتا ہے کہ اس کے جسم میں مختلف شکاریوں کے نیزے پیوست ہوں گے۔ وہ بڑی چالاکی سے شکاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور پھر اس سے بچنے کی ترکیبیں بتلاتا ہے۔ اپنے عملے کو پوری طرح باخبر کر کے وہ سمندری سفر پر روانہ ہوتا ہے۔

سمندری سفر میں کیپٹن آہاب عقابی نظروں سے موبی ڈک کو تلاش کرتا ہے۔ کچھ روز سمندر میں سفر کے بعد آہاب

اچانک دیکھتا ہے کہ سمندر میں فوارے چھوٹ رہے ہیں اور وہ چلا کر اپنے عملے سے کہتا ہے ''یہی ہے موبی ڈک'' اپنے نیزے سنبھالو اور حملے کے لیے تیار ہو جاؤ''

چار کشتیاں جہاز سے سمندر میں اتاری جاتی ہیں اور ملاح نیزے لے کر موبی ڈک پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن موبی ڈک پھرتی سے جوابی حملہ کرتی ہے اور ان کے نیزوں کو توڑ دیتی ہے اور خود غائب ہو جاتی ہے۔ اسی دوران دوسری وہیل مچھلیاں ان پر حملہ کرتی ہیں۔ ایک وہیل مچھلی کو ملاح مارتے ہیں۔ اس حملے میں ٹیگو کا پاؤں ایک مردہ وہیل مچھلی کے جبڑے میں پھنس جاتا ہے کیوکیگ بڑی جوانمردی اور بہادری سے ٹیگو کا پاؤں جبڑے سے نکالتا ہے اور اسکی جان بچاتا ہے۔ جہاز کا سارا عملہ اس کی تعریف کرتا ہے اور اسے ہیرو کا خطاب دیتا ہے۔ کپتان آہاب کو موبی ڈک کے غائب ہونے کا بہت افسوس ہے اور وہ دن رات ''موبی ڈک نظر کیوں نہیں آتی'' کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔ اور دن رات اس لمحے کو یاد کرتا ہے جب اس کا پاؤں موبی ڈک کے جبڑے میں پھنسا تھا اور اسے اپنی ٹانگ سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ جب جب اسے یہ گھڑی یاد آتی ہے اس کے انتقام کی آگ تیز تر ہو جاتی ہے۔

آخر چند دنوں کے بعد اس کا موبی ڈک سے سامنا ہو جاتا ہے۔ اپنے سامنے برف کا ایک پہاڑ دیکھ کر وہ چلاتا ہے:

''وہ دیکھو موبی ڈک''

سب کشتیوں میں بیٹھ کر اپنے نیزے سنبھال کر موبی ڈک کی طرف بڑھتے ہیں۔ کپتان آہاب خود بھی حملے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ موبی ڈک پینترے بدل بدل کر ملاحوں پر حملہ کرتی ہے اور کشتیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ جہاز کو نقصان پہنچاتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ آہاب کا انتقام شدید ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگر موبی ڈک نہیں مرتی تو ہمیں مر جانا چاہیے اور اعلان کرتا ہے:

''جو بھی موبی ڈک کو مارے گا میں سونے کے دس گنا سکے ملاحوں میں تقسیم کروں گا۔''

دوسرے دن موبی ڈک پھر آتی ہے۔ ملاح اس پر حملہ آور ہوتے ہیں لیکن ان کے نیزے آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں اور ان کی کشتیاں سمندر میں ڈوب جاتی ہیں۔ ملاح زخمی ہوتے ہیں موبی ڈک کے حملے سے ان کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں۔ ملاح تیر کر جہاز پر واپس چلے جاتے ہیں۔ دو دن بعد موبی ڈک پھر آتی ہے، ملاح اس پر حملہ کرتے ہیں۔ سارا دن موبی ڈک ان سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ رات کے وقت ملاح لالٹین لے کر موبی ڈک کو تلاش کرتے ہیں لیکن موبی ڈک ان کے ہاتھ نہیں آتی۔

دوسرے دن بہت سی وہیل مچھلیاں پیکاڈ جہاز کا پیچھا کرتی ہیں۔ ملاح ان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور پھر اچانک ان میں موبی ڈک ظاہر ہوتی ہے، اس پر نیزوں سے حملہ کیا جاتا ہے۔ کپتان بڑی بہادری سے اس پر حملہ کرتا ہے اور ایک نیزہ اس کے جسم میں اتار دیتا ہے۔ موبی ڈک کپتان کی کشتی کو دھکیل کر سمندر میں لے جاتی ہے اور پھر وہ اپنے بڑے دشمن پیکاڈ کی طرف بڑھتی ہے اور اس پر حملہ کرتی ہے۔ کپتان آہاب دوسرا نیزہ بھی موبی ڈک کے جسم میں گھونپ دیتا ہے۔ موبی ڈک غصے میں آ کر کشتیوں کو باری باری سمندر کی نذر کرتی ہے۔ ملاح سمندر میں ڈوبتے ہیں موبی ڈک پھر جہاز کے پیندے میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جہاز میں پانی بھر جاتا ہے اور جہاز سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ کپتان آہاب انتقام کی حسرت دل میں لے کر اپنے ساتھیوں سمیت لقمہ اجل ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ملاح اسماعیل زندہ رہتا ہے۔ جو یہ ساری داستان سناتا ہے۔ موبی ڈک جہاز اور ملاحوں کو تباہ کر کے سمندر میں فاتحانہ انداز میں غائب ہو جاتی

ہے۔

اسماعیل اس کہانی کا آغاز کرتا ہےاور ساری کہانی اسی کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ کپتان آہاب موبی ڈِک سے انتقام لینے کیلئے بیڈفورڈ کے ساحل سے جوفوج لے کر سمندر کی طرف گیا تھا۔اسماعیل اس فوج کا آخری سپاہی ہے۔ جو میدان کارزار سے واپس لوٹا ہے۔''موبی ڈِک'' نے اسے شاید اس لیے زندہ چھوڑا ہے کہ وہ یہ کہانی لوگوں تک پہنچا سکے۔

ہرمن میلول اس لحاظ سے ایک بدقسمت آدمی ہے کہ اسے اپنی زندگی میں وہ مقبولیت اور شہرت حاصل نہ ہوسکی جو اسے مرنے کے بعد ملی۔اس کی سفری یادداشتوں کولوگوں نے کچھ عرصہ یاد رکھا اس کے بعد کی تحریروں کو وہ خاطر میں نہ لائے بحثیت شاعر اسے لوگوں نے تسلیم نہ کیا حالانکہ اس نے امریکی نظم نگاری میں طویل ترین نظم (Clarel) لکھی۔ جو ایک طالب علم کا ارض مقدس کی طرف بحثیت زائر سفر ہے۔ یہ 1876ء میں چھپی اس کی صرف 350 کاپیاں بکیں۔1925ء میں ہرمن میلول کے ایک نقاد نے نیویارک لائبریری میں اس کی ایک کاپی دیکھی۔اس کتاب کے صفحات اب تک جڑے ہوئے تھے۔اسے کسی نے اپنے نام جاری تک نہیں کرایا تھا۔بقول نقاد (Lewis Mumford)

"It had sat there unread for 50 Years."

بعد میں اسکی شاعری کا انتخاب چھاپا گیا مگر بحثیت شاعر اسے خاطر خواہ پذیرائی نہ مل سکی۔

ہرمن میلول کی اصل شہرت اس کا ناول ''موبی ڈِک'' ہے۔اسے مقبول بنانے اوراس کے محاسن قارئین کے سامنے پیش کرنے میں میلول کے بائیوگرافرز کا بڑا ہاتھ ہے۔اس کے تین بائیوگرافرز

1- Raymond Weaver

2- Carl Van Doren

3- Lewis Mumford's

پیش پیش ہیں۔

1921ء میں ریمنڈ کی کتاب Melville Man Mariner and mystic چھپی تو میلول پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور میلول کا احیا ہوا۔اس کے بعد 1925ء میں Lewis Mumford کی کتاب ''ہرمن میلول'' چھپی اور پھر ہرمن میلول کے نام پر ادبی تنظیمیں بننے لگیں اور اس کا نام چاروں طرف پھیل گیا۔

''موبی ڈِک'' ہرمن میلول کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے۔بے شک اسے اپنے عہد میں پذیرائی نہیں ملی لیکن آج وہ دنیائے ادب کا ایک بے مثال شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔اس کے اسلوب، زبان اور مشکل اندازِ تحریر میں بہت کچھ کہا گیا یہاں تک کہ اس پر یہ الزام بھی لگا کہ ہرمن میلول الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں بڑا لاپرواہ ہے اور ایسے غیر مانوس اور روائتی الفاظ سے فقرے مرتب کرتا ہے کہ قارئین کو سمجھنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ انگریزی کے مشہور ناول نگار آر۔ ایل سٹیونسن (Robert Louis Stevenson) نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

(Melville had no Ear)

لیکن میلول کا اپنا نظریہ تھا:

"To Produce a Mighty Book, you Must Choose A Mighty Theme and it must be Dealt with in the Grand Style."

اور ظاہر ہے گرینڈ سٹائل کی زبان ایسی ہی ہوگی جیسی میلول نے استعمال کی۔

ناول نگاری کی ابتدا سے ناول کے موضوعات محبت، نفرت، موت، زندگی، دوستی دشمنی، خدا، انسان، لالچ، دولت، غرور، نیکی، بدی کے تصادم کے دائرے میں گھومتے رہے ہیں۔نسل در نسل سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہرمن میلول نے جو موضوع چنا ہے وہ خیر وشر کی لڑائی ہے۔کیپٹن آہاب کی ٹانگ ''موبی ڈِک'' نے ضائع کی۔ وہ اس سے انتقام لینا چاہتا ہے۔اس ''موبی ڈِک'' سے جو کھلے سمندر میں آزادی سے زندگی گزار رہی ہے۔وہ سمندر سے باہر جا کر کسی کو تکلیف نہیں دیتی۔جبکہ انسان اس کے گھر آ کر اسے مارتا ہے۔اس کی آزادی میں خلل ڈالتا ہے۔''موبی ڈِک'' کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اس دشمن کا راستہ روکے جو اس کی حدود میں آ کر اس کی آزادی چھینتا ہے۔آہاب شر کی علامت ہے اور ''موبی ڈِک'' خیر کا استعارہ ہے۔کیپٹن آہاب انسانوں کی ایک فوج لے کر ''موبی ڈِک'' کی سلطنت پر حملہ آور ہوتا ہے۔دفاع کرنا ''موبی ڈِک'' کا حق ہے۔وہ دفاع کرتی ہے۔دشمن کا راستہ روکتی ہے۔ جنگ کرتی ہے اور آہاب اور اس کے ساتھیوں کو ختم کر دیتی ہے۔اس طرح شر کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور خیر کو فتح حاصل ہوتی ہے۔

ہرمن میلول جب ''موبی ڈِک'' لکھ رہا تھا تو اسے خطرہ تھا کہ اس موضوع سے لوگ اختلاف نہ کریں اسے ڈر تھا:

"That this work Might be Looked upon as a monstrous fable"

اور شاید ہاتھورن کا بھی یہی خیال تھا:

''موبی ڈِک'' سمندری مہمات پر شاید ہومر (Homer) کی اوڈیسی کے بعد سب سے بڑا سمندری سفر نامہ ہے۔ سمندری زندگی، طوفان، خونخوار وہیل مچھلیوں سے ملاحوں کی مڈبھیڑ، ملاحوں کی زندگی کے نشیب وفراز، ساحلی زندگی کے خطرناک واقعات، ساحلی سراؤں میں ملاحوں کی لڑائیاں، شب وروز کی تفصیل، جنسی زندگی کے مناظر۔''موبی ڈِک'' کے کردار، ان کی نفسیاتی پرتیں، شخصیت کے خدوخال، ان کی آپس کی لڑائیاں، سمندری سفر میں ان کے بدلتے ہوئے لب ولہجے، یہ سب کچھ ہرمن میلول نے ہنرمندی سے قلم بند کیے ہیں۔ جدید اور قدیم نقادوں کو بس ایک ہی اعتراض ہے کہ میلول نے ان کی بول چال کی زبان میں کوئی فرق نہیں رکھا۔سب ایک ہی زبان بولتے ہیں۔

''موبی ڈِک'' اپنی خوبیوں اور فنی صفات کی بنا پر نہ صرف امریکی بلکہ دنیائے ادب کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔ بقول مشہور نقاد (Susan Cheevers)

"Moby Dick has become Melville's Most Famous work and is considered one of the Greatest Literary works of all Times."

ارنسٹ ہیمنگوے کا مشہور ناول بوڑھا اور سمندر (Old man and Sea) ''موبی ڈِک'' سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اس میں آدمی کو فاتح قرار دیا گیا ہے جبکہ ''موبی ڈِک'' میں جیت مچھلی کی ہوتی ہے۔

ہرمن میلول کی ساری زندگی مصیبتوں، الجھنوں کا شکار رہی۔ آخری دنوں میں معاشی حالات تو قدرے سنبھل گئے لیکن ذہنی پریشانیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔گھریلو زندگی بہت کٹھن حالات سے دوچار رہی۔شہر میں افواہیں گردش کرتی رہیں کہ وہ بہت بڑا شرابی ہے، بیوی سے بُرا سلوک کرتا ہے اور وہ میلول سے خوش نہیں۔ میلول پر پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔دیوانہ ہے، جنونی ہے۔اس میں شک نہیں وہ ایسا تھا۔بسیار شراب نوشی نے اس کے دیوانہ پن میں اضافہ کر دیا تھا۔ بیوی کے رشتے داروں نے اس کی بیوی پر بہت زور ڈالا کہ وہ میلول سے طلاق لے لے، عدالت سے رجوع کرے۔مگر

اس نیک بخت نے ایسا نہ کیا۔ اولاد میلول کو چھوڑ کر بھاگ گئی مگر وہ اس کے ساتھ رہی۔ بیوی نے اس کی شراب چھڑانے کی بہت کوشش کی اور اسے قدرے کامیابی بھی ہوئی۔ ہرمن میلول 28 ستمبر 1891ء کو فوت ہو گیا اور اسے بیوی کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ اس کی کتاب (Pierre) کے 26 ویں باب کا یہ ٹکڑا اس کی قبر کا کتبہ ہے:

''میرے خیال میں ہر بہادر آدمی کے پاس سواری کے لیے دو گھوڑے ہونے چاہیں۔ ایک سمندر اور ایک خشکی، سرکس کے آدمی کی طرح اسے گھوڑے سے اترنا نہیں چاہیے۔ بلکہ گھوڑا بدل بدل کر سواری کرنی چاہیے اور سورج کی روشنی میں اسے دوڑ میں شامل رہنا چاہیے۔''
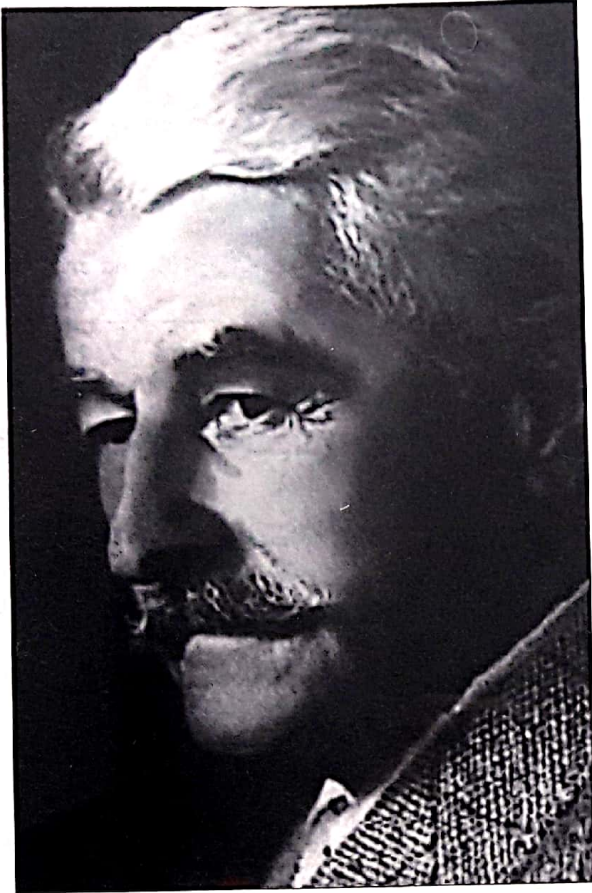
ولیم فاکنر

(William Faulkner)

ولیم فاکنر کو امریکہ کا عظیم ادیب مانا جاتا ہے۔ ولیم فاکنر بیسویں صدی کے صنعتی اور سائنسی دور کو فساد اور شر کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ ولیم فاکنر نے ناول میں مرتی تہذیب اور بکھرے خاندانوں کے نقشے کھینچے ہیں۔ جن میں اچھائی اور برائی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

ولیم فاکنر

کارکردگی، محنت، ریاضت اور کاوش کے شجر پر پھل ضرور آتا ہے اور ایسے موقعوں پر لوگ ثمر دار درخت یا فرد کی طرف اشارہ کر کے ضرور کہتے ہیں:

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

''دانہ'' زمین کی تہہ دار گہرائیوں اور اندھے غاروں میں سفر کر کے کس طرح زمین کا سینہ چیر کر باہر آتا ہے یہ دانہ ہی جانتا ہے مگر اس کی ذات میں اپنے آپ کو دکھانے اور ذات کا اظہار کرنے کے لیے جس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

ولیم فاکنر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ بڑے پاپڑ بیلے۔ بڑی محنت کی، بہت ذلت اٹھائی، تب جا کر دنیا نے اسے تسلیم کیا اور جب اسے نوبل انعام ملا اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ وصول کرنے سویڈن گیا تو اس نے کہا:

''یہ انعام مجھے نہیں میرے کام کو دیا گیا ہے''

ولیم فاکنر بہت کاہل، ناکارہ اور بے کار طالب علم تھا۔ کلاس میں جاتا تو بیٹھا دیواروں کو دیکھتا رہتا اور پھر جب دیکھتا کہ استاد نے بلیک بورڈ پر کچھ لکھنے کے لیے اپنا رخ پھیر لیا ہے تو وہ کلاس روم سے بھاگ جاتا تھا۔ اس کے باپ کی برتنوں کی دکان تھی اور اس نے گھوڑے بھی پال رکھے تھے جنہیں وہ کرائے پر دیتا تھا۔ بس ولیم فاکنر گھوڑوں اور حبشیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلتا اور مچھلیاں پکڑتا رہتا تھا۔ دوسرا شوق جو اسے ہر وقت بے چین رکھتا تھا وہ لائبریری میں جا کر شکاریوں کی کتابیں پڑھنے کا تھا۔ پھر پڑھتے پڑھتے اسے لکھنے کا شوق چرایا اور وہ کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ سارا دن کاغذ کالے کرتا رہتا شام کو بے ترتیب جملے اور الٹی سیدھی باتیں جن میں کوئی ربط نہ ہوتا تھا پڑھ کر بہت غصہ آتا اور وہ سارے کاغذ پھاڑ دیتا اور سو جاتا۔ مایوسی بڑھی تو اس نے اپنے والدین سے درخواست کی کہ اسے ادب پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں داخل کرا دیا جائے۔ ماں باپ کو اس کی حالت پر رحم آیا اور انہوں نے اسے سٹیٹ یونیورسٹی آکسفورڈ میں داخل کرا دیا جہاں اس نے انگریزی ادب پڑھنا شروع کر دیا۔ انگریزی شاعری پڑھتے پڑھتے شوق نے پھر انگڑائی لی اور اس نے شاعری شروع کر دی جو نہایت فضول کوشش تھی اور بے معنی الفاظ کا ایک پلندا۔ روسی مصنف گوگول کی طرح ایک شام موم بتی کی روشنی میں اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر شاعری سے توبہ کر لی۔ اسی اثنا میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ولیم فاکنر کے نزدیک یہ جنگ صلیبی جنگ تھی اور اس جنگ میں شریک ہونا اس کے نزدیک کارِ ثواب تھا۔ چنانچہ اس نے جنگ لڑنے والوں میں اپنا نام درج کرا دیا۔ جنگ ہے تو قتل و غارت اور بربادی کا کھیل مگر ولیم فاکنر کے لیے یہ بہت نیک فال ثابت ہوئی۔ ایک تو اس نے فاکنر کے سب کس بل نکال دیئے۔ ایک تو بے ترتیبی میں ترتیب پیدا کر دی اور دوسری بات جو بڑی اہم ثابت ہوئی وہ یہ کہ اسے لکھنے کے راستے پر ڈال دیا۔ اس نے ایک ناول لکھنے کا ڈول ڈالا جس کا نام اس نے (Soldier's Pay) رکھا۔ جب ساری دنیا سو جاتی تو یہ لکھتا رہتا اور آخر اس نے یہ ناول مکمل کر لیا۔ پبلشر کو دیا تو اس نے

(Sound and Fury) میں ان سیاہ فام لوگوں کی جدوجہد نظر آتی ہے جو وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کر رہے تھے۔

....

ولیم فاکنر نے خود کلامی کا انداز جیمز جوائس اور ہرمن میلول سے لیا ہے۔

(Howard Hawks)

....

یہ انعام مجھے نہیں میرے کام کو دیا گیا۔

(نوبل انعام ملنے پر ولیم فاکنر کی تقریر)

جواب دیا۔

''بالکل فضول اور بکواس ہے۔ دوبارہ لکھو'' ولیم فاکنر نے پبلشر کی بات کا بُرا نہ منایا۔ دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔ ناول مکمل کیا اور پبلشر کو بھیج دیا۔ اس نے چھاپ دیا۔ اس کے اسے پیسے بھی ملے جو سیر و تفریح میں اجاڑ دیئے۔ ولیم فاکنر کی چھپنے والی باقاعدہ پہلی تحریر "Soldier's Pay" تھی۔

ولیم فاکنر کا سن پیدائش 1897ء ہے مقام نیو ایلبینی۔ باپ کا نام مرے سی فاکنر، ماں کا نام ماڈ بٹلر۔ ولیم فاکنر کے تین بھائی اور بھی تھے جن کے نام مرے، جون اور ڈین تھے۔ ولیم فاکنر کا پردادا بہت رنگین مزاج، مہم جو اور داستانی کردار تھا۔ اس کے پردادا نے قتل بھی کئے مگر چالاک بہت تھا، ثبوت یوں غائب کر دیتا تھا کہ عدالت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی۔ جب امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس نے بڑھ چڑھ کر جنگ میں حصہ لیا۔ وہ بہت سخت گیر سپاہی تھا۔ فوجی قوانین پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اپنی بیوہ ماں کے خرچے پورے کرنے کے لیے اسے پیسہ کمانے کا جنون تھا۔ محنت کرتے کرتے ایک ریلوے لائن کا مالک بن بیٹھا۔ اس میں اس کا ایک کاروباری ساتھی بھی تھا۔ اس سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں الگ ہو گئے لیکن ریاستی الیکشن میں آمنے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔ فاکنر کا پردادا جیت گیا اور اس کا مخالف ہار گیا۔ مگر پردادا کا مخالف چالاک آدمی تھا، ایک دن موقع پا کر اس نے فاکنر کے پردادا کو قتل کر دیا۔ شہر کے لوگ اس سے بہت محبت کرتے تھے چنانچہ انہوں نے چندہ اکٹھا کر کے اس کا ایک مجسمہ بنا کر اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے قریب کھڑا کر دیا۔ پردادا کا تفصیلی ذکر اس لیے ضروری تھا کہ جس طرح روسی مصنف دوستوئیفسکی کے ہاں اس کے باپ کا کردار اس کے کئی ناولوں میں آتا ہے اور مختلف کرداروں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس طرح فاکنر نے اپنے پردادا کی داستان اور دلچسپ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اکثر ناولوں میں آنے والے کرداروں میں سمو دیا ہے۔

ولیم فاکنر کو انگریزی ہسپانوی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس نے اخباروں میں مضامین لکھے، کتابوں کی دکانوں پر نوکری کی۔ گھر میں رنگ و روغن کا کام کیا۔ بڑھئی کی دکان پر ملازمت بھی کی اور کچھ عرصہ پوسٹ ماسٹر بھی رہا۔ 1929ء میں اس نے ایسٹیل اولڈھیم سے شادی کی اور روزی کمانے کے لیے کام کرنے کے لیے کمر کس لی۔ پھر ہالی وڈ سے اسے فلموں کا سکرپٹ لکھنے کا دعوت نامہ آ گیا۔ (Howard Hawks) ہالی وڈ کا مشہور ڈائریکٹر اس کا بڑا مداح تھا۔ اس نے ولیم فاکنر کو کیلیفورنیا بلوایا اور فلموں کے لیے سکرپٹ لکھنے کے لیے کہا۔ ولیم فاکنر کہتا ہے ''مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی چنانچہ میں نے لکھنا شروع کر دیا۔''

ولیم فاکنر نے The Big Sleep نامی فلم کا سکرپٹ لکھا۔ ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول To Have and Have not کی فلمی تشکیل کی۔ بہت پیسے کمائے، بہت سے معاشقے کیے۔ ایک معاشقے پر ہاتھا پائی بھی ہوئی اور پھر ایک دن اس نے ہاورڈ سے کہا:

''میں سٹوڈیو میں بیٹھ کر کام نہیں کر سکتا۔ گھر بیٹھ کر کام کروں گا''۔ ہاورڈ نے بات مان لی اور ولیم فاکنر کاغذ اٹھا کر ہوٹل چلا گیا جہاں اس کا قیام تھا۔ دس پندرہ دن تک جب ولیم فاکنر آیا اور نہ لکھا ہوا کوئی کاغذ تو ہاورڈ ہاک ہوٹل چلا گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ تو پندرہ روز ہو گئے ہوٹل چھوڑ کر جا چکا ہے اور پھر ولیم فاکنر واپس لوٹ کر ہالی وڈ نہ آیا اور اپنے ادبی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں کا ماحول اور فضا اس علاقے کے گرد گھومتی ہے جہاں وہ رہتا تھا اور وہ علاقہ اس کے شہر آکسفورڈ کے نواح کا علاقہ تھا۔ اس کے بیشتر ناولوں میں اسی علاقے کی چھاپ ہے۔ اس لئے اس

علاقے کی شناخت کی وجہ سے اسے ولیم فاکنر کا (Postage Stamp) کہتے ہیں۔

ولیم فاکنر کا کہنا ہے کہ لکھنے کے لیے کسی طے شدہ فارمولے یا ماڈل کی ضرورت نہیں۔ اگر نئے لکھنے والے کسی فارمولے کے تحت لکھیں گے تو ان سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔ انہیں لکھنا چاہیے اور اپنی غلطیوں سے سیکھنا چاہیے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط۔ فاکنر نے ایک بار یہ بات کہی تھی۔

"The Good Artist Beleives That no Body is Good Enough to Give him Advice."

ولیم فاکنر کی تحریروں کے کردار پرانی نسل کے زمیندار، رئیس اور جاگیردار تھے، وہ سیاہ فام جوان کے ملازم تھے، ان کے ظلم و ستم سہہ کر بھی خاموش رہتے تھے۔ اس کی تحریروں میں ان سیاہ فام لوگوں کی جدوجہد بھی نظر آتی ہے جو وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کر رہے تھے۔

شراب ولیم فاکنر کی ساری زندگی کمزوری رہی۔ یہ بات اس کے خاندان اور پریس کے لوگوں پر عیاں تھی۔ ولیم فاکنر ساری عمر اس عذاب میں مبتلا رہا۔ وہ ہر وقت شراب پیتا رہتا تھا۔ لکھتے وقت شراب نوشی اور تیز ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ یہ شراب ہی ہے جو اس کے لکھنے کے تخلیقی عمل کو تیز تر کر دیتی ہے۔

ولیم فاکنر نے کئی عشق کئے۔ جب بھی موقع ملا اس نے عشق کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ہالی وڈ گیا تو ڈائریکٹر ہاورڈ ہاک کی سیکرٹری میٹا کارپینٹر سے عشق شروع کر دیا۔ ایک لڑکی جو خود بھی مصنفہ تھی۔ اس نے ولیم فاکنر کو اپنا گرو مانا اور فاکنر اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ 1950ء میں نوبل انعام لینے سٹاک ہوم گیا تو اس کی ملاقات ایلس جانسن سے ہو گئی۔ 1953ء تک اس سے فاکنر کا معاشقہ چلتا رہا۔ یہ خاتون اخبار کی رپورٹر تھی۔ 1946ء میں اس نے فاکنر کا انٹرویو لیا تھا۔ جین سٹین جو ایک اخبار کی ایڈیٹر تھی، کئی کتابیں لکھ چکی تھی۔ اس کا باپ فلم پروڈیوسر تھا۔ ایک عرصہ فاکنر اس کے عشق میں مبتلا رہا۔ یہ سارے عشق ولیم فاکنر کی کہانیوں اور ناولوں میں موجود ہیں بس کرداروں کے نام اور مقامات بدل لیتے ہیں۔

ولیم فاکنر نے کہانیاں بھی لکھیں اس کی کہانیوں کے پہلے مجموعے کا نام These 13 تھا جس میں اس کی مشہور کہانیاں شامل ہیں۔

1) A Rose of Emily.

2) Red Leaves.

3) The Evening Sun.

4) Dry September.

یہ ولیم فاکنر کی نمائندہ کہانیاں مانی جاتی ہیں۔

شہری زندگی کے بارے میں لکھے گئے تین ناول

1) The Hamlet

2) The Town

3) The Mansion

جو شہری ماحول اور شہر میں رہنے والے لوگوں کی نفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں اس نے دس سال کے اندر اندر وہ سارا کام مکمل کر لیا جو اس کا بہترین کام تصور کیا جاتا ہے اور پھر 1950ء

میں اسے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ فرانس، جاپان کے دورے کیے۔ ورجینیا یونیورسٹی میں کچھ عرصہ وزیٹنگ پروفیسر رہا اور 6 جولائی 1962ء کو انتقال کر گیا۔

ولیم فاکنر کو امریکہ کا عظیم ادیب قرار دیا جاتا ہے۔

وہ اپنی تحریروں میں خطیب کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے الجھن بھی محسوس ہوتی ہے اور اس کی تحریروں میں ابہام بھی موجود ہے۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ فاکنر کے نزدیک بیسویں صدی کا صنعتی اور سائنسی دور دراصل فساد کی جڑ ہے جو شر کے سوا کچھ نہیں۔

ولیم فاکنر نے بہت کچھ لکھا اور بہت اچھا لکھا جس کو نقادوں نے بہت سراہا ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے۔ ولیم فاکنر کا پہلا باقاعدہ ناول Soldier's Pay ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک رسالے ''ڈبل ڈیلر'' میں خاکے اور تحریریں لکھ چکا تھا اس کے ناولوں اور کہانیوں کے مجموعے میں چند کے نام یہ ہیں۔

1) Lost Generation.

2) Fin de Siecle.

3) Sartoris.

4) Sancturary.

5) Requiem for a Nun.

6) As I Lay Daying.

7) Light in August.

8) The Fire and Hearth.

9) Go Down Moses.

10) Intruder in the Dust.

11) Knights Gambit.

ولیم فاکنر کا ناول "Sanctuary" ایک اختلافی ناول ہے جس کا موضوع ریپ ہے۔ کہتے ہیں اس ناول سے ولیم فاکنر کو منافع بھی ہوا اور شہرت بھی ملی۔ کچھ نقادوں کا کہنا ہے کہ ادبی دنیا میں یہ ولیم فاکنر کا مکمل تعارف تھا۔ نقادوں نے اس ناول کی تعریف بھی کی لیکن ساتھ ساتھ اعتراضات اور اختلافات کا ایک دفتر بھی کھل گیا۔ ''Sanctuary'' کی کہانی تحیر سے بھری ہے۔ واقعات میں دلچسپی ہے اور واقعات کی کڑیاں ملانے میں ولیم فاکنر نے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے (ولیم فاکنر کی بھی یہی رائے ہے) کہ ولیم فاکنر نے یہ ناول پیسہ کمانے کے لیے لکھا۔ اصل ناول ساؤنڈ اینڈ فیوری ہے۔ جس نے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''Sound and Fury'' ولیم فاکنر کا اہم اور مقبول ترین ناول ہے۔ اس ناول کے بارے میں نقادوں کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ ناول ولیم فاکنر کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس میں اس کی فنی مہارت اپنے پورے عروج پر ہے۔ ولیم فاکنر نے خود بھی اس ناول کے بارے میں لکھا ہے کہ اس ناول نے اس کی جان کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ ناول لکھتے ہوئے اس نے اپنے سینئرز سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ جیمز جوائس اور ہرمن میلول سے اس نے

بہت استفادہ کیا ہے۔ خود کلامی کا سارا انداز ان دونوں ناول نگاروں کی دین ہے۔

''ساؤنڈ اینڈ فیوری'' کی کہانی دراصل ایک خاندان کی کہانی ہے جو بتدریج عروج سے زوال کی طرف گامزن ہے۔ ایک ایسے گلدستے کا قصہ ہے جس کا ہر پھول اور پھول کی ہر پتی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔ ایک ایسا خاندان جس کے کردار ایک طرف اپنے ماضی اور عظمت رفتہ کی یادوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اپنی بچی کھچی عزت کی دھجیاں بکھیرنے میں مصروف ہیں۔ اس ناول کے معصوم کرداروں کو زنا، شراب اور جنس زدہ ماحول میں رینگتے ہوئے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ''ساؤنڈ اینڈ فیوری'' ایسی معصومیت کی داستان ہے جو کہیں کھو گئی ہے اور جسے تلاش کرنا قاری تو قاری ناول نگار کے بس کی بھی بات نہیں گرچہ یہ ناول ایک خاندان کا المیہ ہے لیکن اس کہانی میں ایک پورا عہد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے۔

''ساؤنڈ اینڈ فیوری'' مس سی پی کے ایک خاندان کی کہانی ہے۔ اس خاندان کی عزت اور جاہ و جلال قابل ذکر تھا۔ ایک دبدبہ تھا جو ماضی کی گرد میں کھو چکا ہے۔ اس کے کچھ سیاہ فام ملازمین ہیں۔ اس زمانہ میں سیاہ فام اپنے حقوق کی لڑائی لڑ رہے تھے، ہر جگہ مظاہرے اور ہنگامے جاری تھے۔ اقدار اب بدلنے لگی تھیں، عہد کروٹیں بدل رہا تھا مگر اس خاندان کے مرکزی کردار جاسن کامپسن اور اس کی بیوی کیرولین یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ زمانہ بدل رہا ہے حالانکہ تبدیلی ان کے گھر ہی میں آنا شروع ہو گئی ہے۔ ان کا باغ اجڑ چکا ہے۔ درجنوں گھوڑوں میں سے صرف تین گھوڑے باقی رہ گئے ہیں۔ بگھی ٹوٹ چکی ہے۔

جاسن کامپسن کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے کوئنٹین سب سے بڑا بیٹا ہے۔ بیٹی کیڈی، بہت خوبصورت ہے اور دوسرے نمبر پر ہے، موریس کامپسن دوسرا بیٹا ہے اور سب سے چھوٹا بیٹا بنجی ہے۔ جو کمال حد تک بے وقوف ہے۔

جاسن جاسن کا شوق صرف ایک ہے وہ لائبریری میں بیٹا سارا دن شراب پیتا رہتا ہے اسے کچھ پتا نہیں کہ اس کی اولاد کیا کر رہی ہے۔ اس بے خبری میں اولاد جوان ہو جاتی ہے اور جوانی ان میں کچھ تبدیلیاں لے کر آتی ہے۔ جس سے بہت اہم ترین واقعات رونما ہوتے ہیں اور سب سے عبرتناک واقعہ بنجی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ بنجی پیدائشی طور پر بے وقوف تو تھا ہی جوان ہوا تو اس سے ایک اور حماقت سرزد ہو گئی اور اس نے شہر کی ایک لڑکی کا پیچھا شروع کر دیا، پھر موقع پا کر اس کی عزت لوٹ لی۔ شہر والوں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ گھر والوں کو پتہ چلا تو اسے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا۔ لیکن مشتعل لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے ساری عمر کے لیے مردانگی سے محروم کر دیا۔ کیڈی اور کوئنٹین نے شرم و حیا کی ساری حدیں پار کر لیں اور نہایت جنس زدہ زندگی گزارنے لگے۔ کوئنٹین کو گھر والوں نے ہاورڈ یونیورسٹی میں داخل کرانے کا منصوبہ بنایا۔ خرچہ پورا کرنے کے لیے انہوں نے بنجی کے حصے کی وہ زمین بیچ دی جو اس کے دادا نے اس کے نام کی تھی۔ کیڈی کے لیے انہوں نے کوئی لڑکا تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لڑکا مل گیا۔ شادی کر دی۔ مگر کیڈی کو عادت تھی کہ وہ ہر روز اپنے لئے کوئی نیا عاشق ڈھونڈتی تھی جس سے اس کا خاوند ہربرٹ بہت پریشان تھا۔ ہربرٹ کا اپنا بینک تھا کیڈی کے والد کو یہ رشتہ اس لیے بھی منظور کرنا پڑا کیونکہ اسے امید تھی کہ شاید شادی کے بعد وہ جاسن کو بینک میں ملازم رکھ لے۔ کوئنٹین خودکشی کر لیتا ہے باپ کی وفات کے بعد جاسن اب گھر کا مالک ہے۔ سیاہ فام ملازم اس سے خوش نہیں۔ جاسن ایک سٹور پر نوکری کر لیتا ہے۔ اس کا خرچہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ ہفتے بعد کچھ پیسے ماں اور بنجی کو خرچے کے لئے دیتا ہے۔
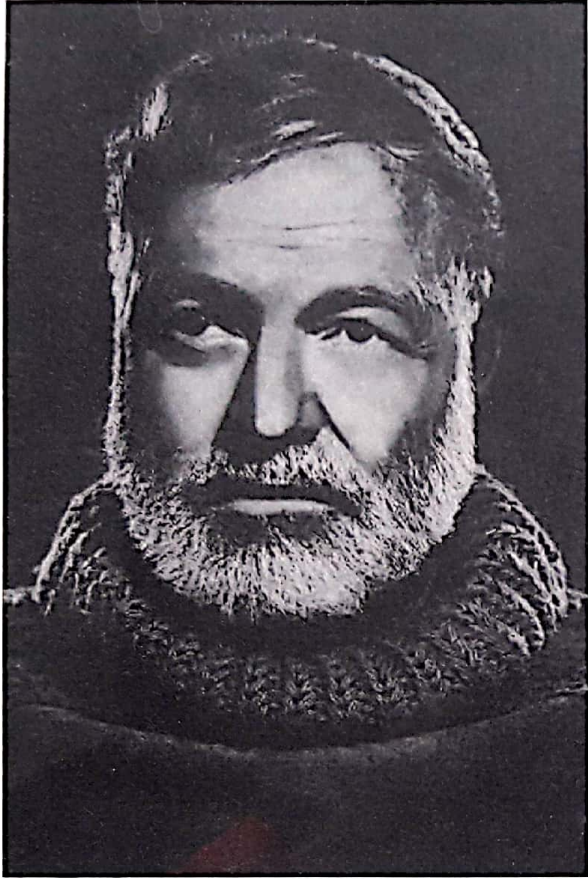
کیڈی کی شادی ناکام ہوتی ہے۔ ہربرٹ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ کیڈی کی بیٹی جوان ہوتی ہے اور اب وہ جاسن اور اپنی ماں سے نفرت شروع کر دیتی ہے اور خود بھی عشق کرنا شروع کر دیتی ہے۔ رات کو جب گھر والے سو جاتے ہیں تو اپنے عاشق سے ملنے چلی جاتی ہے جاسن کو جب پتہ چلتا ہے تو وہ اسے بُرا بھلا کہتا ہے اور اسے اپنی ماں کی دوسری شکل قرار دیتا ہے کہ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ چنانچہ یہ لڑکی اپنے ماموں جاسن کی باتوں سے تنگ آ کر ایک رات گھر سے بھاگ جاتی ہے اور جاتے جاتے 5000 ڈالر بھی لے جاتی ہے جو جاسن نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی نانی مسز کامپسن لائبریری میں اسی کرسی پر بیٹھی ہے جہاں اس کا خاوند بیٹھا شراب پیتا تھا بنجی باورچی خانے میں بیٹھا اپنی نامردانگی کا رونا رو رہا ہے۔ جاسن کو 5000 ڈالر جانے کا افسوس ہے اور تینوں اپنے خاندان کی تباہی پر اداس ہیں اور آنسو بہا رہے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ولیم فاکنر کی تحریروں میں ہمیں ہرمن میلول اور جیمز جوائس کی خودکلامی موجود ہے اور ان کی خصوصیات کا پرتو موجود ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ اس کے اس ناول میں ہمیں دو مصنفین کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ دو ناول نگار ہاتھورن اور دوستوئیفسکی ہیں۔ نقادوں کا خیال ہے کہ ہاتھورن کے ناول A House of Seven Gables اور دوستوئیفسکی کے ناول The Brothers Karamazov کا اس کے ناول ساؤنڈ اینڈ فیوری سے کچھ نہ کچھ رشتہ یا مماثلت ضرور ہے۔

Sound and Fury کا عنوان ولیم فاکنر نے شیکسپیئر کے ڈرامے ''میکبتھ'' کے ایک مشہور مصرعے سے لیا ہے:

"Life is a Tale

Told by an Idiot . Full of Sound and Fury Signifying Nothing."

کامپسن کے بیٹے بنجی (Benjy) کا کردار ایک پیدائشی بے وقوف اور دماغی طور پر کمزور آدمی کا کردار ہے۔ کوئنٹین اور جیسن کے حوالے سے بھی یہ عنوان درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی ساری گفتگو بے وقوفی اور حماقتوں کی مختلف پرتیں کھولتی ہے۔ شور اور غوغا ہے مگر اندر معانی کا موتی موجود نہیں۔ صرف بربادی اور زوال کی گرد اڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں ایک عالی شان، جاہ و جلال والے خاندان کی تباہی اور موت ہے اس ناول کا یہ جملہ جو غالباً ناول کے آخر میں آتا ہے ناول کی روح کو پیش کرتا ہے اور ناول لکھنے کے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔ جملہ یہ ہے:

"The Way to Dusty Death"

ولیم فاکنر نے نوبل انعام لیتے وقت اپنی تقریر میں کہا تھا:

"People must Write About Things That Come From the Heart, "Univesal Truths."

ولیم فاکنر نے اپنی تحریروں میں یہی انداز اپنایا۔ دل سے لکھا اور بین الاقوامی سچائیوں کے بارے میں لکھا۔

ارنسٹ ہیمنگوے

(Ernest Hemingway)

ارنسٹ ہیمنگوے بیسویں صدی کا مقبول ناول نگار ہے۔ اس کے ناول، شارٹ سٹوری اس کی مہماتی اور بھرپور زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس نے دوسری عالمی جنگ میں حصہ لیا اور جنگ کی ساری روداد اپنے ناولوں میں بھر دی۔

میری زندگی کا بیشتر وقت خطرناک جانوروں کو مارنے میں گزرا، کچھ لوگ موت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں ان میں سے ایک میں ہوں۔ میں اپنے آپ کو کبھی نہیں مار سکتا۔

(ارنسٹ ہیمنگوے)

....

2 جولائی 1961ء کو ایک مصنف جسے نقاد اس صدی کا بڑا ناول نگار کہتے ہیں۔ جس نے نوبل انعام اور کئی انعام جیتے جس نے جی بھر کے شادیاں کیں۔ لندن، امریکہ، پیرس اور سپین میں جس کے خوبصورت گھر تھے۔ اس آدمی نے 2 جولائی 1961ء کو شارٹ گن سے اپنا خاتمہ کرلیا۔

(Cosmopolitan اخبار کی خبر)

....

ہر آدمی کی زندگی کا انت ایک جیسا ہوتا ہے صرف ایک چیز اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے زندگی کیسے گزاری اور اسے موت کیسے آئی۔

(ارنسٹ ہیمنگوے)

ارنسٹ ہیمنگوے

میو کلینک سے ڈسچارج ہونے کے دو دن بعد 2 جولائی 1961ء کو وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ اس نے الماری سے اپنی شارٹ گن نکالی۔ اس میں دو کارتوس ڈالے۔ گن کا اگلا حصہ اپنے منہ میں ڈالا اور بندوق کی لبلبی دبا دی۔ ڈاکٹر سکاٹ ارل 7 بج کر 40 منٹ پر اس کی رہائش گاہ پر آیا جس نے تصدیق کردی کہ ارنسٹ ہیمنگوے مر چکا ہے۔ ساری دنیا حیران تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ جبکہ وہ کئی بار کہہ چکا تھا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ ایوا گارڈنر اپنے زمانے کی خوبصورت اداکارہ جب گال سٹون کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھی تو ارنسٹ ہیمنگوے اس کی تیمارداری کے لئے گیا (ایوا گارڈنر نے اس کی لکھی کہانی پر بننے والی فلم The Killers میں برٹ لنکاسٹر کے ساتھ کام کیا تھا)۔ باتوں باتوں میں موت کا ذکر چھڑ گیا۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے کہا:

''میری زندگی کا بیشتر وقت خطرناک جانوروں کو مارنے میں گزرا ہے۔ کچھ لوگ موت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے آپ کو کبھی نہیں مار سکتا۔''

(Cosmopolitan) رسالے کے سٹاف رپورٹر مسٹر اے ای ہوچنر نے ارنسٹ ہیمنگوے پر بہت خوبصورت کتاب (Papa Hemingway) لکھی ہے جسے ساری دنیا میں دلچسپی سے پڑھا گیا۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے۔

''2 جولائی 1961ء کو ایک مصنف جسے سب نقاد اس صدی کا بڑا ناول نگار کہتے تھے۔ جسے زندگی سے بہت پیار تھا۔ جس کی فطرت میں مہمات شامل تھیں۔ جس نے ادب کے میدان میں نوبل انعام اور متعدد بڑے انعامات جیتے۔ جس سے پیار کرنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ جس نے جی بھر کے شادیاں کیں۔ لندن، امریکا، پیرس اور سپین میں جس کے خوبصورت گھر تھے۔ اس آدمی نے 2 جولائی 1961ء کو شارٹ گن سے اپنا خاتمہ کرلیا۔ ایسا کیوں کیا اس نے؟''

یہ سوال ساری دنیا کے لیے حیران کن تھا۔ ارنسٹ ہیمنگوے جیسے سخت جان، مہم جو اور بہادر سپاہی سے یہ بات ممکن نہ تھی، لیکن اصل بات یہ تھی کہ اسے ایک ذہنی بیماری ورثے میں ملی تھی جس بیماری کی وجہ سے اس کے باپ نے بھی خودکشی کی۔ خاندان کے پانچ دیگر افراد بھی اسی بیماری کی نذر ہوئے۔ خودکشی کرنے والوں میں اس کی پوتی مارگس بھی شامل تھی۔ ارنسٹ ہیمنگوے بھی اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ارنسٹ ہیمنگوے کی موت کو اگر اس کی پچھلی زندگی کے تناظر میں دیکھیں تو یقین نہیں آتا کہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والا ارنسٹ ہیمنگوے کیا وہی ارنسٹ تھا جو میدان جنگ میں سب سے آگے دشمنوں کے علاقے میں بلا خوف وخطر چلا جاتا تھا۔ 1918ء میں یہ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور تھا۔ اس کی ڈیوٹی اٹلی کے محاذ پر تھی۔ کینٹین پر بیٹھے ہوئے ایک بم کے گولے سے بُری طرح زخمی ہوگیا۔ باوجود شدید زخموں کے اس نے ایک اطالوی فوجی کی جان

بچائی اور اسے محفوظ مقام پر پہنچایا۔ ان جرأت مندانہ اقدام پر اٹلی کی حکومت کی طرف سے (Silver Medal of Bravery) دیا گیا۔ اسکی مہماتی زندگی کے حیرت انگیز واقعات پڑھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ارنسٹ ہیمنگوے نے خود کو نہیں مارا۔ اسے تو ورثے میں ملی ہوئی ذہنی بیماری مار گئی۔

ارنسٹ ہیمنگوے 21 جولائی 1899ء کو اوک پارک (شکاگو کے نواح) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ گریس ہال ہیمنگوے ایک دیہاتی ڈاکٹر تھا۔ وہ ارنسٹ ہیمنگوے کی پیدائش پر اتنا خوش ہوا کہ گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر بگل بجا کر اعلان کیا کہ اس کی بیوی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔

ہیمنگوے کی ماں کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اوپیرا شوز میں کبھی کبھی گیت بھی گاتی اور لوگوں کو موسیقی بھی سکھاتی تھی۔ ماں نے ارنسٹ کو بھی موسیقی کی طرف لانے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ اسے تو شکار اور مچھلی پکڑنے کا شوق تھا۔ جنگلوں میں جا کر کیمپ لگانا اور خطرناک جانوروں کو دیکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ اس کے باپ کا (Walloon) جھیل کے پاس ایک گھر تھا۔ ارنسٹ زیادہ وقت وہیں گزارتا۔ دور دراز گنجان جنگلوں میں جا کر رہنا اسے بہت پسند تھا۔ فطرت کے اس قرب نے اس کی تحریروں میں بڑی جگہ پائی ہے۔ سکول کے زمانے میں اس نے سکول کے میگزین اور اخبار کو سنبھالا۔ یہ تجربہ اس کے بہت کام آیا۔ جب وہ سکول سے گریجوایشن کر کے فارغ ہوا تو اسے ایک اخبار میں رپورٹر کی نوکری مل گئی۔ یہ نوکری اسے اپنے چچا کے توسط سے ملی جو چیف ایڈیٹر کا دوست تھا، اس کا خیال تھا کہ جس طرح مارک ٹوین، سٹیفن کرین ناول نگار بننے سے پہلے صحافی تھے۔ ارنسٹ کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے یہاں صرف چھ ماہ نوکری کی مگر یہاں اس نے اچھی نثر لکھنے کے سنہری اصول سیکھے جو یہ تھے۔

جملہ مختصر لکھو۔ پیراگراف لمبا نہ ہو۔ انگریزی کے طاقت ور الفاظ لکھو۔ انداز منفی نہیں مثبت ہونا چاہیے۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے پہلی جنگ عظیم ہسپتال کی نوکری میں دیکھی۔ اسے فوج میں جانے کا بہت شوق تھا۔ انٹرویو دیا تو اپنی خراب آنکھ کی وجہ سے ملٹری میں نہ جاسکا۔ اسے بچپن میں باکسنگ کا بہت شوق تھا۔ باکسنگ سیکھتے سیکھتے اپنی ایک آنکھ خراب کر بیٹھا۔ اس کا شوق دیکھ کر اسے ریڈ کراس میں ایمبولینس ڈرائیور کی نوکری مل گئی۔ چھ مہینے میلان میں وہ زیر علاج رہا (اٹلی کی کینٹین میں وہ ایک گولے سے شدید زخمی ہو گیا تھا) میلان ہسپتال میں وہ ایک نرس سے محبت کرنے لگا۔ طے یہ پایا تھا کہ جب وہ صحت مند ہو گا تو وہ ارنسٹ سے شادی کر لے گی لیکن حالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ اس نرس نے ایک اطالوی آفیسر سے شادی کر لی۔

ارنسٹ ہیمنگوے میلان سے شکاگو چلا آیا۔ مختلف اخباروں کے لئے رپورٹنگ کرنے لگا۔ یہیں ہارڈلے رچرڈسن سے ملاقات ہوگئی۔ وہ عمر میں آٹھ سال بڑی تھی۔ ارنسٹ نے 1921ء میں اس سے شادی کر لی۔ اس کے بعد ارنسٹ ہیمنگوے ایک اخبار کا نمائندہ بن گیا اور پیرس چلا گیا۔

پیرس میں نامور ادیبوں کا ایک گروہ ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ وہ ایک تحریک سے وابستہ تھے جس کا نام (Lost Generation) تھا۔ ایذرا پاؤنڈ بھی ان میں سے ایک تھا۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، ایذرا پاؤنڈ ہی دراصل پہلا آدمی تھا جس نے اس کے تخلیقی جوہر کو پہچانا اور حوصلہ افزائی کی، دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ جیمز جوائس سے ارنسٹ ہیمنگوے کی ملاقات ایذرا پاؤنڈ کی معرفت ہوئی۔ ارنسٹ ہیمنگوے اخبار ''ٹورنٹو سٹار'' میں اپنے سفرنامے کے حصے بھی چھپواتا رہا۔ ایک سفر کے دوران اس کا ایک بکس بھی گم ہو گیا جو اس کی کہانیوں اور نامکمل ناولوں کے

مسودات سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دُکھ برسوں ارنسٹ ہیمنگوے کو رُلاتا رہا۔

ایذرا پاؤنڈ نے ارنسٹ ہیمنگوے کی ملاقات فورڈ میڈوکس فورڈ سے 1924ء میں کرائی۔ ارنسٹ نے فورڈ کی ''ٹرانسلیٹنگ ریویو'' مرتب کرنے میں مدد کی۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی ابتدائی کہانیاں اسی میں چھپیں۔ 1926ء میں ارنسٹ ہیمنگوے کا پہلا ناول The Sun Also Rises چھپا۔ یہ ناول ارنسٹ کو مقبولیت دلوانے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ ناول کی کہانی ہیرو جیک بارنس کے اردگرد گھومتی ہے، جسے جنگ نے بہت بڑا زخم دیا ہے۔ اور وہ زخم ہے اس کی مردانہ صلاحیت سے محرومی۔ اسے نہ نیند آتی ہے، نہ چین، بس روتا رہتا ہے۔ اسے سماج اور سوسائٹی کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی ہے۔ وہ پیرس جا کر ایک ایسے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے جس کی ساری سرگرمیاں بے مقصد ہیں۔ ان میں ہر شخص جنگ کا زخم خوردہ ہے اور گم کردہ راہ ہے۔ شاید یہی وہ لوگ تھے جن کو دیکھ کر ایذرا پاؤنڈ اور اس کے ہم خیال ادیبوں نے اپنی تحریک کو (Lost Generation) کا نام دیا تھا۔

ارنسٹ ہیمنگوے کو بُل فائٹنگ کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک عرصہ یہ سوچتا رہا کہ وہ مصنف بنے یا ''بُل فائٹر'' آخر اس نے ووٹ مصنف بننے کو دیا، لیکن بُل فائٹنگ کو وہ اپنے اندر سے نہ نکال سکا۔ اس کا ناول (Death in After Noon) اسی موضوع پر ہے۔ اس نے اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے بہت سی لڑائیاں دیکھیں۔ بُل فائٹنگ کے بہت سے فیسٹیول دیکھے۔ اس ناول میں اس نے بل فائٹنگ کے مذہبی اور روایتی پس منظر پر بحث کی ہے۔ وہ سپین کے پس منظر پر لکھتے ہوئے سپین کے مہاگرو سے بے حد متاثر تھا جس کا نام (Pio Baroja) تھا۔ جب ارنسٹ کو نوبل انعام ملا، تو انعام لے کر سیدھا Pio Baroja کے پاس گیا۔ صرف یہ بتلانے کے لئے کہ اس انعام پر مجھ سے زیادہ تمہارا حق تھا۔

ارنسٹ ہیمنگوے کو سپین سے بہت پیار تھا۔ اس نے وہاں ایک عرصہ اخباری نمائندے کی حیثیت سے گزارا۔ جب سپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس نے اس میں حصہ لیا اس کا ناول For whom the Bell tolls اسی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ جس میں اس نے سپین کے بارے میں اپنی معلومات کو شامل کر کے ناول کو ایک شاہکار بنا دیا ہے۔

دنیا کے دوسرے بڑے مصنفین کی طرح ارنسٹ نے بھی اپنی مہماتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو کہانیوں کا موضوع بنایا اور پل پل کے تجربے کو تحریر میں استعمال کیا ہے مثلاً اس کا ناول A Farewell to Arms جس میں اس نے اپنے دو عاشقانہ قصوں کو شامل کر کے جنگ کے پس منظر میں ایک خوبصورت ناول بنا دیا ہے۔ جب ارنسٹ ہیمنگوے میلان میں تھا اسے اگنس نامی نرس سے محبت ہوئی لیکن ناکامی ہوئی۔ اس ناول کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ ہیرو نرس سے محبت کرتا ہے۔

جب اسے میدان جنگ میں دوبارہ جانے کا حکم ملتا ہے تو وہ اس کو لے کر سوئٹزرلینڈ چلا جاتا ہے۔ نرس اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ نرس کیتھرین بارکلے ہسپتال میں داخل کی جاتی ہے جہاں وہ بچے کو جنم دینے والی ہے۔ دردِزہ کے اس تاثر کو جس طرح ارنسٹ ہیمنگوے نے تحریری شکل دی ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی ہارڈلے کو اس میں مبتلا دیکھ چکا تھا۔ نرس مر جاتی ہے اور ہیرو خالی دامن لے کر ہسپتال سے چلا جاتا ہے۔ ارنسٹ شاید یہ بتلانا چاہتا ہے کہ آدمی جب تک زندہ ہے وہ سماجی بندھنوں میں جکڑا رہتا ہے جبکہ مرنے کے بعد وہ ایسے ہر بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آسان، پختہ اور صاف نثر اور حقیقی کرداروں نے اس ناول کو شاہکار بنا دیا ہے۔

ارنسٹ ہیمنگوے بچپن ہی سے افریقہ کے جنگلات دیکھنے کا بہت خواہش مند تھا۔ چنانچہ 1933ء میں اسے افریقہ جانے کا موقع ملا۔ اس نے ممباسہ، کینیا، ٹانگانیکا اور نیروبی کا سفر کیا اور مغربی حصے کی جھیل تک پہنچ گیا۔ اس دورے سے اس نے اپنی کہانیوں کے لیے مواد اکٹھا کیا۔

1937ء میں ارنسٹ ہیمنگوے کا ناول (To Have or Have not) چھپا اس ناول کا ہیرو ہیری مورگن ایک سمگلر ہے جو ایمانداری سے گھر نہیں چلا سکتا تھا چنانچہ کیوبا کے علاقے سے امریکی چیزیں اسمگل کرنا شروع کر دیتا ہے اور ایک دن مارا جاتا ہے بقول فلپ ینگ۔ ارنسٹ اس ناول کے ذریعے ہمیں یہ بتلانا چاہتا ہے کہ جب آدمی اکیلا رہ جائے تو شکست اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

ارنسٹ ہیمنگوے کے ناولوں میں مصروف عمل ہیرو کو اس کے اپنے کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ناول کا ہیرو ارنسٹ ہیمنگوے کی کہیں نہ کہیں جھلک ضرور دکھاتا ہے۔ اسکی پہلی کہانی کا ہیرو بچہ نِک ہے جس کے سامنے اس کا ڈاکٹر باپ ایک جیبی چاقو سے ایک عورت کا پیٹ کاٹ کر کے بچہ پیدا کرتا ہے۔ عورت تکلیف میں تڑپ رہی ہے نک پانی کا برتن لے کر باپ کے پاس کھڑا ہے۔ عورت کا خاوند بیوی کی تکلیف دیکھ کر اپنا گلہ کاٹ لیتا ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ بچہ نِک (جو دراصل ارنسٹ ہیمنگوے کا اپنا کردار ہے) ساری زندگی اس منظر کو اپنے ذہن سے نہ بھلا سکا اور یہ بچہ درد کی کیفیت اور تکلیف ساری زندگی ارنسٹ کے دل میں چھپے رہے اور اس کے کرداروں میں نظر آتے رہے۔ اس کا ناول A Farewell to Arms میں نرس کیتھرین کا بچہ جننے کا منظر ذہن میں لائیں اور ہیرو کو ہسپتال کے برآمدے میں ٹہلتا دیکھیں۔ اس کے چہرے پر کیتھرین کی درد بھری آوازوں سے وہی تاثر ملے گا جو نِک کے چہرے پر اس وقت تھا جب انڈین کیمپ نامی کہانی میں پانی کا برتن لے کر وہ اپنے باپ کے پاس کھڑا تھا۔

اس کے ناول For whom the bell tolls کے ہیرو رابرٹ جارڈن پر نظر ڈالیں اس کی الجھن، پریشانی، جنگ میں زخمی ہونا، ماریا سے اس کی محبت، زخموں کے باوجود اپنے فرض کی ادائیگی اور انسانی ہمدردی کا جذبہ (یہاں ارنسٹ ہیمنگوے کا وہ دلیرانہ کام یاد آجاتا ہے جب اس نے باوجود زخمی ہونے کے ایک اطالوی فوجی کی جان بچائی تھی) اور رابرٹ جارڈن کی موت اور یہ موت بھی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے۔

جنگل، پہاڑیاں، جھیلیں اور میدان جنگ، یہ سب ارنسٹ کی پسندیدہ جگہیں تھیں جو بچپن سے اس کے ذہن میں رچی بسی تھیں اور سب سے بڑھ کر سمندر! ارنسٹ بچپن ہی سے مچھلیوں کے شکار پر سمندر میں دور دور نکل جاتا تھا اسے سمندر کا بہت تجربہ تھا۔ اس تجربے اور مشاہدے کو اس نے اپنے مشہور ناول بوڑھا اور سمندر (Old Man and Sea)۔

''بوڑھا اور سمندر'' ایک بوڑھے مچھیرے سنتیا گو کی کہانی ہے جو مچھلیاں پکڑتا ہے اور بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ ایک بار وہ مچھلیوں کی تلاش میں اپنی چھوٹی سی کشتی لے کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ آخر سمندر میں بہت دور جا کر ایک بڑی اور جسیم بڑی مچھلی مارلن اس کے کانٹے یا جال میں پھنس جاتی ہے۔ دو دن اور دو راتیں سنتیا گو ڈوری تھام کر اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا رہتا ہے۔ یہ بھاری مچھلی اس کی کشتی کو کھینچ کر سمندر میں دور تک لے جاتی ہے۔ سنتیا گو ہمت نہیں ہارتا اور ڈوری کو تھامے رکھتا ہے۔ آخر یہ بڑی مچھلی جو کانٹے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی مر جاتی ہے۔ اب سنتیا گو اسے کھینچ کر کنارے کی طرف کشتی چلانا شروع کر دیتا ہے۔ سنتیا گو تھک چکا۔ بھوکا پیاسا ہے، لیکن ہمت نہیں ہارتا۔ اپنی محنت پر خوش ہے لیکن اس کی محنت پر سمندر کی دوسری مچھلیاں پانی پھیر دیتی ہیں۔ وہ مارلن کو کانٹے میں پھنسا دیکھ کر اسے کھانا شروع کر دیتی ہیں۔

سنتیا گو اسے کنارے کی طرف لے جا رہا ہے۔ سمندر کی شارک مچھلیاں اسے کھاتی رہتی ہیں اور پھر کانٹے میں صرف مارلن کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے لیکن سنتیا گو کو کوئی افسوس نہیں ہوتا اور ڈھانچہ لے کر گھر آجاتا ہے۔

اس ناول کا سب سے بڑا وصف بوڑھے سنتیا گو کا کردار ہے جو باہمت ہے۔ اپنی دھن کا پکا، فطرت اور مخالف حالت سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ سنتیا گو ایک ماہر اور تجربہ کار مچھیرا ہے۔ ڈوری ڈالنے اور ڈوری سنبھالنے میں وہ دوسروں سے زیادہ مہارت رکھتا ہے۔ اس ناول میں ارنسٹ ہیمنگوے ہمیں یہ بتلانا چاہتا ہے کہ بوڑھا ہونا ایک عذاب ہے، جب آدمی بوڑھا ہو جائے تو قسمت اور حالات دونوں اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں اگر شکست بھی ہو تو آدمی ثابت قدم رہ کر فتح حاصل کر سکتا ہے۔ سنتیا گو کا کردار ایک مثالی کردار ہے۔ اس کے لئے مارلن کا زندہ پہنچنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے بڑھاپے کو اس کی طاقت کے مقابلے میں کھڑا کر دیتا ہے مارلن اسے سمندر میں لے جاتی ہے۔ سنتیا گو اسے کنارے کی طرف لے جانے کا پختہ ارادہ کرتا ہے۔ باہمت اور ثابت قدم رہ کر کنارے کی طرف جانا شروع کر دیتا ہے اگر سمندری مچھلیاں مارلن کو نہ کھاتیں تو سنتیا گو اسے کنارے پر لے جاتا لیکن جب وہ ڈھانچہ دیکھتا ہے تو پھر بھی اسے مایوسی نہیں ہوتی وہ اس ڈھانچے کو گھر لے جاتا ہے اور گہری نیند سوجاتا ہے اور جوانی کے خوابوں میں کھو جاتا ہے:

شکست و فتح مقدر سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ارنسٹ ہیمنگوے کے نزدیک زندگی فطری طاقتوں کے خلاف (وہ طاقتیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں) ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔

ارنسٹ ہیمنگوے کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد کرتے گزری۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا اور بھرپور حصہ لیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر ہسپتال میں تھا۔ اس کے جسم پر 57 ٹانکے لگے تھے لیکن جب اسے بھرتی شروع ہونے کی خبر ملی تو سب ٹانکے توڑ کر بھرتی کے دفتر چلا گیا۔ وہ خطرناک جنگی محاذوں پر سب سے آگے آگے رہا۔ جنگی اخباری نمائندے کی حیثیت سے جب یہ محاذ پر ہوتا تھا تو کمپنی کے کمانڈر کو سب سے زیادہ فکر اسی کی ہوتی تھی کہ جنگ میں اس کی پوزیشن کیا ہے اور اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ارنسٹ ہیمنگوے زندگی بھر اس نظریے کے ساتھ جیتا رہا کہ

"Man Can be Destroyed but not Defeated"

ارنسٹ ہیمنگوے کو یہ ناول خود بھی بہت پسند تھا۔ جب ہالی وڈ والوں نے اس ناول پر فلم بنانے کا منصوبہ بنایا تو اس نے اس میں بھرپور دلچسپی لی۔ اس نے ہفتوں سکرپٹ پر محنت کی۔ اسکی کانٹ چھانٹ کی۔ پیرو (Peru) کے ساحل پر مہینہ بھر کیمرہ سٹاف کے ساتھ گھومتا رہا۔ اور شوٹنگ کے لئے مارلن مچھلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا جو فلم بندی کے وقت کانٹے سے نکل جاتی تھی۔ چنانچہ پھر Culver City کے تالاب میں ربڑ کی مچھلی ڈال کر شارٹ لیا گیا اور پھر اس نے پہلی بار پوری فلم دیکھی ورنہ وہ فلم میں اکثر سو جایا کرتا تھا۔ فلم دیکھ کر اس نے صرف ایک جملہ کہا اور وہ ہیرو یعنی سنتیا گو کا کردار کرنے والے مشہور اداکار سپنسر ٹریسی کے بارے میں تھا، جملہ یہ تھا۔

''سپنسر ٹریسی بوڑھے مچھیرے کے کردار میں بہت توانا، موٹا اور امیر آدمی دکھائی دیتا ہے''

اس کے ناولوں اور کہانیوں پر جتنی بھی فلمیں بنیں وہ ان سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا اگرچہ ہالی وڈ والوں نے اس سے

بڑا مال کمایا۔ جب اس کے ناول A Fare Well to Arms پر فلم بنی تو یہ Hotchner کے ساتھ فلم دیکھنے کے لئے گیا اور 35 منٹ کے بعد سینما ہال سے باہر آ گیا اور کہنے لگا۔

''تم نے دیکھا (Hotchner)، آدمی سالہا سال محنت کرتا ہے اور کتاب لکھتا ہے۔ دیکھو یہ کتاب کا کیا حشر کرتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی اپنے باپ کے بیئر کے گلاس میں پیشاب کر دے۔''

گھریلو اور نجی زندگی میں بھی وہ ہمیشہ آگے اور تیز رفتار رہا۔ اس نے چار شادیاں کیں۔

ان چاروں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے صرف مارتھا سے اسے گلہ تھا کہ شادی کے بعد بھی وہ بیوی سے زیادہ اخباری نمائندہ ہے۔ (مارتھا اس کے ساتھ ایک اخبار کی نمائندہ تھی)۔

ارنسٹ ہیمنگوے نے ایک بھرپور زندگی گزاری اسکی نجی محفلوں میں خوبصورت خواتین کا ایک ہجوم رہتا تھا اور خواتین اس پر دل و جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ Hotchner کی کتاب جب چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو ارنسٹ ہیمنگوے کی نجی زندگی کے کئی حیرت انگیز پہلو سامنے آئے اور کئی حیران کن حقائق بھی۔ مثلاً ماتا ہری ایک خوبصورت، دلچسپ اور پراسرار کردار تھی جو جنگ عظیم میں سورج کی طرح ڈوبتا اور ابھرتا نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جاسوس تھی۔ جو ہٹلر کے لئے کام کرتی تھی، اسے 1917ء میں پیرس میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ ارنسٹ ہیمنگوے اس کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا اور اس سے تعلقات بڑھائے ارنسٹ کہتا ہے کہ ماتا ہری افسران اعلیٰ کو اپنے حسن کا دان دیتی تھی۔ میں اعلیٰ افسر تو نہ تھا لیکن حسن کا دان وصول کرنے والوں میں میرا نام بھی آتا ہے۔ 1965ء میں (Caedmon Records) نے ایک ایل۔ پی۔ ریکارڈ جاری کیا تھا جس کا نام Earnest Hemingway. Recordings ہے اس میں اس واقعے کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ارنسٹ ہیمنگوے کو اس کا قریبی حلقہ ''پاپا ہیمنگوے'' کے نام سے پکارتا تھا۔ لیکن کچھ خوبصورت جوان خواتین (خاص طور پر ہالی وڈ کی ہیروئنیں) اسے پاپا کہنے سے گریز کرتی تھیں۔ مثلاً ان خواتین میں انگرڈ برگ مین واحد خاتون تھی جسے ارنسٹ ''بیٹی'' کہہ کر بلاتا تھا مگر وہ اسے پاپا کہنے پر راضی نہ تھی۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا:

"I dont Have Papa Feelings for him."

ارنسٹ ہیمنگوے اپنے عہد کا ایک اہم ترین آدمی تھا۔ ادبی اور سیاسی لوگوں کے ساتھ اس کے مراسم تھے۔ امریکا کے حساس ادارے FBI کے ساتھ اس کا رابطہ تھا۔ انقلابی اور آزادی کی جدوجہد کرنے والے لوگوں میں اس کا نام احترام اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کیوبا کے فیڈل کاسترو کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ کاسترو کی کامیابی کے لئے دعا گو تھا اور اس کے لئے (All Luck) کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ لیکن جب ارنسٹ ہیمنگوے کے دوست (Manolo Castro) کو قتل کر دیا گیا تو وہ فیڈل کاسترو سے ناراض ہو گیا۔

ایذرا پاؤنڈ، جیمز جوائس، گرٹروڈ سٹین، شیروڈ انڈرسن اس کے قریبی دوست تھے۔ یہ وہ دست تھے جنہوں نے اس کی تخلیقی زندگی کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اتنی مصروف، ہنگامہ خیز مہماتی زندگی گزارنے والے ارنسٹ ہیمنگوے نے بہت ادبی کام لیا۔ دراصل جو کچھ اس نے زندگی میں دیکھا، زندگی میں برداشت کیا یا جو کچھ اس کے ساتھ گزرا اس نے اسے تحریری شکل دے دی۔ مشہور ناولوں کے علاوہ اس کا بے شمار کام ہے۔ 1938ء میں اس کا اکلوتا طویل ڈراما The Fifth Coloumn چھپا اس کتاب میں اس کی

49 کہانیاں بھی تھیں جن میں قابل ذکر:

1)- In Our Time

2)- Men Without Women

3)- Winner Take Nothing

4)- The Snows of Kilimanjaro

ان کے علاوہ کہانیوں کے دوسرے مجموعے بھی شامل ہیں جن میں اس کی مشہور کہانیاں مثلاً The Killers (جس پر فلم بھی بنی تھی) One Reader Writes,Hills Like White Eelephants شامل ہیں۔

ارنسٹ ہیمنگوے اپنی آخری کتاب Garden of Eden شروع کر چکا تھا لیکن اسے مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آخری چھپنے والی کتاب (A Moveable Feast) ہے جو اس کی وفات کے بعد چھپی۔

ارنسٹ ہیمنگوے کبھی موت سے خائف نہیں ہوا۔ اس نے میدان جنگ میں موت کو کئی بار دیکھا اور موت کئی بار اس سے کنی کترا کر گزر گئی۔ اگرچہ اس نے کئی بار اس کا پیچھا کیا۔ 1942ء میں اس نے اپنی کشتی پلار (Pilar) کی خدمات امریکی بحریہ کے سپرد کر دیں اور وہ کیوبا کے ساحل کے ساتھ ساتھ جرمن آب دوزوں کو تباہ کرنے کے لئے پھرتا رہا۔ کار کے حادثے میں شدید زخمی ہوا۔ 57 ٹانکے لگے لیکن وہ سب ٹانکے توڑ کر فوج میں بھرتی ہونے چلا گیا۔

ارنسٹ ہیمنگوے زخموں سے چُور چُور ایک بہادر آدمی تھا۔ درد قولنج، دانت کا درد، درد گردہ، چہرے، بازو اور ٹانگوں میں درد کی شکایت۔ باکسنگ کی وجہ سے انگلیوں میں درد مسلسل، کار کے حادثے میں بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی لیکن ان تمام تکالیف کے باوجود اس نے زندگی کو ٹھونک بجا کر گزارا۔ اس نے ایک بار کہا تھا:

''ہر آدمی کی زندگی کا انت ایک جیسا ہوتا ہے۔ صرف ایک چیز اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے زندگی کیسے گزاری اور اسے موت کیسے آئی۔''

ارنسٹ ہیمنگوے نے اپنی کہی ہوئی بات کو سچ کر دکھایا۔ اس نے زندگی بھی اپنے انداز میں گزاری اور مرنے کے لئے بھی اپنا انداز اپنایا۔ اس کے دونوں کاموں میں واقعی انفرادیت تھی۔

ہاورڈ فاسٹ

(Howard Fast)

بیسویں صدی کا اہم امریکی ناول نگار۔ کیمونسٹ پارٹی سے وابستہ تھا۔ 1946ء میں امریکی سینٹ نے اسے جیل بھیج دیا۔ جیل سے باہر آیا تو ایک عظیم ناول ''سپارٹیکس'' اس کے ہاتھ میں تھا۔ بیسویں صدی کے بڑے ناولوں میں اس کے ناول کا شمار ہوتا ہے۔ روسی حکومت نے اسے ''سٹالن امن'' انعام سے نوازا۔

سپارٹیکس ایک عظیم ناول ہے اور اس کا مصنف بھی بے مثال آدمی ہے۔

(پبلو نرودا)

....

قارئین اس ناول میں پبلشر کی طرف سے پرنٹ لائن نہ دیکھ کر آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ناول مصنف نے خود چھاپا ہے۔

(ہاورڈ فاسٹ)

....

''جاؤ سینٹ کے پاس جا کر یہ پیغام دے دو کہ تم نے جو ہمارے خلاف فوج بھیجی ہے وہ ہم نے تباہ کر دی ہے۔ ہم غلام ہیں جنہیں تم بولنے والے اوزار کہتے ہو۔ دنیا کوڑوں کی آواز سے بیزار ہو چکی ہے۔ جو تم ہم غلاموں پر برساتے ہو۔ پہلے سب انسان برابر تھے مگر تم نے انہیں آقا اور غلاموں میں تقسیم کر دیا ہے۔''

(سپارٹیکس سے ایک ٹکڑا)

ہاورڈ فاسٹ

ورڈز ورتھ نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاعری دراصل تنہائی میں بیٹھ کر گزشتہ یادوں کو اکٹھا کرنے کا نام ہے۔ ٹھیک ہی کہا تھا ورڈز ورتھ نے اور یہ تنہائی قید خانے سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ قید آدمی سے دنیا کی ہر آسائش، آرام اور سہولت چھین لیتی ہے۔ رشتوں ناطوں سے دوری پیدا کر دیتی ہے لیکن تنہائی نہیں چھین سکتی۔ آدمی اگر تخلیقی ہو لکھنے لکھانے کا ہنر جانتا ہو، اسلوب کی تکڑی کے پلڑے برابر رکھنے کا فن جانتا ہو تو وہ ان یادوں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ وہ ایک شاہکار کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ قید خانے میں دنیا کے بڑے بڑے لکھنے والوں نے بڑے شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ بڑے بڑے فن پاروں کی منصوبہ بندی کی ہے۔ مثلاً:

1) مارکو پولو نے جیل میں بیٹھ کر اپنا سفر نامہ لکھوایا
2) جان بنین نے جیل میں Pilgrim's Proggress لکھی
3) ابوالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' لکھی
4) دوستوئیفسکی نے اپنے بڑے بڑے ناولوں کی منصوبہ بندی سائبیریا میں سزا کے دوران کی
5) حسرت موہانی جب جیل جاتے کچھ شاہکار غزلیں لے کر باہر آتے۔

اسی طرح ہاورڈ فاسٹ (Haward Fast) نے اپنا شاہکار ناول ''سپارٹیکس (Spartacus)'' قید خانے میں مکمل کیا۔ ہاورڈ فاسٹ کا تعلق کمیونسٹ پارٹی کے اہم ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ اپریل 1946ء کی بات ہے امریکی فاشزم کا زمانہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی زیر عتاب تھی۔ ہاورڈ فاسٹ کے پیچھے جاسوس پاگل کتوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ اسے پارٹی کو چندہ دینے والے لوگوں کے ناموں کی فہرست دینے کے لیے کہا گیا۔ اس نے انکار کر دیا چنانچہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں اسے سزا دینے کے لیے ووٹنگ ہوئی 62 ممبران نے حق میں 262 نے خلاف ووٹ دیا۔ اسے جیل بھیج دیا گیا۔ ہاورڈ فاسٹ نے کاغذ سامنے رکھے۔ قلم ہاتھ میں پکڑا اور ''سپارٹیکس'' مکمل کر لیا۔ 1951ء میں ناول مکمل ہوا۔ اس ناول کو چھاپنے کے لیے کوئی پبلشر تیار نہ تھا۔ فاسٹ نے ناول خود چھاپا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی 50 ہزار کاپیاں بک گئیں اس ناول کا دنیا کی 82 زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس ناول کو بیسویں صدی کا اہم ترین ناول قرار دیا گیا۔ اردو میں اس ناول کا 1988ء میں مشہور ادیب شاہ محمد مری نے بہت خوبصورت ترجمہ کیا اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔

ہاورڈ فاسٹ 11 نومبر 1914ء کو امریکہ کے شہر نیویارک میں پیدا ہوا۔ یہودی تھا۔ ماں (IDA) برطانیہ سے ہجرت کر کے نیویارک گئی تھی اور باپ یوکرائن کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام Barney Fastorsky تھا۔ نیویارک میں آیا تو Fastorsky کو مختصر کر کے Fast بنا لیا اسی مناسبت سے ہاورڈ FAST کہلاتا ہے۔ اپنی سوانح عمری Being Red میں ہاورڈ فاسٹ اپنے گھریلو حالات کے بارے میں لکھتا ہے:

''ہم بہت غریب تھے۔ مگر میری ماں نے کبھی ہمیں محسوس نہیں ہونے دیا۔ 14 سال کی عمر ہی میں میرے باپ نے

لوہے کی فیکٹری میں مزدوری شروع کر دی تھی۔ پھر میرے باپ نے نیویارک سٹی میں چلنے والی کیبل کار میں نوکری کر لی۔ پھر ملبوسات بنانے والی فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔ اسے وہاں 40 ڈالر ہفتہ وار ملتے تھے۔ میری ماں کپڑے سی کر سویٹر بُن کر گھر کا خرچہ چلاتی تھی۔ برتن دھوتی اور مجھے اچھی اچھی کہانیاں سناتی۔ اس کا لہجہ اس قدر دلچسپ، رنگین اور دل پذیر تھا کہ اب بھی جب میں یاد کرتا ہوں تو موت کا خوف میرے دل سے غائب ہو جاتا ہے۔"

1923ء میں جب اس کی ماں مری اور باپ کی نوکری چھوٹ گئی تو حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور گھر سے ساری خوشحالی ہوا ہو گئی۔ ہاورڈ فاسٹ نے گلی گلی گھوم کر اخبار بیچنے شروع کر دیئے اور نیویارک کی پبلک لائبریری میں نوکری کر لی اور پھر مختلف شہروں میں روزگار تلاش کرنے کے لیے مارا مارا پھرنے لگا۔ ان بُرے حالات نے اس کا دھیان دو چیزوں کی طرف موڑ دیا۔ وہ لکھنے لگا اور سوشلزم کے نظریات اس کے دل میں گھر کرنے لگے۔ اس کا پہلا ناول (Two Valleys)1933ء میں چھپا۔ جب وہ 18 سال کا ہوا تو اس نے اپنا مشہور ناول(Citizen Tom Pain) لکھا۔The Last Frontier اور Freedom Road جن پر امریکی تاریخ کی چھاپ ہے بعد میں چھپے۔

1944ء میں ہاورڈ فاسٹ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا اور اس کا شمار پارٹی کے اہم آدمیوں میں ہونے لگا۔ کمیونزم کے نظریات اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملے تھے جو روئے زمین پر مزدوروں کی حاکمیت کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ جب ہاورڈ فاسٹ نے پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو امریکہ میں کمیونزم کی سخت مخالفت ہو رہی تھی اور پارٹی کی سرگرمیوں پر سخت نظر رکھی جا رہی تھی۔ کمیونزم کو کچلنے اور ملیا میٹ کرنے پر پوری توجہ دی جا رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے نام پر کمیونسٹ کو مارنا کارِ ثواب سمجھا جا رہا تھا اور پارلیمنٹ اس پارٹی کے سرکردہ افراد کو سزائیں دینے پر تلی ہوئی تھی۔ امریکی حکومت کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کو دبایا جا رہا تھا اور کمیونسٹ نامور لوگوں کے پیچھے جاسوس لگے ہوئے تھے۔ ہاورڈ فاسٹ اس ضمن میں گرفتار ہوا۔ پارلیمنٹ کی کونسل کے سامنے پیش ہوا۔ اس سے وہ فہرست مانگی گئی جس میں ان لوگوں کے نام درج تھے جنہوں نے پارٹی کے لیے چندہ دیا تھا۔ ہاورڈ فاسٹ نے فہرست دینے سے انکار کر دیا اور اسے جیل بھیج دیا گیا جہاں سپارٹیکس جیسا شاہکار اس کا منتظر تھا۔

ہاورڈ فاسٹ نے اپنے اصل اور فرضی نام سے بہت کچھ لکھا۔ ناول، فلموں کے سکرین پلے، T.V. سیریل لکھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار Daily Worker میں کام کیا۔ اس کی تحریروں میں کمیونزم نظریات کے پرچار پر اسے 1953ء میں "سٹالن امن انعام" سے نوازا گیا۔ اپنی تخلیقی زندگی کے آخر میں اسے کمیونسٹ انتظامیہ سے اختلاف ہو گیا اور اس نے پارٹی سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لیا اور سیاسی میدان سے کٹ کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اگرچہ اس نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ

"I am Niether Anti-Soviet nor anti-communist, but I can not work and write in the Communist movement."

فاسٹ نے 1933ء میں لکھنا شروع کیا اور 2001ء تک لکھتا رہا اس کا آخری ناول (Greewich)، 2001ء میں چھپا اس نے 40 ناول اپنے اصلی نام سے لکھے اور 20 ناول E.V.Caunnin Gham کے فرضی نام سے شائع کئے۔ اس کے مشہور ناولوں میں

1) Two Valleys

2) The Unvanished
3) Fallen Angel
4) The Golden River
5) Seven days in June
6) The Last Frontier
7) Citizen tom Pain
8) Freedom Road
9) April Morning
10) The American
11) Spartacus.

(E.V.Cunningham) کے فرضی نام سے اس نے جاسوسی ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا اور تقریباً دس کے قریب ناول لکھے جو خالص کمرشل نوعیت کے تھے اور عام قاری کے لیے ان میں دلچسپی کا بڑا مواد تھا۔ ان ناولوں میں

1) The Case of the Angry Actress.
2) The Case of The Russian Diplomat
The Case of the Kidnapped Angel

بہت دلچسپی سے پڑھے گئے۔

Being Red اور The Naked God اس کی یادداشتوں کے مجموعے ہیں جن میں اس نے اپنی زندگی، سیاسی اور تخلیقی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی تفاصیل لکھی ہیں۔ یہ کتابیں پڑھ کر قاری فاسٹ کے گھریلو حالات، کمیونسٹ پارٹی سے اس کی محبت اور اختلافات کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

ہاورڈ فاسٹ نے فلموں اور (T.V) کے لیے بھی بہت کام کیا۔ اس کے ناول سپارٹیکس پر ہالی وڈ میں بہت اچھی فلم بنی لیکن اس فلم کا سکرین پلے فاسٹ کا نہیں تھا۔ اس نے کئی فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں اور سکرین پلے لکھے۔ ٹیلی ویژن کے لیے کئی سیریل لکھے۔ "How the West was Won" نامی سیریل ایک عرصہ ٹیلی ویژن پر بہت شوق سے دکھایا گیا۔

ہاورڈ فاسٹ نے دو شادیاں کیں۔ 1937ء میں Bette Cohen سے اور اس کی موت کے بعد 1999ء میں دوسری شادی کی۔ آخری عمر میں فاسٹ Old Green wich چلا گیا۔ 12 مارچ 2003ء کو اس کی وفات ہوئی۔

Spartacus

سپارٹیکس ہاورڈ فاسٹ کا نمائندہ شاہکار ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور نقادانِ فن اس ناول کی تعریف میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد جب ہاورڈ فاسٹ پیرس پہنچا تو مصور پبلو نرودا نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اسے اپنی ایک Painting پیش کی اور ایک نظم لکھ کر اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

جیل کے ایام میں فاسٹ نے مظلوموں اور غلاموں کے بارے میں زیادہ گہرائی سے سوچا۔ وہ خود کہتا ہے کہ جیل میں

جا کر مجھے غلاموں کی بدتر حالت کے بارے میں زیادہ گہرائی سے سوچنے کا موقع ملا جو اس سے پہلے میں نے نہیں سوچا تھا۔ چنانچہ اس غور وفکر کا نتیجہ میری ناول سپارٹیکس ہے۔

سپارٹیکس ایک پیدائشی غلام ابن غلام کی کہانی ہے۔ جس نے صرف قتل کرنے اور لوگوں کو مارنے کی تربیت حاصل کی تھی مگر جب اس کے اندر کا انسان جاگا تو اس نے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ غلاموں کی فوج کو ترتیب دی اور سلطنت روم کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ سپارٹیکس 71 قبل مسیح کے روم کی کہانی ہے۔ تاریخی حقائق پر مبنی یہ ناول غلاموں کی زندگی، رہن سہن، مشکلات کے بارے میں ایسی تفاصیل پیش کرتا ہے جو شاید اس سے پہلے نہیں پیش کی گئیں۔

ناول کا مرکزی خیال دنیا میں زندہ انسان کی ان اقدار کو پیش کرتا ہے جن کا وہ ازل سے خواب دیکھ رہا ہے اور یہ اقدار، آزادی، محبت، امید اور اچھی مسرت بخش زندگی ہیں۔ لیکن غلامی ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ جبر کے اس خونی منظر میں سیاست بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ جبر اور سیاست مل کر انسان سے اس کے خواب چھین لیتی ہیں اور انسان محض ایک بے جان گوشت کا لوتھڑا بن کر رہ جاتا ہے جو زندگی اور آزادی کے نام سے ناواقف ہے۔ سپارٹیکس نے ان کے خلاف بغاوت کی سپارٹیکس دراصل ہر اس آدمی کا استعارہ ہے جو ظلم کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور ظالم سے ظلم کا بدلہ لیتا ہے اور اپنے حق کے لیے لڑتا ہے۔ سپارٹیکس نے روم کے ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی وہ روم کو مکمل طور پر تباہ نہ کر سکا لیکن بعد میں آنے والے اس کے پیروکاروں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

''ایک وقت آئے گا جب روم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ٹکڑے کرنے والوں میں صرف غلام ہی شامل نہیں ہونگے۔ اس میں مصیبت زدہ کسان، عوام، اور ظلم سہنے والے لوگ بھی شامل ہونگے۔ جب تک محنت کرنے والے کی محنت کا پھل لیتے رہیں گے۔ سپارٹیکس زندہ رہے گا۔ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی بلند احتجاج میں۔''

جیسا کہ میں مضمون کے پہلے حصے میں لکھ چکا ہوں کہ اس ناول کو چھاپنے سے تمام پبلشروں نے انکار کر دیا تھا۔ فاسٹ نے یہ ناول خود چھپوایا، پہلے ایڈیشن میں فاسٹ خود اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''قارئین اس ناول میں پبلشر کی طرف سے پرنٹ لائن نہ دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ناول مصنف نے خود چھاپا ہے۔ مصنف نے جب دیکھا کہ سیاسی دباؤ کی وجہ سے کوئی پبلشر ایسا کرنے پر تیار نہیں تو اسے یہ ناول خود چھپوانا پڑا۔ یہ ان ہزاروں لوگوں کی وجہ سے کیا گیا جو اس کتاب کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں۔ مصنف ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہے۔''

سپارٹیکس حال اور ماضی میں لکھا ہوا ناول ہے۔ اشرافیہ کلاس کے سات معزز افراد ایسے واقعات اور کہانیاں سناتے ہیں جس سے سپارٹیکس کی داستان مکمل سامنے آتی ہے۔ کراسس، باتیاتس، کائیس اور سائیسرو، سپارٹیکس کے بارے میں واقعات سناتے رہتے ہیں۔ اور سپاٹیکس کی زندگی کے Flashes ہمارے سامنے چلتے رہتے ہیں اور سپارٹیکس ہمارے دل و دماغ میں اپنا گھر بناتا رہتا ہے۔ سپارٹیکس ایک مصری غلام تھا جو کرو خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا مطلب مصری زبان میں جانور ہے۔ اسے یونان کے شہر تھیبز سے خریدا گیا تھا۔ آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا یہ غلام سورج کی دھوپ میں جل کر بھورے رنگ کا ہو گیا تھا۔ اس کا سارا بدن کوڑے کھا کھا کر پتھریلا ہو چکا تھا۔ زنجیروں کا بوجھ اس قدر تھا کہ سیدھا ہو کر چلنا مشکل تھا۔ اس کی گردن موٹی تھی مگر گردن پر زنجیر کی رگڑ کی وجہ سے زخم اور پھوڑے بن گئے تھے۔ بھرے بھرے ہونٹ، منہ چوڑا، مسکراہٹ کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ غلاموں کے ساتھ چٹانوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر چلتا تھا۔ جن کے بازوؤں اور گھٹنوں پر داغ پڑ چکے تھے۔ وہ دن بھر کام کرتے تھے پھر انہیں بیرک میں دھکیل دیا جاتا تھا اور زنجیریں کھول دی جاتی

تھیں۔ سارے دن کی محنت کا صلہ صرف ایک پیالہ خوراک اور آدھی چھاگل پانی دیا جاتا۔ پانی اس قدر کم تھا کہ آہستہ آہستہ ان کے گردے فیل ہو جاتے تھے اور جب وہ مر جاتے تو انہیں صحرا میں پھینک دیا جاتا تھا۔

بیرک میں بدبو اور سڑانڈ بہت زیادہ ہوتی تھی لیکن غلام جی متلانے پر قے بھی نہیں کرتے تھے انہیں خوف تھا کہ قے کرنے سے کہیں ان کے معدے میں ایک اونس خوراک کم نہ ہو جائے۔

سپارٹیکس بیرک میں بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔ وہ دوسرے غلاموں جیسا نہیں تھا۔ وہ پتھر تھا مگر کہیں نہ کہیں ان میں رحم کا جذبہ موجود تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے غلاموں کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ دوسرے سارے غلام اسے ''باپ'' نام سے بلاتے تھے۔ جب کوئی غلام اسے کہتا ہے:

''باپ یہ کیسا دوزخ ہے؟''

تو سپارٹیکس جواب دیتا:

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

سپارٹیکس اب کان سے باہر کی دنیا میں آتا ہے اور باتیاتس اسے خرید کر اپنے گلیڈیٹرز میں شامل کر لیتا ہے اسے زندگی کی ساری آسائشیں ملتی ہیں اور اب اس کا کام قتل کرنا ہے۔ اسے اکھاڑے میں بھیجا جاتا ہے اور اسے اپنے مدِ مقابل کو قتل کرنا ہے اور لوگوں کو خوش کرنا ہے۔ یہاں سپارٹیکس نے اپنی اور اپنے غلام ساتھیوں کی آزادی کی خاطر جنگ لڑنے کا منصوبہ بنایا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی کو قتل نہیں کرے گا۔ اس نے یہ بات اپنے غلام ساتھیوں کو اکٹھا کر کے کہہ دی۔ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا ''باپ تو پھر ہم کیا کریں۔''

''تم ابھی بھی الگ الگ ہو جاؤ، کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا۔''

ان غلاموں میں وہ جرمن عورت، ورینیا بھی شامل تھی جو سپارٹیکس کے آقا باتیاتس نے اسے بیوی کے طور پر بخشی تھی اور جو سپارٹیکس سے شدید محبت کرتی تھی۔

سپارٹیکس نے ایک منصوبہ بندی کے تحت تمام غلاموں کو اور گلیڈیٹرز کو پیغام پہنچایا اور پھر ایک وقت مقررہ پر سب نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ سپارٹیکس کو اپنا کمانڈر بنا لیا اور اپنے اپنے تربیتی اداروں سے باہر آ گئے۔ رومن سپاہیوں سے مقابلہ کیا لڑائی کے فن میں وہ سپاہیوں سے زیادہ ماہر تھے گلی گلی لڑائیاں ہوئیں اور سارے روم میں لاشیں سڑتی رہیں۔ غلاموں نے سرکاری اسلحہ خانوں کے تالے توڑے اور اسلحہ قبضے میں کر لیا اور پھر وہ شہر چھوڑ کر پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ ورینیا سپارٹیکس کے ساتھ تھی وہ سب سورج کی روشنی میں ایک گاؤں کے میدان میں بیٹھے تھے سپارٹیکس کے ساتھی نے کہا:

''اب ہم کہاں جائیں گے، ہر جگہ یہی غلامانہ نظام ہے''۔

سپارٹیکس نے کہا:

''ہم ہر جگہ جائیں گے، غلاموں کو آزادی دلائیں گے۔ اپنی فوج میں شامل کریں گے۔ رومن فوج کا مقابلہ کریں گے۔ یہ خدا کو معلوم ہے کہ فتح ہماری ہوگی یا رومن فوج کی۔''

سپارٹیکس نے پھر کہا:

ہم ایک ایسی دنیا بنائیں گے جہاں نہ کوئی غلام ہوگا، نہ آقا، جس چیز پر ہم قبضہ کریں گے وہ سب کی مشترک ہوگی۔ بیوی کے علاوہ کوئی عورت پاس نہیں رکھیں گے۔ عورت کو مرد کے برابر حیثیت حاصل ہوگی۔

روم سے سینٹ نے فوجیوں کے دستے کا پورا بھیجے جہاں سپارٹیکس غلاموں کی فوج لے کر موجود تھا، مگر سپارٹیکس نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ دوبارہ بھاری فوج بھیجی مگر ہزار غلاموں نے دس دس کا گروپ بنا کر ان کا خاتمہ کر دیا۔ فوجیوں کے ہتھیار چھینے، ان کے جسم سے کپڑے اتارے اور چھکڑوں پر لاد کر لے گئے۔ صرف ایک سپاہی زندہ رکھا اور اسے کہا۔

''جاؤ سینٹ کے پاس جا کر میرا پیغام دو کہ تم نے ہمارے خلاف فوج بھیجی، ہم نے اسے تباہ کر دیا، ہم غلام ہیں، جنہیں تم بولنے والے اوزار کہتے ہو، دنیا تم سے بیزار ہو چکی ہے۔ دنیا کوڑوں کی آواز سے بیزار ہو چکی ہے۔ جو تم ہم غلاموں پر برساتے ہو، پہلے سب انسان برابر تھے مگر تم نے انہیں آقا اور غلاموں میں تقسیم کر دیا۔

ہم تم سے بہتر انسان ہیں۔ ہم میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اچھے انسان میں ہونا چاہیے۔'' سپارٹیکس نے چار سال تک رومن حکومت کا مقابلہ کیا اور پھر ستر ہزار رومن فوجیوں نے سپارٹیکس کی محدود فوج کو گھیرے میں لے لیا اور اس کی فوج کا خاتمہ کر دیا۔ سپارٹیکس نے موت قریب دیکھی تو اس نے آخری احکامات اپنی نوکرانی کو کچھ اس طرح جاری کیے۔

''میز پر تھیلوں کی قطار ہے۔ ہر تھیلے میں میرے ہر غلام کے لیے آزاد ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے ہر تھیلے میں 20 ہزار سیٹرز (رومن سکہ) ہیں میں یہ چاہتا ہوں یہ تھیلے انہیں دے دو۔ انہیں کہو فوراً چلے جائیں۔''

اور پھر الماری سے اپنی ہسپانوی تلوار نکالی اور اپنے آپ کو قتل کرنے کے خیال پر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

سپارٹیکس مرا نہیں اب تک زندہ ہے۔

''جب تک انسان محنت کرتا رہے گا اور دوسرا انسان اس کی محنت کا پھل اور منافع چھینتا رہے گا۔ سپارٹیکس زندہ رہے گا، کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی بلند احتجاج میں۔''
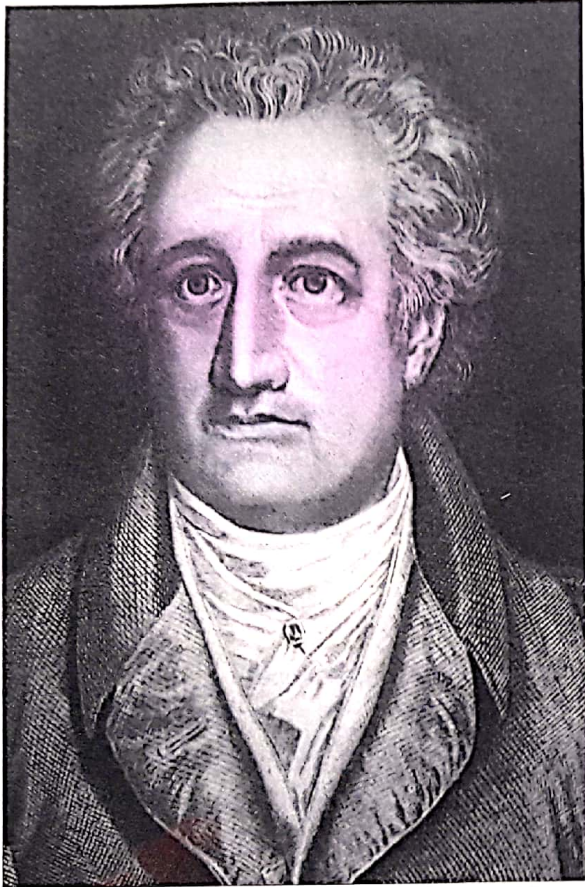
گوئٹے

(Johann Wolfgang von Goethe)

اٹھارویں صدی کا عظیم جرمنی فلاسفر، ناول نگار، ڈرامہ نویس، سائنس دان، محقق، پودوں اور رنگوں کا شناسا، نیچرل سائنس کا ماہر، ایک بڑا دماغ جس سے نکلی ہر بات ضرب المثل بن گئی ہے۔ جسے ایک عہد میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ گوئٹے ہر عہد کا بڑا دماغ ہے۔

بحیثیت شاعر جو کچھ میں نے کیا مجھے اس پر فخر نہیں لیکن اس صدی کا میں واحد آدمی ہوں جس نے رنگوں کی مشکل ترین سائنس میں منفرد کام کیا ہے جو کسی نے نہیں کیا اس پر مجھے فخر ہے۔

(گوئٹے)

....

نقادوں کے سامنے نہ آدمی جھک سکتا ہے نہ اپنا دفاع کر سکتا ہے ان سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ کام کرتے رہنا چاہیے ایک دن وہ خود آپ کے سامنے جھک جائیں گے۔

(گوئٹے)

....

" Divide and Rule, a Sound Motto ,

But Unite and Lead a Better one."

....

Art is Long , Life is Short.

(Goethe)

گوئٹے

قابلِ رشک تخلیقی طاقتوں کا دعویدار، شاعری، ڈراما، ناول، فلسفہ، پودوں، حیوانات، پتھروں اور عالم آب وگل کے چھپے بھید جاننے کا خواہش مند۔ نہ صرف ادب بلکہ سائنس کی دنیا کا ایک مستند نام گوئٹے۔ جرمنی کا سب سے بڑا ادیب جس کی نثر اور شاعری نے پوری دنیا کے ادبی منظر میں رنگ بکھیر دیئے۔ ناول، شاعری، ڈراما، موسیقی، فلسفہ، تھیولوجی، سائنس میں گراں قدر نشان چھوڑے۔ پودوں اور حیوانوں پر تحقیق کی۔ نیچرل سائنس پر اپنے خیالات کو عام کیا اور چارلس ڈارون جیسے نامور آدمی پر اثر انداز ہوا۔ ایک صدی تک اس کی تحریریں سارے یورپ کے لئے تحریک کا باعث بنیں اور پورے مغرب کو اس کی نثر اور شاعری نے ہلا کر رکھ دیا۔

گوئٹے 28 اگست 1749ء کو جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوا۔ رئیس باپ کا بیٹا تھا۔ بچپن میں ماں مرگئی، باپ جوحان کیسپر اور ایک پرائیویٹ استاد نے اسے بچپن ہی میں لاطینی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کا ماہر بنا دیا۔ ناچ، گھڑ سواری اور تیغ زنی کی تربیت اس کے علاوہ تھی۔ 1765ء اور 1768ء کے درمیان وہ لائپ زگ قانون پڑھنے چلا گیا، قانون سے زیادہ اسے شاعری سے دلچسپی تھی اور وہ نثر میں بھی بہت کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے 1770ء میں کچھ نظمیں لکھیں اور شاعری کی پہلی کتاب چھپوائی۔ ایک بار بیمار ہوا۔ بہن نے تیمارداری کی۔ بستر میں لیٹے لیٹے اس نے ایک کرائم کامیڈی لکھی جسے بعد میں اس نے ضائع کر دیا۔ صحت مند ہو کر اس نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1771ء میں وکالت کرنے کا لائسنس ملا اور 1774ء میں اس نے ایک ایسا ادبی کارنامہ سرانجام دیا جس نے اسے عالمی شہرت بخشی اور دیکھتے ہی دیکھتے گوئٹے کا نام پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ یہ ادبی کارنامہ اس کا ناول تھا جس کا نام نوجوان ورتھر کی داستانِ غم (The Sorrows of Young Werther) ہے۔ اس ناول سے اسے کوئی مالی فائدہ تو نہ ہوا کیونکہ اس وقت کاپی رائٹ نہ تھا لیکن اس کتاب کی شہرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں وہ عام آدمی سے معزز اور پروقار مسند پر جا بیٹھا۔ 1775ء میں اسے ڈیوک آف وائمار' کارل آگسٹس کا دعوت نامہ آیا اور گوئٹے اس کے مشیر خاص کے فرائض انجام دینے لگا۔ ڈیوک 18 سال کا تھا اور گوئٹے کی عمر 26 سال تھی۔ وائمار وہ جگہ تھی جہاں گوئٹے نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر عالمی شہرت حاصل کی۔

وائمار میں قیام کے دوران اپنی دفتری ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ وہ ڈیوک کے حلقہ دوستاں میں بھی شامل رہا۔ گوئٹے نے اٹلی، سسلی اور یونان کے سفر کئے اور ان سفرناموں کے بارے میں ڈائریاں لکھیں جو بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ 1792ء میں ہونے والی جنگ میں اس نے ڈیوک کے ساتھ مل کر نپولین بوناپارٹ کے سپاہیوں سے جنگ لڑی۔ فرانسیسی سپاہی اس کے گھر میں گھس آئے۔ توڑ پھوڑ کی اور یہ ان کے ہاتھوں مرتا مرتا بچا۔ ریڈگر سفرنسکی نے ایک کتاب شوپنہاؤر پر لکھی ہے جس کا نام (Shopen Hauer and the wild years of philosophy) ہے۔ اس میں اس نے گوئٹے کے سیکرٹری کے حوالے سے لکھا ہے:

"نپولین کے سپاہی گھر میں گھس آئے۔ شراب پی کر غل غپاڑہ مچایا اور چلا کر کہا۔ "گھر کا مالک کہاں ہے"۔ گوئٹے رات کے لباس میں اپنے کمرے سے باہر آیا۔ سپاہیوں نے اس پر بندوقیں تان لیں۔ گوئٹے کی محبوبہ کرسٹینے نے عقل مندی سے کام لیا نوکروں کے ساتھ مل کر سپاہیوں پر قابو پالیا اور خوش قسمتی سے گوئٹے کی جان بچ گئی۔"

دوسرے دن گوئٹے نے کرسٹینے ولپیس سے چرچ میں جا کر باقاعدہ شادی کرلی۔ 18 سال بعد اس نے یہ رسم نبھائی۔ 18 سال تک وہ اس کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہا تھا۔ کرسٹینے ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ کمپنی میں شاید پھول بنائے جاتے تھے۔ اس خوبصورت عورت کو تین چیزیں بہت پسند تھیں یا کہہ لیجئے اسکی کمزوری تھیں۔ شراب، تھیٹر اور گوئٹے۔ گوئٹے نے اسے 18 سال تک تینوں چیزیں دیں اور سپاہیوں کے حملے میں جب کرسٹینے نے جان پر کھیل کر اسکی جان بچائی تو گوئٹے نے اسے باقاعدہ چرچ میں جا کر بیوی بنالیا۔

کرسٹینے سے عشق اور چوری چوری ملاقاتوں کا سلسلہ شوپنہاؤر کے گھر سے شروع ہوا۔ شوپن ہاؤر کی ماں اپنے زمانے کی مقبول ناول نگار تھی۔ گوئٹے کا وہاں آنا جانا تھا۔ اس نے گوئٹے کو اجازت دے رکھی تھی کہ کرسٹینے کو وہ اپنے ساتھ لاسکتا ہے۔ چنانچہ گوئٹے کرسٹینے کو ساتھ لے کر جاتا۔ شوپنہاؤر کی ماں کے ساتھ جہاں وہ تاش کھیلتے اور دل ایک دوسرے کے سامنے ہارتے۔ ان ہی ملاقاتوں میں گوئٹے نے شوپن ہاؤر کی ماں کو بتلایا کہ تمہارا بیٹا بہت ذہین آدمی ہے اور ایک دن عالمی شہرت حاصل کرے گا۔ ماں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ دو ذہین شخصیات ایک ہی گھر میں اکٹھی رہیں۔ چنانچہ گوئٹے کی تعریف شوپن ہاؤر کو بہت مہنگی پڑی اور شوپن ہاؤر کی ماں نے شوپن ہاؤر کو گھر سے نکال دیا۔

گوئٹے کی ساری زندگی عشق کے کھیل کھیلتے گزری۔ اس نے خود بھی اپنے اندر دو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک کا تعلق جسم سے تھا اور دوسری کا روح سے۔ اپنے مقبول ڈرامے "فاؤسٹ" میں ایک جگہ اس نے فاؤسٹ کو اپنے بارے میں گفتگو کرتے دکھایا ہے اور اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ گوئٹے کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ فاؤسٹ اپنے بارے میں کہتا ہے:

"میرے اندر دو روحیں ہیں جن میں ہمیشہ کش مکش رہتی ہے جنگ رہتی ہے دونوں ایک دوسری پر غلبہ پانے میں مصروف رہتی ہیں۔ ایک نے جسمانی لذتوں کے شوق میں دنیاوی کثافتوں پر اپنا بدصورت جال پھیلا رکھا ہے اور دوسری اپنی طاقت کے زور پر اڑ کر آسمانوں کی طرف جانا چاہتی ہے جو اس کا پیدائشی اور آبائی مسکن ہے۔"

یہ بات بالکل درست ہے گوئٹے کا ایک پیر عشق، محبت اور عورتوں سے تعلقات کی کشتی میں تھا تو دوسرا پیر کائنات کے رازواسرار، روحانی اور فلسفے کی گتھیاں سلجھانے والی کشتی میں رکھا ہوا تھا۔ ہوتا یوں ہے کہ ان دو کشتیوں میں سفر کرنے والا آدمی دو چار منزلیں طے کرکے منہ کے بل گر جاتا ہے مثال کے طور پر انگریزی ڈراما نگار کرسٹوفر مارلو جو شراب پی کر خانہ بدوش لڑکیوں کی بانہوں میں ڈانس کرتا تھا اور دوسری طرف اس نے ڈاکٹر فاسٹس جیسا لافانی اسلوب کا ڈراما لکھا مگر وہ زیادہ دیر تک اس توازن کو قائم نہ رکھ سکا۔ لیکن گوئٹے میں بڑا دم خم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ترازو جس میں جسم وروح کے دو پلڑے تھے مرتے دم تک برابر رہے۔ کرسٹینے 1816ء میں فوت ہوئی۔ 1823ء میں گوئٹے ایک 18 سالہ لڑکی الریکے فون لیوت زووے کے عشق میں بری طرح الجھ گیا۔ چاہتا تھا کہ اسے شادی کا پیغام بھیجے مگر لڑکی کی ماں کی شدید مخالفت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا۔

گوئٹے 1771ء میں وکالت کی ڈگری لے کر ایک چھوٹے سے گاؤں ویٹز لار (Wetzlar) چلا گیا تاکہ وہاں کی

چھوٹی عدالت میں وکالت میں اپنا ہاتھ سیدھا کرسکے لیکن وہاں عدالت میں رشوت عام تھی جج بدقماش اور راشی تھے چنانچہ گوئٹے نے ہومر (Homer) اور پنڈار (Pandar) کی شاعری کی طرف دھیان دیا اور عشق کے اس جال میں پھنس گیا جس نے اس سے "ورتھر کی داستان غم"، لکھوائی۔

ویٹز لار پہنچنے پر اسکی ملاقات ایک نوجوان کیسٹنر (Kestner) سے ہوئی جو ایک سفیر کا سیکرٹری تھا۔ وہ گوئٹے سے عمر میں بہت بڑا تھا مگر دونوں کے مزاج ملتے جلتے تھے۔

کیسٹنر نے گوئٹے کی ملاقات ایک رقص کی محفل میں اپنی منگیتر شارلوٹے سے کرائی جسے لوٹے یا لوٹش کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ گوئٹے اسے دیکھ کر دل دے بیٹھا اور یہ ملاقات اس کے لئے تباہی کا باعث بن گئی اور یہی تباہی "ورتھر کی داستان غم" کا باعث بنی۔ کیسٹنر کو جب پتا چلا تو اس نے گوئٹے کی قابلیت اور ذہانت کو دیکھ کر اسے کچھ نہ کہا۔ شارلوٹے کے ساتھ گوئٹے نے آہستہ آہستہ اظہار عشق کیا۔ شارلوٹے مجبور تھی اس کی منگنی ہوچکی تھی اور وہ اپنے منگیتر کیسٹنر سے بہت پیار کرتی تھی۔ گوئٹے عشق میں ناکوں ناک دھنس چکا تھا جب ان دونوں کی شادی ہوگئی تو یہ ویٹز لار چھوڑ کر فرینکفرٹ آگیا اور ہجر کی آگ میں جل کر راکھ ہوگیا۔

"ورتھر کی داستان غم" کا یہی سارا تانا بانا ہے صرف نام بدلے ہیں وہ بھی دو نام۔ اپنے لئے ورتھر اور کیسٹنر کے لئے البرٹ کا نام رکھا گیا ہے۔ شارلوٹے کا نام وہی ہے۔ یہ ناول اپنی بنت، شدت جذبات، وارفتگی اور رومانوی فضا سے بھرپور ہے۔ ورتھر شارلوٹے سے شدید عشق کرتا ہے۔ شارلوٹے دو ایک مقام پر لڑکھڑاتی ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔ البرٹ سے چھپ کر وہ ورتھر سے ملتی ہے مگر اسے ورتھر سے ہمدردی ہے وہ اسے اداسی اور غم سے بچانا چاہتی ہے اور مشورہ دیتی ہے کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے شادی کرلے مگر ورتھر اس کی بات نہیں مانتا۔ اس کہانی کے لئے انجام گوئٹے نے اپنے ایک دوست یروشلم کو چنا جس نے خودکشی کرلی تھی۔ جب شارلوٹے کی البرٹ سے شادی ہوجاتی ہے۔ ورتھر پھر بھی اس سے ملتا رہتا ہے لیکن شارلوٹے کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ ورتھر کو شارلوٹے کے بغیر دنیا تاریک نظر آتی ہے۔ وہ کئی کئی دن کمرے میں اور دریا کے کنارے اکیلا گزارتا ہے۔ آخر وہ ایک فیصلہ کرتا ہے۔ اپنا نوکر بھیج کر البرٹ کے گھر سے پستول منگواتا ہے۔ البرٹ پستول شارلوٹے کو دیتا ہے کہ وہ ورتھر کے نوکر کو دے دے۔ شارلوٹے نوکر کو پستول دے کر پوچھتی ہے کہ ورتھر نے پستول کیا کرنا ہے۔ نوکر بتلاتا ہے کہ وہ کسی سفر پر جارہے ہیں حفاظت کے لئے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ نوکر پستول لاکر ورتھر کو دیتا ہے۔ جب ورتھر کو پتا چلتا ہے کہ اس پستول پر شارلوٹے کے ہاتھ بھی لگے ہیں تو وہ خوشی سے پاگل ہوجاتا ہے۔ شارلوٹے کو خط لکھتا ہے اور ایک خط البرٹ کو لکھتا ہے اور پھر خودکشی کرلیتا ہے نوکر سے پستول لے کر ورتھر شارلوٹے کو خط لکھتا ہے جو آخری خط ہے اور کہتا ہے۔

"پستول تمہارے ہاتھ میں رہ چکا ہے۔ تم نے اس کی گرد جھاڑی ہے۔ میں اس پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں بار بوسہ شوق دیتا ہوں۔ تم نے اسے ہاتھوں سے چھوا ہے قسمت میری رہبری کررہی ہے۔ میری تمنا تھی کہ تمہارے ہاتھوں میری موت آتی۔ لو آج میری تمنا پوری ہوتی نظر آرہی ہے" پھر ورتھر نے خط میں آگے لکھا:

"بچوں کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا۔ شارلوٹے میں تمہارا گرویدہ ہوں۔ وہ فیتہ جو تم نے مجھے میری سالگرہ پر دیا تھا۔ میرے ساتھ دفن ہوگا۔ پستول بھرا ہوا ہے۔ گھڑی میں ٹھیک بارہ بجے ہیں۔ لو اب کام ہوا چاہتا ہے۔ شارلوٹے شارلوٹے الوداع۔ الوداع۔"

دوسری صبح ورتھر کا بوڑھا نوکر کمرے میں آیا۔ لاش زمین پر پڑی تھی۔ ورتھر کو اسی جگہ دفنایا گیا جہاں ورتھر نے دفن ہونے کی خواہش کی تھی۔ بوڑھا اور اس کے بیٹے جنازے کے ساتھ تھے۔ البرٹ جنازے میں نہ جا سکا۔ جنازے میں کوئی پادری ساتھ نہ تھا۔

''ورتھر کی داستانِ غم'' کا چھپنا تھا کہ 18 ویں صدی کے لوگ جو خیال پرستی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کے دلوں میں چنگاری بھڑک اٹھی۔ انہیں ورتھر کے دکھ درد میں اپنا دکھ درد نظر آیا۔ اس کے آنسوؤں میں ان کے آنسو شامل ہو گئے۔ گوئٹے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

''اس چھوٹی سی کتاب کا بڑا اثر ہوا کیونکہ اس نے اس عہد کی خصوصیات کو چھیڑ دیا تھا۔ جس طرح ایک دیا سلائی دکھانے سے پوری سرنگ بھک سے اُڑ جاتی ہے اسی طرح میری اس کتاب سے زبردست دھماکہ ہوا۔''

کارلائل اس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے۔

''اس عہد کے اثرات کو سب محسوس کر رہے تھے مگر ان اثرات میں آواز صرف گوئٹے نے پیدا کی۔''

نقادوں کا کہنا ہے کہ آج تک جرمنی کی کسی کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی (حتیٰ کہ گوئٹے کے فاؤسٹ کو بھی) جتنی اس ناول کو حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ہر عہد میں پسند کی گئی۔ جب تک دکھ، درد، ہجر و فراق، درد کی خلش انسانوں کے سینے میں موجود ہے یہ کتاب پسند کی جاتی رہے گی۔

یہ کتاب خطوط کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ورتھر اپنے ایک دوست کو یہ ساری داستان سناتا ہے جس کا نام ولہلم ہے۔ اپنے عشق اور ملاقات کی ایک ایک تفصیل خط میں لکھتا ہے۔ خودکشی کے بعد دوست نے اس ناول کو انجام تک پہنچایا۔ خطوط کے ذریعے ناول لکھنے کا یہ انداز انگریزی ناول نگار رچرڈسن سے شروع ہوا جو ایک پریس میں کام کرتا تھا اور لڑکیاں اس سے خطوط لکھوانے آتی تھیں بعد میں رچرڈسن نے انہیں ''پامیلا'' نامی ناول میں منتقل کر دیا۔ اردو ادب میں اس کی مثال قاضی عبدالغفار کا ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

''ورتھر کی داستانِ غم'' پر اعتراضات بھی بہت ہوئے' خودکشی مذہب میں جائز نہیں اس ناول کے چھپنے کے بعد بے شمار نوجوانوں نے خودکشی اور مذہبی حلقے نے اس ناول کی مخالفت کی۔ کئی شوہروں نے اپنی بیویوں کو شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ لڑکوں نے ورتھر کی طرح نیلا کوٹ، پیلی واسکٹ اور پیلی پتلون پہننا شروع کر دی۔

اس کتاب کے فرانسیسی، اطالوی، انگریزی میں تراجم ہوئے، نپولین نے یہ ناول سات بار پڑھا۔ مصر پر حملہ کرنے گیا تو یہ کتاب اس کے ساتھ تھی۔ 1808ء میں جب نپولین زار روس سے ملاقات کرنے اَرفرٹ Erfurt قصبے میں گیا تو اس نے ڈیوک آف وائمار کی دعوت کی جس کے ساتھ گوئٹے بھی تھا۔ نپولین نے گوئٹے کو دیکھ کر کہا:

''واقعی آپ ایک عظیم انسان ہیں۔''

اور پھر گوئٹے سے ورتھر کے بارے میں گفتگو شروع کر دی اور گوئٹے سے کہا کہ مجھے ایک حصے پر سخت اعتراض ہے اور پھر اس حصے پر اعتراضات کئے جو انسانی نفسیات کے منافی تھا۔ گوئٹے یہ باتیں غور سے سنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے لئے یہی بات کافی تھی کہ نپولین نے یہ ناول سات بار پڑھا ہے۔

''ورتھر کی داستانِ غم'' کا ڈاکٹر ریاض الحسن نے 1933ء میں اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ انہوں نے الہ آباد مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں ترجمے کی ایک کاپی علامہ اقبال کو پیش کی اور پھر 1935ء میں اصغر گونڈوی کا خط لے کر لاہور ڈاکٹر اقبال

سے ملنے آئے اور ترجمے کے بارے میں بات کی تو اقبال نے کہا:

''آپ نے اس کا ترجمہ کر کے بہت اچھا کیا مگر یہ کتاب 40 سال کے بعد پڑھنا چاہئے کیونکہ اس کتاب کے جوش اور تیزی کی عنفوانِ شباب تاب نہیں لا سکتا۔''

ریاض الحسن نے جواب دیا:

''مگر جب گوئٹے نے یہ کتاب لکھی تو اس کی عمر 23 سال تھی۔''

علامہ اقبال نے جواب دیا:

''لیکن ہر نوجوان گوئٹے کی طرح غیر معمولی نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کا یہ ترجمہ اپنی لائبریری میں کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہے کہ اس عمر میں کہیں جاوید یہ کتاب نہ پڑھ لے۔''

گوئٹے کی دوسری شہرہ آفاق کتاب اس کا ڈراما فاؤسٹ (حصہ اول) ہے جو اس کی زندگی ہی میں چھپا، دوسرا حصہ اس کی وفات کے ایک سال بعد چھپا۔

شیطان جو ہر مذہب میں انسان کا دشمن۔ خیر کی طاقت کے سامنے ایک رکاوٹ اور راندہ درگاہ ہے جس کا کام ہی انسان کو الجھنوں میں قید کرنا ہے۔ جسے یہ بات پسند نہیں کہ انسان سیدھے راستے پر چلے اور خیر کا استعارہ بنے، ڈراما ''فاؤسٹ'' انسانی لغزشوں اور ایک انسان کی گمراہی کی کہانی ہے۔

ڈرامے میں شیطان یعنی میفسٹوفلیس (جو جرمنی میں ابلیس اور شیطان کا دوسرا نام ہے) سے خدا پوچھتا ہے کہ کیا تم فاؤسٹ کو جانتے ہو۔ شیطان جواب دیتا ہے کہ وہ تو بڑا پڑھا لکھا عالم اور علامہ دہر ہے۔ مسرت اور فن کا طلب گار ہے دنیا کی کسی خواہش کا طلب گار نہیں۔ بس اونچائی کی طرف جا رہا ہے۔ خدا جواب دیتا ہے کہ میں اسے جلد ہی نور سے مالا مال کر دوں گا۔ اگر تمہاری بدی میں طاقت ہے تو اسے راہ راست سے ہٹا کر دکھاؤ کیونکہ وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ شیطان مسکرا کر کہتا ہے۔ مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔ میں تو جیتنے والا گھوڑا ہوں۔ میری جیت میں کوئی شک نہیں۔ اور پھر شیطان فاؤسٹ کو بہلا پھسلا کر اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔

شیطان انسان کو ایک جھینگر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو گھاس پر بازو پھیلاتا ہے اور پھر گھاس پر ہی گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی گندگی کے ڈھیر پر گر جاتا ہے شیطان کا کہنا ہے کہ اب اسے انسان کو ورغلانے میں زیادہ تکلیف اور جدوجہد نہیں کرنا پڑتی۔ یہ خود بخود قباحتوں اور گناہوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔

شیطان فاؤسٹ کو لالچ دے کر اس سے روح کا سودا کرتا ہے اور اسے دنیا کی ہر نعمت دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ فاؤسٹ اس کی ہر بات مانتا ہے۔ اس کی ہر چال پر عمل کرتا ہے جب روح دینے کا وقت آتا ہے تو اسے خدا کی عظمت، رحمت اور طاقت کا احساس ہوتا ہے اور اسے ندامت اور شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی ندامت اور شرمندگی اور توبہ ایک بار پھر اس کے اندر سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہے۔

''فاؤسٹ'' گوئٹے کا ایک عظیم شعری کارنامہ ہے۔ دانش روحانی اقدار، انسانی لغزشوں، پستی، بلندی کا ایک حسین مرکب ہے۔ گوئٹے کے علم، تجربے، مشاہدے اور فلسفیانہ طرز اسلوب نے اسے ایک عظیم شاہکار بنا دیا ہے۔

''فاؤسٹ'' کی اپنی محبوبہ مارگریٹ سے گفتگو۔ شیطان سے مکالمے اور خدا کے حضور فاؤسٹ کی التجا اور آہ وزاری نے اس ڈرامے کو ایک لافانی انداز بخشا ہے۔ ''فاؤسٹ'' کے موضوع پر انگریزی ڈراما نگار کرسٹوفر مارلو نے بھی ایک بڑا

جاندار ڈراما لکھا ہے۔شیکسپیئر کے اس ہمعصر نے ایک بار تو لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر مارلو اپنے آپ پر قابو رکھے شراب اور شباب سے نظر چرا کر لکھنے پر توجہ دے تو شیکسپیئر کا استھان ہل سکتا ہے مگر مارلو دو ایک ڈراموں کے بعد اپنی توجہ لکھنے لکھانے پر مرکوز نہ کر سکا۔ گوئٹے کا فاؤسٹ اور مارلو کا ڈاکٹر فاسٹس ۔ دونوں کس حد تک فنی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پایہ ہیں؟ یہ بات اس مختصر مضمون میں نہیں ہو سکتی صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت کے راستے پر دونوں دوڑ رہے ہیں ۔ دونوں کے قدم تیز حرکت کر رہے ہیں ۔ دونوں کی اپنی اپنی مہک ہے ایک لحاظ سے گوئٹے مارلو سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ گوئٹے نے فاؤسٹ میں شعری عظمت، تشبیہہ، استعارے اور زبان کے حسن کے علاوہ جس طرح فہم ودانش، اپنے مطالعے اور فکر وفلسفے کو اس ڈرامے میں برتا ہے وہ شاید کرسٹوفر مارلو نہیں کر سکا ۔ یہی بات گوئٹے کو ایک امتیازی حیثیت دلاتی ہے۔

گوئٹے کی ادبی زندگی میں اس کے عہد کے ایک شخص کا بہت ہاتھ ہے ۔اس کا نام ہرڈر ہے ۔ ہرڈر سے ملاقات نے گوئٹے کی زندگی بدل دی ۔ ہرڈر کی رہنمائی میں اس نے فرانسیسی طرزِ فکر سے دامن چھڑایا اور خالص جرمن فکر کو اپنایا۔ ہرڈر ایک شدتِ احساس رکھنے والا آدمی تھا۔ گوئٹے کی تحریروں میں شدت، تیزی اور جذبات کا طوفانی لب ولہجہ ہرڈر کی دین ہے۔ ہرڈر کو آپ جرمنی ادب میں ایک نئے طرز اسلوب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

گوئٹے کے زمانے میں ایک انقلابی ادبی تحریک کا بہت بول بالا تھا ۔ اس کا نام ’’طوفان و ہیجان‘‘ (Stum and Dranz) تھا یہ تحریک دس سال تک فعال رہی۔ گوئٹے اس کا رکن اور ہرڈر اسے منظم اور مضبوط انداز میں چلانے والا تھا۔

ہرڈر کے بعد جس شخص نے اسکی زندگی میں بہت گہرا اثر چھوڑا وہ شیلر تھا۔ اس کی دوستی نے اس کی تخلیقی زندگی کو بڑی تقویت دی ’’فاؤسٹ‘‘ کی تحریر وتشکیل میں شیلر کی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے ۔ گوئٹے جو ایک بڑی بے ترتیب زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ شراب اور شباب کے سلسلے میں اس کی ساری عادات مغل اعظم کے چہیتے شیخو سے ملتی جلتی تھیں۔ شیلر سے ملاقات کے بعد اس نے پرانی زندگی کو الوداع کہہ دیا۔ شراب چھوڑ دی یہاں تک کہ کافی تک کو منہ نہ لگایا۔ اس دوستی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شیلر نے گوئٹے کو خط لکھ کر ملاقات کی دعوت دی اور ملاقات کے بعد دوستی کی گرہ بندھ گئی جو شیلر کی موت تک قائم رہی۔ گوئٹے کو شیلر کی موت کا بہت دکھ ہوا جس کا سوگ وہ مرتے دم تک مناتا رہا۔

گوئٹے کی ایک اہم تصنیف (Wilehim Meister,s Apprenticeship) ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ جس پر گوئٹے نے 1785-1777ء تک کام کیا۔ گوئٹے کی فکر اور نظریات سمجھنے کے لئے یہ بہت اہم کتاب ہے (مضمون کی طوالت کی وجہ سے اس پر گفتگو ممکن نہیں‘ اس پر میں کسی اور وقت بات کروں گا) اس کے بارے میں مختلف نقادوں کے مختلف نظریات ہیں مثلاً G.H.Lewes کا کہنا ہے:

’’کسی فن پارے میں جتنی خامیاں ہو سکتی ہیں وہ اس میں موجود ہیں‘ سست روی، تھکا دینے والی کیفیات، کبھی کبھی بُری اور بیدلی سے لکھی ہوئی نثر۔‘‘

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ گوئٹے فرانسیسی فکر سے جرمن قوم کو الگ کرنا چاہتا تھا۔ روسو اگر چہ اسے پسند تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنے خیالات اور نظریات کو لوگوں میں فروغ دینا چاہتا تھا۔ یہ کتاب طنز، رومانویت، حقیقت پسندی، روشن خیالی کا مرکب ہے۔ گوئٹے کی تحریروں پر نقادوں کے اعتراضات کی ایک لمبی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے ایک بار گوئٹے نے اپنے سوانح نگار (Eckermann) ایکرمن سے کہا تھا:

’’ورتھر میں لوگوں نے اتنی خامیاں نکالی ہیں کہ اگر میں ان حصوں اور فقرات کو کتاب سے نکال دوں تو ساری کتاب میں پڑھنے کے لئے کوئی سطر نہیں بچے گی۔‘‘

نقادوں کے بارے میں گوئٹے کا اپنا ایک مضبوط نظریہ تھا جس پر وہ ساری عمر قائم رہا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں کہتا ہے:

’’نقادوں کے سامنے نہ آدمی جھک سکتا ہے۔ نہ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ ان سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ کام کرتے رہنا چاہیے ایک دن وہ خود آپ کے سامنے جھک جائیں گے۔‘‘

گوئٹے اپنی تحریروں میں اس مسرت کی تلاش کرتا رہا جو اس کے بس میں نہ تھی (فاؤسٹ ۔ ورتھر کی داستان غم، شاعری اور دوسری تحریریں اس کی گواہ ہیں) اور یہی رومانوی ادیبوں کا مرکزی خیال ہے ۔گوئٹے کا فاؤسٹ انیسویں صدی میں ایک (Myth) کی شکل اختیار کر گیا۔ ورتھر کا کردار مثالی بن گیا۔ اس نے فارسی شاعر حافظ سے بہت اثر قبول کیا اور حافظ کی طرز پر نظمیں لکھیں اور اپنی اس کتاب کا نام دیوان رکھا۔ گوئٹے نے نثر اور شاعری میں جو بھی لکھا بے مثال لکھا اور اس کا بیشتر حصہ ضرب المثل بن گیا۔ سینکڑوں جملے دنیا کی مختلف زبانوں میں اپنی شان دکھاتے پھر رہے ہیں۔ چند جملے میں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا جو مختلف زبانوں میں تحریک کی شکل اختیار کر گئے مثلاً:

"Divide and rule, a sound motto, but unite and lead, a better one"

"Enjoy when you can, endure where you must"

"Art is long, life is short"

گوئٹے کی ادبی، فکری اور خالص شعری تخلیقی صلاحیت کی ہلکی سی ایک جھلک آپ نے دیکھی، آیئے اب اس کی تخلیقی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی دیکھیں جو گوئٹے کے نزدیک اس کی ساری زندگی کا اصل مقصد تھا۔ غالب نے ایک بار کہا تھا کہ اگر میری شاعری کی قدر و قیمت جاننا چاہتے ہو تو اردو کی بجائے میری فارسی شاعری پر نظر ڈالو۔ دیکھیے گوئٹے اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اپنے سوانح نگار ایکرمن سے ایک بار اس نے کہا:

’’بحیثیت شاعر جو کچھ میں نے کیا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں لیکن اس صدی میں‘ میں واحد آدمی ہوں جس نے رنگوں کی مشکل ترین سائنس میں منفرد کام کیا ہے جو کسی نے نہیں کیا اس پر مجھے فخر ہے۔‘‘

گوئٹے نے نیچرل سائنس، شکلیات، پودوں اور رنگوں پر بے شمار تجربے کئے ہیں اور اس کی صلاحیت کو ہیگل اور چارلس ڈارون نے بھی تسلیم کیا۔

سائنس کی دنیا میں گوئٹے کے یہ تجربات اور تحقیق بڑی مستند ہے اور اسے مندرجہ بالا اشیا کے بارے میں تحقیق کو بہت سراہا جاتا ہے۔ گوئٹے نے پہلا سائنسی پیپر 1784ء میں لکھا جس میں اس نے انسان کے بالائی جبڑے میں ہڈی کا مشاہدہ کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس ہڈی کو وہ بین الفکین کا نام دیتا ہے۔

گوئٹے جب ڈیوک کی دعوت پر وائمار (Weimar) گیا تو ڈیوک نے اسے معدنیات کی کانوں کی کھدائی کا کام سونپ دیا۔ جہاں گوئٹے نے پتھروں پر تحقیق شروع کر دی۔ چٹانوں کی ابتدا ان کی رفتہ رفتہ تشکیل کے بارے میں مضامین لکھے جن کی اہمیت کو آنے والے سائنس دانوں نے بھی تسلیم کیا۔

اٹلی میں اپنے قیام کے دوران اس نے پودوں پر ریسرچ کی اور پورے پودے کو ایک پتہ قرار دیا۔ وہ کہتا ہے:

"From top to bottom a plant is a leaf , united so inseparably with the future but

that one cannot be imagined without the other"

رنگوں کی خاصیت پر گوئٹے کا کام بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ 1810ء میں اس کا مضمون Theory of colours چھپا تو رنگوں کے بارے میں کئی باتیں سامنے آئیں۔ گوئٹے نے ثابت کیا کہ رنگ اصل میں روشنی کے ساتھ اندھیرے کو ملانے سے بنتے ہیں اور دونوں مل کر سلیٹی رنگ کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے بنفشی، سیاہ، ارغوانی کو ملا کر باقاعدہ اشکال بنا کر نتائج اخذ کئے۔ فعلیاتی رنگوں پر لکھا ہوا اس کا مضمون اہم ترین مضمون سمجھا جاتا ہے۔

گوئٹے کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں' وہ انیسویں صدی پر بہت اثر انداز ہوا۔ اس کے خیالات پوری دنیا میں پھیلے اور نئے لکھنے والوں اور دانشوروں کو متاثر کیا۔ اس کی شاعری، ڈراما، ناول، سائنس، نیچرل سائنس، تنقید، مضامین، ایک نئی خوشبو بن کر دنیا میں پھیلے۔ اس نے جرمنی ادب کے لئے نئے تنقیدی اور تخلیقی اصول وقواعد وضع کئے۔ علاوہ ازیں کلچر اور ثقافت کو فروغ دیا۔ وہ ایک ثقافتی طاقت تھا اس نے تہذیبی روایات پر ریسرچ کی اور گرد جھاڑ کر انہیں نئی شکل دی۔

گوئٹے کی جرمنی میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ ہٹلر کے عہد حکومت میں اس کی مقبولیت کے چاند پر بادل چھایا مگر ہٹلر کے جانے کے بعد یہ چاند پھر بادلوں سے باہر آ گیا۔ اس کی شاعری کو نامور موسیقاروں نے سروں کا لباس پہنایا۔ بیتھوون (Beethoven) نے فاؤسٹ کی سمفنی تیار کی۔ گوئٹے کے نام پر دنیا بھر میں انسٹی ٹیوٹ قائم ہوئے۔ گوئٹے اور شیلر کی دوستی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے وائمار (Weimar) کے چوک میں دونوں کے مجسمے لگے ہوئے ہیں جنہیں گزرنے والے روز ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔

گوئٹے 22 مارچ 1832ء کو 82 سال کی عمر میں وائمار (Weimar) میں فوت ہوا۔ ایک بڑے آدمی نپولین نے کہا۔ ''تم واقعی عظیم انسان ہو'' اس کا سوانح نگار ایکرمن آخری منظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جس صبح گوئٹے فوت ہوا میں اس کے گھر گیا۔ اس کے وفادار ملازم فریڈرک نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں نے گوئٹے پر نظر ڈالی اس کے چوڑے ماتھے پر اب بھی فکر کی لکیریں تھیں۔ اس کے جسم کے اردگرد برف رکھی گئی تھی۔ اس کا جسم سفید چادر میں لپٹا تھا۔ ایک خوبصورت آدمی جاہ وجلال کے ساتھ لیٹا تھا۔ میں پل بھر کے لئے بھول گیا کہ گوئٹے مر چکا ہے۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ مکمل خاموشی تھی۔ میں اپنی آنکھوں میں آنسو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔''

گوئٹے کہنے کو مر گیا مگر اقبال، ڈارون، ہیگل، شیلر، شوپن ہاؤر، کارلائل، نطشے، آندرے ژید اور ترگنیف کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں وہ آپ کو سر اٹھا کر جھانکتا ضرور نظر آئے گا۔